

وہ خوب کے گناہ تک

ایم ایف ایف



دُھوپ کے پگھلنے تک

امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 37232336-37352332 - 042

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	دعوت کے پھلنے تک
لکھاری	:	احمد جاوید
ناشر	:	گل فراز احمد
سن اشاعت	:	الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور
تعداد	:	2014ء
	:	1000

..... لئے کے پتے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور

کتاب گھر	اشرف بک انجینی
اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی
وہیم بک پورٹ	غزنیہ علم و ادب
اردو بازار، کراچی	انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
رشید نیوز انجینی	جہانگیر بکس
احمد مارکیٹ، اردو بازار، کراچی	یوہڑ گیٹ، ملتان
منج بک انجینی	شمسیر بک ڈپو
بھوانہ بازار، فیصل آباد	تلہ سنگ روڈ، چکوال

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کہو رنگ طاعت، صحیح طور پر سازش میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

میرے بھائی، میرے دوست، میرے محسن
گل فراز احمد صاحب اور ملک محمد حسین صاحب

کے نام

معاشرتی ایسے پر خوشگوار کہانی

انقلاب کی لہر ہمیشہ معاشرے سے اٹھتی ہے اور یہ عوام ہی ہیں جو نہ صرف اپنا مقدر بدلنے ہیں بلکہ حکومت تک کے نصیب بھی وہ خود ہی لکھتے ہیں۔ مگر ہوتا یوں کہ تبدیلی کا وقت صدیوں بعد آتا ہے، اور اس وقت کی پہچان رکھنے والے بہت ٹھوڑے ہوتے ہیں۔ وقت کو پہچان لینے کی صلاحیت آسانی سے نہیں ملتی، یہ نگاہ انہی میں پیدا ہوتی ہے، جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے خون بکھر سے اپنا نصیب لکھتے ہیں۔

دھوپ کے پگھلنے تک، ایک ایسا ناول ہے، جس میں احمد جاوید نے اپنے معاشرے کو وہ پیغام دیا ہے، جو وقت کی ضرورت ہے۔ ان کا روئے سخن براہ راست عوام کی طرف ہے اور بہت بے تکلفانہ انداز میں وہ اپنا پیغام ایک کہانی کی صورت میں دے جاتے ہیں۔ قاری کہانی میں کھو کر بھی محسوس کرتا ہے کہ احمد جاوید تو اسی کی بات کر رہا ہے۔ قاری جو کچھ کہنا چاہتا ہے، احمد جاوید وہی کچھ بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو یہ ہر قاری کی اپنی کہانی ہے، جسے احمد جاوید نے کہا ہے۔ یہی دلچسپی اس وقت اپنی انتہا کو جا پہنچتی ہے، جب یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ یہ کہانی سوچیں ہی ایسی دے جاتی ہے کہ وہیں سے نئی کہانیوں کی شروعات کا احساس ہونے لگتا ہے۔

معاشرتی ایسوں کی کوکھ سے جنم لینے والی کہانی میں جہاں کردار عام فہم اور ہمارے ارد گرد کے ہیں، وہیں اس کہانی کا انوکھا پن مسکرا کر بھی ہے۔ اس کہانی میں جو میں نے خاص بات محسوس کی وہ یہ کہ احمد جاوید کہیں بھی کوئی فیصلہ نہیں دیتا، بلکہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہوئے مختلف تصویریں دکھاتا ہے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ یا پھر یوں کہا جائے کہ حالات کی شورش میں جو ہنگامہ آرائی ہے، کسی اونچی جگہ کھڑے ہو کر وہ قاری کو ان کرداروں کی نشاندہی کر دیتا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جو معاشرتی المیہ کا باعث بنتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میرے خیال میں یہ معاشرتی ایسے پر خوشگوار کہانی ہے۔

احمد جاوید۔ اب ناول کی دنیا کا وہ نام ہے جسے قارئین نے پسندیدگی کی سند عطا کر دی ہوئی ہے۔ میں اسی امید کے ساتھ یہ ناول آپ تک پہنچا رہا ہوں کہ یہ بھی آپ کے ذوق مطالعہ پر پورا اترے گا۔

تبدیلی اور انقلاب کا حقیقی پیغام

ایک سچا قلم کار معاشرے کا باض ہوتا ہے اور اس کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ وہی کچھ لکھتا ہے جو وہ معاشرے میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر وہ اس سے ہٹ کر لکھتا ہے تو اس میں ہمہ گیریت اور آفاقیت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ صرف اس کی ذاتی تسکین کا باعث ہو سکتی ہے۔ ایسی تحریر پانی کی سطح پر موجود پانی کے بلبلے کی ہے جس کی زندگی نہایت مختصر ہوتی ہے۔ یا پھر جلتے ہوئے شعلے کی طرح بھڑک کر بجھ جاتی ہے مگر اندھیرے میں آجلا نہیں کر سکتی۔

اسی تاثر میں دیکھا جائے تو امجد جاوید ایک سچا قلم کار ہے۔ وہ اپنے قلم کی حرمت و عزت کا پاس رکھنا جانتا ہے۔ ان کے گزشتہ کام کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ”دھوپ کے پتھلے تنک“ ایک بالکل ہی نئے انداز کا ناول ہے۔ انہوں نے اپنے روایتی کھلے دھلے انداز میں لکھا ہے۔ جو نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ فلسفہ اور بے جا تجسس کی راہ پر نہیں چلے بلکہ کہانی کے پرت بغیر کسی پیچیدگی کے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے قاری پوری دلچسپی سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ بڑی چابک دستی سے جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں وہی اپنے قاری کو دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کوشش میں زیر قلم کردار کو پوری طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ وہ قاری کو خود سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ وہ زندگی کی کنہوں کو بغیر لگی لپٹی رکھے من و عن پوری سفاکی سے بیان کرتے ہیں اور اس سلسلے میں لفظوں کے ہیر پھیر سے اس کی شدت کو کم کرنے یا چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ ابلاغی اصول ہے کہ آپ جن کے لئے اپنا پیغام دے رہے ہیں، انہیں بات پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔ میرے خیال میں انہوں نے اپنے مقصد کو اولیت دی اور زبان بیان کو دوسری، تاکہ ان کے مقصد کا ابلاغ پوری طرح ہو جائے۔ یہ ایک ہا مقصد لکھاری کا اپنے معاشرے کے بارے میں انتہائی درجے کا خلوص ہوتا ہے۔

جیسے کبھی قلم اظہر سحر میں فارمولا کہانوں کا دور آیا تھا۔ ویسے ہی فارمولا کا دور بھی آیا۔ خصوصاً خواتین کے لکھے ہوئے تمام ناولوں کا پلاٹ ایک جیسا ہوتا ہے۔ کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ امجد صاحب کے موجودہ ناول کا پلاٹ بھی ایک لحاظ سے فارمولا ہے، وہی گاؤں کا ماحول، محالہ چوہدری اور مظلوم عوام مزارعہ وغیرہ لیکن اس کہانی میں یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ایک مقصدیت ہے۔ انہوں نے جاگیردارانہ ذہنیت کی عکاسی بڑی مہارت سے کی ہے اور اس کے خلاف آواز بھی اٹھاتی ہے۔ یہ اپنے علاقے میں سکول نہیں کھلنے دیتے تاکہ لوگوں میں اپنے حقوق کا شعور بیدار نہ ہو۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ اگر لوگ لکھ پڑھ گئے۔ تو ان کی چاکری کون کرے گا۔ انہوں نے

اپنے نئی جیل خانے بنا رکھے ہیں۔ غریب ہاریوں کی بہو بیٹیاں ان کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔ حکومتی ایوانوں تک بھی یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ وطن عزیز کو آزاد ہوئے ۶۷ برس ہو گئے ہیں مگر ابھی تک یہ وڈیروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور لغاریوں حزار یوں کے قبضے سے آزاد نہیں ہو سکا۔ پہلے جو ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کے محکوم تھے، اب وہ انہی کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ امجد جاوید اپنی عوام کو ہر طرح کی غلامی سے آزاد دیکھنے کا شدید خواہش مند ہے۔

آج کل ہر سیاست دان انقلاب اور تبدیلی کا نعرہ لگاتا ہے مگر تبدیلی کا راستہ کوئی نہیں دکھاتا۔ ان کے نزدیک تبدیلی یہی ہے کہ اقتدار پر انہیں بٹھا دو تو یہ تبدیلی ہے۔ امجد صاحب نے اس ناول میں تبدیلی کا درس بھی دیا ہے اور تبدیلی کیسے آئے گی، یہ راستہ بھی دکھا دیا ہے۔ انہوں نے یہ ناول لکھ کر وطن عزیز کی ان استحصالی قوتوں کا لالکا رہا ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک عوام کا استحصال کرتی آرہی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے ہیرو سے ”مولا جٹ“ کا کام نہیں لیا جو گولیوں کی برسات میں محض ایک گنڈا سہ کے ساتھ کشوں کے پٹنے لگا دیتا ہے۔ اُن کا ہیرو ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہے جو تشدد پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ عوام میں انکے حقوق کا شعور پیدا کر کے ان کو منزل تک پہنچنے کا درس دیتا ہے اور بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے اندھیر مگرگی میں انقلاب کی روشنی پھیلانے کا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔

انقلاب کا یہی پیغام اس ناول کی بنیاد ہے اور عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلانا اس کا مقصد ہے۔ اور میرے خیال میں امجد جاوید اپنے اس مقصد میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔

عارف محمود

مدیر ماہنامہ حکایت لاہور

کن کی تلاش میں نکلا ہوا دیوانہ

امجد جاوید کہانیاں نہیں لکھتے، یہ کہانیاں بنتے ہیں۔ کہانی لکھنے اور کہانی بننے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق دینی محسوس کر سکتا ہے جو احساس سے عاری نہ ہو۔ بالکل ایسے کہ منگے برانڈ کی کوئی سویٹر، کبھی بھی ہاتھ سے بنی ہوئی سویٹر کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ جب کوئی بہت مان اور پیار سے کسی اپنے کے لیے دن رات لگا کر سویٹر بنتی ہے تو اس کا نشہ ہی عجیب ہوتا ہے۔ اس نشہ کا سرور یا تو سویٹر بننے والی کو معلوم ہوتا ہے یا پھر جس کے لیے بنی جائے، اس کی آنکھوں سے چھلکتا ہے۔ امجد جاوید بھی بہت مان کے ساتھ اپنے قاری کے لیے کہانیاں بنتے ہیں۔ اسی لیے ان کا اپنے قاری سے رشتہ مضبوط ہوتا چلا جا رہا ہے۔

امجد جاوید نے ناول تو بہت لکھے ہیں لیکن وہ پیشہوروں کی اس بھیڑ چال کا حصہ نہیں بنے۔ انہوں نے شروع سے ہی فارمولا ناول لکھنے کی بجائے کہانی جتنی شروع کی۔ ان کے بعض ناولوں پر کہانی بننے بننے انہیں دس سال بھی لگے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب وہ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اب ان کے ناول چوری نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو امجد جاوید سے پہلے ان کا مستقل قاری بول اٹھے گا۔ یہی فن کی معراج ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ فن کی اس منزل پر پہنچنے پہنچنے ہم ایسے اپنے پر جلا بیٹھتے ہیں۔

امجد جاوید نے زیادہ تر تصوف اور عشق کو موضوع بنایا ہے۔ اب صورت حال اس پنج پر پہنچی چکی ہے کہ روشن آنکھوں والے انہیں پہچاننے لگے ہیں۔ کسی سچے جوگی کی طرح یہ حالات امجد جاوید کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے شعوری طور پر راستہ بدلنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے ”کیمپس“ کو موضوع بنایا۔ پھر ”امرت کور“ کے آچل میں چھپنے کی کوشش کی اور سکھ ازم کی گلی میں داخل ہوئے۔ یہ شعوری کوششیں بھی ان کے کسی کام نہ آئیں۔ کیمپس میں عشق طویل کر گیا۔ امرت کور میں تصوف کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار درویش نے کہا تھا تصوف بذات خود کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ رب کی عطا ہے جو انسان کو مذہب سے اوپر اٹھا کر اس جہاں میں لے جاتا ہے جہاں انسانی رویہ عشق میں وحل کر بذات خود مذہب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی صرف عشق کرتا ہے۔ وہ کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ سمندر میں اترنے والا پانی کے چند قطرے کے لئے سفر پر بھلا کہاں ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح صوفی اور دلی بھی ہم گناہ گاروں کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑتے۔ جس طرح ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اسلام لے کر آئے ہیں اسی طرح صوفی جانتا ہے کہ اسلام لانے والے آقا دو جہاں ﷺ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ سارے جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ صوفی ازم بھی سارے جہانوں سے منسلک ہے۔ یہ باریکیاں اور یہ ریزیں بھلا مجھ ایسا خطا کار کہاں سمجھ سکتا ہے۔ جو سمجھتے ہیں وہ خود کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ شاید امجد جاوید کوئی راز چھپاتے چھپاتے بہت کچھ عیاں کر بیٹھے ہیں۔ اس ”جرم“ کی سزا جانے کیا ہو، ہم یہ بھی نہیں جانتے۔

ہم ایسے تو ان محفلوں میں جو تیاں سیدھی کرنے سے زیادہ کی جرات ہی نہیں رکھتے۔

”دھوپ کے پھیلنے تک“ ان کی شعوری کوشش ہے۔ اپنی طرف سے انہوں نے رنگ بدلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ یہ ناول ان کے مجموعی مزاج سے ہٹ کر بنی گئی کہانی ہے۔ اس کا پلاٹ مضبوط ہے۔ کردار سازی سے لے کر منظر نگاری تک یہ ناول ”اصول ناول“ کے پیمانوں پر پورا اترتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے دعویٰ ہے کہ اس میں ”ہنستی چلے“ اور ”کالی چادر“ کا سایہ نظر آتا ہے۔ شعوری کوشش میں بھی لا شعوری رنگ چمکتا ہے۔ اس میں ایک بڑا سبق پوشیدہ ہے۔

یقین مانیے مجھے ”دھوپ کے پھیلنے تک“ نے جو کچھ پر مجبور کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد جاوید کے اس ناول پر ڈرامہ بن سکتا ہے۔ ویسے ڈرامہ تو انہوں نے اپنے مستقل قاری کے ساتھ بھی کیا ہے۔ اگر انہوں نے راستہ بدلایا درویش کی کنیا میں ہونے والے فیصلہ سے پھرے تو پھر ”قلندر لاہوری“ سے اپنا تعلق کمزور کر بیٹھیں گے۔ ابھی تو ان پر دروہ واہوئے ہیں۔ یہ ناول لکھ کر احمد جاوید اپنے فنی سفر کے سنگم پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ اب آخری فیصلہ انہیں خود کرنا ہے۔ گیسر کی چکا چوند کا شکار ہونے والے لشکر کی دیگ کے نیچے لکڑیاں جلانے کے لیے پھولکیں نہیں مارا کرتے۔ ایک جانب گیسر، دولت اور بے اعتنا شہرت ہے۔ یہ راستہ بھی ان کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ دوسری جانب درویش کی کنیا ہے۔ فیصلہ انہیں خود کرنا ہے۔ ہاتھ سے بنی ہوئی سویٹر اور تکیے کے نیچے سے ملنے والی موچے کی کلیوں کی بھیننی بھیننی خوشبو ان کے لیے زیادہ اہم ہے۔ یا پھر براڈ سویٹر اور مہنگے پر فیوم اثر رکھتے ہیں۔

احمد جاوید کے کئی ناول ایسے ہیں جو آپ کو زندگی دیں گے۔ وہی زندگی جو کسی محبوب کا ہاتھ تھامنے والے سچے عاشق کو ملتی ہے۔ وہی نشہ جس کا اسیر ہونے کے بعد سوتلی کپے گھڑے پر دریا میں اتر جاتی ہے اور فرہاد شہر کھود لاتا ہے۔ احمد جاوید کو سمجھنے کے لیے ان کے لکھے کو سطحی معنوں میں نہ لیں۔ ان کی اصل کو ان کے ناولوں میں کھویں۔ بہت سے لوگ اس سلسلے کو سمجھ کر ”دھوپ کے پھیلنے تک“ کو ایک ناول ہی سمجھیں گے لیکن میں انتظار کروں گا۔ اس ناول کا جو دھوپ کے پھیلنے تک نہیں لکھا جاسکتا۔ دھوپ کے پھیلنے تک احمد جاوید کی ”سزا“ جاری رہے گی۔ لیکن دھوپ کے پھیلنے کے بعد آپ کیا لکھیں گے؟ یہی سوچ مجھے مقام حیرت پر روکے ہوئے ہے۔ آخر ”کن“ کی تلاش میں لگا دیوانہ کیا کچھ لکھ سکتا ہے؟ میرے طرح آپ کو بھی انتظار کرنا ہوگا۔ صرف دھوپ کے پھیلنے تک۔۔۔۔۔!!!!

سید بدر سعید
نوائے وقت گروپ

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وقفے وقفے سے کڑکتی ہوئی بجلی دلوں کو دہلا رہی تھی۔ قسمت مگر کے ہاں جہاں اس بارش کو اپنی فصلوں کے لئے نعمت خیال کر رہے تھے وہاں ایسے غریب بھی تھے جنہیں اپنے گھروں کے بہہ جانے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ جب بھی اندھیری میں بجلی چمکتی، قسمت مگر ڈرا سی دیر کے لئے روشن ہو جاتا، پھر وہی تاریکی چھا جاتی، بالکل اسی طرح جیسے نسل در نسل چلتی ہوئی ان کے مقدّر کی تاریکی تیسری نسل کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔

چوہدری کبیر اس طوفانی رات میں اپنی فور ویکل جیب بھاگے چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں بہتا پانی بھی اس کی جیب کو نہیں روک پایا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی جیب سلاخے جٹ کے گھر کے باہر آن لڑی۔

سلاما جٹ اس وقت اپنی بیٹھک میں اپنے یار امین آرائیں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ امین آرائیں بارش رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ آج بارش کی وجہ سے وقت کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ بارش رُکے تو اپنے گھر جائے۔ تبھی اس کی بیٹھک کے سامنے چوہدریوں کی جیب آرکی۔ چند لمبے بعد اس میں سے چوہدری سکندر کا منہ چڑھا اور اگلوتا نو جوان بیٹا چوہدری کبیر اُترا۔ وہ دولت اور طاقت کے نشے میں بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی، اس نے برستی بارش کی پروا نہیں کی۔ چوہدری کبیر کے پیچھے اس کے ملازم تھے۔ چوہدری کبیر باہر کھڑا رہا اور اس کے ملازموں نے سلاخے کو پکڑا اور باہر نکال کر چوہدری کبیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس نے سلاخے جٹ کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر انتہائی غصے میں بولا

”اوئے تجھے کہا نہیں تھا کہ تو نے زمین صرف ہمیں بیچنی ہے، کسی دوسرے کو نہیں، پھر تو نے وہ بیچی، اور وہ بھی ہمارے دشمن کو..... کیوں؟“

”چوہدری صاحب وہ مجھے اچھے پیسے دے رہا تھا اور.....“ سلاخے نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر اُسے ٹوکتے ہوئے بولا

”اور ہم تجھے کم دے رہے تھے۔ تجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ ہم نے کیا کہا تھا۔ اب اس کی سزا تجھے ملے گی۔ ہمارے ہی علاقے میں کوئی ہمارے خلاف سراٹھائے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تیری اس حرکت سے کوئی دوسرا بھی سراٹھا سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بولٹ مارا تو امین آرائیں نے مت بھرے انداز میں کہا

”چوہدری جی! معاف کر دیں! اسے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ زمین یہ آپ.....“

”بکواس نہ کروئے، تو کون ہے میرے ساتھ بات کرنے کی ہمت کرنے والا..... چل بھاگ یہاں سے“ چوہدری کبیر نے انتہائی غصے میں کہا، پھر سامنے کھڑے سلاخے جٹ کے سینے میں کئی گولیاں اُتار دیں۔ فائرنگ کی آواز سے چند لمحوں کے لئے فضا تڑا اٹھی تھی۔ انہی چند لمحوں میں سلاما جٹ خون سے لت پت زمین پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی آخری سانسوں پر تھا، جب چوہدری کبیر اپنی فور ویکل منہنگی جیب میں بیٹھا اور یہ دیکھے بغیر کے سلاما کس قدر رُپ رہا ہے۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔ امین آرائیں جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے

سلائے کو سنبھالتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا۔ قازنگ کی آواز سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ لیکن کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سلا، جٹ اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔



قسمت نگر کا مقدر بھی کوئی نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ وہی جاگیردارانہ تسلط کے تحت مجبور، بے بس اور بے کس لوگ۔ جن کی زندگی خوف، ڈر اور غمکی میں بسر ہو رہی تھی۔ انسانی تذلیل کا وہی بے غیر تانہ نظام ان پر مسلط تھا۔ ایسے ماحول میں سلائے کا قتل بھی کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک طرف غریب کسانوں، مزدوروں اور مزدوروں کے کچے کچے گھروں پر مشتمل گاؤں قسمت نگر تھا۔ اس بستی سے ذرا ہٹ کر سفید رنگ کی پکی اور اونچی حویلی اپنے کینوں کی طرح پر غرور سر اٹھانے دکھائی دیتی تھی۔ اس حویلی کے یکیں ان قسمت نگر کے لوگوں کی قسمت بارے فیصلے کیا کرتے تھے۔ وہ حویلی چوہدری جلال سکندر کی پرکھوں کی حویلی تھی۔ یہ اس کے باپ نے بنائی تھی جو اب اس کے بیٹے کو منتقل ہونے والی تھی۔ پہلے اس کا باپ ان قسمت نگر کے کینوں کی قسمت بارے فیصلے دیتا تھا، اب وہ دے رہا تھا، کچھ عرصے بعد اس کا بیٹا چوہدری کبیر ان کے مقدر کا مالک بنے والا تھا۔ انسانی تذلیل کا یہ نظام اسی طرح چل رہا تھا کہ اس دن حویلی میں لچل بج گئی۔

شمار حویلی کے ڈرائنگ روم میں مٹی خوش دین بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ چوہدری جلال سکندر کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر بیٹائی تھی، جیسے کچھ نہ ہوا ہو گیا ہو۔ تبھی چوہدری جلال سکندر اندرونی کمرے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ لمبے قد کا اویز عمر، دیہاتی انداز کا روایتی سیاست دان تھا جو کم تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں، لیکن اپنے رعب و دبدبہ کے باعث اپنی بات منوانا جانتے ہیں۔ بھاری سفید مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، بڑے چہرے پر جلال، گورے لٹھے کے شلواری قیاس پر ویسٹ کوٹ پہنے، پاؤں میں تلے دار کھمبہ، وہ بڑے بارعب اور درمیانی چال سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے باہر کی طرف جاتے ہوئے ڈک کر ٹٹٹی کی طرف دیکھا، پھر بڑے کروفر کے ساتھ ڈک کر اس سے پوچھا

”ہاں مٹی، بول کیا بات ہے؟“

”وہ جی، قتل کیس کی تاریخ کل ہے۔ اور وہ گواہ امین آرائیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جھنجکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ تبھی چوہدری

جلال سکندر نے، ہاتھ پر تپوری لاتے ہوئے پوچھا

”کیا ہوا ہے اے؟“

”سارا مقدمہ اب اسی یعنی شہ پر ہے۔ اس نے اگر عدالت میں گواہی دے دی تو پھر گے چوہدری کے لیے بہت مشکل ہو

جائے گی۔“ مٹی نے تیزی سے بتایا تو چوہدری جلال سکندر نے حیرت سے پوچھا

”اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس کا بندوبست نہیں کیا؟“

”کیا قاضی میں اس کے پاس... مگر وہ مانسائی نہیں ہے، کہتا ہے گواہی ضرور دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ مٹی فضل دین

نے تشویش سے کہا تو چوہدری جلال چونک گیا۔ اسے یہ قطعاً امید نہیں تھی کہ کوئی اس کے معاملے میں چوں چوں بھی کر سکتا ہے۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، اُسے نہیں معلوم کہ وہ کس کے خلاف گواہی دے رہا ہے؟“

”خراب ہی لگتا ہے جی اس کا دماغ۔ آپ اس علاقے کے حکمران ہیں۔ سدا بہار ایم این اے ہیں۔۔۔ ہر حکومت میں آپ شامل ہوتے ہیں۔۔۔ آپ کے حکم کے بغیر یہاں پہنچ نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ کئے چوہدری کے خلاف گواہی دے گا۔ عقل خراب والی بات ہی ہے مافی اس کی۔“

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال سکندر نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا پھر تشویش زدہ لہجے میں بولا

”ہوں۔۔۔ بات یہ نہیں ہے مٹی کہ وہ کئے چوہدری کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔ بلکہ سمجھنے والا نکتہ یہ کہ اس کی جرات کیسے ہو گئی۔ ہمارے علاقے میں ہمارے ہی خلاف، کسی کو بھی پونے کی ہمت نہیں ہوئی۔۔۔ اور اگر کسی نے یہ ہمت کی بھی تھی، تب اس کی زبان ہی نہیں رہی۔ وہ کیسے؟“

”وہی تو میں سوچ رہا ہوں چوہدری صاحب۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چوکتے ہوئے کہا، ”نہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ کسی مخالف کی سازش ہو۔ الیکشن بھی تو سر پر آگئے ہیں نا چوہدری صاحب؟“

”الیکشن۔۔۔ اخیر کچھ بھی ہوشی، وہ زمین پر ریگٹنے والا کیڑا۔ ہمارے خلاف گواہی تو ایک طرف، اگر وہ ہمارے حق میں گواہی نہیں دیتا تو بھی وہ عدالت تک نہ پہنچ پائے۔ اسے یہ سمجھا دو۔ اگر وہ سمجھتا ہے تو۔۔۔“ چوہدری جلال سکندر نے غصے میں کہا تو ہنسی جا جی سے بولا

”میں نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے چوہدری صاحب۔۔۔ میں اسی لیے حاضر ہوا تھا کہ آج ہی کا دن ہے ہمارے پاس۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے لئے رکھا اور پھر بولا، ”ویسے اگر آپ حکم دیں تو کیا اسے کئے چوہدری کے حوالے نہ کر دوں؟ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کے اس طرح کہنے پر وہ اکتاتے ہوئے بولا

”اُوئے ہنسی۔۔۔ باتیں ہی مانتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی، اب یہ معاملہ ختم ہونا چاہیے۔ دو مہینے تو ہو گئے ہیں اس جی جی کو۔“

”اب آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ بس معاملہ ختم ہی سمجھیں چوہدری صاحب۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں اب۔۔۔“ ہنسی خوش ہوتے ہوئے بولا تو چوہدری جلال سکندر نے اسے ٹوکے ہوئے کہا

”مزید اگر کوئی بات ہوئی تو مجھے بتانا۔“ یہ کہہ کر چوہدری باہر کی جانب چل دیا۔ ہنسی اس کے پیچھے پلٹا ہوا بڑھ گیا۔ چوہدری جلال سکندر تو شہر جانے کے گاڑی میں بیٹھ گیا جبکہ رات سے ہنسی کے دماغ میں پکنے والی کئی باتیں لاوے کی طرح اُٹنے لگیں۔ وہ واپس ڈرائیونگ روم میں آ گیا۔ اب اسے چوہدری کبیر کا انتظار تھا تا کہ اسے نئی صورت حال کے بارے میں بتا کر کوئی پر مشورہ دے سکے۔

نجانے کتنے برس ہو گئے تھے۔ فشی ان چوہدریوں کا ملازم تھا اور اس ملازمت کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ذمے کوئی کام لگایا جائے اور وہ کام ہوا نہ ہو۔ پہلی بار اسے امین آرائیں کی طرف سے ناکامی ہوئی تھی۔ جس نے فشی کی بات ہی نہیں سنی تھی بلکہ اسے ذلیل کرے بھاگ دیا تھا۔ رات بھر وہ بھی سوچتا رہا تھا کہ امین آرائیں کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ چوہدری کبیرا بھی کچھ دیر میں بیدار ہو کر جاگنگ کرنے کے لئے ڈیرے پر جائے گا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے پانچو فٹلے امین آرائیں کو اٹھا کر ڈیرے پر پہنچا دیں گے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ خفاست سے مسکرا دیا۔

چوہدری کبیرا ڈیرے سے ڈر اور فصلوں کے درمیان میں بنے کچے راستے پر سے جاگنگ کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے جیب ملی آ رہی تھی، جس پر اس کے محافظ گنیں تانے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ جاگنگ کرتا ہوا بڑے اطمینان سے ڈیرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا محن کے درمیان میں امین آرائیں کو اس کے ملازموں نے پکڑا ہوا تھا۔ ابھی اس کا خاص ملازم، ماکھے نے تولیہ اور پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے امین آرائیں طرف دیکھتے ہوئے پانی کی بوتل پکڑی، چند گھونٹ لے کر پوچھا ”اوئے ماکھے، کیا کہتا ہے یہ۔ امین آرائیں؟“

”اپنی ہی بات پر ڈٹا ہوا ہے۔ کہتا ہے ہمارے خلاف کو ای دے گا۔“ ماکھے نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو چوہدری کبیرا خفاست سے مسکراتا ہوا اس کے پاس گیا۔ پانی پیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر ایک دم سے باقی پانی اس کے چہرے پر پھیلتے ہوئے بولا ”کل تیری عدالت میں پیشی ہے نا۔ لیکن تو نہیں جائے گا، جا ہی نہیں سکے گا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔“

”چوہدری۔ اتم لوگوں نے میرے یار کو قتل کیا ہے۔ میرا منہ بند کر لو گے تو خدا کو کیا جواب دو گے۔ میری آنکھوں کے سامنے تم نے قتل کیا ہے۔ میں گواہی۔“ امین آرائیں نے نفرت سے کہتا چاہا مگر لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ چوہدری کبیرا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا

”بکواس بند کر، ورنہ تجھے بھی تیرے یار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا پھر تیری گواہی کون دے گا؟“

”کوئی تو ہو گا جو تمہارے اور تیرے باپ کے ظلم رو کے گا۔“ اس نے زور سے کہا۔

”تو نے دیکھا تھا نا۔۔۔ کیسے، راتھا میں نے اسے۔۔۔ اس طرح تم بھی۔۔۔ ہاں تم بھی اوپر پہنچ جاؤ گے۔۔۔ تو نے بھی بڑی فشی کی تھیں کہ میں اس پر رحم کروں۔ اسے چھوڑ دوں۔۔۔ پر نہیں۔۔۔ اسے سزا ملنی تھی وہ میں نے دی۔ میں چاہوں تو ابھی تیری زبان بند کر دوں۔۔۔ لیکن تجھے مارنے کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا

”چوہدری آنے والے وقت سے ڈر۔“ امین آرائیں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو وہ انتہائی خفاست سے بولا

”اور تو ذرا اپنی زبان درازی سے۔۔۔ اس کی تو سزا تمہیں ملے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی ”اوئے ماکھے۔“

”جی لکے چوہدری صاحب۔ ا“ وہ جیزی سے اس کی جانب ہلکتے ہوئے بولا تو چوہدری کبیرا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”اسے ایک دو دن اپنے پاس رکھو۔ اسے ہی نہیں دوسروں کو بھی معلوم ہو کہ چوہدریوں کے خلاف سوچنا بھی کتنا بڑا جرم ہے۔ میں تو اپنے خلاف کسی کو سوچنے بھی نہیں دیتا۔“

”جی کئے چوہدری صاحب۔ ا“ مانکھے نے فرمانبرداری سے کہا تو چوہدری کبیر دہاں سے ہٹ کر اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا ہے۔ مانکھے نے امین کو بازو سے پکڑا اور دھکے دے کر اندر کی طرف لے جانے لگا۔ امین ارائیس کا جرم بھی تھا کہ وہ جی گواہی دینا چاہتا تھا، لیکن طاقت نے اسے ہاندہ کر اندھے کمرے میں پھینک دیا تھا۔ ماحول میں قانون شکنی کی سزا عذرا بھیل چکی تھی۔



وہ قسمت مگر گاؤں میں متوسط سا گھر تھا۔ بھلے وقتوں میں یہ گھر بنا تھا، ورنہ اس کی حالت دیکھ کر بھی لگتا تھا کہ برسوں سے اس کی دیکھ بھال ہی نہیں ہو سکی۔ ایک طرف چار کمروں کی قطار تھی، دوسری طرف کچن اور سنور تھا۔ تیسری طرف کبھی ڈھور ڈگر بندھے ہوتے تھے لیکن اب وہ برآمدہ خالی تھا۔ سامنے کی طرف لوہے کا بڑا سا پھٹکا تھا جو اب رنگ آلود ہو چکا تھا۔ کمروں کے آگے دالان میں چار پائی پر ماسٹر دین محمد لینا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ سر کے نیچے بیماری لگی تھی اور پیروں کی طرف کھس ڈالا ہوا تھا۔ ریٹائرڈ زندگی گزارنے والا بوڑھا ماسٹر دین محمد، اپنی وضع قطع اور رویے ہی سے استاد دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ سکول میں پڑھاتا تھا، تب وہ بہت آسودہ تھا مگر اب وہ گاؤں میں احتیاجی کمپری میں وقت گزار رہا تھا۔ وہ چوہدری کے عتاب کا شکار تھا۔ اسے ریٹائر ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی پنشن کیس کا فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ بہت صابر اور شاکر قسم کا بندہ تھا۔ کبھی خود دوسروں کی مدد کیا کرتا تھا، اب جبکہ زندگی کے دن اس پر بہت تنگ ہو چکے تھے، اس نے پھر بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ اس وقت وہ کتاب پڑھنے میں محو تھا کہ سائیکل کی جیر گھنٹی نے اسے چوکا دیا۔ وہ اس مخصوص گھنٹی کو پہچانتا تھا۔ اس نے پچانک کی طرف منہ کر کے کہا

”اوئے رحمت کا کا، آ جا اندر ہی آ جا“

آواز کی بازگشت کے ساتھ ہی ایک نوجوان مگر مرل سا ڈاکیا اپنی سائیکل گھسیٹا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اپنا تھیلا سنبھالا اور سیدھے ماسٹر دین محمد کو سلام کر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکے نے اپنا بیک کھولتے ہوئے پوچھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

اس پر ماسٹر دین محمد نے اٹھ کر خوش کن انداز میں کہا

”اوپار۔! بس ٹھیک ہی ہے۔ یہ بڑھاپا بھی تو ایک بیماری ہی ہوتی ہے۔ تو سنا تیرے دل بچے ٹھیک ہیں ناں۔“

”جی استاد جی۔۔۔۔۔ آپ کی دعا کیں ہیں۔“ اس نے ممنونیت سے کہا پھر مٹی آرڈر اس کی جانب بڑھا کر بولا۔ ”یہ لیں یہ آپ کا

مٹی آرڈر۔۔۔۔۔ دیکھ کر دیں۔“

ماسٹر دین محمد نے وہ کاغذ پکڑا اور دیکھ کر کے دہانہ کر دیا۔ اس دوران ڈاکیا رقم گن چکا تھا۔ اس نے وہ رقم ماسٹر کو دیتے ہوئے کہا

”یہ لیں استاد جی۔ گن لیں۔“

”اوئے ٹھیک ہی ہوں گے۔“

”نہیں استاد جی آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں اور میں بھی کہتا ہوں رقم کا معاملہ ہے۔ گن پینے چائیں“ ڈاکے رحمت نے کہا
تو ماسٹر دین محمد نے رقم لی اور اسے گنے بغیر اس میں سے ایک نوٹ نکال کر ڈاکے کو دیتے ہوئے کہا

”جب میرا رب مجھے میرے عمل و یکے بنا، گنے بغیر دے رہا ہے تو ان چند نوٹوں کو کیوں گنوں، لے پر رکھ۔“ ڈاکے رحمت نے وہ
نوٹ پکڑا اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا

”وہی استاد جی، یہ جو بندہ بھی آپ کو مٹی آرڈر بھیجتا ہے، بڑا پکا بندہ ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخوں میں بھیجتا ہے۔ ویسے یہ
کوئی آپ کا رشتے دار ہے کیا؟“

”کوئی ہر مہینے یہ سوال کرتا ہے اور میرا یہی جواب ہوتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم، یہ کون ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ ہوگا، جسے میرا احساس
ہے۔ میں نہیں جانتا۔“

”اللہ رازق ہے نا استاد جی۔۔۔ اس نے کوئی نہ کوئی وسیلہ تو بنادیا ہے نا۔“ رحمت ڈاکے نے جذب سے کہا تو ماسٹر دین محمد نے کہا
”بے شک رازق تو اللہ ہی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے رحمت پتر اسی مٹی آرڈر سے گھر چلتا ہے۔ جس دن یہ بند ہو گیا

گزارہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے یہ بند نہیں ہوگا اور پھر ایک در بند ہوتا ہے نا تو سوور کھلتے ہیں۔ بخشن کیس کا فیصلہ تو
ایک دن میں ہو جائے۔ بس یہ چودھری جمال ہی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے اگر سکول بند کر دیا ہے تو کیا وہ کسی کی روزی بند کر سکتا ہے؟“

ماسٹر دین محمد کے اس طرح کہنے پر ڈاکے یوں سہم گیا جیسے ڈر گیا ہو۔ اس نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر اپنے قبیلے میں
سے ایک خط نکالتے ہوئے بولا

”اچھا استاد جی، یہ ایک چٹھی بھی سلمی بی بی کے نام کی ہے، یہ لے لیں۔ اب میں چلتا ہوں۔“
ماسٹر دین محمد نے خط پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس دوران ڈاکے اپنا قبیلہ سنبھال کر اٹھ گیا۔ جس وقت وہ ۶ ہر والا گیت چار

کر گیا، تب ماسٹر دین محمد نے وہ رقم اور خط ہاتھ میں لیے آواز دی۔
”سلمیٰ..... اُدھر سلمیٰ۔“

اندھری کسی کمرے سے جواب آیا۔
”جی آئی... بابائی۔“

آواز کی بازگشت میں سلمیٰ والان میں آگئی۔ وہ سادہ سی، پرکشش، انتہائی نازک اور حسین لڑکی تھی۔ چڑا ماتھا، شرکیں، بھورا
آنکھوں پر چٹکیں چتون سے پہلی نگاہ ہی ان لوٹ لینے والے نیوں پر پڑتی تھی۔ ستواں ناک، پتلے پتلے لب کے اوپری دائیں کونے پر ذرا

سیاہ ل۔ گول چہرہ، کانوں میں بندے لانی گردن، جسے اس نے بڑے سارے آنچل میں پھپھایا ہوا تھا۔ سرودھ اور متناسب جسم کو دیکھ کر پہلا بھی خیاں آتا تھا کہ گدڑی میں پڑا ہوا لعل ایب ہوتا ہے۔

”جی اہاجی...“ دالان میں آکر لاشعوری طور پر وہ اپنے درست آنچل کو مزید ٹھیک کرتے بولی۔ ماسٹر دین محمد نے اسے رقم اور خط دیتے ہوئے کہا

”یہ لے پتر... مٹی آرڈر کی رقم سنبھال لے۔ اور یہ لو تمہارا خط ہے، کوئی سرکاری چھٹی لگتی ہے۔“

اس پر سلسی نے تجسس اور تذبذب میں خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا، اور اچھے ہوئے لہجے میں چیز سے خط کھولتے ہوئے کہا ”اُدو۔! مجھے اس چھٹی کا انتظار تھا۔“ پھر ایک دم سے حیرت اور خوشی سے بھر پور لہجے میں بولی، ”اہاجی یہ دیکھیں... مجھے نوکری مل گئی۔ آپ کی طرح میں بھی ٹیچر بن گئی ہوں۔“

ماسٹر دین محمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر حیرت، خوف اور بدحواسی کے لے جلتے تاثرات سے لبریز لہجے میں پوچھا ”تم ٹیچر بن گئی ہو؟ کیا مطلب؟“

سسی بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ستارے رقصاں تھے۔ اس نے باپ کے لہجے کو محسوس نہ کرتے ہوئے پر جوش انداز میں کہا

”یہ دیکھیں... آپ کو یاد ہوگا۔ دو ماہ پہلے میں انٹرویو دے کر آئی تھی۔ یہ ای کالیٹر ہے۔ اب صرف جانا ہے اور جو انین کرتا ہے۔“

”کہاں جو انین کرتا ہے یہ دیکھا ہے تم نے؟ ماسٹر دین محمد نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا تو بولی ”یہ ساتھ فور پور میں۔ اتنا دور نہیں ہے آدمے گھنٹے کا تو سفر ہے۔ بس یاونگین پر آرام سے چلی جایا کروں گی۔“

”بہت دور ہے پتر... خیر تم فی الحال اسے رکھو۔ مجھے کہیں کام جانا ہے۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ ماسٹر دین محمد کے امداد اور لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں پوچھا

”کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی اہاجی؟“

”کہنا... پھر بات کرتے ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے سلسی سے آنکھیں چرا تے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ سلسی حیران سی اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں گہری بے بسی تھی۔

”نہیں اہاجی۔! ہمیں اس پر ابھی بات کرنا ہوگی۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں، کیا آپ کو میرا نوکری کرنا اچھا نہیں لگے گا؟“

”بات اچھا لگنے یا نہ لگنے کی نہیں ہے بیٹی۔ جب تم گھر سے نکلتی ہے تو تیرے باپ کا دل دھل جاتا ہے۔ اور تم نوکری کرنے کی بات کر رہی ہو۔“

”اباجی۔! میں سارے حالات جانتی ہوں۔ لیکن مجھے بتائیں میں گھر میں پڑی کیا کرتی ہوں۔ کیا فائدہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کا۔ اگر یہ تعلیم ہی میرے کام نہ آئی تو۔“ اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا تو ماسٹر دین محمد لرزتے ہوئے بولا

”تعلیم تو ہر بیٹی کا حق ہے پتر۔ اور میں عورت کے کام کرنے کا مخالف بھی نہیں ہوں۔ بس پتر۔! زمانے سے ڈر لگتا ہے میں بوڑھا کیا کر پاؤں گا۔“

”میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں اباجی۔ مگر کب تک؟ کیا ساری زندگی یونہی گزر جائے گی۔ کبھی تو باہر نکلتا ہوگا۔ ڈر کر، زندگی گزارنے سے بہتر ہے، مرنے میں۔“ اس کے لہجے میں آگ تھی۔

”اللہ نہ کرے میری بیٹی۔ ایسا مت کہو۔ بس یہ میری بیٹھن والا معاملہ حل ہو جائے تا تو میں تیرا فرض بھی ادا کروں اور۔۔۔“

ماسٹر دین محمد نے کہنا چاہا مگر سلسلی بات کا نٹے ہوئے بولی

”اور آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ دوں۔ ایسا نہیں ہوگا اباجی۔“

”بیٹیاں اپنے ہی گھر میں اچھی لگتی ہیں۔ باپ کے گھر میں تو مہمان ہوتی ہیں۔ اللہ کرے تیرا اچھا سا گھر بن جائے تو پھر میں بھی سکون سے اللہ کے پاس چلا جاؤں۔“ وہ طر حال سا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

”دیکھا! پھر مایوسی کی باتیں شروع کر دی ہیں نا آپ نے۔ ہم جانتے ہیں اباجی، بیٹھن کیس کا فیصلہ کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ اور وہ مٹی آرڈر جس کے بارے میں پتہ نہیں کون بھیجتا ہے۔ کسی دن بھی بند ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں گھر کیسے چلے گا۔“ اس نے حقیقت کہی

”لیکن بیٹی۔! ابھی تو گھر چل رہا ہے نا۔ بیٹھن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“ وہ کمزور سے لہجے میں بولا

”آپ کی یہ دلیلیں بہت کمزور ہیں اباجی۔ میں نوکری کروں گی اور بیٹا بن کر آپ کی خدمت کروں گی۔۔۔ میں۔۔۔ میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔“ اس نے، ان اور لگا کیساتھ کہا تو تڑپ کر بولا

”نہ میری بیٹی نہ۔! نوکری بے شک کر۔۔۔ مگر تجھے اپنے گھر تو جانا ہے۔ آج میری آنکھیں بند ہو جائیں تو پھر تیرا کون ہے؟“

”میری قسمت میں جو ہوگا نا اباجی، وہ ہو کر رہے گا۔۔۔ لیکن میں اب بے بسی کی دعا کی نہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنا گھر خود چلانا چاہتی ہوں۔ آپ نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا درس نہیں دیا، اور اس غربت میں بھی کسی سے کچھ نہیں، لگا۔ تو کیا میں خود کا نہیں سکتی؟ میں اپنے پیروں پر خود نہیں کھڑا ہو سکتی؟“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے اپنے باپ کو دیکھتی رہی پھر اگلے قدموں واپس اندر چلی گئی۔

ماسٹر دین محمد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر لمبی سانس لے کر خود کھامی کے انداز میں بوڑھا

”اللہ تیری قسمت بہت اچھی کرے میری بیٹی۔“

یہ کہہ کر وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔ وقت اور حالات نے اسے بوڑھا ہی نہیں، لاپرواہ بھی کر دیا تھا۔



رات کا گہرا سناٹا اس بچکے کے آنکھن میں بول رہا تھا۔ جبکہ رات ابھی کچھ دیر پہلے ہی شہر پر اتری تھی۔ پوش علاقے میں وہ سفید بجلی سنہری روشنی میں جھلکا رہا تھا۔ پورچ میں قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر مستعد چوکیدار تھے۔ ان کے علاوہ کئی سارے لوگ تھے جو اپنے اپنے رہائشی کو انٹرنز میں چائے تھے۔ اس شاندار اور قیمتی بچکے کے کہیں صرف دو لوگ تھے۔ محمود سلیم، جو ریٹائرڈ بیوروکر سیٹ تھا۔ ان کی ساری زندگی مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سروں کرتے گزری تھی۔ زندگی نے اگرچہ اسے بہت کچھ دیا تھا لیکن اولاد جیسی نعمت سے نہیں نوازا تھا۔ وہ سمجھ دار تھا۔ ساری زندگی رب تعالیٰ پر بھروسہ کئے رہا۔ اگر اس کا رب چاہتا تو اس کی جھولی بھر دیتا، اس نے کبھی بھول کر بھی اپنی بیوی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اسے اولاد نہیں دے پائی ہے۔ جبکہ اس کی بیوی پوری زندگی اسی ڈکھ میں گھلتے ہوئے، اس جہان کو چھوڑ چکی تھی۔ بہت پہلے جب وہ فہد حسین جیسے لاوارث بچے کو لے پا لگ بنا کر اپنے گھر لایا تو شوہر کی خوشی میں وہ بھی خوش ہو گئی تھی۔ فہد کو اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا، جس کا وہ صرف خواب ہی دیکھتی تھی۔

فہد جوان ہو گیا مگر وہ اس کی کوئی خوش دیکھے بنا اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ فہد حسین نے پولیس آفیسر کی ٹریک کی تھی، مگر جیسے ہی محمود سلیم نے ریٹائرڈ ہو کر اپنا بزنس کرنے کا اعلان کیا تو اس نے پولیس کی سروس جو انہیں نہیں کی بلکہ اپنے باپ کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے ابھی باقاعدہ بزنس نہیں سنبھالا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ فہد ان دنوں بہت ڈسٹرب تھا۔ محمود سلیم اپنے پارٹنرز کے ساتھ اپنا بزنس سیٹ کر رہے تھے اور وہ اپنے ہی اندر کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

اس وقت بھی فہد اپنے شاندار اور قیمتی ترین اشیاء سے آراستہ بیڈروم میں سویا ہوا تھا۔ ساری دنیا جاگ رہی تھی اور وہ دنیا سے اس کی دلچسپیوں سے اور اس کی کشش سے آزاد، اندھیرے اجالے کی سی کیفیت میں اپنے بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت بھی خواب کی ہی کیفیت میں دھندلے دھندلے اور الجھے ہوئے خاکے چلتے ہوئے ایک دوسرے میں گنڈھ ہو رہے تھے۔ اسے ایسی بھیاں آوازیں آرہی تھیں جن میں سے صرف خوف ہی فک رہا تھا۔ وہ مضطرب ہوتے ہوئے کسمسا رہا تھا۔ پھر ایک دم اس کی آنکھیں کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اپنے آپ کو بیڈ پر پا کر اپنے حواسوں میں آنے لگا۔ اس نے ٹیبل لیپ آن کیا، اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ اپنے آپ میں آتا چلا گیا۔ اس نے قریب پڑے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خود پر قابو پاتا رہا اور کھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آج پھر کیوں اس کے اندر کا وحشی جاگنے لگا ہے۔ اسے اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی۔ آج اس سے ماثرہ ملی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی اس سے ملاقات کی ساری جزئیات اس کے دماغ میں جاگ گئیں۔ اس ملاقات میں باتیں ہی ایسی ہوئیں، جس نے اسے سوچوں کے حصار میں لاپھونکا تھا۔

شام کے بعد سے انہی سوچوں نے دشت میں اٹھنے والے بگولوں کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ جس نے اس کی پوری ذات کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ، نہ کوئی منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی۔ اور دوست بھی ایسی جہاں خلوص، اپنائیت اور محبت کے سوا کچھ دوسرا نہیں تھا۔

ماثرہ الزماؤرن صحافی تھی، قدرے فربہ مائل، اگرچہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن گفتگو اور انداز میں ایسی کشش رکھتی تھی کہ دوسرے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر وہ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بہت باصلاحیت تھی، اس لئے قدرے مغرور بھی تھی۔ فہد کے معاملے میں وہ بہت نرم تھی۔ فہد کو یہ اندازہ تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔ اس کے باپ کا شمار شہر کے بڑے بزنس مین ہوتا تھا، جواب سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ بزنس نہیں کیا، بلکہ محض اپنے شوق کی خاطر میڈیا کے لئے کام کر رہی تھی۔ پرکشش، ذہین اور ماؤرن ماثرہ، کبھی فہد کی کلاس فیلو تھی اور تب سے اس پر مرثی تھی۔ وہ تو اپنی محبت کا اظہار کی بار کر چکی تھی، لیکن فہد ابھی تک گونگو کی کیفیت میں تھا۔ اب تک اسے کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، یہ ماثرہ کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

اس شام وہ دونوں پارک میں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے خاموشی بھی اک زبان ہو۔ وہ چلتے ہوئے آکر ایک ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سکونا سے بیٹھنے کے بعد، ماثرہ نے فہد کے چہرے پر دیکھا اور اچھے ہوئے لہجے میں بولی "یہ آج کل تم کہاں غائب رہتے ہو فہد۔ تمہارا فون کبھی بڑی ملتا ہے تو کبھی بند۔ مگر بھی نہیں ملتا ہوا اور تمہیں یاد ہے، ہم پچھلے ایک ہفتے سے نہیں ملے۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔"

ماثرہ کے اس طرح شکوہ بھرے انداز پر وہ چونک گیا، پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا "میں! میں غائب رہتا ہوں، اور یہ بات تم جیسی معروف اور معروف جرنلسٹ کہہ رہی ہے۔ جس سے ملنے کے لئے خود وقت لینا پڑتا ہے۔"

"دیکھو! مجھے بتاؤ مت۔ صاف اور سچی بات بتاؤ۔ کہاں بڑی ہو؟" ماثرہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ تب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا "کہیں بھی غائب نہیں ہوں اور نہ ہی بڑی ہوں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ اتنے دن ہو گئے۔ نہ ملے، نہ بات کی۔ اور جب سے تم یہاں آئے ہو، گم سم ہو۔ پہلے والے فہد دکھائی ہی نہیں دے رہے ہو۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں ڈیپریس ہو آج کل؟ مسئلہ کیا ہے تمہارا؟" اس کا لہجہ ہنوز اکتایا ہوا تھا "دیکھو ماثرہ۔! تمہیں معلوم ہے کہ پایا جاتا ہے کہ کوئی اچھا سا بزنس شروع کروں، مگر اپنی طبیعت ہی ابھی... اس نے کہا نا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولی

"یہ اوٹ پٹانگ باتیں کر کے تم مجھے نہیں بہلا سکتے۔ کم از کم مجھے نہیں، جو تمہیں... تم سے زیادہ جانتی ہے۔ میں جو تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم ڈیپریس کیوں ہو اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی وجہ ہے جو تم اس طرح کا بنی ہو کر رہے ہو۔"

"ماثرہ! ٹھیک ہے تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اپنی خود ساختہ سوچ مجھ پر مسلط کر دو۔" کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خود سے بھی چھپتی جاتی ہیں۔ اب میں کیا بتاؤں تمہیں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو ماثرہ نے اسے چونک کر دیکھا، پھر کافی حد تک دھیمے اور پرسکون لہجے میں بولی

”کیا تم ابھی تک مجھے اپنا دوست ہی سمجھتے ہو... میں تم سے محبت کرتی ہوں فہد۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اور پھر...“ اس سے آگے اس سے کہا ہی نہیں گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ روہانا ہو گئی تو فہد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر چستہ پاتے ہوئے کہا

”سوری۔! یہ جو محبت ہوتی ہے، ناز، کبھی کبھی بڑے دکھ دے جاتی ہے۔ بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔ زندگی کی راہ پر چلتے چلتے اچانک کوئی نہ کوئی ایسا دورا ہوا آ جاتا ہے۔ ایسے ہی کسی وقت کے لئے بندہ تیار رہے تو پھر وہ ٹوٹا نہیں۔“ فہد کے لہجے میں عجیب یاسیت تھی جس پر وہ چمکتے ہوئے بولی

”یہ تم کیسی فضول باتیں کرنے لگے ہو... مارواہ اتنی کمزور نہیں ہے کہ ٹوٹ کر ٹکڑا جائے۔ تمہاری محبت نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا اور سخت لہجے میں بولی، ”بتاؤ، کیوں ڈیڑھس ہو تم؟“ اس پر فہد نے اسے سچ پانگا ہوں سے دیکھا، وہ بھی سخت چہرے کے ساتھ اسے گھورتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو ڈرا دیر تک گھورتے رہے پھر دونوں ہی ایک دم ہنس دیجے، ”اچھا چلو نہ بتاؤ۔ لیکن جب تک تم یہاں میرے ساتھ ہو اپنا سوڈا درست رکھو۔ میں وارننگ دے رہی ہوں تمہیں۔“

”شکر ہے، تمہاری یہ گفتیش ختم ہوئی۔ اگر تم مزید سوال نہ کرنے کا وعدہ کرو تو ایک بات بتاتا ہوں۔“ اس نے پرسکون انداز میں کہا اور کرسی سے ٹپک لگاں

”بولو نہیں کروں گی سوال۔ وعدہ۔“ وہ صدق دل سے بولی تو اس نے نیلے آسمان پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولا

”مارواہ۔! میری زندگی میں ایک دورا ہوا آ گیا ہے۔ یہ اچانک نہیں آیا۔ بلکہ میں خود اس کا منتظر تھا۔ مجھے کون سے راتے پر جانا ہے اور کس رستے کو میں نے چھوڑ دینا ہے۔ اس کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اب تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا کراتے میں دیگران کے قریب آ گیا۔ مارواہ نے جلدی سے سوٹ ڈرنک کا آرڈر دیا اور فہد سے پوچھا

”کیسا فیصلہ۔ کیسا دورا ہوا۔ میں کچھ بھی نہیں؟“

”تم نے ابھی وعدہ کیا تھا۔“ فہد نے تیزی سے کہا تو مارواہ کو یاد آ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر سمجھنے والے انداز میں بولی

”اوکے، میں تمہارے کسی فیصلے یا دورا ہے کے بارے میں نہیں پوچھتی۔ لیکن ایک سوال ضرور کروں گی۔“

”بولو“ اس نے بے بسی والے انداز میں کہا

”تم نے پولیس سروس جوائن کی۔ ٹریک بھی لے لی، آفیسر بنے اور پھر چند مہینے بعد جاب چھوڑ دی۔ کیا یہ تمہارے اسی فیصلے یا دورا ہے کی وجہ سے... تو آریس۔“ اس نے تیزی سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا تو فہد چند لمحے سوچ کر بولا

”ہاں۔! میں نے اسی لیے پولیس سروس چھوڑی ہے۔۔۔ بلکہ میں نے پولیس ٹریننگ بھی اسی مقصد کے لئے لی ہے۔ اب کوئی سوال نہیں کرنا، ابھی یہاں سے کوئی ڈرنک لو۔۔۔ پھر میں تمہیں تمہارے فورٹ ڈیسٹورن سے کھانا کھلاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔

اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر مائرہ نے زیادہ تجسس کیا تو ممکن ہے وہ کچھ کہے بنا یہاں سے اٹھ کر چل جائے۔ کیوں کہ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ ان لمحوں کو غنیمت سمجھ رہا تھا جو وہ اپنی دوست کے ساتھ گزار رہا تھا۔ جھوٹ بولنے کا ڈیڑھ ٹھنڈا اور سچ نہ بول پانے کی بے بسی اسے اندر سے جکڑے ہوئے تھی۔

اس شام جب وہ واپس گھر آیا تو اس کا جی بہت بوجھل تھا۔ شاید یہی دباؤ تھا جس نے اوٹ پٹا نگ خواب کی صورت میں اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اب تک اپنے حواسوں میں آگیا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے پیڑروم سے باہر چلا گیا۔

وہ باہر مان میں ٹہلنے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مائرہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا جیکہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کے ساتھ پورے دل سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس کی محبت کا بھرپور جواب دیتا اگر وہ ایسے حالات میں سے نہ گذر رہا ہوتا۔ وہ مائرہ کے ساتھ محبت کی حسین شاہراہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ یہ انہی حالات کی مجبوری اور بے بسی تھی۔ اسی لئے اس نے کبھی بھی مائرہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اسے کوئی ذکر نہیں تھا۔ جو آگ اس کے من میں بھین سے لگی ہوئی تھی، اس کے سامنے مائرہ کی محبت برستی ہوئی بارش کی مانند نہیں تھی۔ جو انتقام کی اس جلتی آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ اس نے مائرہ کو کبھی بھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی اسے دھوکا دینا چاہتا تھا۔ وہ ان خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس نے اپنے کانٹے پر نرم ہاتھ کالس محسوس کیا۔ اس نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا، اس کے سامنے محمود سلیم کھڑا تھا۔ جب اس نے حیرت سے پوچھا

”پاپا آپ سوئے نہیں ابھی تک؟“

”بیٹا، بکلی سواں اگر میں تم سے کروں تو؟“ یہ کہتے انہوں نے شفقت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولے ”اور ویسے بھی میں بوڑھا آدمی ہوں مجھے اتنی جلدی نیند نہیں آتی، اور پھر ابھی کتنا وقت ہوا ہے، صرف بارہ بجے ہیں“ یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ”خیر میں کئی دنوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں تم ڈسٹرب ہو، بولو بیٹا، کیا بات ہے؟“ پاپا نے کچھ اس طرح پوچھا کہ وہ پورے اعتماد سے بولا

”پاپا۔ امیں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میں واقعی ڈسٹرب ہوں۔“

”کیوں بیٹا، ایسا کیا ہو گیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ ہے؟“ محمود سلیم نے گہری تشویش سے پوچھا تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

”پاپا، میرے اندر قسمت نگر کا وہ بچہ اب بھی دھانڑیں مار کر رو رہا ہے، جسے اس کے والدین سمیت وہاں سے ذلیل کر کے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک قرض ہے مجھ پر، جواب اتنا بڑھ گیا کہ برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔“

”کیا میری پرورش میں کوئی کمی رہ گئی ہے کہ وہ بچہ اب تک؟“ محمود سلیم نے دلگیر لہجے میں کہا تو شدت سے بولا

”نہ... نہ... نہیں پاپا، اگر آپ مجھے گو نہ لیتے میرے والدین کے فوت ہو جانے کے بعد آپ مجھے سہارا نہ دیتے تو میں بھی

اب تک بے کس اور مجبور لوگوں کی طرح مرکب گیا ہوتا۔ اس بے رحم معاشرے کے چنگل میں پھنس کر رحم مانگنا بھی بھول گیا ہوتا۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ جہاں آپ نے میری پرورش کی وہاں مجھے اپنی شعور بھی دیا ہے۔ یہی شعور... میری ذات پر قرض کا بوجھ بڑھا رہا ہے۔ میں اپنے ضمیر کا سامنا نہیں کر پا رہا ہوں... پاپا... نہیں کر پا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

”ریلیکس بیٹا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر خاموش رہا پھر بولا ”سنو! میں ایک ریٹائرمنٹ بورڈ کرٹ ہوں۔ تم جانتے ہو۔۔۔ جتنی قوت اور طاقت ریٹائرمنٹ سے پہلے تھی، اب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پہلے ملازمت کی کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب تو وہ بھی نہیں رہیں۔ میرے ایک اثر سے پر... وہ کیا... وہاں کا چوہدری جلال سکندر... اسے... اس نے دانت پیستے ہوئے کہا چاہا تو فہد نے ٹوکتے ہوئے کہا ”نہیں، یہ آپ ہی نے مجھے سکھایا ہے کہ اپنے حق کے لیے خود لڑنا چاہئے، چاہے اس میں جیسے بھی حالات ہوں۔ میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا، میں وہ لے کر ہی رہوں گا۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہاں تمہاری تھوڑی سی زمین اور ایک گھر ہے، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر وہ زمین اور گھر... محمود سلیم نے اس کی طرف دیکھا اور کہتے کہتے رک اس کی جانب دیکھنے لگا تو فہد نے مسکراتے ہوئے کہا ”نہیں پاپا، آپ نے جتنا مجھے دے دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ زمین اور گھر تو ذرا سی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں اپنا وہ حق نہیں کہہ رہا، بلکہ میں اس وجہ کو تسلیم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے باعث نہ جانے کتنے لوگ ظلم کی جگہ میں بس رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، آج کے اس جدید دور میں بھی غلامی ختم ہو گئی ہے، نہیں پاپا، آج بھی خوف کی ان دیکھی زنجیروں میں بندھے غلام موجود ہیں جو طاقت اور وسائل پر کا بعض لوگوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے۔ ان کا مجھ پر حق ہے۔ یہ میرا قرض ہے، جسے میں خود ہی چکانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہوئی بیٹا کہ تم مردہ ضمیر لوگوں میں سے نہیں ہو۔ تم جو چاہتے ہو، ویسا کرو، میں اُسے مجبور کروں گا کہ وہ یہاں تمہارے پاس آ کر تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگے۔“ پاپا نے دسبے دسبے غصے میں کہا

”سوری پاپا۔ میں خود وہاں جا کر یہ قرض چکانا چاہتا ہوں۔ اس چوہدری کے لئے تو چند روپوں کی ایک چھوٹی سے بلٹ کافی ہے... مگر...“ یہ کہتے وہ دانت چس کر رہ گیا۔ وہ شدت جذبات میں کچھ کہ نہیں پاتا تھا۔ تب پاپا نے اس کے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ”اگرچہ مجھے، تمہیں یوں اجازت دینے میں ڈکھ ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک تم وہ نہیں کر پائے جو تم چاہتے ہو اس وقت تک سکون نہیں پاسکو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں اجازت دیتا ہوں، تم یہ قرض چکاؤ۔ جو چاہتے ہو وہ کرو۔“

فہد نے چونک کر اپنے پاپا کی طرف دیکھ بھرا انتہائی خوشی میں اپنے پاپا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر بولا

”میں اسی الجھن میں تھا پاپا، میں آپ کی اگلی آمد ہوں... آپ کی محبت نے مجھے روکا ہوا تھا... اب میں... میں...“

مزید اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا وہ یہ کہتے ہوئے وہ پاپا کے گلے لگ گیا۔ محمود سلیم اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

”میں اب سمجھا ہوں بیٹا کہ تم نے پولیس ٹریننگ کے بعد تو کڑی کیوں نہیں کی اور نہ ہی اب بڑھ کر رہے ہو۔۔۔ کوئی بات

نہیں۔ جیسا تم چاہو۔۔۔ آؤ اب سکون سے سو جاؤ، کل ہم دونوں اس پر مزید ڈکس کر لیں گے۔ رات بہت گہری ہو گئی ہے۔“ پایا نے کہا اور اسے ساتھ لگا کر اندر کی طرف مڑا۔ فہد اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔



وہ حالیہ برسوں میں بننے والا شہر کا نیا پوش علاقہ تھا۔ یہاں زیادہ تر کاروباری طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے ایک سے بڑھ کر ایک جدید طرز کے ہنگے بنوائے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک ہنگے کے ڈائینگ ہاں میں ٹیبل پر اچھی صحت اور بہترین شخصیت والا حبیب الرحمن بیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس اس کی بیوی ہانو بیگم موجود تھی۔ اس نے ان اکلوتی بیٹی مائرہ تیار ہو کر آگئی اور آتے ہی بولی ”گڈ مارنگ، ماما۔۔۔ گڈ مارنگ پایا“

”گڈ مارنگ۔۔۔ کیسی چل رہی ہے تمہاری صحافت۔۔۔“ حبیب الرحمن نے اخبار چہرہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا تو چپکے والے انداز میں بولی ”ٹھکانا سبک پایا۔۔۔“

”گڈ۔۔۔ ایسے میں بھی دیکھ رہا ہوں تمہاری نیوز سٹور پر۔۔۔ اچھا کام ہے۔“ اس نے تعریف کرتے ہوئے ٹوسٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس کی بیوی بنا کر پلیٹ میں رکھ چکی تھی۔ وہ بھی اپنے کپ میں جس انڈلیتے ہوئے بولی ”پاپا۔۔۔ ایک بات بتائیں۔“

”پوچھو۔“ یہ کہتے ہوئے حبیب الرحمن نے اس کی طرف دیکھا ”آپ تو سیدھے سادھے بزنس مین ہیں۔ یہ اچانک آپ سیاست میں کیوں دلچسپی لینے لگ گئے ہیں؟ اور جس پارٹی میں آپ ہیں اس میں بہت اچھا عہدہ بھی آپ کو مل گیا، یہ کیسے؟ لیکن جواب دیتے ہوئے یہ ذہن میں رہے پایا کہ آج کل میں سیاست دانوں کے نیچے ادھیڑ رہی ہوں۔“

اس پر پہلے تو حبیب الرحمن ہنس دیا، پھر سوچتے ہوئے سنجیدگی سے بولا ”ہوں۔! یہ سچ ہے کہ میں سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں اور مجھے پارٹی میں بہت ذمے داری والا عہدہ بھی مل گیا ہے۔ لیکن مجھے کوئی ایم پی اے، ایم این اے وغیرہ بننے کا شوق بھی نہیں اور نہ ہی میں بننا چاہتا ہوں۔۔۔ بس اتنا سمجھ لو کہ مجھے بھی تمہیں دیکھ کر سیاست میں آنے کا خیال آ گیا ہے۔“

”مجھ دیکھ کر پاپا۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں؟“ وہ برا سامنا کر بولی تو حبیب الرحمن نے اسی سنجیدگی سے کہا ”میں مذاق نہیں کر رہا میری بیٹی، بلکہ میں پوری سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھتی ہو کہ اس وقت اپنے ملک کو روایتی سیاست چھوڑنا ہوگی۔۔۔ سیاست میں پڑھ لکھے اور ہاشور لوگوں کو آنا چاہئے۔ ان پڑھ اور جاہل سیاست دانوں نے اپنے ملک کی

عوام کو کیا دیا ہے؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچی گئی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہی ایک سوال ہے۔ جو بہر حال مجھے سیاست میں لایا۔ ایک خوشحال ملک بنانے میں اب ہمیں آگے آنا ہوگا۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اس ملک کا جتنا نقصان، ان مفاد پرست سیاست دانوں نے کیا ہے، اسے سوچیں تو لرز جائیں۔ کرپشن کے سوا کوئی بات ہی..... سمجھ نہیں آتی آخر یہ کرنا کیا چاہتے ہیں۔ جمہوریت کا راگ ہی الٹا پے جارہے ہیں، کیا جمہوریت کا مطلب ان کا ذاتی مفاد ہے؟“ وہ تلخ ہوتے ہوئے بولی

”جب کسی کے پاس مفاد پرستی کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوگا۔ عوام کی بجائے وہ اپنی خوشحالی پر توجہ دیں گے تو ملک کا نقصان ہی ہوگا۔ اس کا ایک بیک گراؤ ہے۔ جسے فی الحال تم ایسے نہیں سمجھ پاؤ گی..... ہم اس پر تفصیل سے پھر کبھی بات کریں گے۔۔۔ ابھی میں جارہا ہوں۔۔۔“ اس نے ریست واجد دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے بابا۔“ مائرہ نے پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا تو وہ باہر کی جانب چل دیا۔ جیسی اب تک خاموش بیٹھی بانو بیگم نے طعنا میرے لہجے میں کہا

”مجھے تم باپ بیٹی کی بالکل سمجھ نہیں آرہی۔ پتہ نہیں کیا کر رہے ہو تم دونوں۔“

”بابا پرنس کر رہے ہیں اور میں صحافت۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولی تو بانو بیگم نے اسی طعنے لہجے میں کہا

”نہ سمجھ آنے والی بات یہ ہے کہ جمہاری شادی کی عمر ہو گئی ہے۔ لیکن تم دونوں کو خیال ہی نہیں ہے۔“

”اوماما۔ ایہ شادی کہاں سے درمیان میں آ گئی۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا تو بانو بیگم غصے میں بولی

”میں ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بیٹی کے لئے کیا فرض ہوتا ہے۔ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے پاس میری بات سننے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔“

”ماما۔ اس میں excited ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب شادی ہونا ہو گی تو ہو جائے گی۔ ابھی تو میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولی

”جو بھی کرنا ہے شادی کے بعد کرتی رہنا۔ تمہاری پھوپھو آمنہ نے مجھ سے بات کی ہے اپنے رضوان کے لئے۔“ ماما نے جیسے دھماکا کر دیا تو حیرت سے بولی

”وہ تو کینیڈا رہتے ہیں۔ اتنی دور میں، وہاں کیا کروں گی۔“

”جو یہاں کر رہی ہو۔ وہاں بھی ٹی وی چینل ہیں، بلکہ رضوان کا توانا چینل ہے۔ تم بتاؤ تم اس بارے کیا کہنا چاہتی ہو۔“ ماما نے حتی الامکان میں کہا

”کیا آپ سنجیدہ ہیں ماما؟“ اس نے حیرت سے تصدیق چاہی

”بالکل۔! میں نے چند دنوں میں تمہارے پایا سے بات کرنی ہے لیکن میں نے چاہا کہ میں پہلے تم سے پوچھ لوں۔“ وہ یوں پرسکون انداز سے بولی کہ جیسے یہ بات کر کے اس نے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ بھی وہ ایک طویل سانس لے کر بولی

”ٹھیک ہے ماما۔! میں آپ کو سوچ کر بتا دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنا پرس سنہال کر اٹھ کھڑی ہوئی تو بانو بیگم نے حیرت سے کہا

”ناشتہ تو کرو مائثرہ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دی۔ بانو بیگم اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے اس طرح کے رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جیتے ہوئے دماغ کے ساتھ اپنی کار میں آ بیٹھی۔ اسے خود پر ہی طعنا آ رہا تھا۔ وہ پوری شدت سے فہم کو چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ کسی قسم کا کوئی ریسپانس نہیں دے رہا تھا۔ کبھی اس نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی اس کی محبت کو قبول کرنے کا اشارہ نکال دیا تھا۔ یوں جیسے وہ اسے نظر انداز کر رہا ہو۔ دوسری طرف اس کی ماں اس سے پوچھے بغیر اس کی شادی طے کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی ساری زندگی میں سارے بد شستے بے نام بنی ظہرے ہیں، جنہیں وہ اپنا سمجھتی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ میں اپنے آفس چلنے لگی۔

شہر کی معروف اور معروف ترین شاہراہ پر اس نیوز چینل کی عمارت تھی، جس میں مائثرہ کام کرتی تھی۔ اس وقت وہ نیوز چینل کے مالک کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔ باس نے اسے بلایا تھا۔ اس وقت باس اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، جس دوران، مائثرہ اس کے آفس میں داخل ہوئی۔ باس نے سر اٹھا کر دیکھا تو بہت زیادہ خوشی اور احترام کا اظہار کرتے ہوئے بولا

”ویل ڈن مائثرہ، بہت خوب، میں نے رات تمہاری یہ Investigative رپورٹ دیکھی، مکمل کر دیا، کیا دجیاں اڑائیں ہیں تم نے ان سیاست دانوں کی۔ بے نقاب کر کے دکھ دیا، رات سے فون پر فون آرہے ہیں ان کے۔ آؤ۔! آؤ پلیز بیٹھو“ اس نے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولی

”جینک پوسر۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ایک پروفیشنل جرنلسٹ کی طرح کام کروں۔“

”میں جانتا ہوں کہ یہ جو تمہاری نئی ایڈیٹر شوریز ہیں۔ نیوز کی دنیا میں اپر پریچٹ (Aprichat) کی جا رہی ہے۔ تمہارا کام دیکھا جا رہا ہے۔ تمہاری محنت نظر آ رہی ہے۔“ اس نے ایک نظر لیپ ٹاپ پر دیکھتے ہوئے خوش ہو کر کہا

”جینک پوسر۔ میں ایسے ہی محنت کرتی رہوں گی۔“ وہ ممنونیت سے بولی

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم بہت ساری کامیابیاں میٹھو گی۔ میں نے تمہارے کام سے جواب تک Abservie کیا ہے وہ یہی ہے کہ تم عام لڑکیوں سے زیادہ بہادر ہو۔“ اس نے مائثرہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اعتماد کے دیے روشن تھے۔ اس پر وہ سنجیدگی سے بولی

”جھوٹ انسان کو کمزور کر دیتا ہے سر، اور سچ۔۔۔ انسان کو بہت حوصلہ دیتا ہے، ہمت دیتا ہے۔ میں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا ہے۔ میں نہیں ڈرتی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے، جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔“

”ماڑہ...! تمہارا واسطہ ان سیاست دانوں سے ہے جن کے کالے کروت تم عوام کے سامنے لے آئی ہو۔ وہ اپنی خباثت سے تمہارے خلاف کسی سازش کا جال بن سکتے ہیں۔ اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔... یہ کبھی سوچا تم نے؟“ ہاس نے سمجھانے والے انداز میں پوچھا تو وہ جیسے ہوئے بول

”نہیں... اور میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہتی... کیونکہ میں جج پر یقین رکھتی ہوں۔“

”مجھے فکر ہے ماڑہ کیونکہ تم اس جینٹل کا حصہ ہو... میں اور یہ جینٹل ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ تم کبھی بھی خود کو تھامت سمجھنا۔ اگر ایسی کوئی صورت ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔“ ہاس نے پر یقین لہجے میں کہا

”تھینک یوسر...“ اس نے عام سے انداز میں کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب پروٹیشنل باتیں ہیں۔ جو اس کا ہاس کہہ رہا تھا

”کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، کوئی مشکل محسوس کرو تو فوراً مجھے بتانا“

”جی میں بالکل بتاؤں گی، اجازت؟“ ماڑہ نے خوشگوار لہجے میں اٹھتے ہوئے کہا

”اوکے۔ وٹس یو گڈ لک۔“ ہاس نے خوش ہو کر کہا جسے سن کر وہ مسکراتے ہوئے والہس پلٹ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی لپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دروازے پر ہلکی سی دھک ہوئی تو ماڑہ نے چرکتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ دروازے میں جعفر رضا موجود تھا۔ وہ اس کا کلاس فیلو اور بہترین دوست تھا۔ وہ فہد اور جعفر ان تینوں کا ٹرائی اینگل پورے کالج میں مشہور تھا۔ جعفر اور فہد نے پولیس ٹریننگ اکٹھی لی۔ فہد نے تو جاب نہ کی مگر جعفر نے ایس پی کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ ماڑہ اس کی طرف دیکھ کر دل سے مسکرا دی تو وہ بولا

”کیا میں اندر آ کر آپ کی تنہائی میں قتل ہو سکتا ہوں۔“

”جی ماڑہ نے خوشگوار انداز میں کہا

”او۔ ا جعفر تم... تنہائی میں قتل تو ہو ہی گئے ہو۔ اب آ جاؤ...“

”ذرا نوازی ہے آپ کی، ورنہ بندہ کس قابل ہے“ یہ کہتے ہوئے وہ اندر آ گیا اور سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر بول، ”ویسے لگتا نہیں تم اتنی مصروف ہو جتنا تم دکھائی دے رہی ہو۔ وہی پرانی بات کہ Look busy do nothing مطلب کرنا، کچھ نہیں اور مصروف دکھائی دیتا ہے۔“

”تم لوگوں کو کیا پتہ کہ مصروفیت کیا ہوتی ہے۔ ایک وہ فہد ہے جو کرتا درتا کچھ نہیں مگر اسے بھی فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ اور تم مانتے دن سے کہاں غائب ہو۔ نہ فون کیا، نہ آئے ہو۔“ اس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا

”میں فہد کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر میری تو ایک پینٹل اسٹینٹ تھی، کچھ ڈرگز اور اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث گروہ تھا۔ انہی کو پکڑنے میں مصروف تھا۔ اور وہ پکڑ لئے ہیں۔ لگتا ہے کوئی میڈل شیڈل مل جائے گا۔“ وہ کاغذ اچکاتے ہوئے بول،

واؤ..... نکلا سٹک۔۔۔ جعفر تم تو اچھے بھلے پولیس والے بن گئے ہو۔ خوب ڈر ڈر ہوئی ہوگی۔ اچھا ایک بات بتاؤ..... سی ایس پی پولیس آفیسر بن کر کیا محسوس کر رہے ہو؟“ مائرہ نے حیرت بھری خوشگواریت سے پوچھا تو جعفر ذرا خمیدگی سے بولا

”ایک پولیس آفیسر چاہے تو اپنی رنج میں جرائم کا خاتمہ کر سکتا ہے۔“ پھر ایک دم لہجہ میں موڈ میں بولا ”اور میں..... میں نے یہ نوکری محض انجوائے کرنے کے لیے کی ہے۔ لوگوں پر رعب شوب، جماؤ..... پیر کی ڈ..... ویسے۔۔۔ اچھا پیرا جاتا ہے نا تو بندہ، مادیت پرست ہو جاتا ہے۔ اس میں زندگی کے لطیف احساسات.....“

”اچھا چپ کرو..... مجھے تمہاری تقریر نہیں سننی.....“ وہ ایک دم سے اکتاتے ہوئے بولی، پھر لہجہ بھر پھر کر بہت غلوں سے بولی

”تمہیں کامیابی مبارک ہو۔ کالج دور میں یہ تو نہیں لگتا تھا کہ تم کوئی دھانسو قسم کہ آفیسر بنو گے۔ اب تم ویسے پولیس آفیسر بن گئے ہو۔ اور مجھے پتہ ہے تیرے پیسے بہادر اور ایماندار پولیس آفیسر کی اس معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔“ وہ کہتے ہوئے ایک دم رکی اور پھر بولی ”

اچھا ایک بات بتاؤ“

”پوچھو۔“ اس نے مائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی کہ فہم نے تمہاری طرح تمہارے ساتھ پولیس کو جوائن کیا۔ Asp آفیسر بھی بنا..... اور اچانک سب کچھ چھوڑ کر ریزائن کر دیا۔ اگر اس نے یہ جاب چھوڑنا ہی تھا، تو اتنی مشکل ٹریننگ سے کیوں گزرا؟ مطلب سی ایس پی ایس کیا، ٹریننگ کی“

”اس کے لیے میں حیرت مچی، جس پردہ عام سے انداز میں بولا

”بچ پوچھنا، مائرہ مجھے بھی آج تک سمجھ نہیں آ سکی۔ میں نے ایک دو بار پوچھا تو وہ نال گیا۔ کچھ نہیں بتایا مجھے۔“

”جعفر کیا تم نے Feel کیا ہے کہ آج کل وہ ہم سے مل نہیں رہا۔ فون کرو تو لھیک سے بات نہیں کرتا۔۔۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔ کوئی پرابلم تو نہیں چل رہا اس کے ساتھ؟“ اس نے غماز انداز میں پوچھا

”اب تم یقین کرو گی..... مجھے ملے بھی کافی دن ہو گئی ہیں۔ میں اس.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ناراضگی سے بولی

”تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ نہیں.....“

”وہ کہتے ہیں نا جو بندہ محبت میں ناکام ہو جائے تو وہ شاعر بن جاتا ہے۔ اور جو محبت کرنے کی امت کر رہا ہو..... وہ میرے جیسا پولیس آفیسر بن جاتا ہے۔ مطلب میرے جیسا Asp جسے شاید اپنی بات کہتی نہیں آتی.....“ اس کے یوں کہنے پر مائرہ ہنستے ہوئے بولی

”تمہاری یہ Explanation نہایت فحش ہے۔ یوں لگ رہا جیسے محبت کرنے کے لئے بھی..... باقاعدہ پلان کرنا ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیا پتہ..... کون اپنے دل میں کیا لئے بیٹھا ہے۔ اپنی ہاؤس (Any haow) ہماری روایات میں مہمان نوازی بھی ہے، اور..... چاہو تو ساتھ میں کچھ کھانے کے لئے منگوا لو، میں ماسٹر نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ ہی نے بلوایا ہے۔ آپ کا فون ملا اور آفس

جانے سے پہلے بندہ حاضر ہو گیا۔ کم از کم چائے کا تو حقدار ہوں نا، اس معنوی بے چارگی سے کہا تو ہنس دی۔

”کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔ ۱۰ یولو! چائے یا کافی، کیا پیو گے۔“ یہ کہہ کر وہ انٹرکام کے ریسیور کی جانب متوجہ ہو گئی۔ پھر کچن

میں آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر بولی

جعفر، میں نے تمہیں فون کر کے اس نئے بلایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کر سکوں۔“ اتنا کہ کر وہ لمحہ بھر کو تذبذب کی حالت میں خاموش رہی پھر بولی ”دیکھو! میں ہمیشہ اپنی پریشانی تم ہی سے شیر کرتی ہوں۔“

”اب مجھے الہام تو ہوا ہونے لگے ہیں کہ میں دلوں کے حال پڑھ لوں۔ کہو! کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں سن رہا ہوں۔“ وہ پوری

سجیدگی سے بولا، تو وہ کہنے لگی

”میں فہم سے ملی تھی۔ وہ مجھے بہت پریشان لگا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ مجھے ٹال گیا ہے۔ کیا وہ ہے، کیوں

ڈیپریس ہے وہ آج کل؟“

”مجھے پہلے ہی یقین تھا۔ تم اسی کی بات کرو گی۔ خیر Feel تو میں نے بھی کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں اس نے مجھ سے کوئی

بات نہیں کی۔ سو! میں نہیں جانتا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ ہم اسے کافی لائف سے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے

ساتھ کوئی نہ کوئی پریشانی لگی رہتی ہے، اپنی نہ ہو تو کسی دوسرے کی ہوتی ہے۔“ وہ کافی حد تک اکتائے ہوئے لہجے میں بولا

”تم یہ بھی جانتے ہو جعفر۔ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ وہ مجھے اہمیت تو دیتا ہے لیکن میری محبت کا جواب محبت سے نہیں

دیتا۔ کچھ دنوں سے تو اتنا سنجیدہ بن گیا ہے کہ بالکل انجینی دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے جعفر؟“

اس کے یوں کہنے پر وہ چوہکتے ہوئے بولا

”بچ پوچھنا، مزہ! اہم میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوتی۔ اس نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں کرتا۔“

اس بار چوہکتنے کی باری مازہ کی تھی۔ وہ پریشان لہجے میں بولی

”میں یہ نہیں مان سکتی۔ وہ تمہارا بہترین دوست ہے۔ تم نے اچھے تعلیم حاصل کی۔ دونوں نے مل کر پولیس ٹریننگ لی۔ وہ اپنے

سارے راز و نیاز تم سے کرتا ہے۔ تو پھر یہ بات تم سے کیوں نہیں کہتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”یہ سچ ہے کہ وہ اپنی ساری باتیں مجھ سے ہی کرتا ہے۔ مگر میرا یقین کرو! اور دیکھو، تعلیم تو... تم نے بھی ہمارے ساتھ حاصل کی

ہے... اس نے پولیس ٹریننگ کر کے نوکری نہیں... کیا اس کی وجہ نہیں بتائی... اسی طرح اس نے اپنی محبت کے بارے میں کبھی مجھ سے

بات نہیں کی۔ اور نہ میں نے کبھی پوچھا۔“ اس نے مازہ کو یقین دلاتے ہوئے کہا

”کیوں؟“ اس نے احتجاج بھرے لہجے میں پوچھا۔ جس پر جعفر نے ہولے سے کہا

”مجھے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں تجسس کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے اپنے دوست پر مان بھی ہے۔ اگر اس نے کبھی اپنا یہ

راز شہز کرنا چاہا تو مجھ سے ہی کرے گا۔ ویسے ایک بات کہوں..... میرے خیال میں محبت جتنی نہیں جاتی۔ یہ تو خوشبو کی مانند اپنا آپ منوا لیتی ہے۔“

جعفر کے لہجے میں اک عجیب اپنائیت بھرا احساس تھا، جس پر وہ چوٹے بغیر نہ رہ سکی، وہ چند لمبے اس کی بات کے حصار میں رہی، پھر خود پر قابو پا کر بولی

”پلو میری محبت والا معاملہ تو چھوڑو۔ اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ وہ کس مشکل وقت سے گزر رہا ہے۔ کسی مشکل وقت کے لیے دوست ہی کام آتے ہیں۔“

”اس وقت مازہ! جب دوست مدد کے لئے نکارے۔ ورنہ یہ کسی کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی ہے۔ میں اس کا دوست ہوں، جاسوس نہیں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو مازہ اکتاہٹ اور بے بسی میں بولی

”یہ تم فضول بات کر رہے ہو۔ بس تم اس سے پوچھو۔ وہ پریشان کیوں ہے۔ مجھ سے بحث مت کرو۔“

”تم کہتی ہو تو میں کوشش کر لیتا ہوں۔ کل اگر اس نے شکوہ دیا تو جواب دہم ہوگی، میں نہیں۔“ وہ صاف انداز میں بولا تو مازہ خود

پر قابو پاتے ہوئے بولی

”اچھا۔ اٹھیک ہے۔“

تجبی جعفر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا

”جو تمہارا دل چاہے۔ میں تو وہی چاہوں گا نا۔ جو تم چاہتی ہو۔“

اس کے یوں کہنے پر مازہ نے ایک لمبے کے لئے اس کی جانب دیکھا ہے اور کچھ کہنا چاہا تبھی ملازم ان کا آؤر رلے کر آ گیا۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھے کھانے پینے لگے۔ کمرے کا ماحول ایک دم سے بوجھل ہو گیا تھا۔



قسط نمبر میں بھی ہر گاؤں کی طرح ایک چوراہا تھا۔ اس چوراہے کے درمیان میں بہت قدیم بڑا درخت تھا، جس کی گھٹی چھوڑوں میں گاؤں کے وہ لوگ آکر بیٹھے رہتے جنہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا، بابا لکل فارغ ہوتے۔ وہ سارا دن تاش اور کنخوری کھیلتے رہتے۔ باقی ان کا کھیل دیکھنے جمع ہو جاتے۔ کچھ گھنٹیں لگانے، سستانے اور وقت پاس کرنے وہاں آ جاتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ہر طرح کی خبر مل جاتی تھی۔ کن سوئیاں لینے والے لوگ تو یہاں ضرور موجود رہتے تھے۔ گاؤں کے اس چوراہے میں ایک طرف مسجد تھی اور اس سے ملحقہ دوکانیں تھیں، وہاں بھی لوگ آتے جاتے تھے اور بیٹھے رہتے تھے۔ صبح روشن ہو چکی تھی۔

اس وقت بھی بڑے درخت کے نیچے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں گپ شپ چل رہی تھی۔ کچھ تاش اور کنخوری کھیلتے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ایسے میں ان کے عقب سے اشفاق عرف چھا کا بغل میں اپنا مرغاد بائے تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ پتلے سے بدن والا، سانولے

رنگ کا موٹے نین نقش، ٹھنکریا لے بال، میانہ قد اور ہم سی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ غربت کا احساس اسے دیکھ کر ہی ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی آپ میں مست تھا۔ وہ سیدھا حنیف، دوکان دار کے پاس گیا اور جلدی سے ایک چھوٹا لوٹ بڑھاتے ہوئے ماپنے مرغے کی طرف دیکھ کر بولا

”ہا دام دے میرے اس شہزادے کے لیے۔ ذرا کشش بھی دینا ساتھ میں۔“

اس کے یوں کہنے پر حنیف دوکاندار نے اُسے گھور کر دیکھا، پھر اکتائے ہوئے لہجے میں نصیحت کرنے والے انداز میں کہا

”اُوئے، کچھ تم بھی کھالیا کرو، اپنی محنت دیکھو ذرا۔ اسے ہی کھلاتا رہتا ہے۔“

حنیف دوکاندار نے کہا ہی تھا کہ مرغا بول پڑا، چھاکے نے حنیف کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مرغے سے مخاطب ہو کر کہا

”اومبر کر، تو ہا دام ہی کھائے گا۔ یہ تو ایویں سیانا بننے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔“

”ہاں جیسے تم، تو بڑے سیانے ہو، سارا دن ان نگڑوں کے پیچھے چل خراب ہوتا رہتا ہے۔“ اس ہا اُس کے لہجے میں سے غصہ جھلک پڑا تھا۔ تب چھاکے نے خُرا سامنے بٹاتے ہوئے کہا

”یہ بات نہ کر، اک ہی تو میں ہوں اس پنڈ میں، جس کی سارے علاقے میں دس بچہ ہے۔ اپنا یہ نگڑ سارے علاقے کا جمنگن ہے، پتہ بھی ہے تجھے؟“

”اُوہاں خاک دس بچہ ہے۔ وہ امین آرتیس کے بارے میں پتہ ہے کیا ہوا، اس کے ساتھ وہ کل سے غائب ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔“ اس ہا حنیف نے ادھر ادھر دیکھ کر اسے نئی خبر سے آگاہ کیا۔ اس پر چھاکے نے کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے عام سے انداز میں تبصرہ کیا

”اس نے غائب کہاں ہوتا ہے۔ چوہریوں کا کوئی نیا ظلم ہوگا اور وہ چوہری کر بھی کیا سکتے ہیں۔ امین نے بھی تو اُن کے خلاف گواہی دینا تھی نا۔ اب وہ غائب نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟“

”اس کے گھر والے پریشان ہیں۔ سنا ہے اس کا بھائی سراج بھی شہر سے آ رہا ہے۔“ وہ مصنوعی پریشانی سے بولا

”اُوئے سیانے، ایک پرانی مثال ہے کہ اونٹ رکھنے والوں سے باری ہوتا تو اپنے گھر کے دروازے بڑے اور اونچے رکھتے پڑتے ہیں، امین بے چارے کو کیا معلوم ہے یہ چوہری کیا شے ہیں۔ سراج اگر آ بھی گیا تو وہ کیا کر لے گا؟“ چھاکے نے طنزیہ انداز میں سرمارتے ہوئے کہا کہ حنیف دوکاندار بات سمجھتے ہوئے بولا

”ہات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ان کا سارا گھر بھی زل جائے گا۔ سیدھی ہی بات ہے، یہ چوہریوں کے ساتھ دشمنی تو نہیں لے سکتے، کوشش کریں گے تو۔“ یہ کہتے کہتے وہ خوف زدہ انداز میں رک گیا تو چھاکے کا طنزیہ لہجہ میں بولا

”اُو تو بھی چپ کر، کہیں تم بھی چوہریوں کے عتاب میں نہ آ جاؤ۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا مرغا پھر بول پڑا، چھاکے اس سے مخاطب ہو کر بولا، ”اومبر کر مبر، ہا دام ہی دیتا ہوں، اُو لایا ہا دام، میرا شہزادہ ناراض ہو رہا ہے۔“

اس پر حلیف، دوکان دار نے پہلے چھ کے چہرے پر پھر اس کے مرنے پر قہر آلود نگاہ ڈال کر اپنی دوکان کے اندر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں آیا تو اس نے ہادام ایک لفافے میں ڈال کے اسے تھما دیے۔ چھ کا اسے لیکر چل دیا۔ اگرچہ سارے گاؤں میں یہ خبر بڑے تجسس کے ساتھ سن گئی تھی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں حیرت جانتے کا خواہش مند تھا، لیکن چھ کے کو کچھ کر یوں لگا تھا کہ جیسے اسے ان معاملات کی کوئی پروا نہیں ہے اور وہ اپنی دنیا میں مست تھا۔

چھ کا، تھا بھی ایسا ہی، وہ واقعتاً اپنی دنیا میں مست رہتا تھا۔ کبھی دل کیا تو مزدوری کر لی ورنہ وہ ہوتا اور اس کا مرنے، جس کوڑا نے کی بیماری میں لگا رہتا تھا۔ خود کم کھاتا اور اپنے مرنے کو زیادہ کھاتا تھا۔ اس دنیا میں اس کے باپ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ جو پورے گاؤں میں ”چاچا سوہنا“ کے نام سے مشہور تھا۔ چھ کے کی طرح اسے بھی کھانے کمانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جب ضرورت ہوئی تو کوڑا بہت کمالیہ ورنہ سارا دن گاؤں کے چوراہے میں بیٹھا ناش کھیتا رہتا تھا۔ پہلے کبھی وہ تانگہ چلایا کرتا تھا۔ انجی بھلی آدنی ہو جایا کرتی تھی۔ مدت ہوئی اس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ چھ کا جس قدر اپنے آپ سے بیگانہ اور مست رہنے والا ہو جان تھا، اس کا باپ چاچا سوہنا اسی قدر اپنی تک سبک ہر وقت درست رکھتا تھا۔ عرصہ ہوا چھ کے کی ماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ سو ان کا گھر کیا تھا۔ بس رات کو سونے ہی کی جگہ تھی۔ سامان کے نام پر ضرورت کی چند اشیاء تھیں۔ اس وقت چھ کا اپنے گھر میں داخل ہوا تو سامنے محن والے آئینے کے سامنے کھڑا چاچا سوہنا اپنے بال سنوارتے ہوئے منگھتا رہا تھا۔

”جھنتی بوڑی دے طہیاں نہی تے میں مرگی آ، تیرے عشق نہیا کر کے تھیا تھیا۔“

چھ کا اندر آ کر غور سے اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کی گھورتے رہنے کے بعد بڑے عجیب سے طریقہ لہجے میں بولا ”اؤسے بابا تمیز کر۔ اس عمر میں یہ کیا کر رہا ہے۔ تو کوئی اللہ اللہ کر۔ مسجد جایا کر۔ تجھے اپنے شیرور گے ہڑکا خیاں نہیں کہ وہ پنڈ میں بے عزت بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ ایک ہی چھ کا ہے اس پنڈ میں جس کی سارے علاقے میں دس پوچھ ہے۔ تو اس کی دس بچھ خراب کرنا چاہتا ہے“

چھ کے کے یوں کہنے پر چاچے سوہنے نے پہلے اُسے گھور کر دیکھا، پھر نہ اسامندہ بنا کر طنزیہ انداز میں کہا ”اوئے کھنہ تے سوا۔۔۔ تیری دس پوچھ کو میں نے چٹا ہے۔ جب تیرے جیسی اورا اپنے باپ کے کام ہی نہیں آسکتی۔ سارا دن اس کٹڑ کو بفل میں لے کر گھومتا رہتا ہے۔ اپنے باپ کا ذرا خیال نہیں ہے تجھے۔“

”نہا، مجھے بتا، میں تیرا کیا خیال نہیں کرتا۔ تیرا سارا خرچہ میں دیتا ہوں، تجھے کمانے کی کوئی فکر نہیں اور یہ سر کا جیر نکال کر سارا دن چوراہے پر بیٹھ کر ناش کھیتا رہتا ہے، بتا کیا خیال نہیں کرتا؟“ چھ کے نے بھٹا کر پوچھا

”نہتر، تیرا دل نہیں کرتا کہ تو گھر آئے، سچی روٹی پکی ہوئی ہو، بسترے دھے ہوئے ہوں، مگر صاف ستھرا چمکا ہوا ہو۔“ چاچا سوہنا درمندہ لہجے میں بولا

”میں جانتا ہوں تو میری شادی کرنا چاہتا ہے میں۔۔۔“ اس نے شرماتے ہوئے کہا چاہا تو چاہا سوہنا اس کی بات کاٹتے ہوئے تڑپ کر بولا

”اوہ کون تیری شادی کی بات کر رہا ہے، میری طرف دیکھ، میں کب تک یوں جوان جہان چنڈ میں اکیلا ہوں، تیرا جی نہیں کرتا کہ تیری ماں ہو اس گھر میں؟“

”بس اہ۔۔۔ آگے ایک لفظ مت کہنا۔۔۔ کہیں چھاکے کی دس پوچھ کے ساتھ اس کی بے عزتی نہ کروادیتا، آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔“ اس نے پوری جھجکی سے کہا

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ بہت جلدی ڈ دیکھ لے گا۔“ وہ حتیٰ لہجہ میں بولا، پھر گھور کر چھاکے کو دیکھتا ہوا وہ باہر کی جانب چل گیا۔ چھاکا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اپنے میں گکڑ بول پڑا تو چھاکا انتہائی غصے اور بے بسی میں اس پر برس پڑا

”اوتے ڈوتے چپ کر اوتے۔“

تجھی گکڑ اس سے ہاتھ سے نکل کر یوں بھاگ گیا جیسے وہ اس سے ناراض ہو گیا ہو۔ وہ چند لمحے مرنے کو دیکھتا رہا پھر چار پائی پر بیٹھ کر اپنے گھر کی دیواری کو دیکھنے لگا۔ اس کی سر آؤ نکل گئی۔



رُوشن صبح کی سنہری کرنیں سسلی پر بھی پڑ رہی تھیں جو اس وقت کچھ اور لوگوں کے ساتھ سٹاپ پر کھڑی کسی سواری کی منتظر تھی۔ وہ پہلی بار اپنے گھر سے کمانے کی غرض سے نکلی تھی۔ اس کا یہ خواب بہت عرصے بعد پورا ہونے والا تھا۔ کتنی تک دوڑ کی تھی اس نے، نامساعد حالات میں بھی اس نے تعلیم کو جاری رکھ تھا۔ قرضی گاؤں کے لڑکیوں والے سکول سے آٹھ جماعت پاس کر لینے کے بعد اس نے گھر بیٹھ کر ہی تیاری کی اور پڑھتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے بی اے کر لیا۔ پھر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہی سے بی ایڈ کر چکی تو استانی بن کر اپنے گھر کی معاشی حالت کو سہارا دینے کا شدت سے سوچنے لگی۔ کچھ عرصہ پہلے ہی حکومت کی طرف سے پنچر کی جاب نکلی تھی۔ اس نے درخواست دینے کے بعد انٹر دیوڈ تھا، جس کے جواب میں اسے کال لیٹر آ گیا۔ اور اُس دن وہ قریب ہی کے قصبے نور پور میں یہ جاب جوائن کرنے جا رہی تھی۔ ابھی تک کوئی وین یا بس نہیں آئی تھی۔ اور وہ خود کو بڑی ساری چادر میں لپیٹے سٹاپ پر کھڑی تھی۔

ایسے میں چوہدری کبیر کی جیب زن سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ سسلی کو کیا پتہ کہا اس میں کون تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے قریب سے کون گزر گیا۔ یہ تب اسے معلوم ہوا جب وہی جیب بلیک ہو کر اس کے قریب آن رکی۔ چوہدری کبیر نے دروازہ کھولا اور بڑی پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سسلی نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر نفرت سے مت دوسری طرف پھیر لیا۔ چوہدری کبیر کو دیکھ کر وہاں سٹاپ پر موجود لوگ دھیرے دھیرے کھٹکتے گئے۔ وہ اپنی جیب میں سے نکلا، اس نے اپنی ”گھگوں“ سے بلیک ریمین اتاری اور سیٹ پر پھینک کر سسلی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سسلی کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لے ہوئے تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بڑے سوتیانہ لہجہ میں بولا

”لگتا ہے فور پور جانے کی تیاریاں ہیں۔ آؤ، میں تجھے چھوڑ دوں۔“ اس کے یوں کہنے پر سلسلی نے اسے غرت بھری نظروں سے دیکھا اور منہ بھیر لیا، جب چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ فالتیں۔۔۔ اور یہ فور پور جانے کی تیاری۔۔۔ تو میں نے ٹھیک سنا۔ تم نوکری کرنے جا رہی ہو۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر سلسلی خاموش تھی۔ بس چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اس کا بس نہیں مل رہا تھا کہ وہ گھما کے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے، جبکہ وہ اسی انداز میں کہتا چلا گیا، ”تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ہے، تم تو خود شہزادی ہو۔ تمہیں پتہ ہی نہیں تم کیا چیز ہو۔ میں۔۔۔“

وہ حد سے بڑھنے لگا تو سلسلی نے دبے دبے غصے میں دانت پیٹتے ہوئے کہا

”اپنی زبان کو لگام دو چوہدری۔۔۔ اور جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔“

چوہدری کبیر قہقہہ لگا کر بولا

”تم جانتی ہو سلسلی۔ جس جگہ ہم کھڑے ہیں یہ ہماری زمین ہے، میں مالک ہوں اس کا، اب بتاؤ بھلا، کہاں چلا جاؤں میں۔۔۔“

تم کہو تو اس جگہ کی مالکین بنادوں تمہیں۔ پھر کہہ سکتی ہو مجھے۔“

”میں تمہارے منہ نہیں لگتا چاہتی۔“ سلسلی نے بے بسی سے کہا

”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میری مرضی کے بغیر تم نوکری نہیں کر سکتی۔ ماؤ۔! یہ کاغذات مجھے دو۔ میں تمہاری نوکری لگوا دیتا ہوں۔ اور تمہیں کہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ تمہیں گھر بیٹھے تنخواہ مل جایا کرے گی۔ جاؤ وہاں چلی جاؤ گھر“ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذات مانگتے ہوئے کہا تو وہ خطرہ انداز میں بولی

”میری نوکری لگ گئی ہے اور میں آج پہلے دن جوائن کرنے جا رہی ہوں۔ مجھے تمہاری کسی بھردی کی ضرورت نہیں۔“

”کہانا کاغذات دو اور واپس جاؤ۔ تمہیں نوکری نہیں کرنی۔“ چوہدری کبیر نے عجیب سے لہجے میں کہا

”کیوں؟ تم کون ہوتے ہو۔“ وہ تڑک کر بولی۔ اسے واقعتاً شدید غصہ آ گیا تھا

”میں۔! یہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا اور پھر غمخور انداز میں بولا، ”میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ تم یہ چھوٹی

موتی نوکری کے لئے دھکے کھاتی پھرو۔۔۔ جسے میں پسند کروں اور وہ نوکریاں کرتی پھرے، ایسا تو نہیں ہو سکتا، جان من۔۔۔“

”چوہدری۔۔۔“ سلسلی نے انتہائی غصے میں تڑپ کر کہتے ہوئے وہ تھپڑ مارنے کو آگے بڑھی مگر سلسلی نے چوہدری کبیر کے ایک ملازم

نے جیب میں بیٹھے ہی ہوائی فائر کر دیا۔ باقی دو اسلحہ برداروں نے اس پر گنیں تان لیں۔ وہ سہم کر رک گئی۔ چوہدری کبیر نے اپنے بندوں

کو دیں رکے کا اشارہ کیا اور اس کی طرف پر شوق لگا ہوں سے دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا

”تمہارا بچی غصہ تو مجھے اچھا لگتا ہے۔“

”ایک کمزور لڑکی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے چوہدری کبیر“ سلسلی نے چمک آمیز لہجے میں کہا تو اس کی

تجوڑیوں پر بل پڑ گئے، تبھی اس نے دبے دبے غصے میں کہا

”میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا سلسلی۔ کیوں سنایا، یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ واپس پلٹ جاؤ۔“

”میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔۔۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔“ اس نے کافی حد تک خوف

سے نکل کر خدی لہجہ میں کہا

”خدمت کرو سلسلی۔۔۔ اور واپس پلٹ جاؤ۔۔۔ میری بات مان لو۔“ اس نے پھر بڑے سکون سے سمجھانے والے انداز میں کہا

”کیا کرو گے تم۔۔۔ قتل کرو گے نا۔۔۔ تو کرو۔۔۔“ سلسلی نے سارے خوف اور ڈر کو اُتارتے ہوئے کہا، اس کی نگاہوں میں

غیرت بھرے شیطانی نکل رہے تھے۔ جس پر وہ مسکراتے ہوئے بولا

”میں تمہیں قتل کر ہی نہیں سکتا سلسلی۔ تم نے جو مجھے قتل کر دیا ہے۔۔۔ میں تو صرف لو کر کر کے روک رہا ہوں اور وہ میں

تجھے روک لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک اس کی قائل پکڑ لی۔ ان میں کاغذات دیکھتے ہوئے اس میں سے ایک سفید رنگ کا لٹا

فد نکال کر اسے پھاڑا اور اس کے پرزے پرزے کر کے زمین پر پھینک دیئے۔ سلسلی ہکا بکا رہ گئی۔ ”اگر اب بھی تم نے لو کر کر کے کا سوچا نا

تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ کر جیب میں بیٹھ گیا اور اسے آگے بڑھائی۔ سلسلی وہیں رو جے ہوئے سسکتے لگی۔

چوہدری کبیر کو اس کے خاص مائیکے ملازم مائیکے نے جو خبر دی تھی وہ بالکل درست تھی۔ اسی لئے وہ صبح ہی صبح اس سٹاپ پر آیا تھا

کہ سلسلی کو یہ باور کرا سکے کہ وہ اس کے کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ اگرچہ اسے سسکتی ہوئی سلسلی اچھی نہیں لگی تھی، مگر ایسا کرنا ضروری

تھا۔ پورے علاقے کی یہی ایک لڑکی تھی جس پر وہ مرعہ تھا۔ ایک ظالم، بدتمیز اور بے حس جاگیردار ہونے کی وجہ سے یہ انہونی سی بات لگتی

تھی، مگر ایسا منجانبے کب ہوا، اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ منجانبے نے کتنی کلیاں اس نے مسل ڈالیں تھیں، اسے یہ دوسرے بھی تھی کہ وہ جب چاہے

اسے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر ڈال سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کی چاہت کا طلب گار تھا، وہ یہی سوچتا ہوا حویلی کی

طرف جا رہا تھا۔ جہاں اس کے والدین اس کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

چوہدری جلال حویلی کے کاریڈور میں ٹہل رہا ہے۔ وہ نہ سکون سا ہے۔ سبھی اس کی بیوی بشری بیگم نے اسے دیکھا اور پھر آہستہ

قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ چوہدری جلال اسے دیکھ کر ٹھنک گیا تو بشری بیگم نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

”کیا بات ہے چوہدری صاحب ابوی گہری سوچ میں ہیں آپ؟“

”ہاں بیگم! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ زندگی کے راستے پر چلتے چلتے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کتنا طویل سفر طے کرائے ہیں

اور منجانبے ہاتی کتنا سفر ہاتی ہے۔“ وہ بڑے غم سے ہوئے لہجے میں بولا تو بشری بیگم کو عجیب سا لگا۔ اس کا شوہر پہلے کبھی ایسے نہیں سوچا کرتا

تھا، اس لئے تشویش سے کہا

”میں کبھی نہیں آپ کہتا کیا چاہ رہے ہیں۔“

”تم جانتی ہو بشری بیگم۔! میں نے ایک بھر پور زندگی گزاری ہے۔ پرکھوں کی اتنی بڑی جائیداد میں کی نہیں آنے دی۔ بلکہ اس

میں اضافہ ہی کیا ہے۔ پورے علاقے پر رعب اور دبیدہ ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ میرا حکم نال دے۔“ اس نے گہرے لہجے میں کہا
 ”تو پھر پریشانی کس بات کی ہے؟“ وہ الجھتے ہوئے بولی

”میں پریشان نہیں ہوں۔ بلکہ سوچ رہا ہوں۔۔۔ حالات ایسے بن گئے ہیں کہ اب تمہارے بیٹے جکے چوہدری پر ڈے داریاں
 ڈالوں۔ تاکہ وہ بڑا چوہدری بن کر اس علاقے پر حکومت کرے۔“ اس کے لہجے میں غر جھلک رہا تھا
 ”ہاں چوہدری صاحب۔ اب ہم عمر کے اس حصے میں آگئے ہیں جہاں اپنی ڈے داریاں اگلی نسل کو دینا ہوگیں۔ ہمارے
 اکلوتے بیٹے چوہدری کبیر کو تو رب نے پیدا ہی اسی لئے کیا ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ کر حکومت کرے۔“ اس کے لہجے میں بھی غرور ٹپک پڑا تھا
 ”اؤ نہیں بھائیو! حکومت آرام سے بیٹھ کر نہیں کی جاتی اس کے لئے تو چیتے کی پھرتی، ہانسی کی آکھ اور شیر کا دل چاہیے۔“
 وہ اپنا تجربہ اور گہرا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے بولا

”تو پھر میرے بچے میں کیا کمی ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا
 ”کمی یہ ہے کہ وہ اب تک کھیل تماشے ہی میں وقت گزار رہا ہے۔ دنیا داری کیا ہوتی ہے۔ ابھی وہ نہیں جانتا۔ یہ ساری عقل سمجھ
 اسے لینا ہوگی۔ یہ سناست کیا ہے۔ اسے سمجھنا ہوگا، پھر وہ اس علاقے پر حکومت کرنے کے قابل ہوگا۔“
 ”پر میرا بچہ اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے۔ جانتا ہے کہ دنیا داری کیا ہوتی ہے۔“ وہ دان سے بولی
 ”تو اس کی دل ہے ناماس لئے ایسا کہہ رہی ہے۔ ورنہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ خیر۔ وہ ایک بڑا سیاست دان بن کر
 اس علاقے پر حکومت کر سکتا ہے۔ اگر اس میں جذباتی پن ختم ہو جائے تو۔۔۔ میں نے بھی فیصلہ کیا ہے۔ اس بار الیکشن میں اسے ایم پی اسے
 بنوائی دوں۔ دریا میں کودے گا تو اسے تیرنا بھی آجائے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ سننے ہی بشری بیگم کافی حد تک خوف زدہ
 لہجے میں بولی

”دیسے چوہدری صاحب۔ اس بار آپ اسے الیکشن نہ لڑوائیں۔۔۔ ہم اس کی شادی کرتے ہیں دھوم دھام سے۔۔۔ ہمارے
 اکلوتے بیٹے کے لئے ایک سے ایک بڑھ کر رشتے ہیں۔۔۔ ایک سے ایک بڑھ کر خاندان موجود ہے۔۔۔ کسی بڑے گھر میں شادی ہو
 جانے کے بعد وہ خود بخود اپنی ڈے داریوں کو دیکھنے لگ جائے گا۔“

”ہاں تو تمہاری ٹھیک ہے۔ جب وہ کسی بڑے گھر کا داماد بنے گا تو اور زیادہ مضبوط ہوگا۔ اس کی رسائی اور تک جلدی ہو جائے
 گی۔ پر میں کہتا ہوں وہ کچھ نہ کچھ تو ڈے داری کا احساس دلانے۔ ہمیں پتہ چلے کہ وہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے۔“
 ”وہ جو اس گھر میں ہماری بہو آئے گی نا وہ خود ہی اس کو ڈے داری کا احساس دلادے گی۔ رہے یہ کھیل تماشے۔۔۔ یہ تو خود
 بخود ختم ہو جائیں گے۔ آپ کیا تھے؟“ اس نے لبوں میں مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گیا، پھر مسکراتے ہوئے بولا
 ”ہاں! ہم کیا تھے۔۔۔ کیا زمانہ یاد دلادیا تم نے۔۔۔ خیر تم اپنے بیٹے کی پسند بھی پوچھ لینا۔۔۔ اگر وہ کسی کو پسند کرنا ہو تو۔۔۔“

”نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیٹا ہے وہ میرا۔“ یہ کہہ وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، پھر بولی، ”اچھا آئیں، ناشتہ لگا دیا ہے رانی نے۔“ یہ کہتے ہوئے بشری بیگم چلی ہے تو چوہدری جلال بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ انہی لمحوں میں چوہدری کبیر حویلی میں داخل ہوا۔ اسے یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ اس کے والدین اس کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکے ہیں۔

دو پہرے سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ چوہدری کبیر تیار ہو کر ڈیرے پر جانے کیسے نئے باہر نکلا تھا۔ وہ ڈرائیونگ روم میں آیا۔ جہاں چوہدری جلال اور ان کا وکیل جمیل اختر باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی اشارے سے سلام کر کے بیٹھ گیا۔ تبھی چوہدری جلال نے وکیل جمیل اختر سے پوچھا

”جی وکیل صاحب؟ کیا بنا پھر اس قتل کیس کا؟“

”ظاہر ہے جب اس امین آرائیں جیسے چشم دید گواہ کی گواہی نہیں ہوئی تو فیصلہ ہمارے حق میں ہونا تھا۔۔۔ سندھی نہ گواہ، لیکن ابھی کیس ختم تو نہیں ہوا۔ اندھا قتل ہے۔ فائلوں میں دفن کرتے کچھ وقت لگے گا“ وکیل جمیل اختر نے سکون سے یوں کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔

”ہم نے ایسے ہی تو آپ کو وکیل نہیں رکھا، آپ میرے اچھے دوست بھی ہیں۔ خیر یہ مقدمے بازی کی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“

شناختیں وکیل صاحب۔ انور پوری کی سیاست کیا کہہ رہی ہے۔ الیکشن بھی سر پر ہیں نا“ چوہدری جلال نے لطف لیتے ہوئے پوچھا

”انور پوری کی سیاست میں اب تھوڑی بہت الجھن ہونے کا امکان لگتا ہے۔ سنا ہے، ملک نعیم اس پار الیکشن نہیں لڑے گا۔ جبکہ اس کے لوگ خامسے متحرک ہو گئے ہیں۔“ وکیل جمیل اختر نے گہری سنجیدگی سے کہا

”مجھے نہیں لگتا وکیل صاحب کہ وہ اب الیکشن لڑے گا۔ اس میں اب دم ختم نہیں رہا۔ اس بار ایم این اے کی سیٹ پر بلہ مقابلہ کامیابی ہوگی۔ ہاں چھوٹی سیٹ پر کوئی سامنے آ جائے تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ آپ کوئی سیٹ اپ بنائیں چھوٹی سیٹ کے لئے۔“ اس نے دبے لفظوں میں اہاندا کا کہہ دیا۔

”یہ تو آپ پر منحصر ہے نا کہ آپ اب انور پور کو کتنا وقت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے لوگوں کو کام کاج سے غرض ہوتی ہے۔ لوگوں کے کام آ کر ہی سیٹ اپ بنایا جاسکتا ہے نا۔“ وکیل جمیل اختر نے صلاح دی

”لوگوں کا کام کیا ہے۔ تھنہ، پکھری یا پھر کوئی دفتر۔ اوہاں سب لوگ ہمارے ہی تو لگائے ہوئے ہیں۔۔۔ آپ ان سے کام لیں۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو۔۔۔ اس کا جادو کروادیں گے۔ ویسے بھی میری آئی جی پولیس سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے پوری طرح تھنہ دن کرنے کے لئے کہا ہے۔ آپ بس بے خوف ہو کر کام کریں۔ اس نے اُکٹائے ہوئے انداز میں کہا جیسے عوام کے بارے میں سن کر اسے اچھا نہ لگا ہو۔

”چوہدری صاحب! ہم تو پارٹی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن کوئی بندہ تو ہوسانے۔ مطلب، چھوٹی سیٹ کے مقابلے میں کوئی فرد تو ہونا چاہیے نا۔ جس کے لئے سارا سیٹ اپ بنانا ہوگا۔“ وکیل نے سمجھانے والے انداز میں کہا

”تو یہ ہے نا اچھا کبیر۔۔۔ اب انور پور کو وقت دے گا۔۔۔ آپ پورے اعتماد سے کام کریں۔ خاص طور پر نظر وہاں رکھنی ہے جہاں

حقائق کا مفاد ہو۔“ اس نے صاف انداز میں کبیر کا نام لے دیا۔

”میں سمجھ گیا چوہدری صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں۔“ وکیل جمیل اختر نے اتنی بحث کے بعد وہ نام اگلوایا۔

”بس۔ اگر نایہ ہے کہ کوئی بھی مخالف ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے سیاست میں آنے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھے۔“ اس نے اندر کی

خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا

”ایسا ہی ہوگا چوہدری صاحب۔۔۔ خیر اب اجازت دیں“ وکیل جمیل اختر نے خوش کن انداز میں کہا

”اؤ نہیں۔۔۔ نہیں، ابھی کہاں جائیں گے آپ۔ ابھی کھانا کھاتے ہیں پھر جائیے گا۔ ابھی باتیں کرتے ہیں۔“ چوہدری جلال

نے کہا تو چوہدری کبیر کھڑا ہوتے ہوئے بولا

”میں چلتا ہوں۔ ڈیرے پر کچھ کام ہیں۔“

”ٹھیک ہے“ چوہدری جلال نے کہا تو وہ لٹکا چڑا گیا۔



فہد کے گھر جعفر کو آئے ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر کے

خاموش ہو چکے تھے۔ ملازم دوسری بار چائے لے کر آیا تو جعفر چائے کا سپ لے کر خوشگوار لہجے میں کہا

”تمہارا یہ ملازم کھانا بہت اچھا بناتا ہے۔ یہ چائے یہ بھی بہت اچھی بنائی ہے اس نے۔ وہ پہلے والا ملازم بھی خیر ٹھیک

تھا۔ لیکن یہ زیادہ اچھا ہے۔“

فہد نے جعفر کی طرف متے ہوئے چہرے سے دیکھا اور پھر اکتائے ہوئے انداز میں بولا

تم بہت بول چکے ہو یا، اب مطلب کی بات کرو جعفر۔ تم مجھ سے کیا بات کرنے آئے ہو؟ صبح سے اب تک یونہی بولے چلے

جار ہے ہو۔“

اس پر جعفر نے اسے گھور کر دیکھا اور ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر خاموش رہا، پھر کہنے

لگا: ”پہلی بات یہ ہے فہد! کیا تم مازہ سے محبت کرتے ہو؟ اگر اس سے محبت کرتے ہو تو اس کی محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دیتے ہو؟“

”کچ پو پھوتا۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ میں اس سے محبت کرتا بھی ہوں یا نہیں۔“ فہد نے صاف لفظوں میں اعتراف کر لیا، جس پر

جعفر الجھٹے ہوئے بولا

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔ وہ تمہاری محبت کے سہارے نہانے بیٹھوں کے کتنے محل تعمیر کر چکی ہے۔۔۔ تمہیں پانے کی خاطر وہ دنیا سے

ٹھکر جانے کی ہمت رکھتی ہے اور تم۔۔۔ تمہیں اس کا احساس تک نہیں؟“

”احساس۔ اچھے کیا احساس کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔۔۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو جعفر اس کی بات کاٹ کر بولا

”لیکن یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اب تک کیا تم اس کے ساتھ محض وقت گزار رہے تھے۔ وہ صاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار تم سے کر چکی ہے اور تم اسے مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔ آخر کیوں فہد؟“

”میں اس سے کوئی حسی بات نہیں کر سکتا۔ شادی، وقت گزاری، محبت کا اظہار، ایسی فضول باتیں نہ کرو۔۔۔ میرے سامنے ایک بلی صراط ہے جعفر۔۔۔ اور مجھے وہ پار کرنا ہے۔ میں اس کی یا کسی کی محبت میں خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے کچھ اور کرنا ہے۔“ اس نے دہلی باز اپنے دل کی بات سے جعفر کو آگاہ کیا، جسے وہ نہ سمجھتے ہوئے بولا

”محبت کمزور نہیں ہوتی فہد۔ تمہیں جو کرنا ہے۔ وہ کرو۔ لیکن تم ایک کوئی سی لڑکی کے سچے جذبات کو یوں نظر انداز کر رہے ہو جیسے ان جذبات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں جعفر، محبت انسان میں وہ قوت بھردیتی ہے، جس سے وہ پوری دنیا کے ساتھ لڑ سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حدود پر کمزور بھی کر دیتی ہے۔ مقصد اور محبت میں کبھی نہیں بنی اور میں جو مقصد لئے جہاں پر کھڑا ہوں۔ وہاں سے میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا، اور نہ ہی کوئی سمجھو نہ کر سکتا ہوں۔“ اس کی یوں کہنے پر وہ چونک گیا۔ اس لئے تشویش بھرے لہجے میں بولا

”اس وقت جو میرے سامنے فہد بیٹھا ہے یہ وہ تو نہیں ہے جیسے میں جانتا ہوں۔ تم بدل گئے ہو۔ محبت، دوستی، تعلق۔ اب تمہارے لئے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ جان گیا ہوں۔ شاید اب تمہیں ہم جیسے دوستوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

”نہیں۔ تم بہت غلط سمجھے ہو جعفر۔ اچھے افسوس ہوں۔“ اس نے آرزو دہ لہجے میں شکوہ بھرے انداز میں کہا، پھر لمحہ بھر ٹھہر کے بولا، ”تم ایک ڈین۔ ایمان دار اور قابل پولیس آفیسر ہو۔ تم عام آدمی سے زیادہ بہتر حالات کا تجربہ کر سکتے ہو۔ آؤ۔! میں تمہیں ایک کہانی سناؤں۔ بالکل سچی کہانی۔ پھر میں تم سے ایک فیصلہ چاہوں گا۔۔۔“

”سچی کہانی۔۔۔ اور فیصلہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟“ جعفر نے حیرت سے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا تو فہد نے پرسکون لہجے میں کہا ”پہلے ایک کہانی سن لو۔ ایک چھوٹی سی کہانی۔۔۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ فہد نے کہا پھر کسی نامعلوم نکتے پر ٹکا ہوا جھاتے ہوئے کہتا چلا گیا۔ ”ایک گاؤں میں غریب والدین کا ایک بیٹا تھا۔۔۔ وہ کوئی اور نہیں، میں خود تھا۔۔۔ میرے باپ کا نام فرزند حسین تھا، میری ماں مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک غریب کسان کا بیٹا، مزدوری کے علاوہ کچھ کر سکتا تھا، مگر میرے ماں باپ نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہاں پر میرے استاد، شہزادین محمد ہوا کرتے تھے۔ میرا بہت خیال کرتے تھے۔ بہت اچھے دن گزار رہے تھے۔ اس شام میں گھر پر تھا“ یہ کہتے ہوئے وہ خیالوں میں کھو گیا

فہد بیل گاڑی سے چارہ اتار رہا تھا، ماں چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور باپ چار پانی پر بیٹھ ہے۔ اچانک فہد کی نگاہ گیٹ کی

طرف اٹھ گئی۔ چنانچہ میں ماسٹر دین محمد کڑا سکر رہا تھا۔ فہد نے چارہ وہیں پھینکا اور بھاگ کر اپنے استاد کی طرف گیا۔ جبکہ کرم سلام کیا اور حیرت سے بولا

”آئیے استاد جی۔! آپ اس وقت ہمارے گھر؟“

”ہاں ہجر۔! بات ہی ایسی ہے۔۔۔۔۔ آج تیرے باپ کے سامنے تجھے بتاؤں۔“ ماسٹر دین محمد نے خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں محن کی جانب بڑھے۔ تبھی فہد کا باپ فرزند حسین آگے بڑھ کر ماسٹر دین محمد کو عاجزی سے ملا

”آئیے ماسٹر صاحب۔! اور بیٹھیں۔۔۔۔۔“

اس دوران اس کی ماں بھی اپنا دوپٹہ سنبھالتی اٹھ کر وہیں ان کے پاس آگئی۔

”اسلام علیکم بھائی جی۔ اللہ خیر سکھ رکھے۔ آپ ہمارے گھر؟“ ماں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

”وہ علیکم سلام بہن۔! میں بتاتا ہوں تاکہ میں کیوں آیا ہوں۔۔۔ لے بھائی فرزند حسین۔! آج میں تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے

آیا ہوں۔۔۔۔۔ تیرے سامنے میں بھی سرخرو ہوا اور یہ فہد بھی۔“ ماسٹر دین محمد نے دب دے جوش سے کہا تو فرزند حسین نے یاد کرتے ہوئے کہا

”ہاں، مشر جی، میں نے فہد کو پانچویں جماعت کے بعد سکول سے اٹھا لیا تھا۔ میں غریب آدمی، اس کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا

تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تب سے یہ آپ ہی کا بیٹا ہے جی۔۔۔ یہ آپ کی مہربانی کہ اس کا خرچ آپ نے اپنے ذمے لے

لیا۔ مجھ پر بوجھ نہیں پڑا۔“

”بہت سارے غریب والدین اپنے بچوں کو سکول سے اٹھا لیتے ہیں اور انہیں کام پر لگا لیتے ہیں، خیر اب سنو۔! اس فہد نے

ہمارے اعتماد کا ہمیں کیا پھل دیا۔۔۔۔۔ اپنے فہد نے پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پورے علاقے کا سرخرو سے بلند کر دیا۔“

ماسٹر دین محمد نے انتہائی خوشی سے بتاتے ہوئے کہا تو فرزند حسین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چند لمحوں میں اس سے بولا ہی نہیں گیا،

اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا

”ہائیں۔۔۔۔۔!۔“

یہی حال اس کی ماں کا اور اس کا اپنا بھی تھا۔ ماں نے فرط محبت میں فہد کو گلے لگا لیا۔ جبکہ ماسٹر دین محمد فخر سے کہہ رہا تھا

”فرزند حسین کا بیٹا اور، ماسٹر دین محمد کا شاگرد، یہ فہد، پورے علاقے کے تمام لڑکوں سے آگے بڑھ گیا ہے۔“

اس پر ماں نے اپنا آؤٹل پھیلا کر نہایت عاجزی سے کہا

”ہم آپ کو دعا دینے کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتے ہیں ماسٹر دین محمد بھائی۔ مبارک باد کے حقدار تو آپ ہیں۔! اسے آپ نے اپنے

بیٹوں کی طرح رکھا۔ اس کا صلہ تو ہم نہیں دے سکتے۔ میرا رب ہی آپ کو صلہ دے گا۔“

”اب سنو میں سیدھا سکول سے کیوں یہاں آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے زکا اور پھر بولا، ”کل فہد نے اور مجھے نور پور چاہا ہے۔ بورڈ کے دفتر۔ وہاں نتیجے کا باقاعدہ اعلان ہوگا اور پوزیشن لینے والے بچوں کو انعام ملیں گے۔ اس لیے کل صبح جلدی تیار ہو جانا۔“ ماسٹر دین محمد نے آخری لفظ فہد کو دیکھتے ہوئے کہہ کر وہ مستعدی سے بولا

”جی استاد جی۔! میں تیار رہوں گا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں وہ سوہنے تانگے والے سے کہہ دوں گا۔ وہ ہمیں نور پور لے جائے گا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں۔۔۔۔۔ بہت تھک گیا ہوں۔ سکول سے سیدھا دھر آ گیا تھا۔“ ماسٹر دین محمد نے اٹھتے ہوئے کہا

”ماسٹر جی کچھ کھانی لیں۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ چمے چائے گا۔“ فرزند حسین نے کہا تو وہ بولا

”اوپر کھانی بھی لیں گے پھر کھیں، ابھی مجھے چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چل دیا۔ تبھی فہد نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا

”کے چوہدری کا کیا بنا استاد جی، وہ پاس تو ہو گیا ہے نا؟“

”اس کی قسمت پتر۔! اس نے نقل لگا کی تھی نا۔ وہ لیل ہو گیا ہے۔ بس تم صبح تیار رہنا۔“ ماسٹر دین محمد نے دیکھی۔ لہجے میں کہا اور پھاٹک پار کر گیا۔ فہد پلٹ کر تیل گاڑی سے چارہ اتارنے لگا تو اس کے باپ نے قریب آ کر بیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا

”بس بھئی، آج سے تمہارا یہ کام دھندہ ختم۔ اب ٹو صاحب بندہ بن گیا ہے۔ میں کرلوں گا یہ سب کچھ، ٹو جا۔“

وہ بہت خوش تھا، اتنا خوش کہ خوشی سنبھالنے نہیں سنبھل رہی تھی۔ رات کے تک وہ خوش کن خیالوں میں کھویا رہا۔ اس رات اس کے والدین نے اسے مٹی بھر کے پیار کیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح تیار ہو کر اپنے گھر کے پھاٹک کے باہر آن کھڑا ہوا۔ اسے اپنے استاد کا انتظار تھا، جو سوہنے تانگے والے کو لے کر آنے والے تھے۔ اسے تھوڑا سی انتظار کرنا پڑا۔ سوہنا اپنا تانگہ لے کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ماسٹر دین محمد اس میں سوار تھے۔ فہد اپنے گھر کے سامنے سے تانگے پر سوار ہوا۔ تانگہ گلیوں میں سے گزرتا ہوا گاؤں کی اس مکی سڑک پر آ گیا جو گاؤں سے باہر جاتی تھی۔ گاؤں کی صبح میں جو فطرتی آوازیں ہوتی ہیں اس دن وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھیں۔ تانگے کے چنے کی آواز، پرندوں کے چہچہانے کی آواز، ہوا کی سرسراہٹ، موسیقیوں کے گلے میں گھنٹیوں کی آواز سب بہت بھلا لگ رہا تھا۔

فہد اور ماسٹر دین محمد کے ساتھ سوہنا باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ تانگہ اپنی مخصوص رفتار سے اس مکی سڑک پر چلا چلا رہا تھا جو گاؤں سے باہر جاتی تھی۔ تبھی مکی سڑک کے درمیان کچھ فاصلے پر جیب کھڑی دیکھ کر سوہنے تانگے والے نے کہا

”اللہ خیر کرے۔! یہ چوہدری حلال کی جیب کیوں راستے میں کھڑی ہے صبح۔۔۔۔۔؟“

”ہوسکتا ہے خراب ہو گئی ہو۔ تم ذرا احتیاط سے تانگہ نکال بیٹا۔ کہیں ان پر دھول مٹی نہ پڑ جائے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سوہنے

تانگے والے بولا

”آپ فکر نہ کریں ماسٹر جی۔“

ڈراما میں جیب ان کے نزدیک آگئی۔ تبھی اس میں سے چھ آدمی نکلے۔ ان میں سے ایک آدمی نے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں لٹکارتے ہوئے اونچی آواز میں کہا

”اُوئے سوہنے..... تاکہ روک۔“

سوہنے نے جلدی سے تاکہ روک لیا تو، مسٹر دین محمد نے پوچھا

”کیا بات ہے پہلوان۔ تم نے تاکہ کیوں رکوا دیا؟“

اس پر وہ پہلوان نے انتہائی بدتمیزی سے کہا

”تم اور تمہارا شاگرد۔۔۔ فوراً پور نہیں جائیں گے۔۔۔ یہ چوہدری صاحب کا حکم ہے۔“

تبھی جیب میں بیٹھے ہوئے چوہدری جلال کے خشکیں چہرے پر پڑی، جس سے غصہ چمک رہا تھا۔ مسٹر دین محمد نے کسی حد تک بات سمجھتے ہوئے پوچھا

”کیوں؟“

”یہ تم اپنے ہیڈ ماسٹر سے پوچھتے رہنا۔ اب واپس مڑ جاؤ۔“ اس نے پھر بدتمیزی سے کہا تو مسٹر دین محمد نے سوچتے ہوئے قہقہے سے کہا

”بات سن پہلوان۔ اپنے چوہدری صاحب سے کہو۔ اپنے بیٹے کے قہقہے ہو جانے کا حصہ اس بے چارے غریب پر نہ اُتارے۔۔۔ لگا چوہدری محنت کرتا تو یقیناً پاس ہو جاتا۔ لیکن اُس نے نقل لگائی اور پکڑا گیا۔ جو کچھ کیا انتہائی عملے نے کیا۔ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اس بچے کا نہ ہیڈ ماسٹر کا۔“

”کہو اس نہیں کروادے ماسٹر تم نے صرف اس کچی کے بیٹے کو پوزیشن دمانے کے لئے یہ سب کیا۔ اگر لگا چوہدری پاس نہیں ہوا تو کھو علاقے کا کوئی لڑکا بھی پاس نہیں ہوا۔ خیریت اسی میں ہے کہ واپس چلا جا۔“

”میں کرتا ہوں چوہدری صاحب سے بات۔“ مسٹر دین محمد نے پھر قہقہے سے کہتے ہوئے تاکے سے اتر کر قریب کھڑی جیب میں چوہدری جلال کے پاس جا کر اکھساری سے کہا

”چوہدری صاحب۔! اس بچے نے محنت کی ہے۔ اس لئے تو یہ پوزیشن لے گیا۔ کچے چوہدری۔۔۔“ مسٹر دین محمد نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے انتہائی حقارت سے پہلوان کی طرف دیکھ کر بولا

”اُوئے پہلوان۔ اس ماسٹر سے کہو، ہم کی کمین لوگوں سے بات نہیں کرتے۔۔۔“

اس پر مسٹر دین محمد نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے لہجے میں تکبر تھا، پھر بھی وہ خود ہر قابو پاتے ہوئے بول

”ہم کی کمین ہی سمجھا چوہدری صاحب، تم اگر تاکہ رکھو گے تو کیا ہم پیدل نہیں جائیں گے۔۔۔ فوراً ہار نہ بھی جا سکے تو کیا اس کی

پوزیشن چھن جائے گی۔ سیدھا کیوں نہیں کہتے تم غریب بچوں سے بھی جلتے ہو۔ ہوش کرو چوہدری ہوش۔“

”اُوئے پہلوان۔ اس ماسٹر کی بک بک تو بند کرا۔ اب یہ پیدل بھی نور پور نہ جاسکیں۔ ڈوٹکے کے لوگ ہم سے مقابلہ کرتے ہیں۔“ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا تو فہد تڑپ اٹھا۔ وہ کسی خوف اور ڈر کے بغیر بولا

”چوہدری صاحب۔ میرے استاد جی کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ یہ اچھا نہیں ہے“

”بھونکتا ہے کتے کے پٹے“ چوہدری نے دھماکتے ہوئے کہا تو پہلوان سمیت چوہدری کے لوگ ان دونوں پر ہل پڑے ہیں۔ اسے تانگے سے کھینچ کر اتارا اور اسے مارنے لگے۔ استاد دین محمد ان کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ فہد اپنے استاد کو مار سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی کی طرف بڑھتا تو لوگ اسے کھینچ کر مارنے لگتے۔ ایسے میں استاد کی گھڑی پرے جا گری تو فہد کا دماغ ٹھکوم گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا پتھر آ گیا۔ اس نے قریب کھڑے آدمی کے سر پر مار دیا۔ اس آدمی کا سر پھٹ گیا۔ تبھی باقیوں نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر ایک درخت میں دے مارا۔ وہ بھول کے درخت سے ٹکرایا تو درود کی ایک شدید لہر اس کے بدن میں اٹھی، جسے وہ برداشت نہ کر پایا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

ماسٹر دین محمد اور فہد دونوں بے ہوش ہو گئے تھے۔ سوہنا تانگے والا ہونٹوں کی مانند انہیں دیکھتا رہا۔ چوہدری نے انتہائی حقارت اور نفرت سے انہیں زمین پر پڑے ہوئے دیکھا اور وہاں سے اپنے آدمیوں کے ساتھ گاؤں کی طرف چلا گیا۔ تبھی سوہنے تانگے والے نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بمشکل اٹھایا اور نور پور کے ہسپتال کی طرف تیزی بڑھتا چلا گیا۔

وہ دونوں ڈرائیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ چائے کے کپ میز پر دھرے ہوئے تھے۔ فہد نے ایک طویل سانس لی اور جعفر سے پوچھا

”اب بتاؤ جعفر! اتہمارا فیصلہ کیا ہے اس لڑکے فہد کے بارے میں۔ جس نے پوزیشن لی تھی مگر اپنا انعام نہ لے سکا، بلکہ زخم کھائے اور پھر دوبارہ کبھی گاؤں نہیں جاسکا۔ میرے والدین کو چوہدریوں نے بہت ذلیل کیا۔ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں گاؤں میں دکھائی دیا تو وہ مجھے مار دیں گے۔ میرے والدین نے مجھے گاؤں واپس نہیں جانے دیا تھا۔ میں نور پور میں اکیلا اور میرے ماں باپ گاؤں میں تھے۔ وہ بچارے پہلے ہی میرے بے تڑپ رہے تھے اوپر سے ان پر چوری کا الزام لگا دیا گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ جعفر نے تڑپ کر پوچھا تو وہ بولا

”ہونا کیا تھا، انہی بے غیرت چوہدریوں کی اپنی بٹائی ہوئی چٹاوت نے میرے باپ پر الزام ثابت کر دیا۔ چندا بیکرز زمین، جو ہماری روزی روٹی کا واحد ذریعہ تھی، انہوں نے جبین لی اور میرے والدین کو گاؤں سے نکال دیا۔ وہ نور پور آ گئے اور پھر یہیں فوت ہو گئے۔ میرے والدین کو یہی دکھ مار گیا کہ ان پر چوری کا الزام لگا۔ اور پھر قدرت مجھے پاپا کے پاس لے آئی۔“

”یعنی محمود سلیم صاحب کے پاس۔ کیسے... ان کے پاس کیسے؟“ جعفر نے تبس سے پوچھا

”میں اس دیو میں اکیلا ہو گیا تھا۔ اپنی محنت مزدوری بھی کرتا رہا اور پڑھتا بھی رہا۔ میں نے دسویں جماعت میں پوزیشن لی

تھی... ماسٹر دین محمد صاحب کے ایک دوست کی وجہ سے میں پڑھنے لگا تھا۔ میرے کالج کے پرنسپل نے مجھے پاپا سے ملوایا۔ انہوں نے مجھے بیٹا بنا لیا۔ کیونکہ ان کی کوئی اور ماؤ نہیں تھی۔ انہوں نے پرورش کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے میری راہنمائی کی۔ جیسے وہ تمہاری راہنمائی بھی کرتے ہیں۔“

”یوں تم کالج میں آگئے اور جب سے ہمارا ساتھ ہوا۔ سوری فہد! میں نے غلط سوچا لیکن، اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“ جعفر نے تیزی سے کہتے ہوئے پوچھا

”مجھے تو قرض چکانا ہے۔ اپنی ذات کا قرض۔“ اس نے یوں پرسکون انداز میں کہا جیسے طوفان آنے سے پہلے خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس پر جعفر چونک گیا، پھر دھیرے سے پوچھا

”کیسے... کیسے کرو گے؟“

”یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے زندگی میں اسی لئے اتنی جدوجہد کی ہے۔ میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی محبت تو کیا اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں۔“ اس نے پر یقین لہجے میں کہا

”تو کیا تم نے پولیس جوائن کرنے بعد نوکری اس لیے چھوڑ دی؟ اگر پولیس میں جوتے تو تم زیادہ اچھی طرح ان سے بدلہ لے سکتے تھے؟“ جعفر نے صلاح دیتے ہوئے کہا تو وہ مایوسی سے بولا

”تم بھی یہ کہہ رہے ہو جعفر؟ یہ میرے پیسے سے بددیانتی ہوتی اور میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ سرکاری ملازم ہوتا بھی اختیار رکھتا ہو۔ وہ بہر حال اپنے اختیارات میں محدود ہوتا ہے۔ اور میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا زور بازو آزمانا ہے کہ یہ میری ذات پر قرض ہے۔“

جعفر نے یوں دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، جیسے وہ کچھ کہتا چاہتا ہو لیکن کہہ نہیں پا رہا ہو۔ جب اچانک دونوں گلے لگ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے دکھ کا مدد کیا ہے۔



بے حال امین آرائیں اپنے ذریعے پر انتہائی خستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سلاخے کے قتل کا منظر گھوم رہا تھا۔ اس کے دماغ میں غصہ، جکولوں کی مانند اسے پاگل کئے دے رہا تھا۔ اسے وہ حقارت آمیز سلوک یاد آ رہا تھا جو آج ہی چوہدریوں کے پالتو خنڈوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اس پر شدید تشدد کیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کے ذریعے کے آس کرے کے فرش پر پڑا تھا، جہاں چوہدریوں نے اسے قید رکھا ہوا تھا۔ وہ زخمی تھا۔ ایسے میں دروازہ کھلا اور اس میں ماکھا نمودار ہوا۔

امین آرائیں نے اس کی جانب غصہ ناک انداز میں دیکھا تو وہ حقارت سے بولا

”جل اوئے اٹھ... بھگ یہاں سے...“

”تم اور تمہارے چوہدری نے جتنا تشدد مجھ پر کیا ہے۔ یہ تم لوگوں کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میں ...“ امین اراکین نے کہنا چاہا تو ماکھا بک آ میز انداز میں بولا

اؤے چل اوئے اٹھ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے۔۔۔ تیری قسمت اچھی ہے کہ ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں۔۔۔ اب تیری کوئی ضرورت نہیں رہی۔۔۔ تو جا۔۔۔“

”قانون اتنا بھی اندھا نہیں ہے۔۔۔ جتنا تم لوگوں نے مجھ رکھا ہے۔ آج بھلے ثبوت نہ ہو۔۔۔ مگر کل تم سب کو عدالت میں آنا پڑے گا۔“ امین اراکین نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا

”اؤئے زیادہ بک بک کر کے دماغ خراب نہ کر۔۔۔ ورنہ یہیں دفن کر دوں گا۔۔۔ تیری زندگی بخش رہے ہیں۔۔۔ تو شکر منا۔۔۔ ورنہ جس کیسے تو گواہی دیتا پھرتا ہے نا اس کی طرح منوں مٹی تلے چلا جائے گا۔ سیانہ سیانا۔۔۔ اور دوبارہ چوہدریوں کے خلاف سوچنا بھی مت۔ چل اٹھ۔ چل باہر نکل۔“ ماکھے نے کہا تو امین اراکین بولا

”بہت بچھتاؤ گے تم لوگ۔۔۔“

ماکھے نے یہ سنا تو غضب ناک ہو کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑوایا۔ امین اراکین نے ایک طرف گر گیا۔ پھر دوبارہ سر اٹھایا تو اس کے یوں سے خون بہہ رہا تھا۔

”اپنے آپ پر ترس کھا اوئے۔۔۔ یہ جو تیری حالت میں نے بنائی ہے نا۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تیری ساری ہڈیاں سلامت ہیں اب تک۔ تو شکر کر شکر۔ اور آرام سے اپنے گھر جا کر گرم ہو جا۔ ورنہ ٹوٹو نہیں۔۔۔ میرے گھر والے بے چارے بچھتا نہیں گے۔“ ماکھے نے دانت پیستے ہوئے کہا تو امین اراکین نے نفرت سے کہا

”ٹو چوہدریوں کی طاقت کے تل بوتے پر بھونک رہا ہے ماکھے۔ ورنہ تیرے جیسے بد معاش اس علاقے میں دیکھنے کو بھی نہ ملیں۔ ٹو اور تیرا چوہدری ہڈیاں توڑ سکتا ہے۔ گولی مار کر ختم بھی کر سکتا ہے۔ لیکن میرا ارادہ نہیں بدل سکتے تم لوگ۔۔۔ مارتا ہے تو ابھی مار دو۔۔۔ ورنہ کچھ لو کہ میں تمہاری موت ہوں۔“

یہ سن کے ماکھا غصے میں پاگل ہو گیا۔ یہ ایک طرح سے انہیں کھلی دھمکی تھی۔ انہوں نے جتنا بھی تشدد کیا تھا، وہ بے کار گیا تھا۔ وہ اس کا نہ ارادہ بدل سکے تھے اور نہ ہی اسے خوف زدہ کر پائے تھے۔ اس لئے وہ بھناتے ہوئے بولا

”دل تو کرتا ہے کہ ابھی ایک گولی تیرے پیچھے میں اتار دوں جس میں تیرا یہ ارادہ بیٹھا ہوا ہے۔۔۔ چل پھر۔۔۔ تجھے گولی، رہی دیتے ہیں۔۔۔ نہ تو رہے گا نہ تیرا ارادہ۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ریوالتور نکالا اور اس کی نال امین اراکین کی کنپٹی پر رکھ دی جو قطعاً خوف زدہ نہیں ہوا۔ تھی لڑیگر پرانگل رکھ کر ہنسنے ہوئے بولا۔ ”چل جا۔۔۔ جا کر جو کچھ تو نے کرتا ہے کر۔۔۔ اپنے دل کی حسرت چوہدری کر لے۔۔۔ گولی تو میں تجھے کبھی بھی مار سکتا ہوں۔“

ماکے نے بھراے کوئی بات نہیں کرنے دی۔ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھینٹے ہوئے باہر کی جانب لے گیا اور دھکارتے ہوئے ہر سڑک پر پھٹک دیا۔

امین آرائیں کو یہ یاد آیا تو اس نے اذیت کو برداشت نہ کرتے ہوئے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے بدن پر لگے زخموں کی اتنی اذیت نہیں ہوئی تھی، جتنا کسی کتے کی طرح ذلیل کرنے پر اس کا دماغ تپ رہا تھا۔ اسے اپنے وجود سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھا اور جوتے پہن کر چل دیا۔ اس نے ایک دم سے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

امین آرائیں سیدہ حاقمت نگر کی چوکی پر چلا گیا اور چوکی انچارج انسپکٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اسے گاؤں ہی کے دو لوگوں نے قہا ہوا تھا۔ اس کے زخم ابھی تک تازہ تھے۔ انسپکٹر اس کا بیان سن چکا تھا۔ اس لئے حیرت سے پوچھا

”اے ٹو پاگل ہو گیا ہے جو چوہدری کبیر اور چوہدری جلال کے خلاف پڑ چکوا نے آگیا ہے۔ اوجہ کوئی عمل کا علاج کر دے یہ نہیں ہو سکتا۔“

”انہوں نے مجھ پر تشدد کیا ہے۔ دیکھیں، انہوں نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ تین دن تک انہوں نے مجھے اپنے ڈیمے پر رکھ کر تشدد کیا اور تم ان کے خلاف پڑ چکے نہیں کاٹ رہے ہو۔“ امین آرائیں نے انتہائی غصے اور بے چارگی سے کہا تو انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے لا پرواہی سے بولا

”ہوگا، انہوں نے تم پر تشدد کیا ہوگا۔ تم نے کچھ کیا ہوگا تمہی تیرا یہ حال ہوا ہے نا۔“

”انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا سلائے کا، میں نے گواہی دینا چاہی تو انہوں نے مجھے عدالت جانے سے روکا۔۔۔ تاکہ میں گواہی نہ دے سکوں۔ یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ انہوں نے قتل کیا ہے۔ جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔“ امین آرائیں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولا

”اور تجھے بھی پتہ ہے کہ میں نے وہی کچھ کرنا ہے۔۔۔ جو چوہدری نے کہنا ہے۔۔۔ ام تو ان کے غلام ہیں، وہ جو کہیں گے، وہی ہوگا۔ میرا مشورہ مان۔۔۔ ٹو چپ کر کے اپنے گھر چلا جا۔۔۔ یہ جو زندگی کے چار سانس لئے بھرتا ہے نا۔۔۔ یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔۔۔ اور یہ جو تم نے چشم دید والی رٹ لگا رکھی ہے نا۔۔۔ اسے بھی بند کر دو۔ یہی تیری جان لے لے گی۔ جا چلا جا۔۔۔“

”تو پھر یہ تمہانے کس لئے چس؟۔۔۔ بند کر دانیس اور تم بھی جاؤ اپنے گھر۔۔۔ جب کسی بندے کی آواز ہی نہیں سنی جانی تو کیا فائدہ۔۔۔“ امین آرائیں نے طنز یہ لہجہ کہا تو انسپکٹر ہنس کر اٹھا

”بک بک بند کر اؤ۔۔۔ میں تیری آواز سن بھی ہوں تو کیا ہوگا؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تیری کئی کئی ایف آئی آر روری کی نوکری میں چلی جائے گی۔۔۔ خواجہ کاغذ کا لے کرنے کا فائدہ۔۔۔ ٹو جا۔۔۔ اور جا کر اپنا آپ سنبھال۔“

”انسپکٹر! میری ایف آئی آر لکھ لے۔“ امین آرائیں نے ضد کرتے ہوئے کہا

”کیا نکلوں! کیا ثبوت ہے تیرے پاس۔ تیری گواہی کون دے گا۔ کہیں ہیں تیرے ذمہ۔۔۔ مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“ انسپکٹر جیتے ہوئے بولا

”میں جب تھانے کے سامنے خود کو آگ لگا لوں گا تو۔۔۔ ذمہ نظر آ جائیں گے۔“ وہ دھماکتے ہوئے بولا تو انسپکٹر نے سر دھری سے کہا

”تم جو مرضی کرو۔۔۔ خود کو آگ لگا دو کنویں میں گر جاؤ۔۔۔ جہارا اب کرنا بھی فضول ہے۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ تم ہدایت جاؤ۔۔۔ وہاں سے پرچے کا حکم لے آؤ۔۔۔ جاؤ شاہاں۔۔۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔“

”میں نے پرچہ کھانا ہے انسپکٹر۔۔۔ میں تھانے کے باہر خود کو آگ لگا لوں گا۔۔۔ پھر کچھ نا کچھ تو ہوگا۔“ امین آرائیں نے حتمی لہجے میں کہا تو انسپکٹر نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا

”اچھا تو یہ بات ہے“ یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف ہانک لگا کر کہا ”اؤئے بشرے۔۔۔ اؤئے ڈال اؤئے اس کو اندر۔ اقدام خودکشی کے کیس میں۔۔۔ ذرا اسے چھ چلے۔۔۔ مرنا کسے کہتے ہیں۔۔۔ ڈال اسے حالات میں۔۔۔ اور پانی تک نہیں دینا اسے۔۔۔ مرنے ہے تو مر جائے۔۔۔“

اس کی آواز کی بازگشت میں ایک سپاہی نے آکر انسپکٹر کے حکم پر امین آرائیں کو جکڑ کر حالات کی طرف لے جانے لگا۔ اس کے ساتھ آئے دونوں بندے ہونٹوں کی طرح یہ ساری کارروائی دیکھتے رہے۔ بھی انسپکٹر نے انہیں گھور کر دیکھا اور وہاں سے چلے جانے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ تھانے سے باہر نکل گئے۔ انسپکٹر چند لمحوں اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر جڑی سے باہر چلا گیا۔ تھانے میں امین آرائیں کی جلیں گونجنے لگی تھیں۔



سلی میج سے مسلسل رو رہی تھی۔ ماسٹر دین محمد دالان میں بیٹھا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے چپ کرادے۔ وہ اسے کہہ کہہ کر تھک چکا تھا۔ اب بھی وہ سسک رہی تھی۔ بھی ماسٹر دین محمد نے انتہائی دکی لہجے میں کہا

”چپ کر جا پھر تو بتا دوئے گی، میرے اندر اتنے ہی ذمہ بننے چلے جائیں گے۔ میں نے اسی لئے تمہیں روکا تھا مگر تم۔۔۔“

”ہمارا قصور کیا ہے؟ یہ لوگ ہمیں جینے کیوں نہیں دے رہے ہیں۔“ سلی جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اس کے بچے میں گویا آگ تھی۔

بھی ماسٹر دین محمد نے بے چارگی سے کہا

”ہمارا قصور یہ ہے پھر کہ ہم غریب اور کمزور ہیں۔ وہ لوگ طاقت رکھتے ہیں۔ جو چاہیں کریں۔۔۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔“

”کیا ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں؟ کیا یہ جموٹ نہیں ہے؟ مجھے تو بالکل جموٹ لگتا ہے کہ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔۔۔ فلاں لکھا ہے کتابوں میں کہیں جائیں ہم، کس سے فریاد کریں، کس سے انصاف مانگیں؟“ سلی نے تڑپتے ہوئے کہا

”نہیں پتر۔ اس ملک کو بنانے کے لئے بڑی قربانیاں دی گئیں ہیں۔ اب یہ طاقت والے لوگ... عوام کو اپنی طاقت کے زور پر..... اپنا دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے بے بسی سے کہا

”کیوں... اباجی کیوں... کیا یہ طاقت والے سیاست دانوں کا زرخیز ملک ہے۔ ہم ان کے غلام ہیں... ان جاگیرداروں، دویروں کے دست نگر کیوں ہیں؟ ایسی کیا مجبوری ہے اس عوام کو... کہ یہی ان کی جگہ قربانیاں دیں... اور یہ لوگ حرے سے حکومت کریں... عوام پر اسی طرح ظلم کرتے رہیں؟ قربانی تو غریب ہی دیتا ہے۔ سستا لیس سے پہلے، سستا لیس میں اور اب سستا لیس کے بعد بھی۔“ سلسی نے بھی وہی سوال کر دیا جو اس ملک کا ہر بے بس شہری اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ اس پر ماسٹر دین محمد نے پر یقین لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا

”ایک دن آئے گا پتر، اس عوام کو شعور آئے گا۔ ان طاقت والوں سے وہ اپنا حق چھین لیں گے۔ آج ہمیں ظلم کا سامنا ہے تو کل یہی عوام حکومت کرے گی۔ طاقت عوام کے پاس ہوگی۔ کسی بڑے مقصد کے لیے قربانی تو دینا پڑتی ہے۔“

کب تک؟ اباجی کب تک؟ اور یہ قربانیاں جس غریب عوام نے دی ہیں۔ آج وہ ہماری طرح مجبور اور بے بس ہیں۔ نبی نے کتنی لڑکیاں مجبوری کی پٹلی میں نہیں رہی ہیں۔ ایک لڑکی ہوتا ہی ان کے لئے کتنا بڑا جرم بن چکا ہے۔ جو انہوں کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ مگر کچھ نہیں کر پار ہی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے سسک پڑی۔

”میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں پتر۔ بس میں کمزور ہوں۔ بوڑھا ہوں نا۔ ان سے لڑ نہیں سکتا ہوں۔ اتنا کر سکتا ہوں۔ اب انتظار چھوڑ کر۔ یہاں قسمت گری سے چلے جاتے ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے حتمی لہجے میں کہا

”ظلم نہیں تو ہم ہجرت کریں تو ہم کیا اس ظالم معاشرے کا انصاف بھی ہے۔ کیا غریب کی آواز کوئی نہیں سنتا؟“ سلسی نے بے بسی اور غصے میں پوچھا

”اوپر والا تو سنتا ہے نا۔ تو غم نہ کر۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ ماسٹر دین محمد نے پر یقین انداز سے کہا، پھر اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلسی نے بے چارگی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور روتے ہوئے اندر چلی گئی۔ ماسٹر دین محمد نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھ لیا۔

اسی دوپہ جب ماسٹر دین محمد نماز پڑھ کر مسجد سے آیا تو آتے ہی دالان والی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ سلسی کو اپنے ابا کی آمد کا احساس ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اپنے ابا کے لئے چائے لے کر آئی۔ ماسٹر دین محمد دالان میں بیٹھ ہوا خط لکھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ڈاک کا قند پڑا تھا۔ اسے سلسی کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنے باپ کو خط لکھنے میں محو نہ تھی۔ پھر قریب آ کر دھیرے سے بولی

”یہ لیس اباجی۔ چائے پی لیں۔“

ماسٹر دین محمد نے سنا اور پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا

”راہتر۔۔۔ ارکھو دے یہاں، میں ذرا یہ خط لکھ لوں، پھر چتا ہوں۔“

سہمی نے قریب پڑی تپائی پرچائے کی پیالی رکھتے ہوئے پوچھا

”اباجی۔۔۔ بہت عرصے بعد میں نے آپ کو خط لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ شاید چند برس پہلے۔ ہمارا تو کوئی ہے نہیں۔ آپ یہ خط

کسے لکھ رہے ہیں؟“

”ہمارا کوئی نہیں ہے، تمہاری یہ بات درست ہے بیٹی۔ اسی نے میں ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں، شاید ہمیں کوئی ٹھکانہ

میسر آ جائے۔ اس گھر سے باہر جو فضا ہے نا وہ ہمیں راس نہیں۔ زہر بھرا ہوا ہے اس میں۔“ ماسٹر دین محمد نے اچھائی دکھ سے کہا تو سلمی بولی

”میں جانتی ہوں اباجی۔۔۔ پر اس جس زدہ فضا میں کب تک ہمارا دم گھٹتا رہے گا۔ نہ سانس روک سکتے ہیں اور نہ ہی سانس لے

سکتے ہیں۔“

”دیکھو ہتر۔ ہم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ تو کر ہی لیا ہے۔ اب جانا تو ہے۔ لیکن ہم جائیں گے کہاں؟ بس اسی ہے یہ کوشش

کر رہا ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے سمجھتے ہوئے کہا

”جب سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں اباجی۔ کوئی ٹھکانہ، کوئی منزل تو ہوگی نا؟ یہ تو ام نے سوچا ہی نہیں ہے۔“ وہ ادا اس

ہوتے ہوئے بولی تو ماسٹر دین محمد نے حوصلہ افزا لہجے میں بتایا

”وہی تو، میں نے یہ سوچا ہے ہتر کہ جس پتے پر سے ہمیں جو مٹی آرڈر آتا ہے نا۔ وہیں پر میں یہ خط لکھ دوں۔ میں نے اس

میں اپنی ساری مجبوریاں لکھ دی ہیں۔“

”اباجی۔۔۔ پہلے بھی تو آپ نے اس پتے پر کئی خط لکھے ہیں۔ کسی کا جواب نہیں آیا۔ اس کا جواب کہاں سے آئے گا۔“ وہ مایوسانہ

انداز میں بولی

”مجھے نوجوانوں کیوں یقین ہے، اس بار اس خط کا جواب ضرور آئے گا۔ اور ہم یہاں سے بہت دور، لاہور چلے جائیں گے۔ جہاں

ان چودھریوں کا سایہ بھی ہم پر نہ پڑے۔“ ماسٹر دین محمد نے سوچتے ہوئے کہا

”آپ کا جویشن کیس ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟ اور یہ گھر، یہ کس کے حوالے کر کے جائیں گے۔ اتنا سامان کہاں جا کر رکھیں

گے۔“ سلمی نے تشویش سے پوچھا تو ماسٹر دین محمد نے حتیٰ لہجے میں کہا

”میرا ہتر۔ اس خط کا میں چند دن انتظار کروں گا۔ نہ آپ تو میں خود کوشش کروں گا۔ کسی نہ کسی شہر میں، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا نا

۔ باقی رہا جویشن کیس یا یہ گھر، یہ سب چھوڑنا ہو گا۔ ماضی کی ہر شے بھلا نا ہو گی۔ اب یہاں نہیں رہنا۔“

”ٹھیک ہے اباجی۔ اگر گھر بھی چھوڑنا پڑا تو چھوڑ دیں گے۔ میں کوئی نوکری کروں گی۔ بچوں کو جویشن پڑھائوں گی۔ کچھ کر لوں

گی۔ رزق تو اللہ پاک نے ہی دیا ہے۔ بس ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ سلمی نے مضبوط لہجے میں کہا

”شاباش میرے ہتر۔ ہم دونوں باپ بیٹی، کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ ماسٹر دین محمد نے کافی حد تک خوش ہوتے ہوئے یہ کہتے ہوئے پاس پڑا لٹا ہوا کراس میں خط ڈال دیا اور پھر اسے بند کر دیا۔ سبھی سلی نے پوچھا

”آپ اسے ابھی پوسٹ کر دیں گے؟“

”میں خود جاتا ہوں اسے پوسٹ کرنے۔ رحمت ڈاکیہ کا تو پتہ نہیں۔ اپنے گھر میں رکھ کر بھول جائے۔ تو اپنا خیال رکھنا۔ میں سر پہ سے پہلے شہر جانے والی ڈاک میں دے کر بی والہاں آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے ابھی۔ پر جلدی آ جائے گا۔“ اس نے کہا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ ماسٹر دین محمد چائے پیتے ہوئے سلی کے بارے سوچنے لگا۔ اس کی بیٹی ہی جب یہاں نہیں رہتا چاہتی تو پھر اسے یہاں سے چنے جانا چاہئے۔ اس کے جیتے جی یہاں عزت محفوظ نہیں، بلکہ وہ آنکھیں بند کر گیا تو اسکی بیٹی۔۔۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ اس نے جلدی سے پیالی خالی کی اور اٹھ کر چل دیا۔



نور پور تھانے کی حوالات میں امین اراکین پرانی سی ٹوٹی ہوئی چٹائی پر، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اسے خود پر تشدد ہونے کا اتنا دکھ نہیں تھا، جتنا اپنی ہچک اور ڈھیل ہو جانے کی جھین مار رہی تھی۔ ساری رات یونہی گزر گئی تھی۔ اس کے ذہن میں باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے رد کرنا کھجیے ٹنڈے کے طرز بھرے لفظ یہ دآ رہے تھے۔

”اڈے زیادہ بک بک نہ کر، ورنہ یہیں وٹن کر دوں گا۔ تیری زندگی بخش رہے ہیں تو شکر مٹا، ورنہ جس کیلئے تو گواہی دیتا پھرتا ہے تا اس کی طرح منوں مٹی تلے چلا جائے گا۔ سیانا بن سیانا اور دوبارہ چوہدریوں کے خلاف سوچنا بھی مت چل اٹھ، چل باہر نکل۔“ یہ لفظ اور یہ ہچک آمیز لہجہ اس کے دماغ میں تجھڑکی مانند پیوست ہو گیا تھا اور جیسے اس زخم سے خون بہہ رہا ہو۔ اس پر انسپکٹر کے لفظ نمک بن کر اس اذیت کو حریہ بدھا رہے تھے۔

”بک بک بند کر آؤ، میں تیری آواز سن بھی لوں تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تیری کئی کتنائی ایف آئی آر رودی کی لو کر ہی میں چلی جائے گی۔۔۔ خواتوا کا خذ کالے کرنے کا فائدہ۔ ٹو جا اور جا کر اپنا آپ سنبھال۔“

امین اراکین نے بے قابو ہو کر اپنے سر کو پکڑا، تا کہ اس کی وحشت کم ہو سکے۔ کبھی حوالات سے باہر ہونے والی آہٹ پر اس نے چونک کر دیکھا تو اپنے بڑے بھائی سراج کو سلاخوں کے پار کھڑے ہوئے پایا۔ وہ دکھ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ امین اراکین اٹھ اور اس کے قریب چلا گیا۔ جب سراج نے بھرائی ہو آواز میں کہا

”یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ چار دن ہو گئے، میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ آج پتہ چلا ہے کہ تم حوالات میں ہو۔ ایسا کیوں کیا تم نے، پورا گاؤں خاموش ہے تو پھر تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنی جان پر عذاب بنا لو۔“

”بھائی۔ آج تمہیں پتہ ہے سلا ما میرا دوست تھا، جسے انہوں نے مارا۔ وہ بھی میرے سامنے، شرم آتی ہے مجھے۔ میرا ضمیر مجھے

علامت کرتا ہے۔“ اس نے غصے میں کہا تو سراج اسے سمجھتے ہوئے بولا

”تو میرا بھائی ہے، تیرے جسم پر لگنے والا زخم، میرے دل پر لگا ہے۔ میں تیرے جذبات سمجھتا ہوں، چوہدریوں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم یوں خودکشی کرنے لگ جاؤ۔ کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔“

”بھائی!۔ چوہدری جتنا مرضی ظلم کر لیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کیا ہم ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ اپنے بھائی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا تو سراج نے کہا

”کیوں نہیں کر سکتے۔ میں آگیا ہوں نا۔ اب دیکھ لیں گے۔ تم حوصلہ کرو۔ آج وقت ان کا ساتھ دے رہا۔ ایسا ہمیشہ تو نہیں رہے گا۔“

”یہ جھوٹی قسمیں ہیں، میں نے تمہارا کچھری۔ سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنی جڑیں بہت مضبوط کر چکے ہیں۔ وہ قتل بھی کر دیں۔ تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اور میں حق سچ کی گواہی بھی نہیں دے سکا۔ مان لیں کہ ہم بے بس ہیں۔“ اس پار اس کے لہجہ میں غصے کے ساتھ احتجاج بھی تھا تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا

”نہیں۔ ہم انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میں اگر یہاں ہوتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ میں اسی لیے شہر سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آگیا ہوں۔“

”تو نے شہر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ یہاں تو بے بسی کے ساتھ جینا ہے یا پھر ان کے ساتھ سیدھے سیدھے دشمنی کرنا ہوگی۔ میرے دل میں تو ان کے خلاف نفرت ہی بہت ہے۔ پر مجھے اپنی نفرت کے اظہار کا راستہ تو ملے۔ کیا کروں میں۔“ وہ بے بسی سے بولا

”تم فی الحال کچھ نہیں کرو۔ تمہاری وجہ سے سارے گمراہے پریشان ہیں۔ تو صبر کر میرے بھائی۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اب تو نے تمہارا ر کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنی۔ میں صبح ہی کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔“

یہ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی نے سراج سے کہا

”اُونے جلدی کر سراج۔۔۔ صاحب آنے والا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بھائی جو تمہاری مرضی، جیسے تم چاہو۔“ امین اراکین نے اپنے بھائی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اداس مچھلی ہوئی تھی۔

”میں جلدی تمہیں یہاں سے نکالوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو فکر نہ کرو۔“ سراج اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا اور پھر پلٹ کر باہر کی طرف چل دیا۔ امین اراکین اسے حسرت سے جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر زمین پر پٹھیں ہوئی صف پر آن بیٹھا۔ وہ اپنے بوز سے ماں باپ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے کچھ کچھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس غصہ ہی اتنا تھا۔ وہ خود پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

زید وہ وقت نہیں گزرا تھا کہ تمہارا تھانے میں آگیا۔ وہ سیدھا حالات کی طرف گیا اور پھر امین اراکین کے سامنے جا کھڑا

ہوا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر کھانے والے انداز میں بول

”ٹو ساری رات ادھر کھانے میں پڑا رہا ہے۔ کوئی تپے پوچھنے نہیں آیا۔ وہ بھی نہیں آئے جن کا بندہ قتل ہوا تھا اور جن کے لئے تو نے گواہی دینے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگائی ہوئی ہے۔ بول کوئی آیا ہے تیرے پیچھے؟“

اس پرامن اراکین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”کوئی آیا ہے یا نہیں، تو بول کیا کہنا چاہتا ہے۔“

”مصل سے کام لے اور اپنی زندگی کے باقی دن سکون سے گزار، تو چودہریوں کے ساتھ بھڑا نہیں لے سکتا۔ بندہ بن اور اپنا کام

کر۔ ذات کی کوڑھ کرئی، جھمیروں کو جیسے۔“ اس نے حقارت سے کہا

”ہاں تو نے دارجی، میں نے رات بہت سوچا ہے، اس اندھیر مگرمی میں کیا ہو سکتا ہے، جنگل ہے یہ جنگل۔ یہاں درندے بستے

ہیں۔ اور ٹو بھی انہی میں سے ایک ہے۔ میری ایف آئی آر لکھ۔۔۔ ورنہ مجھے مار دے۔ میں اس کے بغیر نہیں جانے والا۔“

”اوئے تو نہیں سمجھ گاہ، ہمارا وقت نہ رہا، ذکر، سمجھ جا۔ اور جا اپنے گھر، ایف آئی آر تو درج نہیں ہوتی۔ بھول جا۔“ تھانیدار نے کہا

تو امین آراکین بھنائے ہوئے لہجے میں بولا

”میری بھی خند ہے، مار دو۔“

”اڈے بشیرے اس کا دماغ خراب ہے اب تک۔ لگتا ہے رات تو نے اس کا دماغ صحیح طرح سے ٹھیک نہیں کیا۔ اسے کوئی

دوسری خوراک دے۔ جب تک یہ خود باہر جانے کے لیے نہ کہے، اسے اندر ہی رکھ۔“ تھانیدار کے یوں کہنے پرامن اراکین نے اس کی

طرف دیکھا۔ تھانیدار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا جب سے فون نکال کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔



حویلی کے چورچ میں ہنگی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر لان میں بھی ہوئی کرسیوں پہ چوہدری جلال اور چوہدری

کبیر دونوں ہاپ بیٹا بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ وہ ساری ہاتھیں گاؤں اور زمینوں کے بارے میں تھیں۔ چھٹی اچانک چوہدری جلال

نے مسکراتے ہوئے کہا

”کبیر! کیا خیال ہے تمہارا یا ر۔ کیا، اس واقعہ تمہیں انکیشن نہ لڑا دے؟“

باپ کے اس طرح پوچھنے پر اس نے کسی بھی رد عمل کا اظہار کئے بغیر کہا

”میرا کیا خیال ہونا ہے بابا۔۔۔ آپ جو کہیں گے۔۔۔ میں تو ویسا ہی کروں گا۔“

”بات یہ ہے پتر۔۔۔ وہ ہے نالک فہم، سیدھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ بڑا ہی بیباک بندہ ہے۔ لیکن سیاست میں شریف بندوں کا

بھلا کیا کام۔ وہ تو نے کچھری کی سیاست نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا تو زبھی تو کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس بار بھی وہ اپنے پر پرزے لکالے،

اس کے پڑکات دینے ہوں گے۔ دوبارہ انکیشن ہارنے کے بعد شاید اب وہ کبھی ہمت نہ کرے۔ خیر۔ اودہ سب تو میں دیکھ لوں گا۔ تم اپنا ذہن بناؤ۔ انکیشن تو سر پر آگئے ہیں سمجھو۔“ چوہدری جلال نے بڑے غصہ سے ہونے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ عام سے اعزاز میں بولا۔
 ”میرے ذہن کا کیا ہے بابا۔ آپ تو پھر بھی نرمی سے کام لے لیتے ہیں۔ پر مجھ سے نہیں ہوگا یہ۔ بھلا میں ان کی کینوں سے دوٹ ماگوں۔“

”اوتے تم نے کونسا مانگتے ہیں دوٹ، یہ جو ہم نے لوگ پالے ہوئے ہیں، یہ تموڑے ہیں اور انھی۔“
 وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے قریب کھڑے منشی کو دیکھا، جو اس کی توجہ کے لئے منتظر تھا، توجہ پا کر منشی فضل دین اس کے قریب ہو گیا۔ چوہدری جلال نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا
 ”منشی۔ کیا بات ہے؟“

”وہ جی۔ امین آرائیں ہے نا، وہی جسے گلے چوہدری نے۔“ منشی کہتے کہتے رک گیا تو چوہدری کبیر نے اکتا حہ ہوئے کہا
 ”ہاں ہاں آگے بول۔۔۔“
 ”وہ تھانے میں کل سے بیٹھا ہے اور گلے چوہدری کے خلاف ایف آئی آر لکھوانا چاہتا ہے۔ تھانے کے باہر بیٹھ کر خود کو آگ لگا لینے کی دھمکیاں دے چکا ہے۔“ منشی نے جیڑی سے کہا تو چوہدری جلال نے پوچھا
 ”تمہیں کس نے بتایا۔“

”ایس ایچ او کا فون آیا ہے۔“ اس کے بتانے پر چوہدری کبیر غصے میں بھناتے ہوئے اٹھا۔
 ”اس کی یہ جرات، میں اسے ابھی تھانے ہی سے اٹھا لیتا ہوں۔“
 تبھی چوہدری جلال نے بڑے قہقہے سے کہا
 ”کبیر۔ ارکو اور بیٹھ جاؤ۔“

کبیر نے حیرت سے اپنے باپ کی دیکھا اور پوچھا
 ”کیوں بابا۔ امیں تو کسی کو اپنے خلاف سوچنے کی اجازت بھی نہیں دیتا اور اس نے یہ جرات کر لی کہ ہمارے خلاف جا کر ایف آئی آر لکھوائے۔ اچھا ہوتا میں اسے وہیں ڈیرے پر ختم کر دیتا۔“
 ”اتنے جذباتی نہیں ہوتے بیٹا۔! ادھر آؤ، بیٹھو میرے پاس۔“

چوہدری جلال نے اس قہقہے سے کہا تو کبیر چند لمحے سوچتا رہا اور پھر بیٹھ گیا۔ چوہدری جلال نے منشی کی جانب دیکھ کر کہا
 ”اودھا منشی۔! جا کر امیں ایچ او کو فون کرادو اسے سمجھا دے کہ اس امین آرائیں کو تھانے میں رکھ کر اسے اچھی طرح سمجھا دے۔ تاکہ بعد میں اسے سوچنے کی بھی جرات نہ ہو۔“

”جی چوہدری صاحب۔! میں ابھی کہہ دیتا ہوں۔“ منشی مودب ہو کر بولا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد چوہدری جلال نے اپنے بیٹے کبیر کو سمجھاتے ہوئے کہا

”اوپر جو کام ہمارے ملازمین کر سکتے ہیں، ان کے لیے خود پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جمل قوانین جاکر آرام کر۔“

یہ کہہ کر وہ سوپنے لگا لیکن چوہدری کبیر چند لمبے خود پر قابو پا کر اٹھتے ہوئے بولا

”مجھے ڈیرے پر جانا ہے بابا۔“

یہ کہہ کر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا پورچ کی طرف چل دیا۔ وہ سارے راستے اپنے باپ کی بات ہی سوچتا گیا۔ اس میں بھی مصمت تھی۔ اس کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے اثرات ڈیرے پر پہنچ جانے تک ہی تھے۔ اس نے اپنی فورڈ ٹیل جیب روکی اور مگن عبور کر کے ڈیمے کے کاریلڈر میں آ گیا۔ اس کی نگاہ مگن میں ایک طرف بندھے کتوں پر پڑی ہے۔ وہ انہیں دیکھنے کے لیے اس طرف بڑھ گیا۔ ایک جگہ رُک کر اس نے ایک کتے کو دیکھا۔ تبھی اس کا چہرہ غصے میں بگڑ گیا، اس نے کتے کو غور سے دیکھتے ہوئے قریب کھڑے ماکھے سے پوچھا

”اُوئے ماکھے۔! یہی وہ کتا ہے نا۔ جو مقابلے میں ہار گیا تھا۔“

”جی چوہدری جی، یہی ہے۔ وہ دراصل میں۔“ ماکھے نے مودب انداز میں وجہ بتانا چاہی تو وہ غصے میں بولا

”اسے لے جاؤ اور جا کر گولی مار دو، ہارنے والا یہ کتا، میرے ڈیرے پر نہیں ہونا چاہئے۔“

اس نے جیسے ہی حکم دیا، ایک ملازم فوراً آگے بڑھا اور جلدی سے اس کتے کو کھول کر باہر کی جانب لے گیا۔ کبیر چلتا ہوا کاریلڈر

میں پڑے ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ تبھی ماکھا اس کے قریب جا کر بولا

”بہت قیمتی اور نسلی کتا تھا جی۔ وڈے چوہدری صاحب نے بڑی قیمت دے کر منگوا لیا تھا۔“

”لیکن اب یہ قیمتی نہیں رہا۔ مجھے ہار جانے والوں سے سخت نفرت ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ لمبے خود پر قابو پاتے ہوئے

خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک مسکراتے ہوئے پوچھا، ”اُوئے ماکھے۔! تیرے ذمے کام لگایا تھا۔ کیا بنا پھر سٹھی کی نوکری کا؟“

”آپ کی خواہش نہ ہو اور وہ نوکری لگ جائے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ پر یہی بات تو یہ ہے، چوہدری صاحب۔! وہ نور پور گئی ہی

نہیں اور ندی پھر اس کے بعد گھر سے نکلے۔“ ماکھے نے خوشامبرے لہجے میں خوش ہوتے ہوئے بتایا تو وہ تھوہہ لگاتے ہوئے بولا

”اچھا۔! تو اب وہ اپنے ہی گھر میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈرگئی ہے۔“

”جی چوہدری صاحب۔! اب وہ باہر نہیں نکلتی، پر آپ اسے اتنی سزا کیوں دے رہے ہیں۔ وہ تو۔۔۔“ ماکھے نے کہنا چاہا مگر

جان بوجھ کر کہتے ہوئے رُک گیا تو چوہدری کبیر نے اپنے لہجے میں پیار سمیٹتے ہوئے کہا

”اُوئے نہیں اُوئے۔! سزا نہیں ہے۔ یہ۔ میں اُسے سزا دے ہی نہیں سکتا۔ میں تو اُسے ساری دنیا سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر

وہ میری بات سمجھتی ہی نہیں ہے۔“

”سمجھ جائے گی چوہدری جی۔ سمجھ جائے گی۔ جب آپ اس کا خیال رکھیں گے۔“ ماکھے نے کہا

”خیال ہی تو رکھتا ہوں اس کا، بجال ہے کوئی میلی آنکھ اس کی طرف اٹھ جائے۔ میں وہ آنکھیں ہی نہ نکال لوں۔“ چوہدری کبیر

نے خیالوں ہی خیالوں میں سلسلی کا سراپا دیکھتے ہوئے کہا

”یوں کہیں نا چوہدری جی۔ آپ کو اس سے پیار ہو گیا ہے۔“ ماکھے نے کسی حد تک مذاق میں کہا تو ایک دم سے سنجیدہ ہوتے

ہوئے بولا

”میں نہیں جانتا کہ یہ پیار ہے یا کیا ہے۔ بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ پورے علاقے میں اس جیسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اسے خود

فہم معلوم کہ وہ کیا شے ہے۔“

”ہر جو سلوک آپ اُن سے کرتے ہیں۔ اس کی سمجھ نہیں آتی۔ اس طرح تو اس کے ذہن میں آپ کے نئے میں نفرت بڑھے

گی۔“ ماکھے نے تشویش سے کہا

”اوئے، بھانگی ہوئی ہرنی کے شکار کا اپنا ہی حزمہ ہوتا ہے۔ کہاں جائے گی وہ۔ اس کا باپ، ماسٹر دین محمد اپنی آخری

سانسوں پر ہے۔ وہ مر گیا تو سسلی کو جو ملی ہی نے پناہ دینی ہے۔ ہرنی خود ہی جل کر میرے پاس آ جائے گی۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے اور

رضی اس کی نفرت، تو کیا ہوا۔ تعلق تو ہے نا۔ چاہے نفرت کا ہی ہے۔“ چوہدری کبیر نے پھر سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ماکھا پھر خوشامدی

انداز میں بولا

”آپ کی باتیں تو آپ ہی جانتیں۔۔۔۔۔۔“

”تو صرف اتنا جان لے کہ اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے۔“ چوہدری کبیر نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا تو ماکھا مودب

انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا

”جیسے عزم چوہدری جی۔“

یہ سن کر چوہدری کبیر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے خیالوں میں کھو گیا۔ ایک گہری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رنگ گئی تھی۔



سورج مغربی افق میں جا چھپا تھا۔ شہر بھر کی روشنیاں جھگڑا ہٹی تھیں۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ فہد اپنے لان میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا

تھا۔ پورج میں ڈرائیور کب کی گاڑی کھڑی کر کے جا چکا تھا۔ وہ باہر جانے کے لئے تیار تھا۔ اس شام فہد نے خود مائزہ کو ڈنر پر بلا دیا تھا۔ وہ

اپنے آپ میں ہمت جمع کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مائزہ کو سب کچھ بتا دے یا پھر سب کچھ چھپا لے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید

پیارے لوگوں کے لئے کوئی جذباتی فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ جبکہ کچھ دیر پہلے ایک بہت بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے لمحہ بھی

نہیں لگایا تھا۔

دو پہر کے بعد جعفر سیدھا اس کے پاس آیا تھا۔ لٹچ کے بعد جب وہ چائے پی رہے تھے کہ اچانک جعفر نے پوچھا
 ”تو پھر کیا سوچا تم نے؟“

”وہی جو تم جانتے ہو۔“ فہد نے حسی انداز میں جواب دیا

”دیکھو! تمہارا مستقبل یہیں ہے۔ تمہاری تعلیم مکمل ہے۔ ٹھیک ہے تم نے نوکری نہیں کی۔ لیکن میرے پاپا ایک بہترین بزنس کی
 شروعات کر چکے ہیں۔ جو تمہیں ہر طرح کی معاشی فکر سے آزاد کر دے گا۔ ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“ جعفر نے سمجھاتے ہوئے
 کہا تو فہد نے اس کی طرف دیکھا اور دھیمے سے لہجے میں کہا

”یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ پاپا نے اتنا کچھ میرے نام کر دیا ہے کہ معاش میرا مسئلہ نہیں ہے۔“

”لیکن جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو اور جیسا تم نے سوچا ہے۔ ایسا فقط فلموں، ڈراموں یا پھر قصبے کہانیوں ہی میں اچھا لگتا ہے۔
 حقیقی زندگی میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ حیرت ہے تم جیسا بندہ اتنا غیر حقیقی فیصلہ کرے گا۔“ جعفر نے دبے دبے غصے میں کہا۔ اسے دکھ یہ تھا
 کہ وہ اس کی بات کیوں نہیں مان رہا ہے۔

”میں تو فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے پختہ لہجے میں کہا

”فہد! میرے دوست۔ ماضی کو دفن کر کے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ تمہارے ساتھ جو ہوا۔ اس نے تمہاری آدمی زندگی نگل لی
 ہے۔ اب انتقام لینے کے چکر میں باقی زندگی بھی خراب کر لو گے۔“ جعفر نے خود پر قابو پاتے ہوئے رसान سے سمجھا یا اس پر فہد نے
 مسکراتے ہوئے کہا

”مجھے حوصلہ دینے کی بجائے، بزدلی کی باتیں مت کرو۔ میرے اس فیصلے میں میری آدمی سے زیادہ زندگی خرچ ہو گئی ہے۔ اب
 جبکہ عمل کا وقت آ گیا ہے، تو مجھے ہر حال میں جانا ہے۔ اب تو پاپا نے بھی اجازت دے دی ہے۔ میں رک نہیں سکتا۔“ اس نے حسی انداز
 میں کہہ دیا

”چاہے تمہاری جان ملی جائے۔ وہاں تمہیں بے دردی سے قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیا تم نے سوچا ہے کہ دشمنوں کے چنگل میں
 پہنچ کر کیلے کیا کرو گے؟“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے انداز میں کہا

”وہ بندہ جو ایک ہی زندگی میں نجانے کتنی بار مر مر کے زندہ ہوا ہو۔ اس کے نزدیک ایک موت کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔“ فہد
 نے مسکراتے ہوئے کہا تو جعفر جلدی سے بولا

”تم نے بہت کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تم میں کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا تم انہیں گنوا دو۔“
 ”یہ سہولیات سے بھری زندگی۔ یہ ساری کامیابیاں بھی میرے بے اہمیت نہیں رکھتیں۔ میں مردہ اور بے ضمیر لوگوں جیسی زندگی نہیں
 گزار سکتا۔ میں تو اصل زندگی کی طرف جا رہا ہوں اور تم مجھے مفاد کے مردہ خانے کی سرد کوٹھڑی میں دھکیل رہے ہو۔“ فہد نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”اور مائرہ کی محبت۔ اوہ تمہیں کتنا چاہتی ہے وہ جہاں کہے گی اس کے والدین راضی ہوں گے اور انہیں اطمینان ہوگا کہ مائرہ تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔ پھر بھی تم۔“ اس نے کہا جانا تو فہد اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”یہ فہد مائرہ کی اپنی سوچ ہے، محض خوش فہمی۔ اس کے والدین کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میں اس کی محبت کو دل سے محسوس کرتا ہوں۔ میں نے اسے ہمیشہ اچھا دوست سمجھا ہے اور بس۔“

”تمہیں ذرا پروا نہیں۔ وہ تمہارے بارے میں کیا جذبات رکھتی ہے۔ وہ کیا سوچتی ہے۔“ اس نے طنز پر لہجے میں کہا۔
 ”اب میں اس کے سوچنے پر پابندی تو نہیں لگا سکتا۔ اور یار۔ کیا محبت کی زنجیر سے کسی کو باندھا جاسکتا ہے؟ خیر تم مائرہ کا بہت خیال رکھنا۔ تم دونوں مجھے بہت یاد آؤ گے۔“ اس نے حقیقی لہجے میں کہا تو جعفر مذاق اڑانے والے لہجہ میں بولا۔
 ”ایسی بات بھی نہیں ہے کہ ہم تمہارے بغیر جی نہیں پائیں گے۔ تم بہر حال اپنے فیصلے پر قہوڑا خریدو غور کرو۔ ہم پھر اس پر بات کر لیں گے۔“

اس نے کہا تو فہد اس کی طرف چند لمحوں دیکھا رہا، پھر بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنی سائڈ ٹیبل کے دروازے ایک خط لکالا اور واپس آ کر وہ خط جعفر کو دیتے ہوئے بولا۔
 ”آج دوپہر کے وقت ڈاک کیا یہ خط دے گیا تھا۔ تم اسے پڑھو، اور اسے پڑھنے کے بعد خود فیصلہ کرو کہ مجھے قسمت مگر جانا چاہیے یا نہیں، لو پڑھو اسے۔“

”خط۔ اکہاں سے آیا ہے۔“ جعفر نے خط پکڑتے ہوئے پوچھا۔ مگر فہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے خط لکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ وہ غور سے پڑھتا رہا، پھر یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی بڑے دکھ کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے سوتے ہوئے پھر سے کے ساتھ وہ خط لوٹا دیا۔ جی فہد نے کہا۔

”فیصلے کی گھڑی آئی جی جعفر، اب مجھے ہی جانا ہوگا۔ اب سوچنے کی گنجائش نہیں۔“
 شاید۔ اتم ٹھیک کہتے ہو۔ ”یہ کہہ کر وہ فہد کی پرواہ کئے بغیر اٹھ کر باہر نکلا چلا گیا۔ جعفر کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس وقت لان میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ مائرہ کو کس طرح بتانے کہ اس کا قسمت مگر جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ حالانکہ کل شام ہی وہ دونوں بہت دیر تک پارک میں بیٹھے رہے تھے۔ کل مائرہ نے اسے بلایا تھا۔ فہد پارک چلا گیا تھا اور مائرہ اپنے جینز سے سیدھے وہاں آگئی تھی۔ دونوں پارک میں ٹہلتے ہوئے ہاتھیں کرتے رہے تھے۔ وہ بھی اسے سمجھانا چاہتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کچھ دیر باتوں کے دوران مائرہ ہی نے بات کا آغاز کیا تھا۔

”فہد۔ بسا اوقات زندگی کے فیصلے کرتے ہوئے کتنی الجھن ہوتی ہے نا۔“
 ”کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی ہو تم؟“ فہد نے عام سے لہجے میں پوچھا تو، مائرہ نے کہا۔

”ہاں۔ ایک ایسا فیصلہ۔ جس کا تمام تر دار و مدار تھمارے فیصلے پر ہے، جس کا اظہار تم کر ہی نہیں رہے ہو۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پھر پوچھا

”نہد۔ میری ماما نے میری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے لڑکا بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ کینیڈا میں رہتا ہے اور تم اپنے

مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے ہو۔“ وہ سنجیدہ انداز میں بولی

”مستقبل کس نے دیکھا ہے، مائرہ۔ کل کیا ہونے والا ہے۔ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ وہ ہر سکون لہجے میں بولا

”لیکن وہ پلاننگ جو آج کی ہو، اسی پر ہی تو مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی

”مائرہ میں اپنے مستقبل کی پلاننگ کر ہی نہیں سکتا۔“ اس نے اپنی پرواہی کے انداز میں کہا تو مائرہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی

”کیوں نہیں کر سکتے۔ تمہاری یہی باتیں تو مجھے ابھا کر رکھ دیتی ہیں۔ میں نے اپنی ماما سے محض چند دن سوچنے کے لئے مانگے

ہیں اور تم ہو کہ میرے جذبات کو سرے سے نظر انداز کرتے چلے جا رہے ہو۔“

”مجھے تمہارے جذبات کا احترام ہے مائرہ۔ اتم میرے لئے بہت قیمتی ہو، لیکن شاید تم، میرے مستقبل کی پلاننگ میں نہیں ہو۔“

اس نے دھیمے لہجے میں صاف کہہ دیا تو مائرہ نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا

”یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں تمہیں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی نا تو میں تمہارے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔“ وہ سکون سے بولا

”میرے بارے سوچنے میں آخر کون سی ایسی رکاوٹیں ہیں۔ مجھے پتہ تو چلے۔“ اس نے پوچھا

”کوئی دوسرا نہیں، میں خود ہی رکاوٹ ہوں اور تم اسے نہیں سمجھ سکو گی۔ کیونکہ میں اپنے مستقبل کی پلاننگ کر ہی نہیں سکا۔ میرے

حالات نے بہت پہلے جو پلاننگ کر دی ہے۔ وہ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔ یہ کیا ہے۔ کیوں ہے۔ کیسے ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے بڑا وقت

لگے گا۔ تم میرا انتظار نہ کرو۔“ اس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اس پر مائرہ کو کافی حد تک شاک لگا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر

بڑے اعتماد سے بولی

”لیکن میں آخری وقت تک تمہارا انتظار کروں گی۔ تم اگر خد کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں۔“

”یہ ضد نہیں ہے۔ میری مجبوری ہے۔ جو میں تمہیں سمجھانا بھی چاہوں تو نہیں سمجھا سکتا۔“ اس نے قہقہے سے کہا

”یہی مجبوری تو میں جانتا چاہتی ہوں۔ دنیا کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں مل کر ساری مجبوریوں کو دور کر سکتے

ہیں۔“ اس مومومی امید کا سہارا لیتے ہوئے کہا

”مائرہ۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی تمہیں انتظار کی سولی پر لٹکا دیکھ سکتا ہوں۔ میری مجبوری ایک ایسی تلخ حقیقت

ہے۔ جیسے تم برداشت کر پاؤ گی اور نہ میں۔ یہ دورا با جو ہماری زندگی میں آ گیا ہے اگر یہاں سے ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے نا تو یہ

جدائی ہم برداشت کر لیں گے، جس میں کوئی وعدہ نہیں ہے۔“ فہد نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا

”انتظار کی اذیت تو میں برداشت کروں گی نا۔ تمہیں اس سے کیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی

”مجھے معاف کرنا مائہ۔! انتظار تمہی ہوتا ہے نا۔ جب کوئی آس ہو۔ تمہارے حوالے سے میرے پاس کوئی آس بھی نہیں

ہی۔ خود کو ایک نئی زندگی کے لئے تیار کر لو مائہ۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“ وہ دیکھتے ہوئے لمبے میں یوں بولا جیسے یہ سب کہتے

ہوئے اسے خود دکھ ہو رہا ہو۔ اس پر مائہ نے اس کے متھے ہوئے چہرے پر دیکھا اور اعتماد سے بولی

”نہیں۔ اتم کچھ بھی کہہ لو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

”وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے۔ تم اپنے حصے کی خوشیاں ضائع مت کرو۔“ فہد نے ایک دم سے مسکراتے ہوئے کہا تو مائہ

خوشگوار انداز میں بولی

”بھری ہر خوشی تم سے ہے فہد۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔“ فہد نے بے بسی سے کہا اور پھر ایک دم سے موضوع ہی بدل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مائہ اس سے کوئی بات

کرنے آئی تھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائہ کی زندگی خراب ہو۔ وہ اسے دکھ دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اک ذرا

سی آس دے کر وہ نہ تو اسے انتظار کی سولی پر لٹکا سکتا تھا اور نہ ہی چھتتاوے کی آگ میں جمونک سکتا تھا۔ اس لئے بڑی بہت کے ساتھ اس

نے انکار کر دیا تھا۔

کل سے وہ سوچتا رہا تھا۔ اسے مائہ کا دکھ بھرا چہرہ یاد رہا، جب وہ اس سے جدا ہوئی تھی۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ مگر کچھ

بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ بہت سوچ کر فہد نے مائہ کو شہر کے سب سے بہترین ریستوران میں ڈنر پر بلوایا تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی

گھڑی دیکھی اور اٹھ کر چل دیا۔

شہر کے مہنگے ریستوران میں اس وقت وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ مائہ خوشگوار حیرت میں تھی۔ مائہ وہ لگ ہی نہیں رہی تھی

جیسے وہ عام زندگی میں دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بہترین تراش کا سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ میں اس کے نقوش بہت حد تک

عیاں ہو گئے ہوئے تھے۔ وہ اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ فہد اسے فور سے دیکھ رہا تھا۔ ویٹر آڈر لے کر جا چکا تھا، جب مائہ نے خوشگوار حیرت

مے لمبے میں پوچھا

”فہد، بہت دونوں بعد تم مجھے یوں زندہ سے رہے ہو۔ میں نے فون پر بھی پوچھا مگر تم نے بتایا نہیں۔ یہ کس خوشی میں ہے۔“

اس پر فہد مسکرایا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”مائہ۔! کیا سارے کام خوشی سے ہی کیے جاتے ہیں۔ کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں، جو نہ چاہتے ہوئے بھی کئے جاتے

ہیں۔ اور رہی اس ڈنر کی بات، یہ بھی کسی خوشی میں نہیں۔ بلکہ تم سے چند باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔ دل پر بوجھ تھا یا شاید کل میں وہ

باتیں نہیں کر پایا تھا۔“

”چند باتیں؟“ وہ حیرت سے بولی، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی: ”چند باتوں کے لئے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ وہ فون پر ہی کر لیتے۔“

”تم سے ملنا بھی ضروری تھا مارہ۔! میں اپنے آبائی گاؤں واپس جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا
”کتنے دن کے لئے چار ہے ہو۔“ مارہ نے پوچھا

”ہمیشہ کے لئے۔“ وہ سکون سے بولا تو مارہ چونک گئی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی

”تمہارا آبائی گاؤں کیا اتنا دور ہے کہ ہم بیٹھے میں ایک بار بھی نہیں مل سکتے؟“

”ہاں۔ امیرا آبائی گاؤں کافی دور دراز علاقے میں ہے۔ اور اس وقت ملنے کی وجہ یہ کہ میں چاہتا ہوں۔ تمہاری رفاقت کی ایک اور یاد کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ یہ ضروری نہیں کہ جدائی کے لمحوں کو سو گوار ہی کیا جائے، جیسے مسکراتے جدا ہو جائیں تو جدائی کا دکھ کم ہو جاتا ہے۔“

”میں نہیں جانتی کہ تمہاری داغ میں کیا ہے۔ تم کیوں ایک دم سے اجنبی ہو گئے ہو۔ میں یہ محسوس کر سکتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت ہے، لیکن تم اظہار نہیں کرتے۔ کیوں نہیں کرتے؟ میں یہ نہیں جانتی۔ تمہارا یہ آبائی گاؤں جانے کی ضد کرنا، میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آ رہا۔“ وہ الجھتے ہوئے بولی

”تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جو تھوڑا سا وقت ہم مل بیٹھیں جس میں اس میں کچھ ایسی خوشگوار باتیں کر میں جو بعد میں یاد آئیں تو بہت اچھا لگے۔ ساری دنیا کو ایک طرف رکھ کر، محض دو اچھے دوستوں کی مانند تھوڑا سا وقت گزار لیں، پلیز۔“ فہد نے بے سیت بھرے لہجے میں کہا

”تم ایسی باتیں کر کے مجھے اور زیادہ دکھی کر دو گے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم اپنے آبائی گاؤں کیوں جانا چاہتے ہو۔ شاید مجھ سے زیادہ جاننے والے لوگ ہوں گے وہاں پر۔ فہد مجھے یہ دکھ رہے گا کہ تم نے مجھے اپنا اچھا دوست بھی نہیں سمجھا۔“ مارہ نے رنجیدہ انداز میں کہا

”میں نے تمہیں دوست سمجھا ہے تو یوں خوشگوار وقت گزارنے کی خواہش لے کر یہاں بیٹھ ہوں۔ تمہارے ساتھ۔“ اس نے کہا
”نہیں فہد۔! ایسے تم مجھے بہلاؤ مت۔ تم اگر میرے اچھے دوست ہوئے تو تو اچانک اجنبی ہو جانے کی وجہ بتاتے۔ آبائی گاؤں جانے کی ضرورت پر میرے ساتھ بات کرتے۔ یہ جو تم سب کچھ اپنے دل میں رکھ کر مجھ سے جدا ہو رہے ہو۔ اسے میں کیا سمجھوں؟“ اس نے احتجاج بھرے لہجے میں کہا

”کچھ بھی نہ سمجھو۔ میں اس سے قطعاً انکار نہیں کرتا کہ میرے دل میں کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن وہ باتیں جو دکھ دے

جائیں۔ انہیں دفن کر دینا ہی اچھا ہوتا ہے خیر۔ ایک بات کیوں تم سے۔ ”وہ ایک دم سے اپنا لہجہ بدل کر پوچھا

”بولو۔! میں پورے دل سے تمہاری بات سن رہی ہوں۔“ اس نے غلوں سے کہا

”اگر تمہارے دل میں میرے لئے تھوڑی بہت بھی چاہت، خلوص اور احترام ہے تو میری ایک بات ضرور مانو گی۔ مجھے بھول

جانے کی کوشش ضرور کرو گی۔“ اس نے کہا تو مارہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا

”اگر تم مجھے بھول جاؤ گے تو یقین رکھو فہد۔ میں بھی تمہیں بھول جاؤں گی۔ میں تمہیں یاد نہیں کروں گی۔ تمہاری یادوں کو اپنے

قریب نہیں آنے دوں گی۔“

”مارہ۔! اپنے آپ کو اذیت دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ دیرے دیرے خود کو سلاگتے رہنے سے کسی کا کچھ نہیں جاتا۔ حقیقت

پسند ہونا چاہئے۔ یوں زندگی کل ہو جاتی ہے۔“ فہد نے پیار سے کہا

”میں کیسے مان لوں فہد۔ کیا تمہاری یہ بات محض ایک تسلی نہیں ہے؟ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی ایک کوشش۔ خیر۔ میں سمجھ سکتی

ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ آؤ، آج کی اس شام کو خوشگوار بنالیں۔“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے ایک دم سے مسکرا دی، صاف ظاہر تھا کہ

یہ زبردستی کی مسکان ہے تو فہد بھی سر ہلاتے ہوئے بولا

”ہاں۔! میں شاید یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر ہلکے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسنے میں دیران کے قریب آگیا تو وہ دونوں خاموش

ہو گئے۔ مارہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے وہ کوئی بات نہیں کی، جس سے کوئی سوال اٹھتا ہو۔ رات دیر تک وہ باتیں کرتے

رہے۔ کچھ ماضی کی باتیں اور اشارے کنایوں میں مستقبل کی باتیں۔ رات گئے۔ وہ ایک دوسرے سے ہذا ہو گئے۔

باقی رات اس نے کانتوں پہ گزاری۔ ذرا سی دیر کے لئے اسے نیند آئی بھی تو ایک ہیسا تک خواب نے اسے بیدار کر دیا۔ اس

وقت صبح کے آثار نمودار ہو گئے تھے جب اس نے بیڈ چھوڑ کر قسمت نگر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

ناشتے کے بعد فہد ڈرائیونگ روم میں شلوار قمیض پہنے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ جعفر اس کے پاس تھا۔ قریب ہی فہد کا سامان پڑا ہوا تھا۔

جعفر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”تم واقعی جارہے ہو، مجھے یقین نہیں ہو رہا؟“

”ہاں، یار، اب جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے جو تمہیں سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا۔ پلیز۔“ فہد نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن تم ایک وعدہ کرو۔ جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میں ٹھیک کہتا تھا یا تمہارا فیصلہ درست

نہیں تھا۔ جب تم لوٹ آؤ گے یا کم از کم ہمیں آواز ضرور دو گے۔“ جعفر کے یوں کہنے پر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

”تم لوگوں کے سوا میرا ہے کون، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو مگر یہ میری جنگ ہے یا، میں اس میں تم لوگوں کو نہیں جھونکنا چاہتا۔“

”کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اگر تم عقل میں سے بھی آواز دو گے تو میں تمہاری آواز پر لبیک کہوں گا، مگر تمہیں یہ کیوں احساس ہے کہ ہم تمہارے کام نہیں آ سکتے۔“ جعفر کے لہجے میں سے شکوہ چٹک رہا تھا۔ جب فہد نے جلدی سے کہا

”مجھے اعتراف ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔ مگر حوصلہ شکنی کی باتیں نہ کرو۔ مجھے جب بھی ضرورت ہوئی، میں تم لوگوں کو ہی یاد کروں گا۔، مارہ کا بہت خیال رکھنا، میرے جانے کے بعد سب کچھ اطمینان سے بتا دینا کہ میرا گاؤں جانا کتنا ضروری ہے۔ بس وعدہ کرو، جو تمہیں کہا ہے وہی کرو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ جعفر نے دھمے لہجے میں کہا۔ اتنے میں محمود سلیم وہیں آ گئے۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ دل سے نہیں چاہتے تھے، مگر مجبوری میں اسے الوداع کہنے پر مجبور تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ دونوں اٹھ گئے، پھر فہد ان کے گلے لگتے ہوئے بولا

”پاپا، آپ اپنا بہت خیال رکھیں گے۔“

محمود سلیم نے اظہارِ غمی سے لیکن غم آلود آواز میں اس کی پیٹھ پیچھتاہٹے ہوئے کہا

”کیوں نہیں رکھوں گا اپنا خیال۔ میں رکھوں گا اپنا خیال، لیکن تم بھی اپنا بہت خیال رکھنا۔ جاتے ہی رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت لکھنا بیٹا۔ تمہیں پتہ ہے میں تمہیں بہت مس کروں گا۔“

”میں بھی آپ کو بہت مس کروں گا، لیکن اگر آپ اس طرح غم زدہ ہوئے تو میں بہت مشکل عسوس کروں گا۔“ فہد نے کہا تو محمود سلیم جلدی سے تڑپ کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولا

”اؤ نہیں نہیں یا، میں کہاں غمگین ہوں۔ بس تم جارہے ہونا تو یونہی۔ میرے پاس ہے تا یہ جعفر، یہ میرا بہت خیال رکھے گا۔“

”پاپا، اب اجازت دیں اور میرے لیے بہت ساری دعائیں کرنا۔“ فہد نے مضبوط لہجے میں کہا

”ہاں بیٹا، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ملازم بیگ اور سوٹ کیس لے کر ڈرائیونگ روم سے نکل چلا گیا۔ فہد اور جعفر بھی باہر پورچ میں ایک دوسرے کے گلے ملے۔ پھر فہد گاڑی میں بیٹھ گیا اور ایک نگاہ ان پر ڈال کر گاڑی بڑھا دی۔



سورج طلوع ہوئے کافی وقت ہو گیا ہوا تھا۔ چاچا سوہنا مگن میں دھری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے آئینہ رکھا ہوا تھا جس میں دیکھتے ہوئے وہ سر پر پگڑی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ وارث شاہ کی ہیر کے بول بھی گنگنا رہا تھا۔

”ہیر آکھیا جو گیا جھوٹ بولیں اے۔۔۔ کون روٹھزے یا رہتا دندا اے۔۔۔“

اسنے میں کچے کرے سے چھاکا برآمد ہوا۔ وہ بڑے غور سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے، خوشامدانہ لہجے میں بولا

”واہ واہ۔۔۔ ابا واہ۔۔۔ کیا میری جوگی سے گل بات کروا رہا ہے واہ۔ ویسے کیا ٹپک جی رہی ہے تم پر ابا۔۔۔ جوانی میں جب تو شہور کمال کر پنڈ کی نگہوں میں پھرتا ہو گا۔ ہائے ہائے۔۔۔ کتنی تم پر مرتی ہوں گی نا بھلا۔“

اپنے بیٹے کی بات سن کر چاچا سوہنا خوش ہوتے ہوئے بولا

”اوتے کیا ویلا یاد کروا دیا ہے تو نے۔ اے لا چاء اے کڈھیا کرتا، تلے والا کھڑ، جتھ میں لمبی ڈانگ۔ تیری ماں نے بھی دیکھ کر

عی تو میرے ساتھ دیا کیا تھا۔“ وہ ماضی میں ڈوبتے ہوئے بولا

”اسی لئے پھر تیرے کرکوت دیکھ کر وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہی۔ جلدی اللہ کو پیاری ہو گئی۔“ چھاکے نے طنزیہ کہا تو چاچا سوہنا

غصے میں بولا

”یہ کیا بکواس کر رہا تو، اللہ بخشنے وہ تو بڑی بھاگاں والی تھی۔ بس تیری صورت میں اک عذاب چھوڑ گئی ہے میرے لیے،

تیری وجہ سے میرا گھر آباد نہیں ہو رہا ہے۔“

”اوتے ابا میں تیری تعریف کر رہا ہوں اور تو میری بڑتی (بے عزتی) کر رہا ہے۔“ چھاکے نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو وہ

تیزی سے بولا

”تیری بڑتی نہ کروں تو اور کیا کروں۔ سارا دن گلے پھرتا رہتا ہے۔ کوئی عقل کر۔“

”اوا، جو بات تیرے ہتھ میں ہے نا وہ کسی میں نہیں۔ اک میں ہی تو ہوں اس پنڈ میں جس کی پورے علاقے میں دس پوچھ

ہے۔ سن، یہ ساتھ والے گاؤں میں ایک بیوہ ہے، کہو تو پتہ کروں اس کا؟“ چھاکے نے دبے دبے جوش سے پوچھا

”او تیری خبر ہوئے ہتر، آخر خون ہی کام آتا ہے۔ کیسی ہے وہ۔۔۔ منہ تھکے لگتی ہے؟“ وہ خوش ہوتے ہوئے پوچھنے لگا

”ابھی تو پتہ چلا ہے۔ تو مجھے پیسے دے میں آج ہی جاتا ہوں اس کے پاس۔ پھر کوئی بات کرتے ہیں۔“

اس کے یوں کہنے پر چاچے سوہنے نے جیب سے روپے نکال کر اسے دیے پھر ڈرتے ڈرتے جذباتی انداز میں بولا

”دیکھ ہتر، اس رقم سے اپنے گلڑ کو بادام نہ کھلا دیتا۔ اپنی ہونے والی ماں کا پتہ ضرور کر کے آنا۔“

اسنے میں سر نہنے نے زوردار آواز میں بانگ دے دی۔ چھاکا اس طرف منہ کر کے بولا

”میر کر مہر۔ اتیرے لیے ہی تو سخت کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولا، ”لے فیرا، دعا کر، میں چلا

ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب لپک گیا۔ جبکہ چاچا سوہنا اک نئی ترنگ سے ہلکی ہانڈھٹتے ہوئے کنگٹانے لگا۔

”ڈولی چڑھد یا ماریاں ہیر کو کاں۔“

چھاکے نے ایک بار اپنے باپ کو دیکھا، پھر اپنے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے مرنے کو اٹھایا اور باہر والا دروازہ پار کرتا چلا گیا،

اس کا رخ چوراہے کی طرف تھا

چھپا کے نے حلیف کی دوکان سے بادام خرید کے دوکان کے باہر ہی موڑے پر بیٹھ کر اپنے مرنے کو کھانے لگا۔ وہ اپنے وصیان میں تھا کہ سراج گاؤں کا چوراہا پار کر کے چھپا کے پاس آگیا۔ وہ اس کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولا

”اُوئے چھپا کے۔ اُٹا کیا حال ہے تیرا۔ سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟“

”میں تو ٹھیک ہوں سراج، اللہ کا بڑا کرم ہے۔ تمہیں پتہ ہے، ایک میں ہی تو ہوں جس کی پورے علاقے میں دس پوچھ ہے۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا مرغا بول پڑتا ہے، تبھی وہ بھیدہ ہوتے ہوئے بولا، ”لے گواہی بھی سن لے۔“

”یہ بات تو مانی پڑے گی یار، تیری دس پوچھ تو ہے۔ ورنہ مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ امین ہے کدھر؟ تو نے بڑا احسان کیا ہے یار۔“

سراج نے ممنونیت سے کہا

”احسان کو چھوڑ، تو یہ بتا تھا نے دار کا قصہ کچھ ٹھنڈا ہوا کہ نہیں، کیا کہتا ہے؟“ چھپا کے نے تشویش سے پوچھا تو سراج نے آہ بھرتے ہوئے کہا

”اُس کا قصہ کیا ٹھنڈا ہوتا ہے یار، وہ تو سیدھے سیدھے چوہدریوں کا بندہ ہے۔ میں نے امین کو سمجھایا ہے۔ وہ میری بات مان گیا ہے۔“

”یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ اس کا ذہن بدلے گا تو سب کچھ بھول جائے گا۔ کب تک وہ باہر آجائے گا۔“ چھپا کے نے دھیسے سے لہجے میں پوچھا

”میں تو پوری کوشش کر رہا ہوں۔ آج نہیں تو کل وہ باہر آجائے گا۔ ویسے یاران چوہدریوں نے تو اُت چٹائی ہوئی ہے۔ نہ تھانے کچھری میں کسی کی چلتی ہے اور نہ پانچایت میں۔ یوں لگتا ہے ساری دنیا ہی انہی کے ساتھ ہے۔ امین پر بہت ظلم ہوا ہے یار، بہت مارا ہے انہوں نے۔“ سراج نے دیکھتے ہوئے دل کے ساتھ کہا

”کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن ایک غریب آدمی کرے بھی تو کیا، کدھر جائے؟“ وہ یوں بولا جیسے وہ اس ماحول اور ظلم کا عادی ہو گیا ہو۔ جیسے قسمت نگر کے باسیوں کے مقدر میں لکھا ہوا وہ قیوں کر چکا ہو۔ یہ سن کر سراج کا چہرہ بگڑ گیا یوں جیسے یہ سن کر اسے بہت تکلیف ہوئی ہو۔ تبھی وہ غصے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں بولا

”اُو کوئی بات نہیں، کب تک ان کا ظلم چلے گا۔ ہم ہی کوشش نہیں کرتے۔ خیر۔ اپنی الحال تو چل میرے ساتھ ڈیرے پر۔ وہاں چل کے باتیں کرتے ہیں، کچھ سوچتے ہیں یار۔“ سراج یہ کہتے ہوئے اٹھا تو چھپا کا بھی اس کے ساتھ اٹھا گیا۔



قسمت گھر میں ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی چمک میں کچے اور بوسیدہ گھروں کی بد حالی زیادہ واضح ہو کر اپنی بے بسی کی داستان سناتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن اسی دھوپ میں قسمت گھر کی اکلوتی حویلی کا رعب و دہد بہ کچھ حرید بڑھ جاتا تھا۔ حویلی کے ڈرائیونگ روم میں چوہدری جلال اور بشری بیگم دونوں صوفے پر آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری جلال شہر جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اسنے میں حویلی اور چوہدرانی بشری کی خاص ملازمرہ رانی چائے لے کر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری کبیر بھی آکر ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔ رانی چائے پینے لگی تو چوہدری جلال نے اسے دیکھتے ہوئے کہا

”رانی۔ اڈرا کسی کو بلا کر پتہ کراؤ۔ گاڑی تیار ہے کہ نہیں۔“

”جی، پتہ کرتی ہوں۔“ وہ مودب اور دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ گئی۔ تبھی بشری بیگم بولی

”آپ اطمینان سے چائے تو پی لیں۔ پھر چلے جائیے گا۔ کون سا آپ نے کہیں دور جانا ہے، یہیں نور پور ہی تو جانا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وقت پر واپس بھی آنا ہے۔“ اسنے میں کبیرہ ہیں آگیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا

”بابا نور پور جائیں گے تو اپنی مرضی سے، واپسی کب ہوگی، یہ تو انہیں بھی نہیں پتہ ہوتا۔ معلوم نہیں کیسے کیسے لوگ، کس کس طرح کے معاملات کے کو بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے سیام این اے بنے ہی انہی کے لئے ہیں۔“ چوہدری کبیر نے ہنستے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر کہا

”نہیں۔ ایہ آج ایسی کسی جگہ نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ وہاں جا رہے ہیں جہاں شاید مستقبل میں ہمیں بہت زیادہ جانا پڑے۔“

بشری بیگم نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ اسنے میں رانی پلٹ آئی اور اس نے آکر بتایا

”چوہدری صاحب۔ وہ ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔“

”لو بیگم۔ اس میں تو چلا۔ کہیں اور نہ گیا تو کوشش کر کے جلدی واپس آ جاؤں گا۔“ چوہدری جلال نے اسنے ہوئے کہا تو بشری بیگم بھی اٹھتے ہوئے بولی

”میں شدت سے انتظار کروں گی۔“

اس دوران چوہدری کبیر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں بیٹا دونوں اس وقت تک کھڑے رہے جب تک چوہدری جلال باہر نہیں چلا گیا۔ وہ دونوں پھر سے بیٹھ گئے۔ اس دوران رانی چائے پینے لگی۔ جھکی چوہدری کبیر نے پوچھا

”امی۔ یہ بابا کون سی خاص جگہ گئے ہیں۔“

”وہ اپنے ایک دوست کے پاس گئے ہیں، اُن سے ملنے کے لئے۔ سنا ہے کہ ان ایک عیاری سی بیٹی ہے۔ ظاہر ہے اب تمہارے لئے لڑکی تو ہم نے ہی تلاش کرنی ہے نا۔ ویسے کبیر، ایک بات تو بتاؤ۔“ ماں نے اسے بتاتے ہوئے پیار سے پوچھا

”پوچھیں۔“ اس نے لا پرواہی کے سے انداز میں جواب دیا تو بشری بیگم نے پوچھا

”تمہارے بابا نے بھی کہا تھا اور میں بھی چاہتی ہوں کہ تم سے پوچھ لوں۔ کیا تمہاری کوئی پسند ہے تو ہمیں بتاؤ؟“

ماں کے یوں پوچھنے پر وہ چونک گیا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے خاموش رہا۔ پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر مسکراتے کر ہوئے بولا
 ”ماں یہ بات پھر کسی وقت کریں گے۔ اس وقت میں نے ڈیرے پر جانا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا باہر کی جانب چلا گیا۔

بشری بیگم اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے چائے کے بھرے ہوئے کھوکھو دیکھا اور حیران ہوتے ہوئے خود کھائی کے سے انداز میں بولی
 ”پتہ نہیں کیا ہے اس کے دل میں، اچھا پھر یہی،“ یہ کہہ کر وہ رانی کی طرف متوجہ ہوتے ہو پوچھنے لگی: ”اے رانی، اب تو بتا مجھے
 یہ تو آج اتنی جلدی جلدی کام کیوں منسا رہی ہے۔ کیا بات ہے؟“

”وہ چوہدرانی جی۔! آج میں نے جلدی گھر جانا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ پارگاؤں سے میرے دادہ ہونے والے مسرال
 سے مہمان آنے ہیں۔ میں نا۔۔۔ وہ۔۔۔“ رانی کہتے کہتے رک گئی تو بشری بیگم انتہائی عجیبگی سے کہا

”اچھا، اچھا، حیرتی شادی کی بات کرنے آئے ہوں گے۔ تو ایسے کر، وہ چوہو سے کہہ دے۔ وہ کچن دیکھ لے گی۔ تو جا اور ہاں
 سن، اپنی ماں سے کہنا بات ہو جائے تو مجھے ملے آکر۔“

”جی، میں کہہ دوں گی۔ چائے بنا دوں آپ کے لئے۔“
 ”نہیں اب دس نہیں کر رہا تو جا، میں پی لوں گی۔“ بشری بیگم نے کہا تو رانی پلٹ کر ہر نکل گئی۔ وہ اکیلی ڈرائیونگ روم میں بیٹھی
 سوچوں میں کھو گئی۔

چوہدری کبیر کو نمبائے کیوں اپنی شادی کی بات ابھی نہیں لگی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ حوصلے سے
 ڈیرے تک پہنچ کر سوچنا آیا تھا۔ اس نے اپنی فوروسٹل جیب ڈیرے کے گن میں آ کر روک دی۔ اس کے ساتھ گن میں بھی نقل آئے۔ چوہدری
 کبیر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا تو کھا اس کے قریب آ کر بڑے مودب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ چوہدری کبیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا
 ”اوما کھے ستا۔ سب خیر خیر ہے نا؟“

”جی، ساری خیر ہے۔ پر ایک بات ہے چوہدری جی۔ وہ ماسٹر دین محمد۔۔۔“ ماما کہتے کہتے رک گیا تو وہ لا پرواہی سے بولا
 ”کیا ہوا ہے؟“

”میں نے سنا ہے بی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہے۔“

”کہاں! کہاں جائے گا وہ؟“ چوہدری کبیر نے طنز پر ہنستے ہوئے پوچھا
 ”یہ تو پتہ نہیں لیکن یہ خبر ہے پکی۔ آخر کہیں تو جائے گا نا وہ۔“ ماما کے نے پر یقین لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا تو چوہدری کبیر نے

نخوت سے کہا

”تجھے تو پتہ ہے ماما کے، مجھے ماسٹر دین محمد کی کوئی پروا نہیں۔ اُسے تو ہابا نے بڑی سزا دی ہے۔ اب تو ویسے بھی وہ اوپر جانے والا

ہے۔ لیکن یہ سسلی یوں ہاتھ سے نکل جائے، یہ تو مجھے منظور نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا

”تو پھر کیا کیا جائے چوہدری جی، وہ لوگ کہاں تک سزا برداشت کریں۔“ ماکھے نے الجھتے ہوئے کہا

”میں کب کہتا ہوں کہ وہ ساری زندگی سزا ہی برداشت کرتے رہیں۔ سسلی میری بات مان جائے تو شہزاد یوں کی طرح رہے،

نہال کر دوں گا اس کو۔“ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں نہانے کیا کچھ دیکھتے ہوئے کہا

”اب وہی تو نہیں مان رہی۔ اسی لیے انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“ ماکھے نے کہا تو چوہدری کبیر ختی سے بولا

”نہیں ماکھے نہیں۔ انہیں ہر حال میں روکنا ہے۔“

”وہ ہی تو میں چوہدری ہوں چوہدری جی۔ آخر کیسے روکیں؟“ ماکھے نے پوچھا

”اُویار۔! انہیں روپے پیسے کا لالچ دو۔ ہمدردی جتاؤ۔ انہیں کوئی آسرا دے کر روکو۔“ چوہدری کبیر نے اس صلاح دی تو ماکھے نے کہا

”چوہدری جی۔ آپ کو پتہ تو ہے ماسٹر دین محمد اس نے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا، بھوک کاٹ لی اس نے کسی کے سامنے

ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور پھر وہ جس بات پر اڑ جاتا ہے۔ نا تو۔“

”ماکھے۔ انہیں روکنا تو ہے، چاہیں جیسے روکیں۔ انہیں کیسے روکنا ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جب ماسٹر ہی نہیں رہے گا

تو؟“ چوہدری کبیر نے ماتھے پر تیرہویں چڑھاتے ہوئے کہا

”سمجھ گیا چوہدری جی، سمجھ گیا۔ اب میں انہیں روک لوں گا۔“ ماکھے نے یوں کہا جیسے وہ یہی سننا چاہتا ہو۔ بھی چوہدری کبیر نے

اکٹائے ہوئے انداز میں کہا

”ہوں۔ تو پھر جاؤ۔“

ماکھے نے سنا اور سر ہلاتے ہوئے تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اسے جانا دیکھ کر چوہدری کبیر طرہیہ انداز سے افس

دیا۔ اسے سمجھا آگئی تھی کہ اپنی شادی کی بات اسے اچھی کیوں نہیں لگتی تھی۔



دوپہر اصل بجی تھی۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ سسلی آگئی پر سے کپڑے اتار رہی تھی۔ وہ کپڑے اکٹھے کر کے اپنے

کاندھے پر رکھتی چلی جا رہی تھی۔ ماسٹر دین محمد عصر کی نماز پڑھ کر گھر میں آیا۔ صحن میں آ کر اس نے سسلی کو تیزی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر کہا

”آج اتنا سارا کام کر کے تو میری بیٹی تھک گئی ہوگی نا۔“

”نہیں باباجی۔ میں کہاں تھکی ہوں۔ ابھی تو میں نے یہ سارے کپڑے تھک کر کے صندوقوں میں بند کرنے ہیں۔ بس یہی رہ گئے

ہیں۔ یا پھر کھانے پینے والے قعودے سے برتن ہیں۔ انہیں سیننا ہے۔ بس کام ختم؟“ سسلی تیزی سے بولی تو ماسٹر دین محمد نے انتہائی ہلوسی

بھرے لہجے میں کہا

”ہاں ہجر۔ ایک نئے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تک خط کا جواب نہیں آیا۔ لگتا ہے، اس بار بھی خط کا جواب نہیں آئے گا۔ کل کا دن دیکھ لیتے ہیں۔“

”اگر کل بھی جواب نہ آیا تو؟“ وہ یوں بولی جیسے اسے خط کا جواب نہ آنے کا پورا یقین ہو

”پھر بیٹی، اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔“ وہ بولا تو سسلی نے طعنیہ انداز میں کہا

”کیا ہے ہماری زندگی، سر چھپانے کیلئے ایسی کوئی جگہ نہیں۔ کم از کم یہ تو سوچ لیں ابا کہ ہم جائیں گے کہاں؟“

”نہی تو میں سوچ رہی ہوں ہجر۔ اس کی مجھے سمجھ آگئی ہوتی تا تو میں کب کا یہ گاؤں چھوڑ کے چا چکا ہوتا۔“ ماسٹر دین محمد نے بے

چارگی سے کہا

”تو پھر ہم جائیں گے کہاں؟ یوں گھر سے نکل کر دھکے کھانے کا کیا فائدہ؟“ وہ تشویش سے بولی

”تو کیا اپنا آپ چھوڑ یوں کے حوالے کر دیں؟ وہ جو چاہتے ہیں وہی کریں؟ نہیں میرا ہجر نہیں۔ ٹو ماہیوس نہ ہو۔ کل ہم نے ہر

حال میں چلے جانا ہے۔ رہی بات کہ کہاں جائیں گے۔ تو فوراً پور میں ایک میرا دوست ہے، ہم اس کے پاس جائیں گے، وہ میرے ساتھ

سکول میں پڑھا تا رہا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے خیر، تم اپنا یہ سامان بہر حال سیٹ لو۔“ یہ کہہ کر وہ داران کی سست چلا گیا۔ سسی انجھائی مایوسی

کے عالم میں الگٹی سے کپڑے اتارنے لگی۔ ایسے میں دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ ماسٹر دین محمد چار پائی بیٹھتے ہوئے اٹھ گیا۔ تیز دستک

بکھر ہوئی جیسے کسی کو بہت جلدی ہو۔ وہ آہستہ قدموں سے چلا ہوا دروازے تک گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو گلی میں چھوڑیوں کی گاڑی

کھڑی تھی اور مالکھا اپنے ساتھ کچھ بندوں کو لئے کھڑا تھا۔ مالکھے کے ہاتھ میں گن تھی، انھیں یوں اپنے گھر کے سامنے دیکھ کر اس کا ماتھا

ٹھنکا۔ سکی ہوئی سسلی دروازے کی اوٹ میں دیکھ رہی تھی۔ جیسی ماسٹر دین محمد نے گھر سے باہر آ کر درشتی سے پوچھا

”کیا بات، خیر تو ہے، کیوں آئے ہو تم؟“

”آخر ہے ماسٹر۔ بس ایک پیغام دینا تھا تمہیں گئے چھوڑی کا۔ وہ سن لے۔“ مالکھے نے پوری سنجیدگی سے کہا

”پیغام، گئے تیز چھوڑی کا۔ کیا بات کر رہے ہو؟“ ماسٹر دین محمد نے حیرت سے پوچھا تو مالکھے نے اس کی حیرت کو نظر انداز

کرتے ہوئے کہا ”بات یہ ہے ماسٹر کہ تو یہاں سے کہیں بھی نہیں جاسکے گا۔“

”کیا کہو اس کر رہے تو، میں جہاں بھی جاؤں، تم کون ہوتے ہو روکنے والے۔“ ماسٹر دین محمد کو واقفانہ آگیا تھا، اس لئے

اس نے سخت لہجے میں جواب دیا تو مالکھا بدتمیزی سے بولا

”یہ گئے چھوڑی کا پیغام ہی نہیں حکم بھی ہے۔ تو نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو پھر اللہ میاں کے پاس ہی جائے گا۔ اس

لئے ادھر ہی گاؤں میں پڑا رہ۔ اور وہ تجھے اس لیے روکنا چاہتا ہے کہ اسے تیری بیٹی اچھی لگتی ہے۔“

”کہو اس بند کر کہنے۔“ ماسٹر دین محمد کا خون ایک دم سے جوش، رگیا، یہ کہتے ہوئے اس نے مالکھے کے تھپڑ مارنا چاہا کہ مالکھے

نے غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دھکا دے دیا۔ اسی لمحے سسلی کی چیخ نکل گئی

ماسٹر گھوم کر ایک کار کے بونٹ پر جاگرا۔ ماسٹر دین محمد نے سر اٹھا کر دیکھا وہ فہد کی کار تھی۔ ماسٹر دین محمد سمیت وہاں پر موجود سب لوگوں نے حیرت سے اس اچلی کودیکھا، جو کار سے نکل آیا تھا۔ فہد نے کار میں سے نکل کر ماسٹر دین محمد کو اٹھایا، اپنے دامن سے اس کے چہرے پر گئی مٹی صاف کی تو یوں حاما ماسٹر دین محمد اس کے طرز عمل پر سک کر رہ گیا ہے۔ فہد چند لمحے اپنے روحانی باپ کا چہرہ دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کئے پھر پلٹ کر ماکھے کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی پرواہ کئے بغیر اس کی طرف بڑھا، ایک ہاتھ سے اس کی گن پکڑ کر پرے پھینک دی، اور دوسری ہاتھ سے زوردار چھڑا اس کے منہ پر مارا۔ ماکھا لڑکھڑا گیا، فہد نے اسے کار سے پڑا اور دوسرا چھڑا مارا، وہ گر گیا۔ اسی لمحے ماکھے کے ساتھیوں نے گنیں سیدی کر لیں تو فہد نے اپنا ہسل نکال کر بولٹ مارتے ہوئے ماکھے کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ماکھے کی آنکھوں میں خوف سے زیادہ انتہائی حیرت تھی۔ وہ فہد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر فہد کو روکے ہوئے کہا

”نہ منہ ہتر نہ اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ مت رنگتا۔“

فہد نے ماسٹر دین محمد کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ماکھے سے کہا

”یہ شخص میرا روحانی باپ ہے اور ان کی قدر میرے والدین سے بھی بڑھ کر ہے۔ آج تک تم لوگوں نے جو گستاخیاں کرنا تمیں کر لیں، جن کا حساب اب تم لوگوں کو چکانا ہے۔ بہت ادھا رہے تم لوگوں کی طرف، کیونکہ میں، ان کا بیٹا اب آگیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں خود پر کا بوند رکھ سکوں، اور حیرے گندے خون کے چھینٹے یہاں اڑیں، پاؤں پڑ کے معافی مانگ۔“

یہ کہتے ہوئے فہد نے ایک ٹھوکرا اس کی پسلیوں میں مار دی۔ ماکھا تیزی سے ماسٹر دین محمد کے پیروں کی طرف رینگا اور پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو ماکھا اپنی گن اٹھا کر گاڑی میں جا بیٹھا، فہد اپنے ہاتھ میں ہسل لئے انہی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ لحوں میں اس کے ساتھی بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے۔

ماسٹر دین محمد اس کی طرف بڑھا، اس دوران سلی ان کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔ ماسٹر دین محمد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا

”تم کون ہو بیٹا؟ میں نے تمہیں پہچانائیں؟“

یہ سن کر فہد ایک دم سے جذباتی ہو گیا۔ پھر وہ بھی جذباتی لہجے میں بولا

”وقت کتنا ظالم ہے استاد جی، انہوں نے چہرے بدل دیتا ہے، میں، میں فہد ہوں فرزند حسین کا بیٹا۔ آپ کا شاگرد۔“

ماسٹر دین محمد حیرت اور جذبات میں گم ہوتے ہوئے چونک گیا۔ اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا

”تم۔۔۔ تم فہد ہو؟ مجھے یقین تھا بیٹا کہ ایک دن تم ضرور لوٹ کے واپس آؤ گے۔“

”لیکن افسوس تو یہ ہے استاد جی، وقت ابھی تک نہیں بدلا۔ میں نے جس حال میں آپ کو آخری بار دیکھا تھا، مجھے آپ اسی حالت میں ملے ہیں۔ لیکن اب آپ لگزنہ کریں۔ میں یہ وقت ہی بدل دوں گا۔“ فہد نے دانت پیستے ہوئے کہا تو ماسٹر دین محمد نے اس کی توجہ بٹانے لے نئے سلمیٰ کی طرف دیکھ کر کہا

”یہ سلمیٰ ہے۔“

فہد اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ بھی حیرت زدہ لگا ہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فہد نے جلدی سے ماسٹر دین محمد سے کہا

”آپ چلیں۔“ فہد نے کہا تو وہ سب اندر کی طرف چل دیئے۔

فہد اور ماسٹر دین محمد محن میں بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔ بائیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ تبھی فہد نے کہا

”استاد جی لگتا ہے، وقت نے آپ سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔“

اس پر ماسٹر دین محمد نے فہد کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا

”ہاں۔ بہت کچھ چھین لیا ہے۔ اتنا کچھ کہ جس کا ازالہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔“

جب فہد جذباتی ہوتے ہوئے بولا

”میں آگیا ہوں استاد جی۔ اپنے سارے قرض چکانے کے لئے۔ یہ قرض تب کا استاد جی، جس دن ہم دونوں اور پور جا رہے تھے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہاں پر میں نے چوہدری کے خلاف پورا زور لگا کر ایف آئی آر کٹوانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کچھ نہ کر سکا،

اور اسی وجہ سے میں آج تک عتاب میں ہوں۔“ ماسٹر دین محمد آبدیدہ ہوتے ہوئے بولا

”اب نہیں، اب نہیں روٹا استاد جی۔ میں آگیا ہوں نا ساری کشتیاں جلا کر۔ اور آپ کو معلوم ہے، کشتیاں کیوں جلائی جاتی ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ماسٹر دین محمد نے چونک کر پوچھا

”زندگی نے مجھے یہ سبق دیا ہے استاد جی، مرنے کے لئے زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا مجھے

کشتیاں جلا کر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“ فہد نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ، ماسٹر دین محمد جواب دیتا سلمیٰ نے قریب آ کر پوچھا

”اباجی، کھانا لگا دوں؟“

”ہاں، ہاں پتر“ اس نے فہد کی جانب دیکھا اور کہا، ”اچھا چل، منہ ہاتھ دھو لے۔ کچھ کھا لی لے۔ پھر بائیں کرتے ہیں اور میں

چھبیں جاتا ہوں کہ ہم پر کیا گذری۔“

ماسٹر دین محن میں پڑی چار پائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جبکہ فہد اٹھ گیا۔ سلمیٰ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ بہت عرصے بعد ان کے آگن میں تھوڑا سا کون تھا، جس میں خوف نہیں تھا۔



چوہدری کبیر نے اپنی فور وکیل حویلی کے پورچ میں روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ وہ چلا ہوا آکر ڈرائیونگ روم میں آیا تو اس نے منشی فضل دین کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ منشی اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تو منشی اس کے پاس آ گیا۔ چوہدری کبیر نے عام سے نارمل لہجے میں پوچھا

”بابا اب تک واپس نہیں آئے منشی؟“

”وہ اپنی پرانے دوست کے پاس گئے ہیں، اللہ جانے آج واپس بھی آتے ہیں یا نہیں کیونکہ وہ بڑے خاص کام سے ہیں۔“ منشی نے خوشامد انداز میں بتایا۔

”خاص کام۔۔۔“ چوہدری کبیر نے کہا ہی تھا کہ اس نگاہ ماکھے پر پڑی، جو داخلی دروازے میں آکر ڈک گیا تھا۔ اُن دونوں نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔

”اُوئے خیر تو ہے نا ماکھے؟“ چوہدری کبیر نے اُلجھتے ہوئے پوچھا

”خیر ہی تو نہیں ہے۔ میں گیا تھا ماسٹر کو سمجھانے، لیکن اس کا پتر آ گیا ہے۔“ ماکھے نے متحوش انداز میں کہا تو دونوں نے یوں حیرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے ماکھا پاگل ہو گیا ہو، تبھی منشی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا

”پتر؟ اُوئے اس کا تو کوئی پتر ہی نہیں ہے۔ وہ کون آ گیا ہے۔۔۔ اور تجھے ہوا کیا ہے؟“ اس نے ماکھے کی خستہ حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو، ماکھے نے انہیں ساری روداد سنادی، جسے سنتے ہی چوہدری کبیر کا چہرہ غضب ناک ہوتا گیا۔ جب وہ کہہ چکا تو چوہدری کبیر اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا

”آما کھدے دیکھتے ہیں کون آ گیا ہے وہ، جس نے ہماری بھوہ میں آکر ہمیں ہی لگا رو دیا ہے۔“

اسی لمحے منشی نے گھبراتے ہوئے کہا

”اُوئے نہیں گئے چوہدری جی، آپ بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔ ایک فون کروں گا تھانیدار کو وہ تھانے لے جا کر اس کا داغ ٹھیک کر دے گا۔ ماسٹر خود مت ترلا کرنے کے لیے ادھر آئے گا۔ میں کس لیے ہوں۔ دیکھتا ہوں میں، آپ بیٹھو گئے چوہدری جی۔“

اس پر چوہدری کبیر چند لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے سوچتا رہا پھر بولا

”تو چاما کھے ڈیرے۔ چل منشی کر فون اس تھانیدار کو۔ شام تک مجھے وہ اپنے سامنے چاہیے۔“

”میں ابھی فون کرتا ہوں۔ آپ اندر جا کر آرام کریں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ منشی نے اعتماد سے کہا تو چوہدری کبیر اندر کی طرف چلا گیا اور، کھا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد منشی حویلی کے ڈرائیونگ روم میں رکھے فون کاریسور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری طرف تھانے میں فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ دوچار رنگ جانے کے بعد ایک سپاہی نے ریسور اٹھا کر پہلو کہا تو منشی بولا

”او میں منشی فضل دین بات کر رہا ہوں، جو ملی سے، کدھر ہے وہ تمہارا تھا نیدار، اس سے بات کراؤ میری۔“

”وہ تو نور پور گئے ہوئے ہیں۔ آج اُن کی عداوت میں بیٹھی تھی مانی۔“ سپاہی نے آواز بچاتے ہوئے تیزی سے جواب دیا۔

”والہیں کب آتا ہے اس نے؟“ منشی نے سمجھلاتے ہوئے پوچھا

”پتہ نہیں جی، مرضی والے ہیں، چاہیں تو ابھی آجا سکیں یا پھر نہ آئیں خیر تو ہے نا منشی جی، کیسے یاد کیا۔“ سپاہی نے مودب لہجے

میں پوچھا

”بھلا تم پولیس والوں کو کسی خیر میں یاد کیا جاتا ہے، وہ جیسے ہی آئے اسے کہنا فوراً مجھے آکر ملے، بہت ضروری کام ہے۔“ منشی

نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا

”جی بہتر، میں آپ کا پیغام دے دوں گا۔ اور سنائیں ٹھیک ہیں نا آپ۔“ سپاہی نے کہا

”اُدھلیک ہے، ٹھیک ہے۔“ منشی نے اکتاتے ہوئے کہا اور ریور رکھ دیا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ چودھری کبیر سے اس نے وعدہ

کیا تھا، اگر پورا نہ ہوا تو اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ وہ یہی سوچ کر لرز گیا۔



ماثرہ اپنے بیڑم میں تھی۔ دھیمی روشنی میں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے بیڑ پر پڑی رو رہی ہے۔ اسے فہد یاد آ رہا تھا۔

اسے معلوم ہو گیا تھا کہ فہد اپنے آبائی گاؤں قسمت نگر چلا گیا ہے۔ اس فہد کی کہی ہوئی بات بہت بے چین کر رہی تھی کہ میں اپنے مستقبل کی

پلاننگ کر رہی نہیں سکتا۔ میرے حالات نے بہت پیسے پلاننگ کر دی ہے۔ یہ کیا ہے، کیوں ہے، کیسے ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے بڑا وقت لگے

گا۔ تم میرا انتظار کرو۔ ماثرہ کو اس وقت تو اس بات کی اتنی سمجھ نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کا پس منظر جاننے تھی۔ اسے جب جعفر نے بتایا تو

نجانے اسے یہ کیوں لگا کہ وہ فہد کو خود کھونگی ہے۔ ایک دم سے ہی وقت اور حالات اسے کمر درے لگنے لگے تھے۔

وہ اپنے آفس میں بے چین تھی۔ اس سائے شام کے وقت وہ اپنے آفس ہی سے جعفر کے گھر چلی گئی تھی۔ جعفر اس وقت اپنے

کمرے میں کسی فائل پر کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب اس نے تو فہد کو سمجھانے اور مل کر اس سے بات کرنے کے

بارے میں کہا تو جعفر نے اس کے جانے کے بارے میں ساری بات کہہ دی۔ اس نے کچھ بھی ماثرہ سے نہیں چھپایا۔ تبھی وہ ایک دم سے

افسردہ ہو گئی۔ اس کا افسردہ چہرے پر رنجیدہ احساس پھیل گیا تھا۔ کافی دیر ماثرہ خاموش رہنے کے بعد گلوگیر لہجے میں بولی

”تو وہ چلا گیا۔ جعفر! مجھے بتاؤ۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی مجھے اس نے سزا دی۔“

”یقیناً وہ تمہاری محبت کا اہل نہیں تھا۔“ اس نے دھیرے سے کہا تو وہ حیرت سے بولی

”تم؟ جعفر یہ تم کہہ رہے ہو۔ جو خود اس پر اپنی جان نچھاور کر سکتا ہے۔ میری بات چھوڑو، تم بتاؤ تم اس کے لئے پر محسوس کیوں ہو؟“

”اس لئے کہ وہ میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ اس نے پوچھا

”بچی کد آخرا مکی کون سی مجبوری تھی جو اس نے یہاں کی پرسکون زندگی چھوڑ کر خود کو نقل گاہ میں جھونک دیا۔“ مائرہ نے غصے میں کہا

”تم صرف اپنے لئے سوچ رہی ہو کہ وہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں۔ کیا واقعی اسے تم سے محبت تھی؟“

جعفر کے لہجے میں طنز تھا

”میں اس کے دل بارے تو نہیں جانتی کہ میں اس میں ہوں یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں

۔ اور پھر۔! اس نے یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“ وہ صاف انداز میں بولی

”تو بس مائرہ۔! ہم اپنے اپنے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں۔ ہم اپنے ہی بنائے ہوئے معیار پر دوسروں کو پرکھتے ہیں۔ کبھی یہ

جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ دوسرے اپنے دائرے میں کیسے زندہ ہیں۔ اُن کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں اس کی

آنکھوں میں دیکھتا ہوا بول تو مائرہ نے بے بسی سے کہا

”میں بہت ڈسٹرب ہوں جعفر۔! یہ دل اسی کے نام پر دھڑکتا ہے۔“

”صرف اپنے لئے سوچ رہی ہونا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ کیسی خود غرض محبت ہے۔ لیکن ذرا سوچو، تمہاری محبت میں اتنی بھی قوت

نہیں کہ یہ جان سکے، وہ یہاں سے کیوں گیا۔ خدا را اسے طرمت سمجھنا۔“ جعفر نے کہا تو مائرہ نے اس کی طرف چونک کر دیکھا، پھر سر سراتے

ہوئے بولی

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”بچی بات میں نے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ایک ایک پہلو اس کے سامنے رکھا جو اس نے اپنی دلیلوں سے رو کر

دیا۔“ اس نے بے بسی سے کہا

”اُسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ جو ش انتقام میں اس قدر حواس کیوں کھو بیٹھا ہے۔ اور اس طرح اچانک چلے جانا۔“ وہ الجھتے ہوئے بولی

”اچانک نہیں مائرہ۔! وہ اپنی ذات کے ساتھ Committed ہے اس نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ بلکہ اپنا قرض اتارنے خود

عی چل دیا۔ وہ قرض جس کا بوجھ وہ اپنے کاندھوں پر بچھن سے لئے پھرتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے سلگ رہا اور اب آگ اس کے بس سے

باہر ہو گئی ہے۔ اور اس آگ میں ساری محبت، ساری دوستی اور سارے جذبات، جل کر بھسم ہو گئے ہیں میں تمہیں وجہ بتا چکا ہوں کہ وہ کیوں

گیا۔“ جعفر نے بے حد جذباتی ہوتے ہوئے کہا، لہجہ بھر سانس لینے کے بعد بولا، ”ہم اپنی محبت اور دوستی کو رو رہے ہیں۔ مگر، میں یہ کہتا

ہوں۔ کیا اس کے چلے جانے کے بعد ہم اسے بھول جائیں گے۔ کیا اسے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ کیا اسے ہم یقین نہیں دیں گے کہ وہ جہاں

بھی ہے، ہم دونوں کی محبت اور غلوں اُس کے ساتھ ہے؟“

”کیوں نہیں، میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اسے واپس لایا جائے۔ وہ جس مجبوری میں دہاں گیا ہے۔ اسے ہم مل کر ختم کر

دیں۔ ظاہر ہے اسے ہماری ضرورت تو ہوگی۔“ مائرہ نے کہا

”بس یہی اعتماد چاہئے۔ وہ آئے گا ایک دن، ضرور آئے گا۔ وہ جیسے شعر کا مصرع ہے نا۔ لوٹ آئے گا پرندہ، یہ شعر جانتا ہے۔“

جعفر نے تھمتاتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا تو حسرت سے بولی

”ہاں۔! اسے آنا ہی ہوگا۔“

اگرچہ وہ کافی دیر تک فہم کے بارے میں بات کرتے رہے، تاہم اس کا اپنا دل مضطرب ہو گیا تھا۔ سرشام ہی وہ اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گئی اور اس کے آنسو بہتے چلے گئے۔ وہ ان سارے آنسوؤں کو بہا دینا چاہتی تھی۔ وہ ہچکیوں میں رو رہی تھی۔ جیسی اس کا تیل فون بجا۔ مائرہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسکرین پر دیکھا، وہ جعفر کا فون تھا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیکل ہوئی آواز میں کہا

”ہیلو جعفر۔“

”میں جانتا تھا کہ تم اس وقت رو رہی ہو گی۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا

”نہیں تو۔! میں کیوں روؤں گی۔ تم نے غلط اندازہ لگایا۔ اور یہ تم غیبتی کب سے ہو گئے ہو۔“ اس نے جھوٹ بولتے ہوئے خود

پر قابو پاتے ہوئے کہا

”نہیں مائرہ۔! تم جتنا بھی جھوٹ بولو۔ مگر تمہارا دل گواہی دے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ دھستے لہجے میں بولا

”تو پھر اور کیا کروں جعفر۔! فہم نہیں ملتا تھا تو دل اتنا بے قابو نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جہاں پر وہ ہے۔ وہاں اکیلا ہے۔ میں بے

بسی میں کیا کروں۔“ اس نے بے تابی سے کہا

”اُسے کچھ نہیں ہوتا۔ خیر۔! تم رونا دھونا بند کر دو تو ایک بات کہوں۔“ اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا

”کہو۔! میں سن رہی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی

”کل لُچ میرے ساتھ لو۔ تم اپنی پسند کار۔ ستوران بناؤ گی یا میں بناؤں۔“ وہ شوخ انداز میں بولا

”کیوں۔! کوئی خاص بات؟“ اس نے چونک کر پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا

”میں صرف دیکھنا یہ چاہتا ہوں کہ روتے ہوئے تمہارا چہرہ کیسے لگتا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ مائرہ نے ایک دم سے مسکراتے ہوئے کہا

”مسکراہٹ آئی ہے نا تمہارے چہرے پر؟“

اس کے یوں کہنے پر وہ چونک گئی، پھر سچ کہا

”ہاں آئی ہے۔“

”اور دوسری بات۔! اپنے ارد گرد دیکھو، تمہارے ساتھ مل کر رونے والے بھی کچھ لوگ ہیں۔ اور وہ تمہارے اپنے ہیں۔ ان کا

خیال کیا کرو۔“ وہ پھر اسی شوخ لہجے میں بولا تو مائرہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں سمجھتی نہیں۔“

”کل سبھاؤں گا۔ تو پھر کل پکا۔ اب اچھے بچوں کی طرح یہ دونوں دھونا بند کرو اور سو جاؤ۔ کل بہت ساری باتیں کریں گے۔ میں خود

تمہارے پاس آؤں گا تمہارے آفس۔ اب گڈ نائٹ۔“

”گڈ نائٹ جعفر۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا، ٹیبل بسپ آف کیا اور آنسو صاف کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ وہ

اپنے دماغ میں کسی طرح کا بھی کوئی خیال نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ اسے لگا جیسے جعفر کا فون اسے پرسکون کر گیا ہے۔ وہ اس کی باتوں پر غور کرتی ہوئی بجائے کب نیند میں کھو گئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو تازگی کا احساس لئے ہوئے تھی۔ وہ تیار ہو کر اپنے آفس چلی گئی۔ دو پہر سے ذرا پہلے جعفر اس کے پاس

چمیل آ گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے دوران کافی آگئی۔ تبھی مائرہ نے پریشانی میں کہا

”میں نے اپنے ذرائع سے پتہ کیا ہے۔ فہد جس بندے سے ٹکر لینے گیا ہے، وہ بہت طاقت ور ہے۔ ایک طرح سے وہ اپنے

علاقے پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اس کے سامنے اکیلا فہد کچھ بھی نہیں ہو گا۔ وہ تنہا ہے، چوہدری تو اسے۔۔۔ بندہ کچھ تا کچھ تو اپنے تحفظ کا احساس کرتا ہے۔“

”بلاشبہ اس کے اندر انتظام کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ“ جعفر نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی

”انتظام کا جذبہ جتنا مرضی شدید ہو مگر طاقت کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا وہ خود اپنی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔

ہمیں کچھ کرنا ہو گا جعفر۔“

”مجھے تو یہی دکھ ہے مائرہ۔ اب یہاں اتنی دور بیٹھے ہم اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔“ اس نے مائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

تو طرہ لہجے میں بولی

”تم نے ہی کہا تھا جعفر کہ کیا ہم اسے بھوسا بنائیں گے۔ اسے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ کیا اسے ہم یہ یقین نہیں دیں گے کہ وہ

جہاں بھی ہے۔ ہم دونوں کی محبت اور خلوص اس کے ساتھ رہے گا۔“

”ہاں، کہا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے، لیکن کیسے؟ یہی تو سوچنے والی بات ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا

”جو بھی ہو سکا، ہمیں وہ کرنا تو ہے نا۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تو نہیں رہیں گے۔ سوچنا یہ ہے کہ یہاں بیٹھ کر ہم کیا کر سکتے

ہیں؟“ وہ ہر جوش انداز میں بولی

”تو کیا کریں۔ بتاؤ، میں ابھی وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ اس نے حتیٰ لہجے میں کہا

”دیکھو۔! اس وقت سب سے پہلا مسئلہ اس کے تحفظ کا ہے۔ اور ہمیں یہ کرنا ہے کہ کچھ ایسا کریں، جس سے کم از کم اس کا تحفظ

ضرور ہو جائے۔“ مائرہ سوچتے ہوئے بولی

”یہ پولیس کا کام ہے کہ وہ عوام کو تحفظ دیں۔ اور جہاں پر وہ ہے وہاں انہی لوگوں کی پولیس، تھانہ اور کچہری ہوتے ہیں۔ یہاں فہمہ کچھ بھی ہو، لیکن وہاں اس کی حیثیت ایک عام شہری کی بھی نہیں ہوگی۔“ جعفر نے تشویش سے کہا

”پولیس۔! اسے تحفظ دے گی۔ میں کچھ کرتی ہوں۔ تم بھی تو اسے ایس پی ہو، مجھے مشورہ دو، میں کیا کروں۔“ اس نے جعفر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا

”وہاں کے سارے علاقے کا انچارج ڈی ایس پی ہی ہے۔ اسے کہلوادو۔“

یہ سن کر مائرہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا، پھر انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور نمبر مانے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی رابطہ ہو گیا تو وہ بولی

”مجھے آئی جی پولیس سے بات کرنا ہے۔ ان سے ملائیں۔“

یہ کہہ کر وہ ریسیور رکھ دیا اور بے چینی سے ریسیور کو تکتے لگی۔ جعفر یوں سر ہلانے لگا جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ مائرہ کیا چاہتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد فون کی بزرگ بجتے پر اس نے جلدی سے ریسیور اٹھاتے ہوئے اسٹیکر آن کر دیا، پھر لو بھر بعد بولی

”سر میں مائرہ بات کر رہی ہوں۔“

”اوہو۔! بہت دنوں بعد انکل کی یاد آئی ہے۔“ دوسری طرف سے خوشگوار انداز میں شکوہ کیا گیا

”سوری انکل، اتنا بڑی ہوتی ہوں نا۔۔۔۔۔“

”مجھے پتہ ہے، فی وی اسکرین تمہاری مصروفیت بتا رہی ہے آج کل، مٹاؤ کیا کام ہے۔“

”ویسے فون تو میں نے کام ہی کے لیے کیا ہے انکل، ایسا ہے کہ فور پور کے ساتھ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے قسمت نگر۔ آج کل وہاں ہمارا ایک دوست گیا ہے۔ ممکن ہے وہاں اس کی جان کو خطرہ ہو۔ اس کی تفصیلات میں آپ کے آفس میں آ کر بتاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹا تو آ جاؤ نا۔ یہاں بیٹھ کر آرام سے بات کر لیں گے۔ لیکن آنا جلدی، مجھے کہیں چاہیے۔“

”اوکے انکل، میں ابھی آئی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ریسیور رکھا اور جعفر کو چلنے کا اشارہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جعفر کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔



قسمت نگر میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ موسم خاصا اچھا ہو گیا ہوا تھا۔ فہمہ ہادھو کر تیار ہو چکا تھا۔ وہ صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھا تو سسٹی اس کے لئے چائے لے کر آ گئی۔ کرسی کے پاس پڑی تپائی پر کپ رکھتے ہوئے پوچھا

”آپ ناشتا بھی کریں گے یا کچھ دیر بعد؟“

”یہ تم مجھے آپ کیوں کہتی ہو۔ پہلے کبھی میں اجنبیت سے نہیں بلایا کرتی تھی۔ بھول گئی، ماننا اور میرا بچپن؟“ فہمہ نے خوشگوار انداز میں کہا

”آپ کو آپ، اس لئے کہتی ہوں کہ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔“ اس نے شرما تے ہوئے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا
 ”میرے ساتھ ساتھ تم بھی تو بڑی ہو گئی ہو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو سلمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا جو اسے بڑے غور سے دیکھ رہا
 تھا، جب وہ گھبراتے ہوئے بولی

”نہیں! میرا مطلب ہے۔ آپ بڑے آدمی بن گئے ہیں اور یہ آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“
 ”یہی کہ جب میں نے جہیں آخری بار دیکھا تھا تم چھوٹی سی تھی۔ اب تمہیں دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں کو بہت کچھ سمجھنا
 پڑتا ہے۔ روشنی جب زیادہ ہو تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔“ فہد نے کہا تو سلمیٰ گھبراتے ہوئے بولی
 ہاں شاید۔ مجھے یاد نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”استاد جی بتا رہے تھے کہ تم نے بی اے کر لیا ہوا ہے۔ کیسے کر لیا یہاں تو بہت مشکل تھا۔“ فہد نے پوچھا تو اعتماد سے بولی
 ”جی۔ امیں نے بی ایڈ بھی کر لیا ہے۔ یہ سب ابا جی کے حوصلہ دینے کی وجہ سے ہوا۔ وہ مجھے پڑھاتے رہے اور میں پرائیویٹ
 امتحان دے کر پاس ہوتی چلی گئی۔ آپ بتائیں ناشتہ لاؤں؟“
 ”تم بہت اچھی ہو۔“ وہ بولا تو سلمیٰ نے حیرت سے کہا
 ”اتنی سی بات پر آپ نے اتنی بڑی رائے قائم کر لی؟“

”ہاں۔ اچوں کو دیکھو تو پہلی نگاہ میں رائے خود بخود بن جاتی ہے۔“ اس نے ایک دم سے کہا پھر لڑکھنوا موٹی کے بعد آرزو
 لہجے میں بولا، ”خیر۔ امیرے جانے کے بعد میری وجہ سے استاد جی نے بہت مشکل وقت گزارا۔ اس سے تمہاری زندگی بھی متاثر ہوئی۔
 اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔“

”ہمارا تو جیسے جیسے وقت گزرا، گزرا گیا۔ آپ کا وقت شہر میں کیسا گذرا؟“ سلمیٰ نے پوچھا تو فہد نے کھری سانس لے کر کہا
 ”آہ۔ امیرا وقت کیسے گزرا۔ ایک غریب دیہاتی لڑکا، جو اپنی پڑھائی پوری کرنے کے لئے دن بھر محنت کرتا رہا۔ اس کا وقت
 کیسے گزرا ہوگا۔ تم خود اندازہ کر سکتی ہو۔“

”اندازے اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فہد صاحب۔ بہت سارے سوال ہیں میرے ذہن میں۔“ اس خیز انداز میں کہا
 ”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ یہاں تک کہ کوئی بھی سوال نہ رہے گا۔ استاد جی آ جاتے ہیں تو ناشتہ بھی کر لیتے ہیں۔
 پھر میں آج اپنے پرانے دوستوں سے ملنے جاؤں گا۔“ اس نے خیالوں میں کھوئے ہوئے انداز میں کہا

”ٹھیک ہے، جیسے آپ چاہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔ فہد اس کی طرف دیکھتا ہوا اسکا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ دیرانوں میں
 بھی ایسے نرم و نازک اور خوبصورت رنگوں والے پھول کھل جانا نئی اور انوکھی بات نہیں، جن کی خوشبو سے انسان پورے وجود سے مہک جائے۔
 ناشتے کے بعد وہ اپنی کار لے کر سیدھا چوراہے پر چلا گیا۔ فہد کی کار چوراہے میں آ کر رکی تو لوگوں نے چونک کر اس کی جانب

دیکھا۔ وہ کار سے اتر اور چلتا ہوا سیدھا ان کے پاس چلا گیا جو برگم کے درخت تلے بیٹھے تاش کھینے میں مصروف تھے۔ اس نے جاتے ہی اونچی آواز میں کہا

”اسلام علیکم بزرگو۔“

تقریباً سبھی نے ایک زبان ہوتے ہوئے سلام کا جواب دیا تو چاچا سوہنا سے غور سے دیکھنے کے بعد بولا

”اوہو علیکم اسلام۔ اکون ہے جوان تو؟ پچھانا نہیں تجھے؟“

اس پر فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

”لیکن میں آپ سب کو پہچانتا ہوں۔ تو چاچا سوہنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھیک گیا۔ پھر درد بھرے لہجے میں اس کے

چہرے پر دیکھ کر بولا، ”وہ چاچا سوہنا، جواب پوڑھا ہو چکا ہے۔ بیوہ چاچا سوہنا تانکے والا ہے، جس نے میری جان بچائی تھی۔“

چاچا سوہنا ایک دم سے چونک گیا۔ تاش کے بچے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ وہ خوشگوار حیرت سے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے لرزتی آواز میں بولا

”اوئے تو فہد ہے، اپنے فرزند حسین کا بیٹا؟“

اس کے یوں پوچھنے پر وہاں دبیسی دبیسی چہ میگوئی ہونے لگیں۔ سبھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ فہد نے ہاں میں سر ہلایا تو چاچا

سوہنا انتہائی خوشی سے بولا

”اوئے آتش کے بجلی آتش کے بھل شام سے بڑے چہچہ ہیں تیرے پورے قسمت نگر میں۔“

”ہاں چاچا۔ اتہارا بیٹا اشفاق جو میرا کلاس فیلو تھا۔ کہاں ہے وہ؟“

”پتہ نہیں مج سے میرے ساتھ ہی گھر سے نکلا ہوا ہے، جی کرے تو ابھی آجائے، یا پھر گھر میں ہوگا۔ تو اتنا اتنا عرصہ کہہ رہا، اب

اچانک کیسے؟“ چاچے سوہنے نے پوچھا تو جتے ہوئے بولا

”میں ٹھیک ہوں چاچا۔ کیا ساری باتیں ابھی پوچھ لے گا۔ میں ہمیشہ کے لئے آگیا ہوں۔ اب میں آپ لوگوں کے ساتھ ادھر گاؤں

میں ہی رہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ قریب بیٹھے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا۔ پھر وہیں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی وہیں پر موجود ایک بندے نے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے، پر تو رہے گا کدھر؟ تیرے گھر میں تو چوہدہری نے اپنے ڈنگر باندھے ہوئے ہیں اور وہ جو تیری چند ایکڑ زمین

ہے۔ اس پر ان ڈنگروں کے لئے چارہ اگتا ہے۔“

”میں آگیا ہوں نا۔ اب گھر بھی لے لوں گا اور زمین بھی۔“ فہد نے سکون سے کہا تو چاچا سوہنا جلدی سے بولا

”مگر کیسے۔ چوہدہری کی منت ترلا کر لی ہے تو نے؟“

”نہیں چاچا۔ اچوہدہری خود چھوڑے گا زمین اور گھر بھی۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تو وہاں پر

موجود لوگ چونک گئے۔ تبھی چاچا سوہنا جلدی سے بولا

”افند پتر۔ اچو ہدري کے خلاف بات نہ کر۔ ادھر بات منہ سے لکھی گی۔ ادھر چوہدري کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ شاید تمہیں نہیں پتہ، وہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو چکا ہے۔ تھانے پکھری میں اسی کی پھٹی ہے۔ کسی افسر کی مجال ہے جو اس کے آگے چوں چراں کرے۔ ہر بار وہی ایم این اے بنتا ہے۔ اب بھی وہ ایم این اے ہے۔ وہ چاہے تو.....“ چاچا سوہنا کہتا جا رہا تھا کہ فہد نے اس کی بات کاٹ کر کہا

”پتہ ہے مجھے۔ کیا آپ لوگوں کو نہیں پتہ دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے والا چور، ڈاکو اور لیٹرا ہوتا ہے۔ اور چوہدري، چوروں لیٹروں سے بھی زیادہ غلہ آدمی ہے۔ اس نے تو لوگوں کے وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ باقی رہی اس کے ہر بار ایم این اے بننے کی بات۔ اب وہ ایم این اے نہیں بنے گا۔ لوگ اب جاگ گئے ہیں۔ شعور آ گیا ہے۔ اب ایسے چور، لیٹرے اور قاتل ایم این اے نہیں بنیں گے۔ وقت بدل گیا ہے چاچا۔“

یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا پتر، سب ویسے کا ویسے ہے۔ لیکن تو بات سوچ سمجھ کے کر پتر۔ اگر ہمت ہے تو سیدھے اپنا گھر اور زمین لے لے۔ ورنہ چپ کر اور خاموش ہو جا۔ چوہدري کے کانوں تک بات پہنچنے دینا نہیں لگتی۔“ چاچے سوہنے نے اس سمجھتے ہوئے کہا

”چاچا۔ کیا یہاں اس چور ہے پر ہونے والی ہر بات چوہدري تک پہنچ جاتی ہے؟“ فہد نے پوچھا

”ہاں۔ ایم میں سے ہی ہیں وہ لوگ، جو اپنی وفاداری جتانے کی خاطر اسے جا کر سب بتا دیتے ہیں۔“ چاچے نے نفرت سے کہا

”یہ وفاداری نہیں، تلاشی ہے چاچا۔ اچھا ہے، یہ ساری باتیں اس تک پہنچ جائیں۔“ فہد نے کہا ہی تھا کہ اسنے میں ایک طرف سے پولیس وین نمودار ہوئی۔ چور ہے پر موجود سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ دین ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے پہلے دو سپاہی، پھر تھاندار نکل آیا۔ تھاندار فہد کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آیا۔ اس نے آتے ہی اپنی انگلی سے فہد کی ٹھوڈی کواٹھ یا پھر استہنائی بدتمیزی اور پر غرور لہجے میں بولا

”تم ہو فہد، جس نے چوہدري کبیر کے ملازم پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کی ہے۔“

اس پر فہد کو ایک دم سے غصہ آ گیا۔ اس نے اپنی انگلی سے اس کی انگلی کو پرے کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا

”تم بھی قہیزر سے بات کرو، ورنہ میری جرات کیا ہے، وہ میں تمہیں ابھی دکھاؤں کیا؟“

اس کے یوں کہنے پر تھاندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کبھی کسی کی اتنی جرات نہیں ہوئی تھی کہ اس کے سامنے بولے اور فہد نے ان سب لوگوں کے سامنے اسے بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے وہ جتنا لہجے میں بولا

”گنا ہے اپنے آپ کو بڑی توپ شے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو، چل تھانے۔ وہاں بتا دوں، قہیزر کیا ہوتی ہے اور جرات کس چیز کا نام ہے۔“

”ایسی دھمکیاں تم یہاں کے غریب اور بے بس انسانوں کو بہت دے چکے ہو انیسکڑ، یہ مجھ پر کوئی اثر نہیں کرنے والیں، اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے لے جا کر دکھاؤ تمھانے۔ ابھی تیری چڑیا طوطے دیکھ لیتا ہوں۔ لاؤ دکھاؤ، کہاں ہیں میری گرفتاری کے آرڈر؟“ فہد نے غصے میں کہا تو اس نے طرح پر لہجے میں کہا

”کافی بڑھا لگتا ہے۔ چل تجھے گرفتاری کے آرڈر بھی دکھاؤں اور۔۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے فہد کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فہد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسے سر دھک کر تے ہوئے بولا

”مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے سو دفعہ سوچ لو انیسکڑ، تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔“ فہد نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا: ”اب جاؤ

یہاں سے، اور ان سے کہنا کہ اگر ان میں دم ہے تو خود سامنے آئیں، تم جیسے مہروں کا سہارا نہ لیں۔“

اس کے یوں کہنے پر، سپاہیوں نے اپنی گتیں سیدھی کر لیں۔ تمنایدار نے فہد پر ٹکا ہیں گاڑے، ہاتھ کے اشارے سے انہیں

روک دیا پھر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے، خود دین میں جا بیٹھا۔ حیران و پریشان سپاہی بھی دین میں جا بیٹھے تو دین چل دی۔ وحوں کی اوٹ

سے چاچے سوہنے کا چہرہ ابھرا جو فور سے فہد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا

”اُدو خوش کیا پتر۔“ پھر پاس بیٹھے ایک بندے سے کہا: ”اُدے جاوے صلیفے سے ٹھنڈی بوتل لے کر آ فہد پتر کے لئے۔ پھر تجھے

چھ کے سے بھی ملواتا ہوں۔“

وہ بندہ اٹھ کر صلیفے کی دوکان کی طرف چل دیا۔ لوگوں کے لئے قسمت مگر میں انوکھا واقعہ ہو گیا تھا۔

کوئی دو تین گھنٹے کی کوشش کے بعد چھا کا اسے سراج کے ڈیرے پر ملا۔ سراج بھی اس کا کلاس فیلو اور بچپن کا دوست تھا۔ اُتے

برس بعد ملنے پر انہیں حیرت تو ہونا ہی تھیں۔ وہ دیتوں وہاں پڑی چار پائیس بیٹھے ہوئے تھے۔ حال احوال میں جب وہاں ان کے حالات

کا پتہ چلا تو دیتوں کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ فہد بولا

”یار امین کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں سمجھ سکتا ہوں اُس کی ذہنی حالت کیا ہوگی۔ اس انیسکڑ نے اسے غیر قانونی

طور پر بند کیا ہوا ہے۔“

”ان چوہدریوں کے لئے تو یہ معمولی بات ہے جس پر چاہیں ظلم کریں۔ غریب آدمی کا تو جینا مشکل کیا ہوا ہے ان لوگوں

نے۔ اور وہ کبیر۔ وہ تو ایسا منہ زور ہو گیا ہوا ہے کہ لگتا ہے اپنے باپ کی بھی نہیں مانتا۔ جو من میں آتا ہے وہ کرتا ہے۔“ چھا کے نے انتہائی

درومندی سے کہا تو فہد بولا

”بھئی تو امیہ ہے نا۔ یہ غریب لوگ تمہارا کر مار کھاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ ان چوہدریوں کی حفاظت

کرنے والے بھی تو غریب لوگ ہی ہیں۔ وسائل پر کابض لوگوں نے ایسا نظام بنایا ہوا ہے کہ کسی کو سمجھ ہی نہیں آنے دیتے۔ اور ایسا کر کے

یہ غریب خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔“

”یار! وہ جو مرضی کریں لیکن دوسروں کو بھی جیسے کا حق دیں نا۔ جائیدادیں بنالیں۔ ایم این اے کیا وزیر بن جائیں۔ لیکن غریب کے منہ کا نالہ تو نہ چھینیں۔ ان پر خوف تو مسط نہ کریں۔ انہیں بھی جیسے دیں۔ بندہ مار کر گواہی دینے والوں پر ظلم کرنا مردانگی تو نہیں ہے۔ ظلم ہے یہ۔“ سراج نے تلخی سے کہا

”بات صرف شعور کی ہے۔ ایک بندے کو بھی شعور آگیا تو سمجھو، اسی دن چوہدری کی یہ عسکرانی ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔“ فہد نے سکون سے کہا تو چھا کا بولا

”کیسے؟ یہ تو سمجھاؤ ذرا۔ باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے پیارے۔ تم نے شہر کی زندگی دیکھی ہے۔ یہاں رہو گے نا، پر کہاں رہو گے۔ چند دن بعد تم بھی چلے جاؤ گے۔ اسکا کر، تھک کر، دیوار میں ٹکریں مار مار کر خود کو زخمی کر کے۔“

”اؤ نہیں چھا کے ان کے ظلم اور زیادتی کا دور اب ختم ہو گیا سمجھو۔ وقت آگیا ہے کہ یہ سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ نہیں کر سکیں گے اب یہ کسی پر ظلم۔ اب تک اگر وہ ظلم کرتے رہے ہیں تو صرف تم لوگوں کی اپنی وجہ سے۔ جو اپنے دوٹ کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے۔ جس دن انہوں نے اپنے دوٹ کے استعمال کرنے کا گر سیکھ لیا۔ یہ چوہدری نظر نہیں آئیں گے۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو چھا کا ہاتھی میں بولا

”وہ حق کی بات ہے جب لوگ دوٹ ڈالیں گے۔ انہیں تو اپنا نہیں پتہ تم بات کرتے ہو لوگوں کے شعور کی۔ یہ سراج اس کا بھائی

امین، چار دن بعد اس کا پتہ چلا ہے۔ اب بھی وہ غیر قانونی طور پر اندر پڑا ہوا ہے پھر بھی کوئی کچھ دس نہیں یار اسے انصاف کس نے دینا ہے۔“

”کسی چوہدری یا وزیر نے نہیں، عوام نے دینا ہے۔ دکھاؤں تجھے عوام کی طاقت۔ چل اٹھ، ابھی چلتے ہیں، ابھی امین کو لے کر آتے ہیں۔“ فہد نے بڑے سکون سے کہا اور اٹھ گیا۔ سراج اور چھا کا دونوں اس کی طرف ہونٹوں کی طرح دیکھنے لگے۔ فہد کے چہرے پر گہری تنجید کی قمی۔ جسے دیکھتے ہوئے چھا کا اٹھ گیا تو سراج بھی کھڑا ہو گیا۔



چوہدری جلال اپنی حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی چوہدری کبیر بہت ناراض سا شخصے میں بھرا ہوا بیٹھ تھا۔ وہ رات دایس نہیں آیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آیا تو چوہدری کبیر اپنے فٹھی پر برس رہا تھا۔ اس نے سکون سے بیٹھنے کے بعد پوچھا

”بات کیا ہے فٹھی، کیوں ناراض ہو رہا ہے یہ تم سے؟“

”اوتی نکلے چوہدری جی کا جو ملازم ہے نا مکھ، اسے ماسٹر کے بیٹے نے مارا ہے۔“ فٹھی نے جھجکتے ہوئے چوہدری جلال کو بات بتادی، جسے سن کر چوہدری حیران ہوتے ہوئے پوچھا

”ماسٹر کا بیٹا؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی.....“ اس نے کہا چاہا تھا کہ اتنے میں اس کے قریب پڑے فون کی تھنٹی بج اٹھی۔

چوہدری نے بے خیالی میں ریور اٹھا کے کہا

”ہیلو۔“

”جی چوہدری صاحب۔ امیں وی ایس پی نیازی بات کر رہا ہوں۔ کیسے کیسے مزاج ہیں۔“

”ٹھیک ہوں۔ آپ سنا کہیں۔ کیسے یاد کر لیا۔“ اس نے ہنسی کی ہے کہ

”ایک چھوٹی سی انفارمیشن آپ سے شیئر کرنا تھی، اس لئے فون کرنا پڑا۔“ نیازی نے عام سے لہجہ میں کہا

”بولیں۔ کیسی انفارمیشن ہے؟“ اس نے پوچھا

”آپ کے گاؤں قسمت گھر میں کوئی فہد نامی نوجوان آیا ہے۔ کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے؟ میں اس کے بارے زیادہ تفصیل

سے تو آگاہ نہیں ہوں۔ پر اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔“ نیازی نے بتایا تو بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حالانکہ اس نے

گول مول انداز میں اپنا مدعا کہہ دیا تھا۔

”عام آدمی نہیں ہے۔ کیا آپ کا مطلب ہے وہ کوئی جرائم پیشہ ہے۔“ اس نے پھر بھی پوچھا

”نہیں۔ امیں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے لیکن اوپر سے مجھے اس کا بہت زیادہ خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔“ نیازی نے واضح لفظوں

میں کہہ دیا

”تو آپ خیال رکھیں۔ مجھے فون کر کے کیوں بتا رہے ہیں۔“ اس نے کافی حد تک مداحوس کرتے ہوئے کہا

”چوہدری صاحب۔! آپ برا نہ مائیں۔ وہ آپ کے گاؤں میں آیا ہے۔ ممکن ہے اسے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسی

حالت میں اس کے ساتھ تعاون کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس لئے میں نے احتیاطاً آپ کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔“ نیازی

نے قہر سے کہا

”چلیں ٹھیک ہے۔ میں آگاہ ہو گیا۔ خدا حافظ۔“ وہ اکتاتے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ نیازی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ چوہدری ریور رکھ کر ماتھے پر انگلی جمیرتے ہوئے سوچنے لگا جب

کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو فٹی سے پوچھا

”اُوئے فٹی، یہاں گاؤں میں کوئی فہد نام کا بندہ آیا ہے ان دنوں؟“

”ہاں جی، وہی فرزند حسین کا ہوا۔ وہ جس نے آٹھویں کے امتحان میں کوئی پوزیشن لی تھی اور۔۔۔“

فٹی نے بتایا تو بری طرح چونک گیا۔ چوہدری جلال اسی حیرت میں بولا

”یہ فہد! کیا یہ وہی ہے، جو، سردین محمد کے ساتھ تھا؟“ چوہدری جلال نے پوچھا تو برسوں پہلے جیسا ہوا اتفاقاً اپنی پوری توانائی

کے ساتھ اس کے ذہن میں ایک دم سے تازہ ہو گیا۔ بچپن کا فہد اس کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ میرے استاد کی شان میں گستاخی نہ

کرو۔ چوہدری جلال نے خود کلامی کے انداز میں زیر لب کہا، ”فرزند حسین کا بیٹا۔ فہد۔“

اسے لگا جیسے وقت ختم کیا ہے یا بھر وہ چلتے چلتے وہاں آ گیا ہے، جہاں سے وہ چلا تھا۔

چوہدری جلال کی آنکھوں میں غصہ، حیرت اور نفرت ایک ساتھ دکھائی جا سکتی تھی۔ اسے لگا جیسے زندگی کا ہر سطر دائرہ ہے اور وہ محکوم کر پھرد ہیں آگیا ہے جہاں سے چلا تھا۔ منشی فضل دین اس کے جذبات سے بخوبی واقف تھا اس لئے آہستگی سے بولا

”جی وہی تو ہے۔ اس نے تو آتے ہی کام دکھانا شروع کر دیا ہے، میں وہی تو بتا رہا تھا آپ کو۔“

تصدیق ہو جانے پر وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا، جیسے کوئی انہونی ہو جانے پر ششدر رہ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا، چوہدری کبیر تحارت سے بولا

”کہاں تک، کہاں تک وہ پرہیزگار، ایک ہی پہلے میں اس کے پرہیزگاروں کا۔ یہ منشی نے اپنے ذمے نہ دیا ہوتا تو اب تک میں اس کا کام تمام کر چکا ہوتا۔“

”نہیں کبیر پتھر نہیں، ابھی نہیں، میں اس معاملے میں تم سے پھر بات کروں گا۔ ابھی تم اس سے دور ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے منشی کی طرف دیکھا اور لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولا، ”منشی تم اس پر پوری نظر رکھو اور ہاں، یہ دیکھو گا ڈی تیار ہے تو پھر ڈیرے پر چلیں۔ بچاقت ہے اُدھر۔“

منشی فضل دین اس کی طرف دیکھتا ہوا باہر کی جانب چلا گیا، اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ چوہدری جلال کی ایسی خاموشی اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی بہت گھمبیر معاملہ درپیش ہو۔ کبیر اٹھ کر باہر چلا گیا مگر چوہدری جلال کو احساس نہیں ہوا کیونکہ وہ اپنی سوچ میں کھو گیا تھا۔



تقدیر پور قصبے میں تھا جو قسمت مگر جیسے گاؤں سے چند کلومیٹر دور تھا۔ فہد نے اپنی کار تھانے کے احاطے میں جا کر روکی اور نیچے اتر آیا۔ سراج اور چھانکا بھی کار سے باہر آ کر اس کے ساتھ اندر چل پڑے۔ تھانے کے اندر کمرے میں تھانیدار آستینیں چڑھائے، گریبان کے بٹن کھولے، میز پر ناگھیں رکھے ہوئے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک سپاہی اس کا سر دھو رہا تھا۔ فہد نے اسے اس حشرے کی کیفیت میں دیکھا تو میز بھا کر اپنی آمد کا احساس تھانے دار کو دلایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا اور انہیں پہچانتے ہوئے مسکرا دیا۔ چند لمحے ڈرامائی انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہا، پھر طنزیہ لہجے میں بولا

”اچھا کیا، تو نے تھانے میں آ کر خود کو پیش کر دیا ہے۔ ورنہ میں جو کچھ فیروزے بارے میں سوچ رہا تھا وہ اگر ہو جاتا تو... خیر تو نے گاؤں کے چوک میں جو ہیر و گیری دکھائی، چل میں اسے معاف کرتا ہوں۔“

فہد اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اسی طرح طنزیہ انداز میں کہا

”کٹہ چلیاں ایسے ہاتھ نہیں کرتیں۔ جو دوسروں کے اشارے پر ناچتے ہیں نا، ان کا اپنا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ ٹویں، امین کو

ٹوٹے جس بے جا کیوں رکھا ہوا ہے۔“

فہد کے یوں کہنے پر اس نے حیرت سے دیکھا پھر اپنی ناگھیں میز پر سے سیدھی کرتے ہوئے ایک ہٹکا رہا بھرتے ہوئے کہا۔

”ہوں! میرے ساتھ قانون کی زبان میں بات کرتا ہے ٹو۔ لیکن نہیں جانتا کہ یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ میں جو

چاہوں وہی قانون بن جاتا ہے۔“

”اب ایسا نہیں ہوگا انسپکٹر، تو نے امین پر جو ظلم کرنا تھا کر لیا۔ اُسے نکالا، کیونکہ میں نے اسے ساتھ لے کر جانا ہے۔ ورنہ تو جانتا ہے دفعہ تین سو پچاس کیا ہوتی ہے اور ہیلف کسے کہتے ہیں۔ مزید جانا چاہتا وہ بھی بتا دوں گا جو قانون ٹو نے نہیں پڑھا وہ میں پڑھا دیتا ہوں۔“ فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو تنیدار نے چونک کر دیکھا پھر غصے میں بولا

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“

”تو مجھے وہ طریقہ بھی آتا ہے، جس طرح تو نے امین کو غیر قانونی طور پر چس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ وہ طریقہ آزمائوں گا۔ سن۔ قانون ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو اسے مانتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے میز پر پڑی کتاب کو اٹھ کر کہا: ”یہ کتاب نمبر ایک ہے نا، اور اس میں امین کے بارے میں کوئی ایف آئی آر نہیں ہے۔ ہے تو دکھاؤ؟“

تنیدار نے پھر اسے چونک کر دیکھا اور غصے میں بولا

”چھوڑو، رکھو اسے، جمہیں یہ نہیں معلوم کہ اسے عام آدمی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے تنیدار نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن فہد نے بجائے کتاب اسے دینے کے، اسے کھول کر دیکھا اور پھر بند کرتے ہوئے وہ کتاب اسے دکھا کر بولا

”میں یہ کتاب لے کر جا رہا ہوں، روک سکتے ہو تو روک لو، یا پھر اپنے آفیسر کو فون کر کے میرے سامنے، میری لاقانونیت کے بارے میں بتاؤ۔“

تنیدار اس کی جرات پر ششدر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ہی بدل گئے۔ تبھی اس نے پہلی بار نرم لہجے میں کہا

”ٹھہرو، میں جانتا ہوں امین کو۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر تنیدار نے پاس کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا تو وہ تیزی سے باہر کی جانب چلا گیا تو فہد نے کہا

”دیکھ انسپکٹر، میری اور تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ تو صرف اپنی ڈیوٹی کر۔۔۔ ورنہ تو نے یہاں سے بھاگنا ہے اور میں نے جمہیں بھاگنے نہیں دینا۔ جنگ چاہے قانونی ہو یا غیر قانونی، میں وہ لڑنا جانتا ہوں۔“

تنیدار نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ وہ حولات سے امین کو لاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد سپاہی امین کو لے کر آگیا۔ امین کی حالت بہت خراب تھی۔ سراج نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے بھائی کو سنبھالا دیا۔ فہد نے سراج کو اسے باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔ سراج اور چھپا کا اسے لے کر باہر کی طرف چلے گئے۔ فہد، تنیدار کی طرف گہری لٹا ہوں سے دیکھتا رہا، جب وہ کچھ نہیں بولا تو فہد نے کتاب میز پر رکھی، مڑا اور باہر کی جانب چلا گیا۔ اسے یوں جانتا دیکھ کر سپاہی نے تیزی سے کہا

”یہ کیا ہو گیا سر جی؟“

”ابے چپ، دیکھ لیتا ہوں میں اس کو بھی۔ تو جا میرے لئے چائے لے کر آ، ساتھ میں پانی کا ایک گلاس بھی لے کر آ۔“

تھانیدار نے غصے میں کہتے ہوئے پہلے اپنی وردی اور پھر اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ سپاہی تیزی سے باہر نکل گیا کہیں فہد سے ہوئی بے عزتی کا سارا غصہ اس پر نہ نکل جائے۔

تھانیدار واقعی ہی بہت زیادہ بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی میز کے پار کرسی پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اسے فہم کے کبے لفظ یاد آرہے تھے۔ جو وہ ابھی کہہ کر گیا تھا کہ ”دیکھ تھانیدار، میری اور تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ تو صرف اپنی ڈیوٹی کر..... درندہ تو نے یہاں سے بھاگنا ہے اور میں نے تمہیں بھاگنے نہیں دینا۔ جنگ چاہے قانونی ہو یا غیر قانونی، میں دوڑنا جانتا ہوں۔“ وہ لفظ جو اس نے گاؤں کے چوک میں کہے تھے، وہ بھی اسے کچھ کے لگا رہے تھے۔

”ایسی دھمکیاں تم یہاں کے غریب اور بے بس انسانوں کو بہت دے چکے ہو انیسکڑ، یہ مجھ پر کوئی اثر نہیں کرنے والی، اگر تم میں بہت ہے تو مجھے لے جا کر دکھاؤ تمھانے۔ ابھی تیری چڑیا طوطے دیکھ لیتا ہوں۔ لاؤ دکھاؤ، کہاں ہیں میری گرفتاری کے آرڈر۔“

جس طرح وہ فہد کے کہے لفظوں بارے سوچ رہا تھا، اسی طرح، اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے میں سپاہی ایک ٹرے میں چائے اور پانی کا گلاس رکھے آگیا۔ تھا نیدار کو اس کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا۔ سپاہی قریب آ کر ٹرے میں ہر دھک کے جولا

”کیا سوچ رہے ہیں مہر جی“

”وہ فہد، اب میرے دماغ پر سوار ہو گیا ہے۔ جب تک اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے کہاں جین آئے گا بھلا۔“ قنیدار نے دانت پیستے ہوئے کہا تو سپاسی نے عیزی سے کہا

”اوسری، لگتا ہے وہ کوئی اُچی شے ہے۔ مجھے تو وہ کوئی نئے جہد والی چیز نظر آتی ہے۔“

”میں نے یہی کئے ہاتھ ہی تو اس کے کانٹے ہیں۔ تو اب دیکھتا جا۔۔۔“ اس نے سوچے ہوئے کہا

”سر جی، دیکھ میں۔ کہیں لینے کے دینے عیانی نہ پڑ جائیں۔“ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”اُوئے تو منحوس ہا تم ہی منہ سے نکالا کر۔ اُدئے تیری اتنی نوکری ہو گئی۔ تجھے اب تک پہنچ نہیں چلا کہ قانون کی طاقت کیا ہوتی ہے۔“ وہ حقارت سے بولا

”قانون تو سب کے لیے ایک جیسے ہوتا ہے نا جی؟“ سپاہی نے یاد دلا نا چاہا تو پھر اسی حقارت سے بولا ”ہونہہ! سب کے لیے ایک ہوتا ہے۔ اونے قانون بھی طاقت والوں کا ہوتا ہے۔ سن یہ جو قانون ہوتا ہے نا، اس کا پھندا اگر کسی کے گلے میں فٹ کر دیا جائے نا تو وہ بچ نہیں سکتا۔ بڑے بڑے مرٹم خان سدھے تیرے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ فیدہ بکل کا چھو کر اسے کیا پتہ قانون کی طاقت کیا ہوتی ہے۔“

”سرجی میں مانتا ہوں قانون کی بہت طاقت ہوتی ہے۔۔۔ مگر ایک بات بھوسوں رہے ہیں آپ۔“ آخر اس نے سیدھے سبب



”وہ کیا ادئے۔۔۔“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا

”یہ چوہدری کا علاقہ ہے۔ جو کچھ فہد نے یہاں آ کر کیا، جس طرح قانون کی زبان وہ بولا ہے، وہ یا تو کوئی پاگل کر سکتا ہے یا پھر بہت عقل اور حوصلہ رکھنے والا۔ جی بات تو یہ ہے وہ مجھے کوئی معمولی بندہ نہیں لگتا۔ وہ اگر اس علاقے میں آیا ہے تو کچھ سوچ کچھ کر آیا ہے۔“

سپاہی کے یوں کہنے پر وہ چند لمبے سوچتا رہا پھر دھیمی مسکراہٹ سے بولا

”کہہ تو ٹھیک رہا ہے، پر تو دیکھتا جا بس۔ اس کی سرری سوچ اور کچھ اس کے دماغ سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ یہ علاقہ چاہے چوہدری کا ہے۔ لیکن تجھ نے وار بھی اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ تو اپنی چھوٹی سوچ اپنے پاس رکھ۔۔۔“

یہ کہہ کر اس نے اٹھتے ہوئے اپنی وردی درست کی اور باہر کی جانب چل دیا۔

جس وقت فہد گاؤں کے چوراہے میں پہنچا۔ اس وقت سراج، چھاکا اور امین اس کے ساتھ تھے۔ چوراہے میں موجود چند لوگ بیٹھے ناش کھیل رہے تھے۔ چاچا سوہنا زور سے چہ مار کر اونچی آواز میں بولا

”لے فیر۔۔۔ کر تو اس پتے کا۔“

لفظ اس کے مدہی میں تھے کہ اسی لمحے فہد کی گاڑی آ کر چوراہے میں رکی، جسے سراج چلا تھا۔ چاچے سوہنے سمیت ہر بندے نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ چھاکے کو دیکھ کر حیران تھے۔ تبھی فہد اپنی گاڑی میں نکلا تو چاچا سوہنا زوردار آواز میں پھر بولا ”کر دیا تا تو فہد پتر نے انپکڑ کا، لے آیا ہے تا امین کو، وہ دیکھو۔“

سارے لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ تب فہد نے سراج سے کہا

”ہا چھوڑ آا سے گھر پھر جلدی واپس آنا۔ میں ذرا چاچے سوہنے کے پاس بیٹھا ہوں، تم جانتے ہو تا، یہاں بیٹھنا کیوں ضروری ہے۔“

”تا کہ چوہدری تک بات پہنچ جائے۔“ سراج نے غصے اور نفرت سے کہا تو فہد ہنستے ہوئے بولا

”وہ تو انپکڑ خود پہنچا دے گا، مگر عوام کو بھی معلوم ہونا چاہئے۔“

یہ کہہ کر فہد چوراہے میں درخت کے نیچے آنے کے لئے بیڑھا۔ سراج گاڑی لے چلا گیا۔ فہد وہاں ان کے درمیان جا کر بیٹھ گیا۔ چاچے سوہنے نے خوشی سے کہا

”واہ پتر واہ۔۔۔ یہ حیرانی کام تھا۔۔۔ شاید اب سوہنے رب کو قسمت مگر کی قسمت پر ترس آ گیا ہے۔“

”اوجا چا۔۔۔ بس تو دعا کیا کر۔۔۔ بھی تو یہ شروعات ہیں۔۔۔ اب دیکھنا آگے ہوتا کیا ہے۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا تو چاچا

سوہنا بول

”انپکڑ نے امین کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ وہ تو کسی کی ستھائی نہیں، پر حیرے آگے تو۔۔۔“

”اب اسے سب کی سننا پڑے گی چا چا۔ جب بندے کی نیت ٹھیک ہونا تو رب سائیں بھی کرم کرتا ہے۔“ فہد نے اسے سمجھاتے

ہوئے کہا

”یہ ہوا کیسے؟“ چا چا سوہنا حیرت سے بولا

”تو مگر سن چا چا۔۔۔“

فہد نے اس کی طرف دیکھا اور ساری روداد سنانے لگا۔



جب سے فہد گاؤں میں آیا تھا تب سے ماسٹر دین محمد زیادہ پراعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس وقت محن میں نہ تھی چارپائی پر بیٹھا ہوا اپنی ہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ سسلی اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ ماسٹر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”سسلی ہتر۔! کیا بات ہے، کیوں پریشان لگ رہی ہو؟“ ماسٹر دین محمد نے بڑے پیار سے پوچھا

”اباجی۔! ہم نے تو یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا؟ کیا فہد کے آنے سے ہم نہیں جائیں گے؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا

تو وہ بڑے اعتماد سے بولا

”ہاں، مجھے یقین تھا ایک دن رب سوہنا ہماری ضرورت سے گلاب مجھے یقین ہو گیا کہ رب تعالیٰ کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا ہے۔“

”اباجی۔ یہ تو ہم سوچ رہے ہیں نا۔ کیا آپ کی اس سے بات ہوئی؟ وہ ہمیں یہاں سے لے جانے آیا ہے یا وہ ہمیں رہنے آیا ہے؟“ سسلی کی الجھن اسی طرح تھی۔

”وہ ہمیں رہنے کے لئے آیا ہے۔“ ماسٹر نے حتمی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”سوال تو یہی ہے نا اباجی۔ وہ شہر کی سہولت بھری زندگی چھوڑ کر اس گاؤں میں کیوں آیا ہے۔ اور مگر وہ رہے گا کہاں؟ یہاں

ہمارے ساتھ رہے گا؟ کیا لوگ باتیں نہیں بنائیں گے؟“ اس نے محتاط انداز میں اپنی بات کہہ دی

”میں جانتا ہوں بیٹی۔! تم کیہ کہنا چاہتی ہو۔ مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اسے اس بات کا پوری طرح احساس ہوگا۔ میں خود غرض

بن کر اپنے سارے مسائل کا بوجھ اس پر نہیں ڈال دینا چاہتا۔ چند دن بعد میں اس سے بات کر لوں گا۔“ ماسٹر دین محمد نے سنجیدگی سے سمجھایا

”اور کیا آپ نہیں جانتے۔ ان چند دنوں میں کوئی طوفان بھی آ سکتا ہے۔ کیا چوہدری اس کا وجود یہاں برداشت کریں گے۔ یہاں

تو کچھ بھی نہ ہونے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے اس کے یہاں اس گھر میں رہنے سے میری ذات۔۔۔ وہ تیزی سے کہتے ہوئے رک گئی۔

”تم پریشان نہ ہو ہتر۔ جس طرح تمہارے ذہن میں سوال اٹھ رہے ہیں۔ اسی طرح میرے ذہن میں کئی سوال ہیں۔ لیکن یہ

بھی سوچو۔ کیا اس کے آنے سے ہمیں تحفظ کا احساس نہیں ہوا؟“ ماسٹر نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں اباجی۔ تحفظ کا یہ احساس برقرار رہنا چاہیے لیکن بدنامی کی قیمت پر نہیں۔ اسے کیا پتہ ہم کیسی زندگی جی

رہے ہیں۔“ وہ بولی

”ٹوٹکر نہ کر، رب کی عطا کیا ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے گا۔ میں ایک دون میں اس سے ساری باتیں کروں گا۔ میں اسے بتا دوں گا کہ ہم یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“ اس نے کہا تو وہ مطمئن ہو کر بولی

”ٹھیک ہے اباجی۔“

”اور ہاں۔“ وہ اتنے برسوں بعد ہمارے پاس آیا ہے۔ تم اس سے اجنبیوں والا سلوک نہ کرنا پتر۔ رب سائیں اچھا کرے گا۔ وہ اس خوف بھری کالی رات میں تحفظ کا احساس لے کر سورج بن کے ابھرا ہے۔ یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے سمجھایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی

”میں فہد کا بہت خیال رکھوں گی۔ وہ ہمارا حوصلہ بن کر آیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی اور ماسٹر دین محمد اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ سلی وہی سوچ رہی تھی جو اس کا باپ بھی سوچ رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ فہد سے بات ضرور کرے گا۔



سراج کا ڈیرہ گاؤں سے باہر کھیتوں کے درمیان تھا۔ اس وقت سراج کے ڈیرے پر رونق لگی ہوئی تھی۔ فہد، چھا کا، سراج ارا نہیں اور اس کے دوست کھیتوں کے درمیان ٹیوب ویل کے پاس چار پائیلوں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دور فہد کی کار کھڑی تھی۔ وہ خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران سراج نے بڑی ممنونیت سے کہا

”یار بہت خوشی ہوئی ہے میری ماں کو۔ کہ امین واپس پٹ آیا ہے۔ تمہیں بڑی دعائیں رہی تھی۔ کہہ رہی تھی جیہ نیک فرزند ہم کی تھا ویسا ہی اس کا پتر ہے۔“

”یار اس سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کسی کو بھی نہیں بھولا، اپنے دوستوں کو تو بالکل بھی نہیں۔“ چھا کے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”یار فہد۔! ان کی طرح مجھے بھی تجسس ہے تو کہاں رہا اتنا عرصہ۔“ سراج نے ان سب کی طرف دیکھ کر تجسس سے پوچھا تو

آہستگی سے بولا

”یہ ایک لمبی داستان ہے اور یہ وقت نہیں کہ میں سناؤں۔ میں اب یہاں آ گیا ہوں گا۔ ایک ایک کر کے ساری باتیں سناؤں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب تو یہاں رہے گا کہں؟“ سراج نے پوچھا

”میں سمجھ رہا ہوں، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں اپنے ہی گھر میں رہوں گا۔“ فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

”کیا ٹو ماسٹر دین محمد کو گھر کو اپنا گھر کہہ رہا ہے۔ وہ ہمارے تو پہلے ہی چوہدری کے ستائے ہوئے ہیں۔ تجھے کہاں تک اپنے پاس رکھیں گے۔ اور حیرا گھر تو چوہدریوں کے قبضے میں ہے۔ غنڈے بد معاشوں کی ایک فوج ہے اس کے پاس۔ جن کے بل بوتے پر وہ پورے

علاقے پر حکمرانی کرتا ہے۔“ سراج نے اسے سمجھایا تو چھٹکا تیزی سے بولا

”اور اس کا بیٹا چوہدری کبیر، اس کے ہاتھوں کسی کی عزت محفوظ نہیں۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔ رہوں گا تو میں اپنے ہی گھر میں۔ تم لوگوں کو میں کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے

کہا تو سراج نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

”تو اگر اپنے عیروں پر مضبوط رہے گا تو کم از کم میں تیرا ساتھ ضرور دوں گا۔ اپنے لئے تو لڑنا ہی پڑتا ہے۔ مگر جب دوسروں پر

مصلحت آتی ہے تو کبھی خوف کھا جاتے ہیں۔ اور پھر اب تو حیرانمہ پراسان بھی ہے۔“

”تم ہی ایسا نہیں سوچتے ہو سراج، اصل میں یہی خوف ہی یہاں کے ان سب لوگوں کو اکیلا ہونے کا احساس دے رہا ہے۔ انہیں

یہ یقین نہیں کہ ایک ایک مسئلہ حل کر دیا جاتی ہے۔ یہی تو انہیں سمجھانا ہے سراج۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

”تو پھر تو کیا کرے گا، یہ تو تھا؟“ سراج نے تجسس سے پوچھا تو فہد بولا

”میں فقط باتوں پر نہیں عمل پر یقین رکھتا ہوں۔ دیکھتا رہیں کیا کرتا ہوں۔“

”کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ چھٹکے نے پوچھا تو فہد نے پوی سمجیدگی سے کہا

”میں آج ہی اپنا گھر واپس لوں گا اور یہ رات اسی گھر میں گزاروں گا۔ آج گھر نہ لے سکا تو کبھی نہ لے پاؤں گا۔ اس لئے مجھے

ابھی جانا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر سب نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ چند لمحے کبھی خاموش رہے جیسے اس نے انہونی کہہ دی ہو۔ پھر

سراج نے ایک دم کہا

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آؤ۔“

یہ کہہ کر سراج اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ چھٹکا بھی اٹھا تو فہد بھی اٹھتا چلا گیا۔ فہد نے چند لمحے ان کی طرف دیکھا پھر خوشی سے بولا

”ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو چھٹکے۔ اگاؤں میں سے جتنے بھی مزدور مل سکتے ہیں۔ انہیں وہیں لے آؤ۔“

فہد کے یوں کہنے پر چھٹکے نے سر ہایا تو وہ یہ سب وہاں نکلنے چلے گئے۔

ان کے سفر کا اختتام فہد کے اس گھر کے سامنے ہوا جہاں سے وہ آخری بار اپنے استاد دین محمد کے ساتھ نکلا تھا۔ اتنے عرصے بعد

وہ اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ساتھ ہی ساری یادیں ایک دم سے اسے بے حال کر گئیں۔ اس کے اندر غصے کی تیز لہر اٹھ گئی۔ وہاں کئی

لوگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ چھٹکا مزدور لے آیا ہوا تھا۔ گھر کے چھٹکے کے سامنے کار روک کر فہد باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ہی سراج

تھا۔ تبھی چھٹکے نے زور سے آواز دی۔

”موہے، موہے سو بے۔۔۔۔۔“

آواز کے جواب میں پہلے تو کسی نے آواز نہیں دی، پھر اندر سے لمبے قد والے موہا باہر آ گیا اور آواز میں پوچھا
 ”کیا بات ہے؟“

اس کے جواب میں فہد ذرا آگے بڑھا اور سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا
 ”موہے۔ امیرانام فہد ہے، اور تمہیں معلوم ہے۔۔۔ یہ میرا گھر ہے۔۔۔ اس لئے اسے فوراً خالی کر دو۔“
 موہے نے پہلے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور پھر طنزیہ لہجے میں بولا

”اُوئے کون ہے تو۔ میں نہ تجھے جانتا ہوں اور نہ تیرے گھر کو۔ تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے یوں گھر سے نکال کر یہ بات کرنے کی۔“
 ”تمیز سے بات کرو موہے۔ اور سمجھ جا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں تمہیں آرام سے سمجھا رہا ہوں۔“ فہد نے بڑے قہر
 سے کہا تو موہا انتہائی حقارت سے بولا

”کڑی لگاتا ہے۔ لڑنے آیا ہے میرے ساتھ۔ اوئے تیری ہمت کیسے ہو گئی اوئے۔“

”دیکھو۔! میں تجھ سے لڑنے نہیں آیا۔ پیار سے سمجھا رہا ہوں۔ تو چوہدریوں کا نوکر ہے انہیں جا کر بتا دے کہ میں نے اپنا گھر
 لے لیا ہے۔“ اس نے پھر قہر سے کہا تو موہا طنزیہ انداز سے بولا
 ”اویں ایں لے لیا۔ تو اندر چل تو رکھ۔ میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

”لے پھر میں اندر جا رہا ہوں۔“ فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور گھر کے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا تو
 موہے نے چادر کے نیچے سے گن سیدھی کر لی۔ لیکن اگلے ہی لمحے فہد نے اسی گن پر ہاتھ ڈالا اور وہی گن جھین لی۔ پھر چشم زدن میں اس کا
 دستہ نکال کر اس کی گردن پر دے مارا۔ موہا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ فہد نے وہ گن سراج کو تھما کر موہے کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ گلی کی کچی دھول
 میں اٹ گیا۔ فہد نے اسے اٹھایا اور ایک گھونسلہ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی۔ فہد نے اپنی کھڑی آٹھیلیاں اس کی
 گردن کی جڑ میں ماریں تو وہ چکراتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ وہ چند لمحے دیں پڑا رہا پھر چانک اٹھا اور وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ جیسی فہد
 نے چھانکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”جا چمکے، اس کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دو۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے اس گھر کی صفائی چاہئے۔ میں بیٹھا ہوں
 یہاں پر۔“

یہ سننا تھا کہ وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے بندوں کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ گھر کے باہر کھڑا
 رہا۔ کچھ دیر بعد چھانک میں سے جانور نکل نکل کر جانے لگے تھے۔ فہد نے تھوڑی دیر مزید دیکھا اور سراج کو لے کے اندر چلا گیا۔

”اُوئے چھانکے۔! جا کچھ اور بندے لے کر آ۔“ فہد نے اونچی آواز میں کہا اور ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چھانکے نے سن کر
 ایک بندے کو باہر بھیج دیا۔

ذہلی ہوئی دوپہر میں اس پارک کی فضا بہت خوشگوار تھی۔ ہر طرف ہبزہ ہی ہبزہ تھا۔ دھمی دھمی ہوا چل رہی تھی۔ جعفر اور مائرہ ایک ہی سنگی ٹیبل پر بیٹھے، اس پورے ماحول میں ایک دوسرے سے اجنبی ہوئے لگ رہے تھے۔ کافی دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد جعفر نے دھیرے سے پوچھا

”کوئی خاص بات مائرہ! اتنی ابھی ہوئی کیوں ہو۔ اور یہ تو نے کچھ کے لیے کیوں منع کر دیا؟“

”میں ابھی ہوئی تو نہیں ہوں۔ فہد کے چلے جانے کے بعد یونہی اپنی کم مانگی کا احساس ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ میں شاید اس سے محبت ہی نہیں کر پائی۔ یہ پھر اسے مجھ سے محبت تھی ہی نہیں تھی یا پھر اسے تعلق کے درمیان، کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔“ مائرہ نے کسی نامعلوم نکتے پر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا

”تو پھر کیا سمجھ آئی تمہیں؟“

”اتنی جلدی کیسے سمجھا سکتی ہے۔ ابھی تو میں خود کو یقین دلارہی ہوں کہ فہد چلا گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے وہ پہلی کہیں ہے، یا پھر چند دن کے لئے غائب چلا گیا ہے۔ میں کیا کروں، میں خود سے کوئی سمجھوتہ ہی نہیں کر پارہی ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ وہ رونا نہا ہوتے ہوئے بولی

”کیوں نہیں کر پارہی ہو سمجھوتہ۔ حقیقت کا سامنا کیوں نہیں کر رہی ہو۔ حقیقت سے منہ تو وہ چھپاتے ہیں جن کے اپنے دل میں کوئی کھوٹ ہو۔“ جعفر نے کہا

”میرے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ میں فہد کو بھی الزام نہیں دے سکتی۔ پر میں کیا کروں، میرا یہ من، ماننا ہی نہیں ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی تو وہ حتیٰ لہجے میں بولا

”اپنے آپ کو سنبھالو مائرہ۔ ایوں آنسو بہاتے رہنے سے کیا ہوگا۔ وہ تجھے بتائے بغیر نہیں گیا۔ بلکہ اس نے تمہیں بتایا۔ اس کے دل میں تمہارے لئے اہمیت تھی تاہم وہ تم سے بہت اچھے انداز میں الوداع ہوا ہے۔ ورنہ وہ کسی کو بتائے بنا ہی جاسکتا تھا۔“

”یہی الجھن تو مارے جارہی ہے۔ میں یہ جان گئی ہوں کہ وہ اپنا انتقام لینے گیا ہے جو اس کی ذات پر بوجھ تھا۔ وہ اگر یہ فرض نہ چکاتا تو ساری زندگی بے چین رہتا۔ لیکن اصل دکھ تو یہ ہے کہ ہم اس کے پاس نہیں۔ اس کے دکھ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ بے بسی نہیں ہے۔“ وہ گہرے تاسف سے بولی

”میں تمہیں بہلانا نہیں چاہتا مائرہ۔ اوہ اگر ہم سب سے یوں تعلق ختم کر کے چلا گیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ وہ خود غرض نہیں ہے۔ یہ میں ابھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن کیا ہم اس سے تعلق ختم کر سکتے ہیں؟“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو وہ پر یقین سے لہجے میں بولی

”نہیں! ہم اس سے کبھی بھی تعلق ختم نہیں کر سکتے۔ وہ ہماری ذات کے ساتھ پوری طرح جڑا ہوا ہے اسے ہم اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے۔“

”تو پھر۔ اکیارو نے دھونے سے، اپنا آپ بے حال کرنے سے، اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ وہ چلا گیا ہے۔ تب اس کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ یقین مانو مائرو۔ ہم یہاں رہ کر بھی اس کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کے ایسے کونے میں نہیں چلا گیا۔ جہاں تک ہماری رسائی نہ ہو۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا

”تم ٹھیک کہتے ہو جعفر۔ مجھے اپنا آپ سنبھالنا ہوگا۔ لیکن ہم اس کی یہاں رہ کر کیسے مدد کر سکتے ہیں... ہمیں کچھ معلوم تو ہو۔ اس کے حالات کیا ہیں۔“ اس نے چوہکتے ہوئے کہا تو وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا

”میں سب دیکھ لوں گا۔ بس مجھے وہ پہلے والی ہنسی مسکراتی، مائرو چاہیے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے بولی

”تمہاری بات مان لیتی ہوں جعفر۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم مجھے وقت دیا کرو گے۔“

”پکا وعدہ۔“ اس نے دھمے سے لہجے میں کہا، پھر ہنستے ہوئے بولا، ”پتہ نہیں میں کب سے یہی چاہ رہا تھا، کہ تم مجھ سے وقت

مانگو۔ بھلا میں تمہیں وقت نہ دوں، یہ کیسے ممکن ہے یار۔“

جعفر نے ایک دم مسکراتے ہوئے کہا، جیسے اسے کوئی بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔ مائرو ہلکا سا ہنس دی پھر بولی

اب میں بتاتی ہوں کہ میں نے لٹچ کے لئے کیوں منع کر دیا تھا۔ آج میں بہت تھک گئی ہوں۔ آفس میں بہت زیادہ کام تھا۔ دل

چاہ رہا تھا کہ آج بہت دیر تک کھلی خض میں بیٹھی رہوں۔ میں نے سوچا تمہیں بھی بلا لوں۔“

”یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔ میں بھی گھر میں بور ہو گیا تھا۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دھمے لہجے

میں بولی

”اچھا ویسے، فہد سے تمہارا کوئی رابطہ ہوا؟“

”نہیں۔ اصل میں جس گاؤں میں وہ ہے۔ وہاں سیل فون کے سگنل نہیں ہیں۔ وہ اپنے قریبی قصبے نورنگر میں جب جاتا ہے تو

وہاں سے فون کرتا ہے۔ اس کے گاؤں میں لینڈ لائن فون بھی نہیں جو اس سے رابطہ ہے۔ اس لئے اب تک ایک بار ہی اس سے رابطہ ہوا

ہے۔“ جعفر نے یوں جواب دیا جیسے اس کا دل بچھ گیا ہو۔ وہ فہد کے ٹرانس میں سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ جبکہ مائرو اپنی ہی ذہن میں کہتی

ملی جا رہی تھی۔

”کہتے ہیں کہ ہم اتنی ترقی کر گئے ہیں۔ کہاں کی ہے ترقی... اپنے ہی ملک کے بہت سارے حصے ابھی ایسے

ہیں۔ جہاں بنیادی سہولیات تک میسر نہیں ہیں۔ نجانے اس طرف توجہ کب ہوگی؟“

”کیا تم نہیں جانتی ہو کہ دیہاتی اور درواز کے علاقوں میں ترقی کیوں نہیں ہوتی؟“ جعفر نے کہا

”جانتی ہوں جعفر، اصل میں اس مسئلے کے دو پہلو ہیں، ایک روایتی مفاد پرست سیاست دان اور دوسرے عوام خود۔“ اس گہری

سنجیدگی سے کہا۔

”کیسے؟“ جعفر بولا

”مقاد پرست سیاست دان بھی چاہتے ہیں کہ عوام ان کی محتاج رہے۔ ان کی حاکمیت برقرار رہے۔ علم کی روشنی ان تک نہیں پہنچتی دیتے۔ کیونکہ ان مقاد پرستوں کی موت ہے شعور اور تعلیم شعور دیتی ہے۔ جاگیرداری نظام کی موت ہے تعلیم۔“ وہ ایک دم سے پر جوش لہجے میں بولی تو جعفر نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا

”ہماری بات فون سے چلی تھی کہ یہ۔۔۔۔۔“

”اب ضرورت بن گئی ہے۔ عوام دوسرے لوگوں سے رابطہ کریں گے ہاشعور ہوں گے۔ کوئی جھگڑا ہو گیا، فون ہو گا تو فوراً پولیس کو کال ہوگی، نہیں کوئی سنے گا تو اخباروں کو میڈیا کو اور اعلیٰ حکام کو فون کال ہوں گئیں۔ ورنہ جھوٹی بیچ نکوں میں انصاف کا خون ہوتا رہے گا۔ یار ہسپتال جیسی بنیادی سہولت نہیں ہے، یہ علم نہیں؟“ مائرہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں تو جعفر نے کہا

”اور عوام کیسے؟“

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے ان سیاست دانوں سے۔ ان مقاد پرست سیاست دانوں کے چنگل سے کیوں نہیں نکلے؟ صحیح معنوں میں اپنی آزادی کا شعور کیوں نہیں حاصل کرتے۔ جب تک وہ اپنا آپ نہیں بدلیں گے اس وقت تک وہ یونہی پستے رہیں گے، ان پر ظلم ہوتا رہے گا۔ یہی مسئلہ کا حل ہے۔“ وہ اسی دکھ سے بولی، جیسے ایک دم سے سب کچھ بدل دینا چاہتی ہو۔ جب جعفر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”کاش میرے پاس جادو کی چٹری ہوتی، میں ایک دن میں ہی سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔ ویسے ہمیں خود بھی اپنا خیال کرنا چاہیے۔ اب دیکھو، تمہیں ضرورت محسوس ہوئی تھی تم نے سوچا۔ اب جسے ضرورت ہوگی۔ وہی خیال کرے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن فہم سے رابطہ بھی تو ضروری ہے نا۔ ہمیں وہاں کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہئے۔ اسے بھی احساس ہو کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اسے حوصلے ملے گا۔“ اس نے اپنے بات کا مدعا بتایا

”شکر ہے تم نے یہ تو مانا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، ٹھیک کر رہا ہے۔“ جعفر نے ہنسنے ہوئے کہا

”مجبوری ہے، خوشی میں تو نہیں نا۔ ان حالات کو قبول تو کرنا پڑے گا نا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو مذاق اڑانے والی انداز میں بولا

”ویسے تمہارے خوش نہ رہنے سے اس کے حالات درست ہو جائیں گے؟ یقیناً نہیں۔ ان حالات کو نارمل انداز میں لو۔۔۔ تو بہتر سوچ پاؤ گی۔ ورنہ تمہیں اپنا آپ سنبالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو جعفر۔ اچھے اپنا آپ سنبالنا ہو گا۔ لیکن تمہائی میں سوچوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے۔ میں تمہا ہو گئی ہوں۔“ اس نے عام سے لہجے میں اعتراف کیا

”تم اگر خوش رہنے کا وعدہ کر دو تمہاری ساتھ ہوں۔ دوسروں سے کہیں زیادہ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جعفر نے

اس کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مارہ نے اس کی طرف چونک کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی
 ”ٹھیک ہے۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔ میں اپنی ساری سوجھیں تم سے شیئر کر لیا کروں گی۔ وہ بھی جو پہلے شیئر نہیں
 کیا کرتی تھی۔“

”یہ میری خوش قسمتی ہوگی مارہ۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا تو مارہ نے اس کی جانب دیکھا اور بولی
 ”مجھے تم پر اعتماد ہے جعفر۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی، ”اب چلیں؟“
 ”اب کہاں؟“ اس نے پوچھا

”ایک اچھے سے لنگے کے لئے، من سے کافی بوجھ اتر رہا ہے تو بھوک چمک اٹھی ہے۔“ مارہ کے یوں کہنے پر وہ کھٹکھٹلا کر ہنس دیا
 ۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو مارہ نے اپنا ہاتھ اسے تھما دیا۔ وہ دونوں اٹھے اور پارک سے باہر جانے والی سمت کی جانب بڑھ گئے۔



چوہدری جلال کا ڈیرہ علاقے کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لوگوں کے درمیان میں بیٹھا بڑے شاہانہ انداز میں بات سن رہا تھا۔
 وہاں پچائیت چل رہی تھی۔ ایک آدمی اپنی بات کر رہا تھا
 ”چوہدری صاحب۔ ان دو بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم پر جھگڑا ہے۔ کون سی زمین کون لے گا، یہی جھگڑا اب ان دو
 خاندانوں کے درمیان لڑائی بن گیا ہے۔“

”ہوں۔“ چوہدری جلال نے ہنکارا بھرا، پھر ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“
 اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی آدمی جواب دیتا۔ موبہ اور قشعی جیزی سے وہاں آ کر ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ موبہ کی خستہ
 حالت پر چوہدری نے ان کی طرف چونک کر دیکھا۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کی توجہ بھی ان کی طرف چلی گئی تو چوہدری نے ان کی طرف
 دیکھ کر پوچھا

”اوئے نشی، خیر تو ہے۔ کیا ہوا ہے اسے؟“

”اسی سے پوچھ لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے موبہ کو خد کا دیتے ہوئے کہا، ”اوئے بتا اوئے۔“
 تبھی موبہ رو دینے والے انداز میں یوں بولا جیسے اس پر بہت غم کر دیا گیا ہو۔

”وہ جی فہد ہے نا۔ وہ جو ما ستر کے گھر آ رہا ہے۔ اس نے آ کر سارے ڈگر کھول دیئے ہیں اور گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ مجھے بہت مارا
 ہے جی۔“

اس کے یوں کہنے پر دونوں ہاپ اور بیٹے نے اس کی طرف دیکھا جیسے انہونی ہو گئی ہو۔ لوگوں کے چہروں پر خوف چھ
 گیا۔ چوہدری کبیر ایک دم غصے میں اٹھتے ہوئے بولا

”میں دیکھتا ہوں، چل مو بے میرے ساتھ۔ میں بتاتا ہوں اُسے، علاقے میں فتنہ گردی کیسے کرتے ہیں۔“

”ٹھہر دیکبر۔“ چوہدری جلال نے سکون سے کہا، پھر مو بے کی طرف دیکھ کر بولا، ”پہلے پوری بات سنئے دو۔“

”بات تو سن لی ہے بابا۔ یہ کیا تفصیل بتائے گا۔“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا

”سن لینے میں کیا حرج ہے۔“ چوہدری جلال نے اسی سکون سے کہا پھر مو بے کی طرف متوجہ ہو کر بولا، ”بتا ہوا کیا ہے؟“

اس پر مو بے نے پوری تفصیل بیان کر دی۔ وہاں موجود مجمع پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ آخر میں اس نے کہا

”انہوں نے اپنا سامان رکھ کر ہی مجھے یہاں آنے دیا ہے۔ سارا سامان سراج کے گھر سے آیا ہے۔“

”یہ سراج کون ہے؟“ چوہدری جلال نے اچانک اس کی بات کاٹ کر پوچھا تو منشی نے تیزی سے کہا

”جی، وہ امین آرائیں کا بھائی ہے۔ جسے فہد آج ہی تھانے سے لے آیا ہے۔“

”بابا۔ اس فہد کی بھی سزا ہے کہ اسے ابھی ختم کر دیا جائے۔ اور ساتھ میں اس سراج کو بھی۔“ کبیر نے غصے میں پاگل ہو جے

ہوئے کہا

”نہیں کبیر، مجھے نہیں لگتا کہ وہ اکیلا ہے۔ ایک اکیلا بندہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اوئے منشی۔“

”جی چوہدری صاحب۔“ وہ تیزی سے بولا

”لے جا مو بے کو اور اس کی دیکھ بھال کر، اور کسی کو بھیج، ڈنگروں کے بندوبست کرنے کا کہو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ وہ یوں بولا جیسے

یہ بات کوئی اہمیت ہی نہ رکھتی ہو۔ چوہدری ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ”ہاں بتا۔ اکیلا کہہ رہے تم؟“

چوہدری کبیر نے اپنے بابا کی طرف غصے سے دیکھا اور پھر اٹھ کر ڈیرے سے چلتا چلا گیا۔ جبکہ وہ اپنے بیٹے کے غصے کا احساس کر

رہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ سیدھا حویلی جائے گا اور یہ ساری بات اپنی ماں کو بتائے گا کہ اس کے باپ نے علاقے کے لوگوں کے

سامنے بے عزتی کرنا دوی۔

دھوپ میں حویلی چمک رہی تھی۔ بشری بیگم اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائیونگ روم میں آ گئی۔ جہاں حویلی کی ہر اہم اور نو جوان

ملازمہ رانی کو باہر والان میں دیکھنے لگی۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب دکھ پھیلا ہوا تھا۔ جیسے کوئی بات

اسے اندر ہی اندر سے کھ رہی ہو۔ وہ اس کے قریب والان میں چلی گئی۔ وہ اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے بشری بیگم کے آنے کا احساس

نک نہیں ہوا۔ وہ والان میں پڑے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی پھر دیمے سے لہجے میں بشری بیگم نے اسے مخاطب کیا

”رانی..... اؤ..... رانی۔“

جس پر رانی یوں چوکی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس لئے تیزی سے بولی

”جی..... جی..... بیگم صاحبہ جی۔“

”اے رانی کیا بات ہے، کن خیالوں میں کم ہے، کیا سوچ رہی ہے؟“ اس نے نرم سمجھ میں پوچھا

”ک... کک... کچھ نہیں... بس یونہی۔“ وہ ہڑبڑاتے ہوئے بولی تو لیوں پر خوشگوار مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی

”یہ عمر ایسی ہوتی ہے۔ ہر وقت خیالوں میں کھوئے رہنے کو دل چاہتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے بڑے خوب صورت خواب دیکھتا

ہے بندہ۔ بس اس وقت ہار جاتا ہے جب حقیقت میں دنیا کچھ اور طرح کی اسے دیکھنے کو ملتی ہے۔“

”غریب کے خواب کیا ہوتے ہیں بیگم صاحبہ... اور پھر اس معاشرے کی عورت... ایک کھونٹے سے کھوئی اور دوسرے کھونٹے

سے پاندھ دی اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو جینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“ اس نے انتہائی دکھ سے کہا تو بشری بیگم نے چوکتے

ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر سمجھاتے ہوئے بولی

”یہ تو کیا سوچ رہی ہے رانی۔ اتنا تلخ سوچوں کی نا تو زہر بدن میں پھیل جائے گا۔ اسی معاشرے کی عورت بن کر سوچ۔ تبھی

زندگی آسانی سے کٹے گی۔ عورت تیرے جیسے کسی غریب گھر کی ہو یا میرے جیسے کسی امیر گھر کی۔ اس کا مسئلہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے بیگم صاحبہ، عورت بھی تو انسان ہوتی ہے نا۔“ وہ اسی لہجے میں بولی تو بشری بیگم نے کہا

ہاں۔ اہوتی ہے، مگر اس معاشرے میں اپنا آپ منوانا بہت مشکل ہے۔ وہ چاہے اپنے گھر کا خون دیتی رہے۔ مگر بھی اسے وہ

حیثیت نہیں ملتی جو اسے ملنی چاہئے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک شاید کبھی نہ ہو سکے۔ تو سوچا نہ کر۔“

”اپنی سوچوں پر کہاں اختیار ہوتا ہے بیگم صاحبہ۔ اک یہی تو میری کنکلی ہے۔“ وہ بایست سے بولی تو بشری بیگم پھر سے چوٹک

گئی۔ وہ چند لمحے اس کٹی طرف دیکھتی رہی پھر بولی

”جمل اٹھ جا، میرے لئے چائے بنا لا۔ اپنے لئے بھی بنا نا، پھر تجھے بتاتی ہوں کہ آج کیا بنانا ہے۔“ بشری بیگم کے یوں کہنے پر

رانی نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ گئی۔

وہ آرزو ہو گئی تھی۔ بشری بیگم حسرت زدہ چہرہ لئے سوچوں میں ڈوب گئی۔ وہ اپنے خیالوں سے اس وقت نکلے جب چوہدری

جلال کی جیب حویلی کے پورچ میں آکر رکی۔

اس وقت چوہدری جلال اور بشری بیگم دونوں ڈرائیونگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اتنے میں باہر سے کبیر آ گیا۔ اس

نے اپنے والدین پر ایک نگاہ ڈالی اور ٹھہرے میں کسی سے بات کیے بغیر آگے بڑھ گیا تو چوہدری جلال نے اپنی گھمبیر آواز میں اسے پکارتے

ہوئے کہا

کبیر، ادھر آؤ۔ بیٹھو دھارے پاس۔“

وہ جاتے ہوئے ایک دم سے رک گیا، پھر پلٹ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا

”جی...“

”میں جانتا ہوں کہ تم اس قدر ناراض کیوں ہو۔ لیکن تمہیں ناراض ہونے کی بجائے حالات پر غور کرنا چاہئے۔ حالات دیکھ کر وار کرنے والی نالی کامیاب ہوتا ہے۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”کچھ بھی ہے بابا جانی۔ اس واقعے سے پورے علاقے میں ہماری کتنی بے عزتی ہوگی، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں روکنا بہت ضروری ہے۔“ کبیر نے انتہائی غصے میں کہا، جیسے اس کا بس نہ چل رہا ہو۔ اس پر چوہدری جلال نے گہری سنجیدگی سے کہا

”اوائے پاگل! احمد آدر کو بھی برتری ہوتی ہے کہ وہ حملے کے لئے تیار ہو کر آتا ہے۔ اس لئے غفلت کا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اس کی فتح وقتی ہے۔ فہد جتنا بھی پسینے خاں ہوگا۔ وہ اب سزا کا مستحق ہے، لیکن حالات دیکھ کر۔“

”بابا جانی! آپ بدل گئے ہیں یا آپ مجھے بدل دینا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ مجھے یوں کبھی نہیں روکتے تھے۔ اب کیوں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”وقت، میرے بیٹے وقت۔ اس لئے تم جذباتی فیصلے کرنے کی بجائے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر فیصلے کیا کرو۔ اب دیکھو۔ گاؤں کے لوگ خاموش تماشا شائی بنے رہے، اور موہے کو چھڑانے کے لئے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا، کیوں؟“ اس نے کبیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، جہاں غصہ ابل رہا تھا

”بہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آج وہ تماشا شائی بنے ہیں۔ کل ہمارا تماشا شیانے کیلئے نکل کھڑے ہوں گے۔ ہمارا دبدبہ ختم ہوتے ہی وہ ہمارے سر پر سوار ہو جائیں گے۔“ اس نے تیزی سے اپنی دلیل دی تو زہریلی سی مسکراہٹ سے بڑے غرور سے بولا

”اوائے نہیں ہوتا ہمارا دبدبہ ختم۔ تم خود کو ٹھنڈا کر کے سوچو۔ حالات کچھ اور کہہ رہے ہیں۔“

”آج فہد نے اپنا گھر لے لیا۔ کل اس نے زمین لے لی تو پورے علاقے میں۔“ کبیر نے کہنا چاہا تو بشری بیگم نے یاد دلانے ہوئے کہا

”گھر اور زمین اس کی ملکیت ہیں۔ ہمارا قصور وار ماسٹر دین محمد تھا۔ فہد اور اس کے ماں باپ نے تو یونہی سزا کاٹی۔ اب اچھے برسوں بعد وہ اپنی جگہ واپس لے بھی لے تو کیا حرج ہے۔ ہمیں شور شرابا نہیں کرنا چاہئے۔ اس کی زمین بھی اسے واپس کر دینی چاہئے۔ اسی میں عزت ہے ہماری۔“

اس کے یوں کہنے پر کبیر نے چونک کر اپنی ماں کو دیکھا اور پھر اپنی لہجے کو نرم بناتے ہوئے بولا ”پر یہ طریقہ تو نہیں ہے نا۔ وہ آتا ہمارے پاس منت سماجت کرتا۔ اور ہم اسے واپس کر دیتے۔ اس نے غصہ گروی کی ہے۔۔۔ یہ تو برداشت نہیں۔“

”ہر معاملہ گولی کی زبان میں یا پھر جلد بازی میں نہیں ہوا کرتا۔ ہمارا ایک سیاسی پس منظر بھی ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب لوگ ڈانگہ موٹے سے ڈر جایا کرتے تھے۔ اب تم بھی، کھیل تماشے چھوڑو۔ سیاست کے داؤ پیچ سیکھو۔ آج وہی زمیندار کامیاب ہے جو سیاست کرتا ہے۔ اور لوگوں کو اپنی عقل اسے باندھ کر رکھتا ہے۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”یہ سیاست بھی نا۔۔۔ بندے کو کزور کر دیتی ہے۔“ کبیر نے برا سامنا کرتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے کہا
 ”نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سیاست بڑی قوت ہے، جسے چاہیں باندھ کے رکھ دیں۔
 لیکن، سیاست کے میدان میں بہت سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ سیاست جذبات سے نہیں، ٹھنڈے دماغ سے کی جاتی ہے۔ اب تو عام آدمی
 بھی ووٹ دیتے ہوئے پکڑے جاتا ہے۔ عوام کو سمجھو کبیر عوام کو۔“

”ہا ہا جانی۔۔۔ اس فہد کا حوصلہ تو دیکھیں۔“ کبیر کی سوئی ابھی تک اس پرانگی ہوئی تھی۔

”یہ ہوئی نا سوچنے والی بات۔ انہیں حوصلہ کہاں سے ملا، وہ سراج جو اس کے ساتھ تھا۔ وہ امین آرائیں کا بھائی تھا نا۔ اس نے تو
 ہماری مخالفت کرتی ہے۔ سوچو، اب بہت سکون سے انہیں زیر کرنا ہوگا۔“ چوہدری جلال نے اسے حالات کے بارے سمجھاتے ہوئے کہا
 ”کبیر، تم اپنے بابا کی بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ حالات یہ ہیں کہ الیکشن ہونے والے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں بہت سوچنا
 ہے۔ یہ سمجھنا ہے کہ دشمن کوئی سازش تو نہیں کر رہا؟“ بشری بیگم نے کہا

”تمہیں پتہ ہے کبیر، میں دشمن کو کبھی مخالف نہیں کرتا۔ بھلا دشمن کو بھی چھوڑا جاتا ہے۔ اصل فتح اس وقت ہوتی ہے جب دشمن کی
 چال کا پہلے پتہ چل جائے۔ اس میں دماغ لگانا پڑتا ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا تو بشری بیگم اسے احساس دلاتے ہوئے بولی
 ”بیٹا، میں تم کو کبیر کہ کل تم نے اس خاندان ہی کا نہیں اپنے بابا کا سیاسی وارث بھی بننا ہے۔ اب تم دماغ کا استعمال زیادہ کیا کرو۔“

اسنے میں رانی ان کے قریب آ کر ہلکی سی آواز میں بولی

”کھانا لگ گیا ہے، چوہدری جی۔“

تبھی بشری بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا

چوہدری صاحب۔ ایہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ چلیں پہلے کھانا کھاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر بشری بیگم اٹھ گئی تو وہ دونوں باپ بیٹا بھی

اٹھ گئے۔



شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ سورج مغربی افق میں ڈوب گیا۔ سسلی جگن میں چولے کے پاس بیٹھی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔
 اس کی شوڑی اس کے گھٹنے پر تھی۔ وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔ اگرچہ مدقوق سابلب روشن تھا، لیکن چولے کی آگ سے اس کا چہرہ
 ستہری دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے خبر سن لی تھی کہ فہد نے اپنا گھر واپس لے لیا اور اس میں سامان بھی رکھ دیا ہے۔ جب سے وہ مسلسل سوچے
 چلی جا رہی تھی کہ یہ آپ نے کیا کیا فہد۔ ایسا سوچے سمجھے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو؟ ہم تو پہلے ہی بے بس ہیں۔ کس خطرے
 میں ڈال دیا ہے آپ نے۔ برسوں بعد جینے کا ایک سہارا نصیب ہوا تھا۔ صرف ایک دن سکھ کا سانس لینے کو ملا۔ کیا ہمارے نصیب میں کبھی
 سکھ نہیں ہوگا۔ اب نبھانے کیا ہوگا؟ میں اور میرا بڑا بھابھ کیا کر سکیں گے؟ نبھانے کس طرح کا انجام سوچ کر وہ ایک دم سے رو پڑی۔

اچانک اسے لگا جیسے فہد آکر اس کے باپ کے پاس محن بیٹھ گیا تھا۔ سلی جلدی سے اٹھی اور مگن کے دروازے کے ساتھ جا گئی، ان کی باتیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا۔

”فہد! یہ میں نے کیا سنا ہے... تو نے...؟“

آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میں نے اپنا گھر واپس لے لیا ہے۔“ فہد نے سکون سے کہا

”وہ بہت ظالم لوگ ہیں فہد! ماسٹر دین محمد نے سبے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ حوصلہ دیتے ہوئے بولا

”تو کیا ہوا استاد جی۔ ادنیٰ کفر کے ساتھ تو رہ سکتی ہے... ظلم کے ساتھ نہیں۔ آپ یقین رکھیں، جتنا ظلم انہوں نے کرنا تھا کر

لیا۔ اب ان کا کسی پریشانی والا ہاتھ سلامت نہیں رہے گا۔“

”تم اکیلے! میرا مطلب ہے... مقابلہ قوت قوت کا قوت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں

بوڑھا آدمی ہوں۔ ڈانگ سونا بھی نہیں اٹھ سکتا۔ پھر تمہارا ساتھ کیسے دے سکوں گا۔“ اس نے دکھ سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا

”آپ یقین رکھیں، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے ڈانگ سونے کی نہیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

”میرے بوڑھے اور لاغر وجود کا خیال کرنا۔ میں نے بہت سزا کاٹی ہے اور اب...“ آخری لفظ کہتے ہوئے ماسٹر کا لہجہ رعبہ

گیا۔ وہ جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پایا۔ تب فہد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہوئے انتہائی جذباتی انداز میں کہا

”استاد جی! آپ میرا حوصلہ ہیں۔ ایک آپ ہی تو اس دنیا میں میرا آسرا ہیں۔ مجھے حوصلہ دیں۔“

”حوصلہ تو بڑا ہے پتر۔ اپنا حوصلے کے صبر نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑا حوصلہ کیا ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس عمر میں اپنا

سب کچھ کھودوں۔ تیرے جیسا بیٹا لوٹ آیا ہے۔ یہی میرے لیے سات خزانوں جیسی خوشی سے کم نہیں۔“ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولا

”وہ دن ختم ہو گئے استاد جی، وقت اب آپ کے قدموں میں خوشیاں ڈھیر کرے گا۔ بس آپ مجھے حوصلہ دیں۔ مجھے آپ کی

دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ فہد نے، ماسٹر دین محمد کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

ماسٹر چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھ رہا اور پھر اعتماد سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پیار سے فہد کا کاندھا تھپتھپایا۔ اس

کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ تبھی سلی بھی اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دی۔



رات کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ سراج کے ڈیرے پر کچے کمرے میں دیا روشن تھا۔ سراج کمرے کے باہر بڑے اضطراب

سے ٹھہل رہا تھا۔ وہ بار بار راجی ریٹ واج پر دیکھتا اور پھر گہرے اندھیرے میں دیکھنے لگتا تھا۔ اچانک ایک طرف اس نے اپنی نگاہیں جم

دیں۔ بڑے سے آئینل سے منہ چھپے ایک لڑکی فصلوں کے درمیان بے راستے پر بھٹا انداز میں چلی آ رہی تھی۔ سراج ایک دم سے بھٹا

ہو گیا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ لڑکی قریب ہوتے ہوئے ڈیرے پر آگئی۔ اس نے آئینل ہٹایا۔ وہ حویلی کی ملازمہ رانی تھی۔ وہ سراج کے ساتھ فوراً ہی

کچے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔

”بہت دیر کر دی رانی تم نے، اتنے دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے۔ آج وقت ملا ہے تمہیں؟“ سراج نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو رانی نے خوف زدہ لہجے میں گلہ کرتے ہوئے کہا

”میں نے دیر کر دی؟ اپنا پتہ ہی نہیں اتنی دیر بعد آئے ہو شہر سے۔ مجھے تو لگتا ہے تم ہی دیر کر دو گے اور مجھے کوئی اور لے جائے گا۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟“ سراج نے چوہکتے ہوئے کہا تو رانی غصے میں بولی

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ دو دن پہلے پار گاؤں سے آئے تھے مجھے دیکھنے کے لئے۔ اماں بتا رہی تھی کہ انہیں رشتہ پسند آ گیا ہے۔ اب انہوں نے منگنی کر دی تو۔۔۔ پھر کوئی اور ہی لے جائے گا نا مجھے۔“

”میرے سوا تجھے کوئی نہیں لے جاسکتا۔ یہ امین والا معاملہ نہ آ جاتا۔ تو اگلے مہینے میں نے خود آ جانا تھا تا کہ تیرے والدین سے حیر ارشدہ مانگ سکوں۔“ سراج نے تلخی سے کہا

”یہی توجہ ہے کہ میں تجھے اتنے دن ہو گئے ملے نہیں آ سکی۔ اب جو حالات بن گئے ہیں، ان میں اگر حویلی والوں کو شک بھی ہو گیا تو پھر میری خیر نہیں ہے۔“ رانی نے خوف زدہ لہجے میں کہا

”تو کیا ان کی کوئی زر خرید ہے۔ چھوڑ دے تو کری ان کی اور اپنے گھر بیٹہ۔ میں بھیجتا ہوں اپنے والدین کو تمہارے گھر۔“ سراج نے کہا

”میں نے بات کی تھی اپنی ماں سے، وہ تو راضی ہے۔ انہیں تیرا جیسا داماد کہاں سے ملے گا، پر اباشاید راضی نہ ہو۔ وہ غیر بے ادبی میں رشتہ نہیں کرے گا۔“ رانی نے بتایا تو سراج نے سکون سے پوچھا

”یہ تیرا بھی دل چاہتا ہے یا۔۔۔؟“

”مجھ پر شک نہ کر سراج۔ میں نے تجھے اپنا دس دیا ہے۔ میں تجھے نہیں بھول سکتی۔ مگر یہ ذات پات کی رکاوٹیں، امیری، غریبی، اب تو یہ حویلی والے مخالفت کریں گے۔“ رانی نے بھی غصے میں کہا تو سراج بولا

”تو ساری دنیا کو چھوڑ، اپنی بتاؤ کیا چاہتی ہے؟ یہ بات یاد رکھنا، میں نے جو ہدیوں سے بدلہ ضرور لینا ہے۔“

”میں آج بھی تیری ہوں اور کل بھی تیری تھی۔ اب سارا معاملہ تجھ پر ہے۔“ وہ حتیٰ لہجے میں بولی

”تو بس پھر میرا یقین کر، میں تجھے کسی اور کی نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے جو بھی مخالفت کرے۔ آہیٹہ، دیکھ میں تیرے لئے کیا کچھ لایا ہوں اور تو سنا میرے بغیر تیرے دن کیسے گزرے۔“ سراج نے غماز آلود لہجے میں کہا تو رانی اس کی طرف دیکھ کر شرماتے ہوئے خود میں سٹ گئی۔ جیسی وہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں باتوں میں کھو گئے۔



دن کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ سسلی گھر کے سارے کام سمیٹ کر دالان میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ گیٹ پر دستک ہوئی۔ وہ مخصوص دستک تھی، جس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے گیٹ کی طرف گئی اور اسے کھول دیا۔ سامنے فہد کھڑا تھا۔ وہ ایک طرف ہو گئی تاکہ وہ گھر کے اندر آ سکے، جیسی فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”استاد جی نہیں آئے ابھی تک؟“

”نہیں، نماز پڑھنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ آج تو ضرورت سے زیادہ ہی انہیں دیر ہو گئی ہے۔“

اس نے بتایا تو فہد نے پلٹتے ہوئے کہا

”اچھا ٹھیک ہے، میں بھرا آتا ہوں۔ جب تک استاد جی بھی آجائیں گے۔“

تبھی سسلی نے جلدی سے کہا

”آپ نے ناشتہ نہیں کرا۔ آپ بیٹھیں، اباجی ابھی آتے ہی ہوں گے۔ اور میں آپ سے ایک بات بھی کہنا چاہ رہی ہوں۔“

آپ بیٹھیں نا۔“

فہد نے اس کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور گیٹ پار کر کے صحن میں پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔ اتنے میں سسلی بھی گیٹ بند کر کے آ گئی۔ وہ پاس بیٹھی تو فہد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا

”بولو۔ کیا بات کہنا چاہتی ہو۔“

”فہد۔ کیا آپ نہیں جانتے۔ یہاں رہتے ہوئے آپ کسی بھی خطرناک صورت حال سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی دشمن، کسی بھی وقت آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ سسلی نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو فہد مسکرا دیا اور پھر غصہ ہوئے لہجے میں بولا

”سسلی! میں نے اس آگ میں کودنے سے پہلے بہت کچھ سوچا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک یہی کچھ تو سوچ رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ جنگ ہم ہی جیتیں گے۔“

”مگر۔ اسوج اور حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ ہم سوچے اپنی مرضی سے ہیں۔ فتح اور شکست کا تعین بھی خود کرتے ہیں لیکن، حقیقت اٹل ہوتی ہے۔ وہ ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ محض سوچ لینے سے حالات کو کنٹرول بدلا جاسکتا۔ یہ نہیں سوچا آپ نے؟“ اس نے پوچھا

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ حالات کو بدلنے کے لئے بہت کچھ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ارادہ کر لیا جائے، تب حالات بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

”آپ اکیلے، میرا مطلب ہے، یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ ایک طرف آپ اکیلے اور دوسری جانب ان حویلی والوں کے اتنے لوگ؟“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا

”میں خود کو تنہا سمجھ کر ہی یہاں آیا ہوں۔ میں نے تو کسی کا سہارا لینے کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ ہاں۔! اگر تم گھبرانے کی

بجائے مجھے یقین دو کہ مجھے حوصلہ دینے والے میرے اپنے اسی گاؤں میں ہیں تو۔۔۔ اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو سہمی نے چونک کر حیرت سے اسے دیکھا پھر دھیمے سے لہجے میں بولی

”کون اپنے؟“

”تم، اور کون؟“ فہد نے احماد سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو جیسے سہمی کی سماعتوں کو یقین نہیں آیا۔

”کیا کہا آپ نے، میں سمجھی نہیں۔“ اس نے دوبارہ پوچھا

”ہاں سہمی، تم میری اپنی ہو۔ کیا بھین کی یادیں فقط تمہیں ہی یاد ہیں، مجھے نہیں۔ میں کچھ بھی نہیں بھول سکا ہوں آج تک۔۔۔ جہاں خود پر ٹوٹنے والی قیامتیں یاد ہیں۔ وہاں میں ان لمحوں کو بھی سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ جو اسی آگن میں کھپتے ہوئے گذرے ہیں۔“ اس نے بڑے ہی احماد سے کہا سہمی کتنے ہی لمبے ان لمحوں کو سمجھنے کی کوشش میں سادست رہی، پھر ایک دم سے بولی

”میں۔۔۔ میں وہ، آپ کے لئے چائے لے آؤں میں۔ وہ چائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ گہرا ہٹ اور شرماٹے ہوئے تیزی سے اندر کی جانب چلی گئی۔ فہد اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ فہد ناشتہ کر کے آیا تھا۔ اسے چائے کی اتنی طلب بھی نہیں تھی۔ اسے احساس تھا کہ جب تک استاد جی نہیں آئے وہ کچن سے باہر نہیں نکلے گی۔ سو وہ اٹھ کر باہر نکلا چلا گیا۔ اس کا رخ چھانکے کے گھر کی طرف تھا۔

چاچا سو ہٹا گن میں کبھی چار پائی پر پڑا جذب کے ساتھ کافی کے بول گا رہا تھا۔

جس پہلے بھل ہڑے ہوں آوے ہاں رومالوں

دور منداں دے غن محمد دین گواہی حالوں۔

(جس رومال میں پھول پاندھے ہوئے ہوں، اس رومال سے بھی خوشبو آتی ہے۔ اور جو دور و مند دل ہوتے ہیں ان کی گواہی ان

کی باتوں سے عیاں ہو جاتی ہے۔)

چاچا سو ہٹا گا رہا تھا کراتنے میں چھانکے کا مرقا اس کے قریب آ کر اونچی آواز میں بول پڑا۔ اس نے خاموش ہو کر مرنے کو دیکھا اور پھر جیسے ہی گانے لگا، مرقا یوں بول دیا جیسے چاچے کا گانا اسے اچھا نہ لگ رہا ہو۔ اس نے چونک کر مرنے کی طرف دیکھا، صورت حال یہ بن گئی کہ چاچا سو ہٹا جیسے ہی گانا ہے مرقا بول پڑتا، جیسے مرقا اسے گانے نہ دے رہا ہو۔ چاچے کو غصہ چڑھ گیا۔ وہ مرنے کو مخاطب کر کے کہنے لگا

”مجھے اب پتہ چلا ہے کہ تو ہی میرا اصل میں دشمن ہے۔ آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا تجھے۔ آج تیری میرے ہاتھ سے لکھی گئی ہے تو نے ذلیل کر کے رکھ دیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مرنے کے پیچھے لگ گیا۔ جو اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ اسے قابو کرنے کی کوشش میں چاچے کا سانس چڑھ گیا۔ وہ حالوں بے حال ہو گیا۔ اس دوران چھانکے کا گھر کے اندر سے باہر آیا تو یہ صورت حال دیکھ کر چونک گیا۔ چاچا مرنے کے پیچھے بھاگتے ہوئے (دور دور سے کہہ رہا تھا

”نہیں چھوڑوں گا تجھے، آج تیری میرے ہاتھ سے لکھی گئی ہے۔“

آخر چاچے نے مرغے کو پکڑ لیا تو چھ کے کے منہ سے بے ساختہ نکلا

”اومر گیا شہزادہ... اوئے! یہ ظلم نہ کر، شہزادہ میرے شہزادے کو۔ تجھے تیرے کسی پرانے عشق کا واسطہ۔“

”میں اس کا زوالا آج ختم ہی کر دوں گا۔ ٹوٹ چھری لا۔“ چاچے نے انجائی ٹیسے میں کہا ہی تھا کہ اسے میں باہر کار کا ہارن بجا۔ تبھی

چھ کے نے زور سے کہا

”باہر فہد ہوگا۔ مجھے لینے آیا ہے، دیکھا ہاٹو چھوڑ دے میرے شہزادے کو۔“

چاچے نے ایک لمحے کو سوچا اور مرغے کو دھیں چھوڑ کر باہر کی طرف لپک گیا۔ تبھی چھ کا نے مرغے کو مخاطب کر کے کہا

”اوئے بندہ بن، اب بے کوٹک نہ کیا کر۔“

مرغیوں پر جیسے سمجھ گیا ہو تو چھ کا اسے چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ باہر فہد کا ریش تھا۔ چاچا اس کے پاس کھڑا حال احوال پوچھ رہا

تھا۔ چھ کا کا ریش بیضا تو کار پھل دی۔

فہد نے اپنے گھر کے سامنے کار روکی اور چھ کے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ محن میں چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں، جن پر سراج یوں

بیٹھ ہوا تھا۔ جیسے ان کے انتظار میں ہو۔ علیک سلیک کے بعد یونہی گپ شپ کرنے لگے۔ تب اچانک سراج نے فہد سے پوچھا

”یار۔ ایک بات بتا۔ اس دن بھی تو ٹال گیا تھا۔“

”پوچھ، کیا پوچھتا جا رہا ہے۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کیا تو اس نے پوچھا

”راہور میں اتنا اچھا مستقبل چھوڑ کر تم اتنی دور یہاں آ گئے ہو۔ صرف چوہدری سے اپنا انتقام لینے کے لئے؟“

”انتقام۔ انہیں، میں نے چوہدری سے انتقام ہی لینا ہوتا تا تو میں وہیں رہ کر اپنی مرضی سے اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں

یہاں تبدیلی چاہتا ہوں۔ اس کا یقین تمہیں آئندہ آنے والے چند دنوں میں ہو جائے گا۔“

”کیوں، تم کیوں چاہتے ہو تبدیلی؟“ چھ کے نے پوچھا

”میں نے اپنے ساتھ ایک وعدہ کیا ہے۔ یہاں آ کر میں نے اپنی ذات کا ہی نہیں، اس مٹی کا قرض بھی ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ

کہتے ہوئے فہد کے لہجے میں ایک ایسا عزم چمک رہا تھا، جس میں طوفان پوشیدہ تھا، سراج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر بولا

”مٹی کا قرض چکانے کے لئے تو مٹی ہونا پڑتا ہے۔ پر یہ ہوگا کیسے؟“ سراج نے کہا

”میں فرعونیت کا راج توڑنا چاہتا ہوں۔ چوہدری نے جو یہاں خوف طاری کر رکھا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کیا

تم نہیں چاہتے ہو؟“ فہد نے پوچھا

”کیوں نہیں فہد۔ امیرا بھائی امین۔ ان کے ظلم کا شکار ہوا۔ حوالات، رسوائی، مار پیٹ، بے عزتی۔ میرے بھائی نے چوہدری

کے لئے جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ یہ جرم اسے لے ڈوبا۔ وہ قاضی مریم بن چکا ہے۔ میں چوہدری کو کیسے معاف کر سکتا ہوں۔“

”سراج! خوف کی اس فضا میں، لوگ چاہیں زبان سے کچھ نہ کہیں۔ مگر ان کے دلوں میں وہی سب کچھ ہے جو تم چاہتے ہو۔ وہ سوچتے بھی ہیں۔ لیکن انہیں راستہ نہیں ملتا۔ انہیں شعور نہیں کہ وہ اپنے جذبات کی اظہار کیسے کریں۔ اس کے لئے مجھے تم جیسے دلیر لوگوں کی ضرورت ہے۔ کاندھے سے کاندھا ملانا ہوگا۔“ فہد نے پر جوش انداز میں کہا تو چھپا کے نے تیزی سے پوچھا

”پر تم کیا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ ہمارے ذمے جو کام ہے۔ ہمیں وہ کرنا ہے، جنہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نہیں کیا اسی لئے تو چوہدری جیسے لوگ وسائل پر قابض ہو گئے ہیں۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چوہدری جیسے لوگ ہم غریبوں کے ذریعے ہی غریبوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔“ چھپا کا اپنا سر ہلاتے ہوئے

”دیکھو۔! یہ لوگ اپنی حکمرانی اور دولت میں اضافے کے لئے ہر طرح کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عوام و مس رعی ہے۔ وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ محض اپنی لاپٹی میں ان لٹیروں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ کیا غریب کی اچھی بھلا کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتے؟“ فہد نے دکھ سے کہا

”تمہاری بات دل کو گنتی ہے فہد۔ مگر الجھن وہی ہے، یہ ہوگا کیسے؟“ سراج نے الجھتے ہوئے کہا

”یہی تو لوگوں کو سمجھانا ہے کہ وہ اپنی ذات کا احساس کریں۔ لوہے کو کاٹنا ہے۔ تو لوہا بننا ہوگا۔“ فہد نے کہا

”یہ بھی تو ذہن میں رکھنا۔ تم یہاں کی عوام کا مزاج اتنی جلدی نہیں بدل سکو گے۔ وہ تمہاری بات کیوں سنیں گے۔“ سراج نے تیزی سے کہا تو فہد نے سمجھایا

”میں دیکھ چکا ہوں۔ یہاں کی عوام میں چوہدری کے خلاف نفرت ہے۔ اس کی دہشت سے لوگ ڈر جاتے ہیں۔ اب دیکھو۔! اس گھر سے میرا جذباتی تعلق ہے تو میں نے یہ گھر لے لیا۔ میں نہیں ڈرا۔ اب زمین چوہدری خود دے گا۔ عوام پر یہی ثابت کرنا ہے کہ طاقتور چوہدری نہیں بلکہ خود عوام ہیں۔“

”دیکھو فہد! میں تو چوہدری سے نفرت کرتا ہوں۔ اس لئے میں تو تمہارا ساتھ دوں گا۔“ سراج نے حتیٰ لچے میں کہا تو فہد پر جوش لچے میں ہولا

”بس مجھے یہی حوصلہ چاہئے۔ دیکھنا۔! عوام کا مزاج ہی نہیں۔ یہاں سب کچھ بدل جائے گا۔ آؤ چھتے ہیں۔ گاؤں میں بہت سارے لوگوں سے ملتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا تو وہ دلوں میں اٹھتے چلے گئے۔

حویلی کے سرسبز لان میں خوشگوار بیت بھیلی ہوئی تھی۔ سر پہ کادقت تھا۔ ایسے میں چوہدری جلال اندر سے باہر لان میں آگیا، جہاں منشی فضل دین پہلے ہی موجود تھا۔ چوہدری پرسکون سا آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمبے سوچتے رہنے کے بعد اس نے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اوئے منشی! گاؤں میں ایک لڑکے نے اتنا ہنگامہ کر دیا۔ اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔“

جس پر منشی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا

”جناب چوہدری صاحب! صرف مجھے ہی نہیں کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تا تو میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دیتا۔“

”وہ لڑکا، ماسٹر دین محمد کے گھر آیا ہے۔ جس میں خود سانس باقی نہیں ہے۔ گاؤں میں اور کون ہے اس کے ساتھ، جو اس لڑکے

میں اتنی ہمت آگئی کہ ایک ہی دن میں اس نے اتنا ہنگامہ کر دیا۔ ہمارے لوگ کوہرا اور ڈھگر کھول دیئے۔“ چوہدری نے اچھٹے ہوئے کہا

”وہ جی، گاؤں کے چند کی کینوں کے لڑکوں سے ملا تھا۔ جو کبھی اس کے ساتھ پڑھتے رہے تھے۔ ان میں سوائے سراج کے کسی

نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔“ منشی نے وضاحت سے بتایا تو چوہدری نے اس کی طرف دیکھا اور کہا

”ہوں! تو اس نے آتے ہی اپنے مطلب کے بندے تلاش کر لئے۔ حیرا کیا خیال ہے اب اس لڑکے فہم کے ساتھ کیا کرنا

چاہئے؟“

”کرنا کیا ہے جی۔ ادوی جو پہلے کرتے ہیں۔ حکم کریں، گاؤں کے چوک میں کھڑا کر کے چار چھتر لگوا کر یہاں سے بھاگ دیتا

ہوں۔“ منشی نے حیرتی سے کہا

”اگر چار چھتر لگانے بات بن سکتی تا تو یہ موقع ہی نہیں آتا تھا۔ تا مجھے یہ بتا۔! تجھے ذرا بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کیا کرنے والا

ہے۔“ چوہدری کے لہجے میں غصہ خور آیا تھا، جیسے وہ منشی کو اس کا قصور وار سمجھتا ہو۔

”عرض کیا ہے نہ چوہدری جی! اگمان میں بھی نہیں تھا۔ پر اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ چار بندے بھیج کر اسے وہاں سے نکال باہر

کرتے ہیں۔ قبضہ ہی لینا ہے نامکان کا تو وہ لے لیتے ہیں۔“ منشی نے یوں کہا جیسے یہ کوئی اتنا اہم کام نہ ہو۔

”منشی! تو اب بھی میری بات نہیں سمجھ رہا ہے۔ اسے وہاں سے نکالنے میں، بلکہ دنیا ہی سے نکال دینے میں مجھے تیری مدد کی

ضرورت نہیں اور نہ ہی تو کر سکتا ہے۔“ چوہدری نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

”تو آپ کیا چاہتے ہیں چوہدری صاحب۔“ اس بار منشی نے اچھٹے ہوئے پوچھ تو چوہدری بولا

”ذرا سوچو۔! اس کے اچھے برس بعد گاؤں میں واپس آ جانا۔ اپنا گھر واپس لینا اور سب سے خطرناک بات، گاؤں والوں کا

تمنا شائی بنے رہنا۔ اس میں کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ جاؤ جا کر معلوم کرو۔ ایسا کیوں ہوا۔ گاؤں والوں کا دماغ کیسے خراب ہو گیا۔ اس

کے ساتھ جو سلوک ہوگا وہ تو ہم کریں گے ہی۔ تاکہ وہ ساری عمر یاد رکھے۔“

”میں سمجھ گیا چوہدری جی! جیسا آپ چاہیں۔ میں پتہ کرتا ہوں۔ چاہے مجھے ماسٹر دین محمد علی سے کیوں نہ ملنا پڑے“ فٹی نے تیزی سے کہا تو چوہدری سوچ میں پڑ گیا۔ فٹی چند لمحوں کے بعد دیکھتا رہا پھر پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔

فٹی کو اس کے ارادوں کے بارے میں پتہ کیوں نہیں چلا اور گاؤں کے لوگ ان سے اس حد تک بچھڑ ہو گئے ہیں کہ ان کے نوکر کو بچا یا تک نہیں، یہ نہ صرف خطرناک بات تھی، بلکہ فٹی کی نااہلیت تھی۔ اسی لئے فٹی کو کسی پل بھین نہیں آ رہا تھا۔

شام ہونے کو آگئی تھی۔ اسے کچھ اور نہیں سوچا تو وہ سیدھا ماسٹر دین محمد کے گھر چلا گیا۔ اسے یہی ٹھیک لگا کہ ماسٹر کو ڈرا دھمکا دے تاکہ فہد مزید کچھ نہ کر سکے۔ اسے خود ماسٹر ہی روک لے۔

اس وقت ماسٹر اور فہد کھانا کھا چکے تھے۔ سسلی برتن سمیٹ کر لے جا رہی تھی کہ ہر روز اسے پر دستک ہوئی، جس کے ساتھ ہی فٹی فصل دین نے آواز لگاتے ہوئے کہا

”ماسٹر دین محمد! گھر پر ہی ہوتا۔“

اس کی آواز سنتے ہی ماسٹر دین محمد نے تشویش سے کہا

”یہ تو فٹی کی آواز لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فہد کی طرف دیکھا۔ جیسی فہد نے اشارے سے سمجھایا کہ اسے اندر ہی بلا لے۔ جس پر ماسٹر نے ادبچی آواز میں کہا ”ہاں ہاں۔ گھر پر ہی ہوں۔ آ جاؤ۔“

اس دوران سسلی وہاں سے ہٹ کر اندر چلی گئی۔ اگلے چند لمحوں میں فٹی اندر آیا تو فہد کو دیکھ کر الجھ گیا کہ بے وقت آ گیا ہے، پھر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی، ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”ہاں فٹی! کیسے آتا ہوا؟“

جبھی اس نے فہد کی پرواز کرتے ہوئے کہا

”دیکھ ماسٹر! آپ کے اس مہمان نے جو حرکت کی ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔ کیا اس کا احساس ہے آپ کو ماسٹر جی۔ ہم گاؤں والے جو آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ اس کا یہ صلہ دیا آپ نے۔ جانتے ہو، اس سے وڈھے چوہدری صاحب کس قدر ناراض ہوئے ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے بلا کر آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو سمجھاؤں۔“

فٹی کے متناقضانہ لہجے میں چھپی دھمکی کو سن کر فہد نے گھمبیر لہجے میں کہا

”اُوئے فٹی سن۔! میں اس گاؤں میں مہمان نہیں ہوں۔ یہ میرا گاؤں ہے۔ یہاں میرا اپنا گھر ہے، جسے میں نے خالی کر دیا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم اور تمہارے چوہدری نے آج تک جو غلط کیا۔ اس کا جواب وہ کون ہے، ٹو یا تیرا چوہدری؟“

”میں ماسٹر کو سمجھانے آیا ہوں کہ چوہدری نے...“ فٹی نے کہنا چاہا تو فہد بات کاٹ کر بولا

”صرف میری سنوٹی۔ تم لوگوں نے اگر استاد جی کی عزت کی ہوئی۔ تو آج یہ اس حال کو نہ پہنچے۔ غوا نہیں کیا سمجھانے آیا ہے؟“

”بجی کہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔“ منشی نے آرام سے کہہ دیا

”تو پھر یہ بات مجھ سے کہو۔ انہیں کیا کہہ رہے ہو۔ اور مجھے چوہدری کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ آج کے بعد میرے کسی

بھی معاملے میں استاد جی کے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھے تم۔“ فہد نے غصے میں کہا

”لڑکے تم چوہدری کی طاقت بارے نہیں جانتے ہو۔ وہ تمہیں چوہدری کی طرح مسل کر رکھ دے گا۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ تم

لوگوں کو سمجھانے کے لئے مجھے یہاں بھیج دیا۔“ منشی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو فہد نے اس کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں پوچھا۔

”تم مجھے دھمکانے آئے ہو؟“

”دھمکانے نہیں، حقیقت بتانے آیا ہوں۔ تم لٹڈہ گردی کی بجائے ان کے پاس جا کر منت سماجت کرتے۔ وہ تمہیں تہہ را تہہ

دے دیتے۔ انہوں نے اتنے برس تمہارے گھر اور زمین کی حفاظت کی۔ اس احسان کے بدلہ یوں دے رہے ہو۔ شکر کرو، انہوں نے

تمہاری نادانی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے بھیجا۔“ منشی نے احسان جتاتے ہوئے کہا

”تم آنکھوں والے اندھے ہوٹھی۔ تم سے بات کرنا فضول ہے۔ میں نے اپنا گھر واپس لے لیا۔ یہ بات اپنے چوہدری کو بتا دینا

کہ میں اسی طرح اپنی زمین بھی لے سکتا ہوں مگر لوں گا نہیں۔ کیونکہ وہ پیر زمین مجھے خود دے گا۔“ فہد نے طنزیہ لہجے میں کہا تو منشی چونک کر بولا

”لڑکے لگتا ہے تمہارے سر پر خون سوار ہے، اس بوڑھے کا۔“

”خبردار۔! آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔ یہ میرے استاد جی ہیں۔ تمیز سے بات کرو۔“ فہد نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، پھر

بولاً۔ ”اور سنو۔! میں خون خرابہ نہیں چاہتا۔ اپنا حق لینا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے چوہدری نے طاقت دکھانے کی کوشش کی تو میں اس کا ویسا

فی جبر پور جواب دوں گا، جیسا وہ چاہے گا۔ بتا دینا اسے۔“

”تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔“ منشی نے کہا

”اصل میں تمہارے جیسے خوشامدی، اپنے مفاد کی خاطر، چوہدری جیسے لوگوں کو ظلم کرنے پر اکساتے ہیں۔ جب میرے باپ کو

یہاں سے تنگ کیا گیا۔ اس وقت تم لوگ کہاں تھے۔ جاؤ، جا کر اسے کہہ دو۔ استاد جی کی جتنی ہنگ انہوں نے کرنی تھی، کرنی اب اگر ان

کے بارے میں سوچے بھی تو دھیان سے سوچے۔ اور اب جاؤ تم یہاں سے۔“

”ماسٹر۔! یہ لڑکا بڑا جذباتی ہو رہا ہے۔ اپنے ساتھ تمہاری عزت بھی مٹی میں رول دے گا۔“ منشی نے ماسٹر کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا تو وہ بولا

”یہ لڑکا جو کچھ بھی کہہ رہا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب تم جاؤ۔ اور اب تم بھی دھیان سے بات کرنا۔“

پہلی بار ماسٹر کے منہ سے ایسی حوصلے والی بات سن کر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماسٹر بھی ایسی بات کر سکتا ہے۔ اسی

لئے جھجکتے ہوئے بولا

”ماسٹر! میں تو جانتا ہوں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”جیسے کہا ہے ناجاؤ۔“ فہد نے کہا تو فٹی اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔

فٹی پلٹ تو آیا تھا مگر حیران تھا کہ وہ ماسٹر جو کبھی ان کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کرتا تھا، اس نے اسے بے عزت کر کے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس کے اندر آگ لگ چکی تھی۔ وہ اسی آگ میں سلگتا ہوا سیدھا حویلی چلا گیا۔ چوہدری جلال اور چوہدری کبیر ڈرائنگ روم میں ہی تھے۔ وہ دونوں ہاتھیں کر رہے تھے کہ فٹی ان کے پاس جا پہنچا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور شرمندگی تھی، جسے دیکھ کے چوہدری جلال نے پوچھا

”اوکیا ہوا فٹی جیسے؟“

”میں ماسٹر دین محمد کے گھر گیا تھا اسے سمجھانے کے لئے، وہیں سے آرہا ہوں۔“ فٹی نے بے چارگی سے کہا

”تو پھر سمجھایا اسے، کیا کہتا ہے؟“ چوہدری جلال نے تجسس سے پوچھا تو فٹی نے کہا

”وہاں فہد بھی تھا۔ انہوں نے میری بات ہی نہیں سنی بلکہ مجھے بہت بے عزت کیا جی انہوں نے۔“

”کیا، اس نے تمہاری بے عزتی کی؟“ چوہدری جلال ایک دم غصے میں آتے ہوئے بولا

”جی چوہدری صاحب۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ میں کیا جانتا ہوں چوہدریوں کو، اب زمین میں نے نہیں چوہدری خود مجھے دیں

مے۔“ فٹی نے طنز پر لہجے میں بتایا

”اس کی یہ جرات۔“ چوہدری کبیر یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا تو چوہدری جلال نے اسے اشارے سے روکتے ہوئے کہا

”پوری بات بتا۔“

فٹی نے ساری بات کچھ ایسے انداز میں سنائی کہ دونوں باپ بیٹے غضب ناک ہو گئے۔ چھٹی چوہدری جلال نے انتہائی غصے میں کہا

”اس کا مطلب ہے، وہ فہد نہیں بول رہا۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی اور طاقت بول رہی ہے۔ ٹھیک ہے فٹی میں اسے دیکھتا

ہوں۔ اب تم جاؤ۔“

”جو حکم چوہدری صاحب۔“ فٹی نے کہا اور وہاں سے نکلا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی چوہدری کبیر نے کہا

”بابا، یہی وقت ہے، اس کو ختم کر دیں، ورنہ وہ بہت تنگ کرے گا۔ پودے کو نکلے ہی اس کو ختم کر۔۔۔۔۔“

”فلفل سوچ رہے ہو تم، وہ پودا نہیں رہا۔ وہ جو سوچ بھی لے کر آیا ہے، فہد نے اسی سوچ ہی سے مرنا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہے کہ

یونہی خودکشی کرنے یہاں آ گیا۔ بہت سوچ کچھ کر اس پر ہاتھ ڈالنا ہو گا۔“ چوہدری جلال نے پر سوچ انداز میں کہا تو کبیر اپنے باپ کی بات

سن کر بے بسی سے خود پر قابو پانے لگا۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ اسے اپنے باپ کی بات بری لگی تھی۔ کبیر کے

حساب سے اس کا باپ خواہ مخواہ ہتھیار تھا۔ اسی لئے وہ اندر کی طرف چلا گیا جبکہ چوہدری جلال پہلی بار سنجیدگی سے اس کے بارے میں

سوچنے لگا۔ وہ کبیر کی سوچ سے بے خبر تھا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ چوہدری کبیر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سٹلی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ مسلسل سوچتا چلا جا رہا تھا کہ فہد اپنا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ ہمیں نچا دکھانے آیا ہے۔ وہ مجھ سے سٹلی کو بھی چھین سکتا ہے۔ وہی فہد میرے راستے کی دیوار بن گیا ہے۔ وہ مجھے پھر سے ہرانے آ گیا ہے۔ اب میں ہار جانا برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وقت ہے۔ اسے ختم کر دیتا ہی ہوگا۔ میں اس دیوار کو گراسکتا ہوں تو پھر دیکھ کس بات کی۔۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔ یہ سوچتے ہی وہ ہٹا کر اٹھا۔ اس نے بیڈ کی درواز کھول کر اس میں سے دیوار لٹکا لالا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ بیڑیاں اتر کر ڈرائیونگ روم میں آیا، جہاں دہی روشنی تھی۔ وہ محتاط انداز میں چار پا ہوتا کہ سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹکتے ہوئے رک گیا۔ سامنے اس کی ماں بشری بیگم کھڑی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بخٹی تھی۔ وہ چند لمحوں تک اسے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی چوہدری پکڑ لی ہو۔ پھر سر زلزل کرنے والے لہجے میں بولی

”کبیر۔ اس وقت اتنی رات گئے، کہاں جا رہے ہو؟“

”کہیں نہیں ماں، کہیں نہیں جا رہا ہوں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو کبیر نے لہجے میں بولی

”تو پھر اتنی رات گئے یوں۔۔۔۔ باہر؟“

”ہں ماں یونہی نیند نہیں آرہی تھی، سوچا باہر کھلی فضا میں جاؤں، شاید نیند آ جائے۔ پر آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ اس

نے یوں کہا جیسے وہ بھی سمجھ رہا ہو کہ ماں یہاں کیوں ہے۔

”میں تو کب کی یہاں بیٹھی سوچ رہی ہوں۔ میری چھوڑ تو تھا، کیوں پریشان ہے؟“ بشری بیگم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا

”نہیں ماں میں پریشان تو نہیں ہوں؟“ اس نے تیزی سے یقین دلانے والے انداز میں کہا

”میں ماں ہوں تمہاری، جانتی ہوں تیرے بارے میں۔ اگر تیرے دل میں کوئی بات ہے تو مجھے بتا۔ میں تیری ہر پریشانی۔۔“

بشری بیگم نے کہنا چاہا تو اس نے فوکتے ہوئے کہا

”نہیں ماں میں متا رہا ہوں نا، مجھے کچھ نہیں ہے۔“

”دیکھ تیرا بابا۔۔۔۔ تجھے بڑا آدمی دیکھنا چاہتا ہے۔ تو اتنا پڑھ لکھ نہیں سکا لیکن اتنی بڑی جاگیر کی دیکھ بھال بہت بڑی ذمہ داری

ہے۔“ وہ بولی تو کبیر نے لا پرواہی سے کہا

”تو پھر کیا ہوا۔ جاگیریں بندے ہی سنبھالتے ہیں۔“

”میں مانتی ہوں۔ تو ہمارے لئے اب بھی وہی چھوٹا سا کبیر ہے۔ لیکن دنیا داری کے معاملات بہت بڑے ہیں۔“ وہ اسے

سمجھاتے ہوئے بولی

”اتنی غرور مند کیوں ہوں۔ آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔ میں جانتا ہوں اس دنیا کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔ طاقت ہے تو سب جھکتے ہیں۔ ورنہ وہ ہمیں جھکا دیں گے۔ آپ فہم نہ کرو۔ سب ٹھیک ہے۔ جائیں سو جائیں۔“ اس نے پھر اسی لا پرواہی سے کہا تو بشری بیگم بولی

”تمہیں یوں دیکھ کر کیا میں سو سکتی ہوں؟“

”جائیں، اپنے کمرے میں جا کر سو جائیں۔ میں بھی سو جاتا ہوں۔“ اس نے یہ کہہ کر وہ اپنی ماں کو کانڈھوں سے پکڑا اور اندر کی طرف لے کر چل دیا۔ ایسے لمحات میں بشری بیگم نے سکون کا سانس لیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب جا کر سو جائے گا۔ اتنا تو اسے اپنی اولاد کے بارے میں پتا تھا۔

چوہدری کبیر رات گئے تک نہ سو سکا۔ اس کے ذہن میں اپنی بے عزتی ہونے اور سسلی کے کھو جانے کا ڈر کسی ناگ کی طرح پیٹھ گیا تھا۔ جب وہ اپنے آپ سے بھی خوف کھانے لگا تو الماری میں پڑی شراب کی بوتل اٹھ کر کھولی اور پیتا چلا گیا۔

اس کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ وہ بستر سے اٹھ کر ناشتہ کئے بغیر اپنی جیب لے کر ڈیرے کی طرف نکل گیا۔ وہ اپنے ڈیرے میں صوفے پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا خاص ملازم ماکھا آ گیا۔ اس نے چوہدری کبیر کی طرف دیکھا اور قریب آ کر بولا

”چوہدری جی، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟“

چوہدری کبیر نے اس کی طرف دیکھ اور اوڑھیلے سے لہجے میں کہا

”ہاں پوچھو۔“

”جب سے آپ آئے ہیں، میں تب سے دیکھ رہا ہوں جی۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے جی۔“ اس نے

تشویش سے پوچھا تو چوہدری نے ایک طویل سانس لے کر کہا

”میں پریشان نہیں ہوں ماکھے۔ ابس وہ سسلی ہے نا، اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہی ایک لڑکی مجھے پسند آئی ہے۔ لگتا

ہے کہ اب وہ میری ضد بن جائے گی۔ اسے حاصل تو کرنا ہے۔ سوچ رہا ہوں کیسے؟“

”چوہدری جی۔ مجھے اتنی عقل سمجھ تو نہیں ہے۔ پر اتنا ضرور سمجھتا ہوں۔ دلوں کے معاملے میں ذور زبردستی نہیں چلتی۔ آپ نے

اس کا درجہ جیتنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس طرح وہ کیسے.....“ اس نے کہتا جا ہا لیکن کبیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”اوئے ماکھے۔ اب جو دلوں والے معاملے ہوتے ہیں نا۔ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے تو ہمیشہ جین کر حاصل کرنا سیکھا

ہے۔ اور سسلی کو جین لینا ہی ہوگا۔ ایسے وہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔“

”مگر اب فہم آپ کے اور سسلی کے درمیان دیوار بن سکا ہے۔“ ماکھے نے گہرے لہجے میں کہا

”یہی تو اسی دیوار کی وجہ سے ان کے بارے سوچنا ہے۔ دیکھتے ہیں یہ دیوار کتنے دنوں میں گرتی ہے۔ پھر سسلی خود میرے

سامنے آکر انہی دیواروں کے تحفظ کیلئے بھیک مانگے گی۔ وہ فہم والا سہارا بھی دیکھ لے۔ اب تو مزہ آئے گا۔ ان دونوں کے ساتھ کھیلے گا۔“
 کبیر نے یوں کہا جیسے اسے من پسند کھیل مل گیا ہو۔ اس پر، مکے نے مسکراتے ہوئے کہا
 ”چوہدری جی۔ پہلے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھ میں۔ جہاں معاملہ دل کا ہونا، وہاں کھیل نہیں کھیل جاتا۔ اسے اپنا بنا لیا جاتا ہے۔ یا
 پھر اس کے بن جاتے ہیں۔“

”اوائے مکے! یہ کمزور لوگوں کی باتیں ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ میں چاہوں تو اسے ابھی اور اسی وقت حاصل کر لوں۔ مگر
 آسانی سے ہاتھ آنے والی شے میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔“ کبیر نے غصے سے کہا
 ”پر یہ جو محبت ہوتی ہے نا۔ اس میں روز بروز پیچھے نہیں ہلتی۔“ مکے نے اسے احساس دلایا
 ”اوائے تو مجھے پیار محبت کے سبق نہ پڑھا۔ اور نہ ہی میں یہ سبق پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں تو سیدھی بات جانتا ہوں۔“ اس نے
 غرور سے کہا

”ٹھیک ہے چوہدری جی۔! ہو گا تو وہی جیسا آپ چاہیں گے۔“ مکا ایک دم سے خوشامد پر اتر آیا۔
 ”ہاں۔! اب سٹی کو اہمیت دینا پڑے گی اور جو اہمیت میں اسے دینا چاہتا ہوں۔ اسے اب دنیا دیکھے گی۔ سٹی اتنی آسانی سے کسی
 کی نہیں ہو سکتی۔“ وہ کسی حد تک غصے میں بولا تو، مکے نے کہا
 ”ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔! آپ ٹھیک کہتے ہوں گے جی۔“
 ”اوائے جاؤ۔ دفعہ ہو جاؤ۔ اب“ کبیر نے اس کی طرف دیکھ کر غصے میں کہا تو مکا کھنچ لہے اسے دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر
 نکلا چلا گیا۔ چوہدری کبیر پھر سے سوچوں میں ڈوب گیا۔



جھیل کی عمارت دن کی روشنی میں چمک رہی تھی عمارت کے اندر خاصی گہما گہمی تھی۔ مائرہ راہداری میں خیزی سے اپنے کمری کی
 جانب آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو جعفر کو وہاں دیکھ کر ایک دم سے خوش ہو
 گئی۔ وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی
 ”او جعفر! تم آگئے۔ بہت اچھا کیا۔“

”خیریت تو ہے نا مائرہ، اس طرح جلدی میں بلا مجھے، کیا مسئلہ ہے؟“ جعفر نے سنجیدگی سے پوچھا تو مائرہ میز کے عقب
 میں کمری پر بیٹھتے ہوئے بولی

”صبر تو کرو، بتاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذوں کی طرف دیکھا اور ایک طرف رکھ دیئے۔ پھر پوری طرح اس کی
 طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”میں کئی دنوں سے ایک رپورٹ پر کام کر رہی تھی۔ ایک بہت بڑے گروہ کا انکشاف ہوا ہے جو جعلی دوائیاں

بٹا کر بڑے بڑے پرمارکیٹ میں فروخت کر رہا ہے۔ دراصل اس گروہ میں بہت بڑے بڑے نام بھی ہیں۔“

”کون سے نام ہیں ان میں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا تو پرسکون لہجے میں بولی

”بتاتی ہوں، بلکہ تمہیں ہی بتاؤں گی۔ میں اکیلی اس پر کام نہیں کر رہی ہوں، بلکہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ آفیسر بھی شامل

ہیں۔ وہ جگہ، جہاں یہ دوائیاں بنتی ہیں، اور اب بھی جہاں سٹاک موجود ہے۔ وہاں سے انہیں رکتے ہاتھوں پکڑتا ہے۔“

”مطلب، چھاپہ۔۔۔ پہلے تم نے نہیں بتایا، آج کیوں؟ اور ابھی۔۔۔“ اس نے اسی تیزی سے پوچھا تو مائرہ اس کی بات کاٹتے

ہوئے بولی

”اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کا ذرا پسن تمہارے ہاتھوں ہو، بلاشبہ اس کا کریڈٹ تمہیں جائے

گا۔۔۔ اور جانا بھی چاہئے۔“

”اور دوسری وجہ؟“ جعفر نے پوچھا تو مائرہ عجیب حسرت بھرے لہجے میں یاسیت سے کہا

”اگرچہ میرے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں میں خالی پن محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگا کہ میرا اپنا کوئی میرے

ساتھ ہو۔ جس کے سہارے میں خود کو بہت مضبوط سمجھوں۔“

اس کے یوں کہنے پر جعفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جذباتی انداز میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے خوشی ہوئی، مائرہ کہ تم نے مجھے اپنا کہا اور میں۔۔۔“ تبھی مائرہ اس کی بات کاٹتے ہوئے مصنوعی آکٹاہٹ سے بولی

”اچھا اب جذباتی ڈائلاگ مت مارنا۔ ایک عاشق حراج تو جو ان کی بجائے پولیس آفیسر بن کو سوچ۔“

”میں بھی پولیس والا بن کر سوچوں گا تا کہ جب مجھے اس کیس کے بارے میں معلوم ہوگا۔ میرے سامنے تو ایک حسین لڑکی ہے

جسے دیکھ کر سوائے جذباتی مکالموں کے اور کچھ سوچا ہی نہیں جاسکتا ہے۔“ جعفر ایک دم سے پرسکون ہو کر رومانوی لہجے میں بولا

”کہنا تبند کر دیہ جذبات نگاری۔ ہم نے آج ہی چھاپہ مارنا ہے۔ اپنے آفس کابینہ۔ تمہیں آرڈر مل جائیں گے۔ اور سنو میں تمہیں

اس کیس کے بارے میں پوری تفصیل دیں آکر بتاتی ہوں۔ تم اب فوراً نکلو اور چھاپے کی تیاری کرو۔“

”اوکے۔“ جعفر نے ایک دم سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو مائرہ نے اسے پھر پور لگا ہوں سے یوں دیکھا جیسے ابھی صدقے

داری ہو جائے گی۔

اگلے دو اور تین گھنٹوں کے دوران ایک ویران سے مقام پر کٹھنی نما گھر کے سامنے مائرہ کی کار آرکی۔ اس کے ساتھ ہی چینل کی

ویگن آن رکی۔ اس کے پیچھے ہی پولیس کی گاڑی آکر رک گئی۔ گاڑیاں رکتے ہی اس میں سے کئی سارے بندے نکل آئے۔ پولیس کے

جوانوں نے تیزی سے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ تبھی مائرہ اور جعفر دروازے کی جانب بڑھے۔ کٹھنی کے اندر سے مختلف طرف سے ہتھی

کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دونوں دبے قدموں اندر داخل ہو کر آگے بڑھتے گئے۔ ان کے پیچھے دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں سے

سب لوگ دھڑ دھڑ اندر داخل ہوتے گئے۔ اچانک ان کے سامنے ہاں نما کمرہ آگیا۔ وہ سب دوایاں پیک کرنے میں مصروف تھے۔ یوں اچانک پولیس کو سامنے دیکھ کر وہاں پر موجود لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ پولیس والے انہیں پکڑنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ساری کوٹلی چھان ماری اور وہاں پر موجود ہر بندے کو گرفتار کر کے انہیں گاڑی میں بیٹھا دیا گیا۔ اس سارے دورانے میں وہاں ہونے والی ساری کارروائی کو چینل والے کور کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم دورانے میں وہ انہیں لے کر واپس پٹ گئے۔

مائرہ جینٹل آتے ہی بے حد مصروف ہو گئی۔ اس نے اپنی رپورٹ قائل کی اور گمر کے لئے نکل پڑی۔ جس وقت وہ گمر کے قریب تھی، اس کی رپورٹ آن انٹر ہو گئی۔ جینٹل میں ہاس اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس پر مائرہ کی کوریج چل رہی تھی۔ ہاس کے ساتھ ایک سینئر صحافی پورے اسٹیماک سے دیکھ رہا تھا۔ ہاس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ مائرہ کے کام کو قسین کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی ہاس نے تبرہ کرتے ہوئے کہا

”مائرہ بہت محنت کر رہی ہے۔ اس کی رپورٹ میں جان ہوتی ہے۔ عوام کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔۔۔ شند اور رپورٹ بتاتی ہے۔“

”جی، یہ جتنی محنت کر رہی ہے، اتنی عوام میں مقبول بھی ہو رہی ہے۔ اصل میں مائرہ کا شائل یہ ہے کہ وہ سمجھوتہ نہیں کرتی۔ بلکہ کسی بھی ایٹھ کو اس طرح لیتی ہے جیسے یہ اس کے اپنے اوپر بیت رہا ہو۔ ظاہر ہے اس میں اس کے اپنے جذبات بھی آ جاتے ہیں اور وہ پوری طرح وقف ہو جاتی ہے۔“

”ہوں ں ں۔ اناکس۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی محنت اپنے منہ سے خود بولتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی جو تم اس رپورٹ میں دیکھ رہے ہو۔ اس کا بول ہونا ہے۔ کس طرح نورمز کے ساتھ ہے۔“ ہاس نے تعریف کی تو صحافی بولا

”جی یہ تو ماننا پڑے گا کہ یہ ایک بہادر لڑکی ہے اور یہ بھی کہ یہ آپ کے جینٹل کا سب سے فیورٹ پروگرام ہے۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ ہاس نے زیادہ بات نہیں کی۔ یہ کہہ کر وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسا ہوتا ہے، ہاس لوگ اپنے ورکر کی چاہتے ہوئے بھی زیادہ تعریف نہیں کرتے، یہ ان کا معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لوگ کس قدر اس پروگرام کو دیکھ رہے تھے۔ الیکٹرونکس کی مارکیٹ میں ایک دوکان کے باہر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر، مائرہ یوں رہی تھی۔

”یہ دوایاں بنانے والا گروہ، انسانیت کے لیے وہ زہر ہے جو انسانی صحت کے لیے قاتل ہے۔ اس گروہ کی پشت پناہی کرنے والے وہ طاقت ور لوگ ہیں، جن کے نام اگر آپ کے سامنے آئیں تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرنے والے، میڈیا پر انسانیت کی خاطر قربان ہونے والے، انسانیت کے یہ دشمن اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ ادویات بچوں کے لیے بھی ہیں۔ وہ معصوم بچے جو ان جیسے بے رحم قاتلوں کے دور میں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ صرف جعلی ادویات ہی نہیں بنا رہے بلکہ اعضاء کی چوری میں بھی لوث پائے گئے ہیں۔ کچھ نام آپ سن چکے ہیں اور یقیناً آپ اُن ناموں کو سننے کے لئے بھی بیتاب ہوں گے، جو اس میں لوث ہیں۔ وہ نام میں آپ کے سامنے ضرور لاؤں گی اور یہی میرا مقصد ہے کہ معاشرے کے ان بھیاک چوروں کو سامنے لایا جائے تاکہ آپ انہیں

پہچان نہیں۔ ناظرین یہاں بیٹے ہیں ایک چھوٹا سا بیک، ہمارے ساتھ رہنے گا۔“

اس کے ساتھ ہی ماثرہ کی آواز معدوم ہو گئی اور اسکرین پر اشتہار چلنے لگا۔ بھی وہاں عوام میں ایک بندہ حیرت سے بولا
”بھئی واہ، یہ ماثرہ بھی ناچب بھی کسی گروہ پر ہاتھ ڈالتی ہے تو لپکائی ڈالتی ہے۔ اب دیکھنا، بڑے بڑے چہرے بے نقاب ہو
جائیں گے۔“

”ابھی شروع میں جن لوگوں کے نام لے رہی ہے۔ سیاسی حلقوں میں ان کا کتنا بڑا نام ہے۔ پر یہ صاف بچ جائیں گے۔“
قریب کھڑے دوسرے شخص نے مایوسانہ لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا

”جیل یار، ماثرہ تو اپنا کام کر رہی ہے نا۔“ وہ آدمی یہ کہہ کر ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔
پروگرام ابھی ختم نہیں ہوا تھا، ماثرہ نے اپنے گھر کے پورچ میں کاررو کی اور تھکی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے پاپا حبیب الرحمن ٹی
وی راؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جس پر ماثرہ کی رپورٹ چل رہی تھی۔ اسکرین پر پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر بات کر رہا تھا۔

”مس ماثرہ نے بہت حوصلے، محنت اور مہر سے تحقیق کی۔ ہم نے ان کی تحقیق اور معلومات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس گروہ کو
پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ مس ماثرہ جیسے لوگ اگر معاشرے میں اپنی ذمہ داری نبھائیں تو کوئی مشکل نہیں کہ جرائم کا قلع قمع نہ ہو سکے۔“
اس کے ساتھ ہی آواز معدوم ہو گئی۔

ماثرہ اپنے پاپا کو پروگرام دیکھتے ہوئے خوش ہو گئی تھی ماسی لئے خوشگوار انداز میں بولی
”ہائے پاپا۔ کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں بیٹی۔ اتم کیسی ہو؟“ اس نے یوں کہ جیسے وہ ابھی رپورٹ کے سحر سے باہر نہ آیا ہو۔ بھی وہ اس کے پاس بیٹھتے
ہوئے بولی

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”بھئی آج تمہارے چھٹل سے تمہارا کام دیکھا پتہ چلتا ہے کہ تم بہت محنت کر رہی ہو۔ تمہاری بہت تعریف ہو رہی ہے۔“ پاپا کے
لہجے میں فخر چمک رہا تھا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں پاپا۔ میں تو اس سے بھی آگے کا سوچ رہی ہوں۔ بہت سارے پلان ہیں میرے ذہن میں۔“
”گڈ! ان لوگوں کو بے نقاب کرنا ہی ہوگا، جو عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ میڈیا پر آکر بڑے بڑے دعوے کرنے والے،

عوام کو ہنز باغ دکھانے والے، اور پارسا بننے کی کوشش میں ہلکان ہونے والوں کے بارے میں بتانا چاہئے کہ اصل میں وہ کس قدر مجرمانہ
ذہنیت رکھتے ہیں۔ اور مجرم معاشرے کے ان ناسوروں کو سیاست کرنے کا کوئی حق نہیں، جو صرف اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی پردہ پوشی کے لیے
حکومت میں آتے ہیں۔ تاکہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر سکیں۔“ حبیب الرحمن نے گہرے دکھ بھرے جذبات سے کہا

”اسی بات کا تو دکھ ہے، یہاں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال ہی نہیں ہوتا بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے اپنی بھرانہ سرگرمیوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ اس میں سراسر نقصان تو عوام ہی کا ہے نا۔“ وہ بولی

”میڈیا نے سب کھول کر رکھ دیا ہے۔ ان کے چہرے عوام کے سامنے ہیں، فیصلہ اب عوام کے ہاتھوں میں ہے اگر اب بھی وہ ان جیسے سیاست دانوں کو دوبارہ منتخب کر لیں گے تو پھر عوام کی اپنی قسمت خراب ہے۔“ حبیب الرحمن نے کہا

”نہیں بابا، آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اب وہ پہلے والا وقت نہیں رہا، عوام تنگ آچکے ہیں ان بہرہ ریزوں سے۔ وہ اپنا فیصلہ کرنا جانتے ہیں۔“ وہ خوشگوار انداز میں بولی

”میں، متا ہوں، ایسا ہی ہے لیکن اس کا دائرہ کار ان لوگوں تک بھی پھیلاتا ہے جو دور دراز کے علاقوں میں رہتے ہیں اور جاگیرداروں، وڈیروں نے عوام پر تسلط کیا ہوا ہے۔“ حبیب الرحمن نے سکون سے کہا

”میں اس آپشن پر بھی سوچ رہی ہوں پایا۔ کوئی صورت سامنے آئی تو جان کر لوں گی، ابھی تو یہاں کا گند ہی نہیں سمیٹا جا رہا۔ آپ یہ رپورٹ پوری دیکھیں، پھر ہم اس پر بات کرتے ہیں۔ میں چھینچ کر کے آتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ انٹشی اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ پایا بھرنی دی میں کھو گئے۔

انہی لمحات میں جعفر اپنے تھانے میں کام میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے ایک فائل پڑی تھی اور وہ اس میں کھویا ہوا تھا۔ سچی اس کے میز پر پڑا فون بجا۔ اس نے بے دھیانی کے سے انداز میں فون اٹھا کر کہا

”ہیلو!“

”میں خان ظفر اللہ خان بات کر رہا ہوں، جانتے ہوتا۔“

دوسری طرف سے بات سن کر وہ بڑے سکون سے بولا

ہاں جانتا ہوں اور بہت ہی اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ ٹکوتی پارٹی کے ایم این اے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھی جانتا ہوں، جو لوگ نہیں جانتے۔“

”میں نے بھی تمہارے بارے پتہ کیا ہے۔ سنا ہے تم بڑے ایمان دار، قانون کے پابند اور اصول پرست قسم کے سچے پولیس آفیسر ہو۔ نئی نئی نوکری میں ہوتا ہے ایسا۔ ایمان داری کا بڑا بخار چڑھا ہوتا ہے۔“

”جی آپ نے صحیح سنا ہے۔ بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ جعفر نے سکون سے کہا

”وہ جو تو نے اور اس صحافی لڑکی نے اپنا کارنامہ دکھایا ہے نا۔ اس پر بہت داد واہ ہوگئی۔ بڑی داد مل گئی تم لوگوں کو، اب کوئی میڈل شیل بھی مل جائے گا لیکن اب بہت ہو گیا۔ وہ جتنے بندے بھی پکڑے گئے ہیں انہیں تم ہی نے چھوڑا ہے۔ کیسے، یہ مجھے نہیں پتہ۔“

ایم این اے کی بات سن کر وہ ذریعہ لب مسکرایا اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولا

”جی ہاں یہ ہے ظفر صاحب کہ آپ نے جو کچھ کہا انجانے میں کہہ دیا۔ اس لیے پہلی غلطی معاف کرتا ہوں۔ اب میرا جواب سن لیں کہ وہ بندے رہائش میں ہوں گے۔ ان کے ساتھ وہی ہوگا جو قانون کہتا ہے۔“

”لگتا ہے تیرا دماغ درست نہیں جو میرے ساتھ اس لمحے میں بات کر رہے ہو یا پھر مجھے جانتے نہیں ہو۔“ دوسری طرف سے انتہائی طریقہ لہجے میں کہا گیا

”میرا دماغ درست ہے اور پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں وہ کچھ مانتا ہوں جو محام نہیں جانتے۔ دوبارہ پھر بتا دوں کہ میں نے وہی کہا ہے، جو میں نے کرنا ہے جو میرا ضمیر مجھے کہے گا۔ میری تحقیقات جاری ہیں۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ پھر آپ کو دوبارہ اس طرح کا فون کرنے کی رحمت نہ ہو۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ جعفر نے خود پر قابو پا رہے ہوئے کہا تو غصے میں کہا گیا

”نہیں، نہیں اے ایس پی نہیں، میں جان گیا ہوں تو سیدھی طرح ماننے والا نہیں۔ میں کرتا ہوں تیرا کچھ۔“

”تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیری اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ یہی بات کہنے کے لیے تو یہاں میرے آفس آ جائے۔ اب مجھے ہی آنا ہوگا تیرے پاس۔ انتظار کر میرا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا

”واہ۔ احوصلہ، تیرے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ پر اب توفیق جا۔“ ایم این اے نے کہا تو جعفر غصے میں بولا

”دھمکی مت دو، بلکہ جو کچھ کرنا ہے اب کر ڈالو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو کتنا بھاگ سکتا ہے۔“

”بہت جلد۔ اچھے پتہ چل جائے گا۔ لہذا اب بھی وقت ہے سوچ لے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا

”باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے ایم این اے صاحب اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو، کیونکہ میں نے تجھے اور تیرے گینگ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالتا ہے۔“ جعفر نے سکون سے خود پر قابو پا کر کہا تو ایم این اے نے ہلکا سا ہنسنے لگا تاہو بولا

”تو بچہ ہے ابھی۔ تجھے نہیں معلوم، تیرے جیسے کئی پولیس آفیسروں کو میں نے فرینک دی ہے۔ آج وہ بڑے مزے سے نوکری کر رہے ہیں اور زندہ ہیں۔“ ایم این اے نے نیا بیترابا

”مگر مجھے تمہاری ان باتوں سے خوف نہیں ملتی آ رہی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں تو اپنی طاقت دکھا اور پھر میرا حوصلہ دیکھ۔“ وہ غصے میں بولا

”تو نہیں مانتا تو نہ مان۔ بندے تو میں نے چھڑوا ہی لینے ہیں۔ ہاں تیرے جسم پر بھی میڈل سجوا دوں گا۔ پر افسوس وہ جسم زندہ نہیں ہوگا۔“ ایم این اے نے غصے میں کہا

”میں اس دن کا انتظار کروں گا اور تو بھی انتظار کر کہ کب تجھ تک پہنچ جاتا ہوں۔“ جعفر نے کہا تو ایم این اے دھاڑتے ہوئے بولا

”چلو، خواب دیکھتے رہو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جعفر ریور کی دیکھ کر مسکرا اور اسے کریڈل پر رکھ دیا۔



سہمی یکن میں چائے بنا رہی تھی۔ صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ والان میں کرسی پر فہد بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد سسلی دھک چائے لا کر قریب پڑے میز پر رکھے اور سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں والان ہی میں آئے سامنے بیٹھے خاموشی سے چائے پینے لگے۔ بھی اچانک سسلی نے پوچھا

”ایک بات پوچھوں فہد آپ برا تو نہیں مانیں گے؟“

”میں کیوں برا ماننے لگا؟ تم نے جو کہا ہے، پوچھو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو کیا آپ متائیں گے کہ یہاں کیا مقصد لے کر آئے ہو؟“ اس نے اعتماد سے پوچھا تو فہد نے سہ

لے کر عجیبی سے کہا

”سسلی! امیرا یہاں آنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں زمین کے ذرا سے ٹکڑے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ تم

یہاں ہو، استاد جی ہیں۔ یہ مجھے عزیز ہیں۔ انہی پر مجھا اعتماد ہے اور ایسا ہی اعتماد میں چاہتا ہوں۔“

اس کے یوں کہنے پر سسلی چونک گئی۔ پھر تیزی سے بولی

”مطلب، میں آپ پر اعتماد کروں اور آپ جو بھی کرتے چلے جائیں۔ میں اس پر کچھ نہ بولوں، کوئی سوال نہ کروں آپ سے؟“

”ہاں۔! مجھے وہ اعتماد بخش دو سسلی۔ میں تمہیں احترام کی اس سطح پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں تمہیں دیکھنے کے لئے مجھے بھی اپنا سر

اٹھانا پڑے۔ تم فقط ماسٹر دین محمد جیسے مجبور باپ کی بیٹی نہ رہو۔ بلکہ امیدوں کا تار و پیر بن جاؤ۔ یہ میری جذباتی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے

پورا ہونے میں بس تھوڑا وقت حائل ہے اور بس۔“ فہد کے لہجے میں سے اعتماد چمک رہا تھا۔

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ وہ گھبراتے ہوئے بولی

”بس۔! یہی میں سننا نہیں چاہتا۔ اتنے برس میں نے زندگی کی بساط پر مہروں کو آگے پیچھے ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ کون، کہاں

پر کیسے کس کو مات دیتا ہے۔ یہی سمجھا ہے میں نے۔ اگر تم مجھ پر یقین رکھو اور میرا حوصلہ بن جاؤ۔ تو کچھ بھی ناممکن نہیں رہے گا۔ ایک خاص

منزل تک تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ فہد نے اسکی آنکھوں میں دیکھنا ہوا بولا

”میں تو چل پڑوں گی فہد! لیکن، مجھے یقین تو ہو کہ ہماری منزل ایک ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی

جبھی فہد نے چوتھے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے تیزی سے فہد کی طرف دیکھا اور پھر شرم سے کچھ چند لمحوں بعد اپنا ہاتھ اس

کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”بس یہی حوصلہ مجھے چاہئے تھا۔“ فہد نے پر جوش عزم سے کہا تو سسلی اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ وہ شرم سے اٹھ کر دہاں سے جانے

لگی تو فہد نے کہا، ”یوں نہیں ابھی اور اسی وقت اپنی بات کا ثبوت دو، ابھی میرے ساتھ باہر چلو۔“

”کہاں؟“ وہ ایک دم ٹھک کر بولی

”یہاں باہر، کھلی فضا میں۔ سنا ہے تم کئی دنوں سے باہر نہیں نکلی ہو۔ چلو۔“ فہد نے کہا تو وہ چند لمحوں میں سو جتی رہی پھر سر ہلاتے ہوئے انہماک میں غنڈہ بیدے دیا۔

روشن دن میں سرسبز کھیت کی چمکداری پر فہد اور سسلی باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ اسی ہی ایک جگہ رک کر سسلی نے کہا ”آج میں بہت خوش ہوں فہد! پچھلے دنوں بعد میں گھر سے نکلی ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کو یہ قسمت پور کیسا لگ رہا ہے؟“

”کچھ پوچھوں تو خوابوں جیسا، یوں جیسے اپنی ماں کی گود سے آٹا ہوں۔ خیر۔ مجھے یہ بتاؤ۔ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔“ فہد نے ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا

”فہد! جس کے پاس کوئی امید یا کوئی آس ہوتی ہے۔ خواب بھی تبھی دیکھے جاسکتے ہیں نا۔ بس یہاں رہتے ہوئے زندگی گزار رہی ہوں۔ چند صدقہ دے داریوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور بس۔“ وہ سوچتے ہوئے عام سے لہجے میں مایوسی سے بولی

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ خواب ہوں نا، تبھی ان کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔“ وہ بولا

”ہاں۔! میں یہ جانتی ہوں فہد! پرندے میں اڑنے کی صلاحیت فطری ہوتی ہے۔ اسے اڑان بھرناسکھایا نہیں جاتا۔ مگر جب اس کے پر ہی کٹے ہوئے ہوں۔ تب وہ کیسے اڑ سکتا ہے۔“ سسلی حسرت سے بولی

”مطلب۔ کیا کرنا چاہ رہی ہو تم؟“ فہد نے پوچھا

”میں یہاں سکول میں پڑھا سکتی تھی۔ میری جاب بھی ہو گئی تھی۔ لیکن چوہدری کبیر کی وجہ سے میں یہ نوکری بھی نہیں کر پائی۔ اس کی نگاہ بہت گندی ہے۔ میں اسی کی وجہ سے اپنے گھر تک محدود ہو گئی ہوں۔“

فہد چونک گیا پھر جذباتی انداز میں بولا

”سسلی! اڑنے کا شوق اور ہمت پیدا کر دو دل میں۔ پرواز کرنے کا حوصلہ اور طاقت میں دوں گا۔ جس قدر چاہو پرواز کرو۔ کوئی نہیں روک سکے گا۔“

فہد کے یوں کہنے پر سسلی نے حسرت سے کہا

”آپ.... آپ دیں گے مجھے طاقت....“

”ہاں میں۔! کیا بچپن کی یادوں کی اوٹ سے کسی خواب نے نہیں جھانکا.... یولو سسلی! کیا تمہاری زندگی میں میری ذات کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ ابھی تم نے سنا کہ میں یہاں کیوں آ گیا ہوں۔ کیا تمہارے دل نے کوئی جواب نہیں دیا۔“ فہد نے اسے یاد دلایا

”آپ کی آمد سے سارے جواب مل گئے تھے فہد۔! اب میں خواب دیکھا کروں گی۔ مجھے حوصلہ مل گیا ہے۔ محبت انسان کو قوت

دے دیتی ہے اور میں یہ قوت محسوس کر رہی ہوں فہد۔" وہ شرمیلیں لہجے میں بولی

"جی۔۔۔ اسی۔" فہد نے خوشی سے پوچھا تو اس نے آنکھوں سے اثبات کا اشارہ دے دیا۔ جیسی فہد خوشی سے بھر گیا، جس کا

اظہار اس کی آواز میں تھا۔ اس نے کہا

"میں بھی چاہتا تھا۔ اب دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔ اور یوں تو کیا کرنا چاہتی ہو۔"

"بہت کچھ، ستاروں کو چھونا چاہتی ہوں۔" اس نے عزم سے کہا تو فہد نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس طرف چل پڑا، جدھر

گازی کھڑی ہوتی تھی۔

وہ کار میں آہستہ آہستہ کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ قریب ہی سراج کا ڈیرہ تھا۔ اچانک سامنے

چوراہے پر منظر دیکھ کر سلسی کے حواس گم ہونے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ جیجی مارتی، فہد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔



دن کی تیز روشنی میں سراج اپنے ٹریکٹر پر آرہا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ راستے میں چوراہے پر کوئی جیپ لے کر اس

کے راستے میں یوں کھڑا تھا کہ سراج کو اپنا ٹریکٹر لازماً روکنا پڑتا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا تو سامنے، کھانے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا

راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے ٹریکٹر روکا اور ماکھے کو مخاطب کر کے پوچھا

"کیا بات ہے ماکھے، یوں راستہ کیوں روکا ہوا ہے۔ خیر تو ہے نا تجھے؟"

"تم خود سمجھ دار ہو۔ میرا خیال کہ تجھے چھوٹی موٹی بات سمجھانا پڑے گی۔" ماکھے نے اکٹڑ لہجے میں کہا

"کھل کر بات کر دیکھا کہنا چاہتے ہو۔ یا پھر میرا راستہ چھوڑ دو۔" سراج نے قہقہے سے کہا

"رستہ تو ہم دیں گے آج۔ لیکن تم جانتے ہو کہ ہم جب چاہیں تمہارا راستہ روک سکتے ہیں اور تمہارا ہر رستہ بھی بند کر دیں۔ اس لئے ذرا

دھیان سے رہو۔" ماکھے نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا

"دیکھ ادا مکھے۔! تم میں اتنی جرات نہیں ہے کہ تو کسی کا راستہ روک لے یا بند کر دے۔ نوکر بندے کا کیا ہوتا ہے۔ ہاں۔! اگر تو

اپنے چوہدریوں کا کوئی پیغام لے کر آیا تو صاف صاف کہہ، پیہیاں کیوں ڈال رہا ہے۔" سراج نے اپنا غصہ دہاتے ہوئے کہا لیکن طنز پھر

بھی اس کے لہجے میں گھل گیا تھا۔ جیسی ماکھے نے غصے میں کہا

"تو پھر سن۔! یہ جو فہد شہر سے آیا ہے نا۔ اس کی وجہ سے اپنی قسمت خراب مت کر لینا۔ تم جانتے ہو کہ ننگے چوہدری نے تیرے

بھائی امین کے ساتھ کیا کیا تھا۔ وہ حال تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کے یوں کہنے پر سراج غصے میں اٹھ اٹھا۔ اس نے انتہائی غصے میں اونچی آواز میں کہا

"چوہدریوں کو یہ بات جا کر کہہ دے ماکھے۔ فہد یہاں آتا یا نہ آتا۔ میں نے اپنے بھائی کا انتقام ضرور لینا ہے اور آئندہ مجھے کوئی

دھمکی نہیں دیتا۔ میں نے فہد کا ساتھ ہر صورت میں دیتا ہے۔ اب راستہ چھوڑ دو۔“

ماکھے نے سراج کی بات سنی اور اپنی کسی دھمکی کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر اپنی گن سیدھی کر کے بولٹ چڑھایا اور اس کی طرف سیدھی کر کے بولا

”سراج، میں ابھی تمہیں گولی، رسکتا ہوں۔ لیکن کچھ چوہدری کا حکم ہے کہ تمہیں صرف سمجھانا ہے۔ ورنہ تو موت ماکھے کا اور وہ نہیں ملے گی۔ کیا تجھے اپنے بھائی کو دیکھ کر عبرت نہیں ملی۔“

بکو اس بند کرواؤ۔ اسی کو دیکھ کر چوہدریوں سے انتقام لینے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ تم اس کے نوکر ہو۔ اتنی بڑی بات مت کرو۔۔۔ حیرت اوقات ہی نہیں ہے۔ جاؤ، کچھ چوہدری کو بھیج دو۔ مجھ سے بات کرے۔۔۔ چلو راستہ چھوڑ دو ورنہ۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے سراج نے بھی گن نکال لی۔ ماکھا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونک گیا۔ اور اس وقت وہ حواس باختہ ہو گیا جب فہد کی گاڑی وہاں آن رکی۔ اس میں سسلی گھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے لئے یہ منظر بہت دہشت ناک تھا۔ فہد نے ایک نظر سسلی کو دیکھا اور نکلا ہوں ہی نکلا ہوں میں اسے حوصلہ دے کر کار سے باہر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ماکھے نے حیرت سے سسلی کی طرف دیکھا جو کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیب میں جا بیٹھا۔ ابھی سراج نے اونچی آواز میں کہا

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے فہد۔ تم چلو، میں آتا ہوں۔“

فہد گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سسلی بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے ایک نگاہ سسلی کی طرف دیکھا اور کار گاڑوں کی طرف بڑھادی۔ فہد سمجھ رہا تھا کہ یہ منظر کیا کہہ رہا ہے۔

فہد دالان میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سسلی پانی لے کر آ گئی۔ اس نے جگ قریب پڑے چھوٹے میز پر رکھا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی

”فہد، یہ میری کیسی قسمت ہے۔ ذرا سی خوشی ملتی ہے تو، ساتھ خوف کے مہیب سائے کیوں منڈلانے لگتے ہیں۔ ادھوری خوشی کیوں ہے میرے نصیب میں۔“

”تم ایسے کیوں سوچ رہی ہو؟“ فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تو تیز انداز میں بولی

”ٹھیک ہے آپ کے آنے سے مجھے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ لیکن آپ سے جو چوہدریوں کی دشمنی بڑھ رہی ہے۔ ان حالات میں اور کیا سوچا جاسکتا ہے۔“

”یہ تو ہوتا ہی ہے۔ کون چاہتا ہے کہ اس کی عکرائی ختم ہو۔ ہر وہ بندہ جو ان کی عکرائی ختم کر سکتا ہے۔ وہ اس کے دشمن بن جائیں گے۔“ وہ دھیمی سے مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی

”وہ آپ کو۔۔۔ نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ دیکھا نہیں کس طرح وہ۔۔۔“

”سہلی! کسی بھی غلطی میں نہیں رہنا۔ دشمنی میں جان بھی جاسکتی ہے اور ہر اس بندے کو خطرہ ہے، جس کا تعلق میرے ساتھ ہے۔ اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔“ فہد نے ایک دم سے حتیٰ مجھ میں کہا

”اس کا مجھے پوری طرح احساس ہے۔ ہم تو پہلے ہی گھٹ گھٹ کر رہے ہیں۔ ہماری زندگی بھی کیا زندگی ہے، مگر آپ یہ سب کچھ چھوڑ کر اچھا مستقبل اپنا سکتے ہیں۔ کیوں اپنی جان برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“ سہلی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”یہ سب بھول جاؤ سہلی! اور یہ یاد رکھو کہ میں نے اپنا سب کچھ وہیں شہر چھوڑ دیا ہے۔ اب میرا جینا مرنا یہیں ہے۔ یہاں سے چلے جانا بہت آسان ہے۔ مگر کیا چودہویں کو یونیورسٹی میں داخلہ کرنے کے لئے چھوڑ دوں۔ نہیں سہلی۔ اجمتا میرے بس میں ہے۔ میں وہ کروں گا۔ اس راہ میں کوئی میرا ساتھ دے یا خوف زدہ ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دے۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا

”میں اپنے لئے خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی فکر ہے۔ میرا کیا ہے، میرا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ مٹی جی، مٹی ہوں اور مٹی رہوں گی۔“ سہلی نے انتہائی یو سانسہ انداز میں کہا

”نہیں سہلی! تم مٹی نہیں ہو۔ تم تو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہو۔ اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دو کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تم پڑھی لکھی ایک باشعور لڑکی ہو۔ جس میں یہ صلاحیت ہے کہ جو دوسروں کو بھی شعور بانٹ سکے۔“ فہد نے اسے احساس دلاتے ہوئے زوردار انداز میں کہا تو سہلی نے چونک کر اس کی طرف دیکھ اور پھر ایک عزم سے کہا

”کیا میں ایب کر سکتی ہوں۔ کیا میرا وجود، آپ کے کسی مقصد میں کام آ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں پوری جان سے حاضر ہوں۔ مجھے بتائیں کیا کرنا ہوگا؟“

”اب تک کبھی بات تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ یہاں کا ہر فرد میرا مددگار ہو سکتا ہے اور سہلی تم، ایک تہی تو میرا حوصلہ ہو۔ تم وہ کچھ کر سکتی ہو جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا کیونکہ ایک تہی ہو جسے میں پہلے سب سے زیادہ قریب سمجھتا ہوں۔ اس سفر میں میری ہم سفر ہو۔“ وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولا

”مجھے بتائیں فہد! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟“ سہلی حتیٰ انداز میں پوچھا

”خود میں اتنی ہمت پیدا کر لو کہ خوف کے جتنے بھی سائے پھیل جائیں۔ تم ہر حال میں حوصلہ مند رہو۔ جتنا بڑا طوفان آ جائے۔ تم ثابت قدم رہو۔۔۔۔۔ اور تم جانتی ہو ایب کیسے ممکن ہے۔“ فہد نے اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سکون سے کہا تو وہ فہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی

”محبت! یہ محبت ہی ہے جو طوفان سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟“

”محبت لفظوں کا کھیل نہیں، ثابت کر دینے کا نام ہے سہلی۔“ فہد نے شہداء گہنیں لہجے میں کہا

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر دم، ہر گھڑی، ہر جگہ۔ ثابت کروں گی۔“ سہلی عزم سے بولی

”تو میرا یقین رکھو۔ ان چوہدریوں کا خوف ذہن سے اتار کر چھو۔ اپنی سہیلیوں سے ملو۔ ہر کسی کے دکھ درد میں کام آؤ۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر حوصلہ دیتے ہوئے بولا، سچی اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا

”میں آپ کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔“

سہلی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس کا شرم سے سرخ چہرہ دیکھ کر فہد مسکرا دیا۔ وہ تیزی سے بچن میں چلی گئی۔

کھانے کے دوران ہی سہلی کی کچھ سہلیاں آگئیں۔ فہد کھانے کے بعد وہ اٹھ گیا۔

وہ سیدھا اپنے گھر آیا جہاں سراج اور امین آنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں چھا کا چائے لکڑان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا

”لو بھئی۔! میں نے تو اپنی طرف سے کڑک چائے بنائی ہے اب جیسی بھی ہے پی لینا۔“

”اوئے تو لا تو سہلی، باتیں ہی کرتا رہے گا۔“ سراج نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس پر چھا کا شونہ سے بولا

”اوسراج اک ہی تو چھا کا ہے چڈ میں، جس کی پورے علاقے میں دس بچے ہیں۔ اسے چائے بھی بنانی نہیں آئے گی۔“

”تیری دس بچے تو ہے لیکن چھا کے بار۔! تو کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟“ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے یوں کہنے پر

وہ ایک دم سے جذباتی ہوتے ہوئے بولا

”کیا کام کروں بتا۔ چند جماعتیں پڑھی ہیں، کون سا فرنگ ہانا ہے۔ کرنی تو یہی محنت مزدوری ہے نا۔ باپ بھی یہی کرتا آیا

ہے اور اب میں بھی یہی کروں گا۔۔۔ روٹی پوری کر لیں یہی بڑی بات ہے۔“

”کیوں۔! کیا تیرے سر میں بھیجا نہیں ہے؟“ یہ کہتے ہوئے خود ہی سوچتے ہوئے بولا، ”انہیں یہ شعور ہی نہیں کہ ملک کے وسائل

پر ان کا بھی حق ہے۔ ان کے وسائل تو کسی اور کے قبضے میں ہیں۔ یہی بات تو ان گاؤں والوں کو سمجھانی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سراج کی

طرف دیکھ کر کہا، ”سراج۔! تم میری ایک مدد کرو۔ یہاں گاؤں میں کوئی خالی زمین اگر کوئی فروخت کر رہا ہے تو میں وہ خریدنا چاہتا ہوں۔“

”زمین چھا عمر حیات بچنا چاہتا ہے۔ اس کے خاندان والے خود خریدنا چاہتے ہیں۔ چوہدریوں کے پاس بچت بھی چل

رہی ہے ان کی۔ مگر تم اس کا کرو گے کیا؟“ سراج نے سوچتے ہوئے کہا

”میں اسے کسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مقصد کیا ہے۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال جتنی جلدی ممکن ہو

سکے یہ کام کرو۔“ فہد نے حتیٰ لچھے میں کہا تو سراج بولا

”سمجھو۔ تمہارا یہ کام کل ہی ہو جائے گا۔“

”اور پرسوں کا غڈی کا روٹی کے بعد رقم بھی ادا کروں گا۔ اور چھا کے تم یہ ادارہ مت پھرا کرو بلکہ میرے ساتھ رہا کرو۔ بہت

سارے کام ہوتے ہیں کرنے کے لئے۔“ پھر دیکھ لچھے میں امین اراکین سے کہا، ”تم اور سراج پورے دھیان سے رہا کرو، ادھر ادھر کا

خیال کرکا پورا خیال رکھو، دشمن کا کوئی پتہ نہیں۔“ فہد نے تیزی سے کہا

”نہیں فہد! مجھے اس وقت تک سکون نہیں ہوگا جب تک میں اپنے دوست کے قتل کا بدلہ نہ لے لوں۔ تم دونوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا، کیا ہوا وہ؟ کیسا اندھیر ہے یار، میں قتل کا چشم دید گواہ ہوں، اور میری کہیں شہادتائی نہیں۔“

”تو لگزنہ امن، کل ہی تیری ایف آئی درج ہوگی، تم کل تیار رہنا، تمھانے چلیں گے۔“ فہد نے اسے یقین دلایا

”میں ہر وقت تیار ہوں فہد۔“ امن نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ جی سراج تشویش سے بولا

”یار۔ ایک بات میرے دماغ میں کلک رہی ہے۔ ناکھا اگر میرا راستہ روک سکتا ہے تو ہمارے ہی کسی اپنے کو نقصان بھی پہنچا

سکتا ہے۔ میری ماں تو اب رات یہاں نہ رہا کرو۔ استاد جی کے گھر رہ یا میرے پاس۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ چلو ایسا ہی کرتے ہیں۔ ابھی یہ جائے تو پیش۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ فہد نے کہا اور جائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جائے پینے کے بعد سراج اٹھ گیا۔

”فہد میں تمھاری کار لے کر جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ فہد نے کہا اور امن سے باتیں کرنے لگا۔ چھاکا اور سراج باہر نکل گئے۔ گاؤں کے چمک میں جا کر چھاکا اتر

گیا۔ اس نے ضیف دوکان دار سے اپنے مرنے کے لئے میوے لئے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ چھاکے کے گھر میں وہی دیرانی تھی۔

چاچا سوہنا گھر نہیں تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے مرنے کو چھڑا لیا۔

چھاکا اپنے مرنے کو لیے چارپائی پر بیٹھ ہوا، اسے ہادام کھلا رہا تھا اور ساتھ میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”دیکھ شہزادے، میں نے حیری ٹیل سیوا میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس لیے اب تو نے مقابلہ جیت کر دکھانا ہے۔ میری کنڈہ نہیں

لگنے دیتی۔“ اس پر مرنے والوں بول اٹھا، جیسے وہ اس کی بات سمجھ رہا ہو۔ جی چھاکا اپنی ذہن میں کہتا چلا گیا۔ ”ہاں۔! شاہاش، تو میری گل سمجھتا

ہے۔ تجھے تو پتہ ہے اک ہی تے میں ہوں اس پنڈ میں جس کی دس بچہ ہے۔ اگر تو ہار گیا تو پھر میری کیا عزت رہ جائے گی بھلا۔“

اس کی باتوں کے دوران چاچا سوہنا گھر آ گیا۔ وہ مگن میں آیا اور قریب بڑی چارپائی پر خاموشی سے آکر بیٹ گیا۔ چھاکے نے

اپنے باپ کو حیرت سے دیکھا۔ ہر وقت اپنے آپ کو خوش رکھنے والا چاچا سوہنا آج اتنا خاموش کیوں ہے۔ چھاکے نے دھیرے سے پوچھا

”ابا، خیر تو ہے نا، بڑا چپ ہے۔ نہ مجھے کچھ کہنا میرے شہزادے کو۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کہیں کسی نئے عشق میں ناکام تو

نہیں ہو گیا۔“

”اونے پتر، ٹھیک ہے میری طبیعت۔ اب میں نے کیا عشق کرنا ہے یار۔ اب تو بس آگے کی فکر ہے۔ وہ جس طرح میں محمد بخش

سرکار میں کہتے۔ سدانہ بانس لبلیل بولے۔ سدانہ ہارغ بہاراں۔ سدانہ ماہے حسن جوانی سدانہ صحبت یاراں۔“ چاچے سوہنے کی آواز میں

نجانے کیوں سوزور آیا تھا۔ چھاکا ایک دم سے جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے مرنے کو ایک طرف اچھلا اور اپنے باپ کے پاس جا کر بیٹھ

گیا، پھر بڑے پیار سے پوچھا

”ابا! آخر تو ہے نا، ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟“

”اوپر اس قسمت نگر کی قسمت پتہ نہیں کیا ہے..... پہلے تو صرف چوہدریوں کا خوف تھا۔ اب فہد کے آنے سے خوف بڑھ گیا ہے، پتہ نہیں کیا ہوگا۔“ چاچا سو جتنا تشویش سے بولا تو چھہ کے لئے کہا

”فہد ان کی طرح ظالم تو نہیں ہے نا۔ وہ تو خود چوہدریوں کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔“

”اوائے چھہ کے، اگر فہد کوئی تیرے اور میرے جیسا عام سا بندہ ہوتا تو کوئی ڈر نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط ہیں تو وہ ان چوہدریوں سے ٹکر لینے آگیا ہے۔ مجھے ڈر یہ ہے پھر کہ جب دو ہاتھی آپس میں لڑ پڑیں نا تو نقصان اس ہستی کا ہوتا ہے جہاں ان کی لڑائی ہو، پتہ نہیں اب اس قسمت نگر کا کیا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں سے خوف چمک رہا تھا۔

”اوا ابابا، رب سائیں چکا کرے گا تو ایویں خوف نہ کھا۔ بلکہ جو صلے کا انجکشن لگوا، قسمت میں جو ہونا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ پار گاؤں کی بیوہ دارے پتہ کیا تھا میں نے۔“ چھہ کے نے مذاق میں کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر اکٹا ہٹ سے بولا

”اوجا، جا کر اپنے گلزار کو بادام کھلا۔ میرا سر نہ کھا۔ مجھے کچھ دیر آرام کرنے دے۔“ چاچے سوہنے نے جیسے ہی کہا تو مرغا بول اٹھا۔ چھہ کا پیپہ تو اپنے باپ کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر کا نہ مھے اچکا کر ایک طرف جا بیٹھا۔ چاچا سوہنا ہلکے ہلکے گنگٹانے لگا۔

”ٹوٹے لوٹے۔۔۔ بھرنے لڑتے۔۔۔ سچے کر بھاڑا بھرتا۔۔۔“

اس کی آواز میں سوز نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔

سراج کچھ دیر بعد ہی چاچے عمر حیات کو اس کے کھیتوں میں جا ملا۔ اس نے سڑک کنارے کاررو کی تو وہیں دونوں ایک کھیت کی منڈ حیر پر بیٹھ کر باتیں کرتے لگے۔

”چاچا، سنا ہے کہ تو اپنی زمین بچ رہا ہے؟ کیا یہ سچی بات ہے؟“ سراج نے صاف لفظوں میں پوچھا

”ہاں ہتر۔ اگر میرے بھائی بیچتے ہی نہیں دے رہے۔ وہ خواہ مخواہ مجھے اذیت دے رہے ہیں۔ زمین بیچنا میری مجبوری بن گئی ہے ہتر۔“ عمر حیات نے بتایا

”ایسی بھی کیا مجبوری چاہتا ہری زمین ہے، تم خود کاشت کرو۔ بیچنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا مجبوری بن گئی ہے۔“ سراج نے پوچھا تو عمر حیات نے ایک سر آہ بھرتے ہوئے کہا

”کاش ہتر، کوئی تیرے جیسا میرا ہتر ہوتا تو میں بھی سراٹھا کر اپنے بھائیوں کا مقابلہ کر لیتا۔ تو جانتا ہے کہ میری ایک ہی بیٹی ہے، میرے بھائی صرف جائیداد کی خاطر اسے مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو ساری عمر کے لیے اذیت میں نہیں ڈال سکتا۔“

”ایسے کیسے چھین لیں گے وہ تمہارے، اتنی بھی اندیر گری نہیں ہے۔“ سراج نے کہا

”ہے، اندھیر گھری ہے ہر تو یہاں نہیں رہا، تجھے نہیں پتہ۔ پر تیرے بھائی کے ساتھ جو ہوا، وہ تو نہیں جانتا؟ چوہدری میرے بھائیوں کے ساتھ ہے۔ کسی دن چپکے سے مجھے قتل بھی کر سکتے ہیں۔ میری دہی اس دنیا میں تنہا رہ جائے۔ نہیں ہتر، میں اس کی جلد از جلد شادی کر کے، اسے اپنے گھر کی کرنا چاہتا ہوں۔ یہی زمین میری دشمن بنی ہوئی ہے۔ میں اب اسے نہیں رکھنا چاہتا۔“ چاچے عمر حیات نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا

”کیا اس لیے نہیں بک سکی زمین؟“

”ہاں، خریدار کسی بھی پھڈے سے ڈرتے ہیں، میرے بھائی اور چوہدری ان کا جینا حرام کر دیں گے۔“ چاچے نے کہا تو سراج نے اچانک سر اٹھا کر کہا

”چاچا تم اس کی جو رقم مانگتے ہو، میں دیتا ہوں۔ کرو سو دا، اگر تنہا راول مانے تو، پھڈے میں دیکھ لوں گا۔“

”تم یا فہد؟“ عمر حیات نے حیرت سے پوچھا

”فہد ہی سمجھ لو۔“ سراج نے صاف گوئی سے کہا

”یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کل چوہدریوں نے اس زمین کے معاملے میں پھڈا ڈالنا اور میں تمہیں جاتا ہوں، تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔“ چاچے عمر حیات نے کہا تو سراج شے میں بور

”یہ ہم دیکھ لیں گے۔ بس ڈیٹا بت قدم رہتا۔“

”جہاں چاہے بیان لے لینا۔“ چاچے عمر حیات نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے۔ آج شام اپنی رقم لے کر لکھ پڑھ کر لینا۔ میں اور فہد آ جائیں گے۔“ سراج نے حتیٰ انداز میں کہا تو چاچے عمر حیات

نے کہا

”میں انتظار کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ دونوں اس بارے ہاتھیں کرنے لگے۔ قسمت نگر میں اک نیا باب لکھا جانے والا تھا۔



چوہدری کبیر صوفی پر بیٹھا ہوا اور، کھا اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا

”ہوں، تو اس کا مطلب ہے سراج سیدھے طریقے سے نہیں سمجھا۔ اب اسے اچھی طرح سمجھانا پڑے گا۔“

”اس کا تو رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا ہے چوہدری صاحب۔ اب تو وہ اپنے ساتھ اسلحہ بھی رکھتا ہے۔ پہلے ان میں اتنا حوصلہ نہیں

تھا۔“ مائیکے نے بتایا

”کیا اسلحہ بھی؟..... اسے یہ حوصلہ ملا کیسے؟“

”فہد نے، یہ حوصلہ انہیں فہد ہی نے تو دیا ہے اور وہ بھی وہیں آ گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے جیسے اسے یاد آ گیا، تبھی اس نے جھپکتے ہوئے کہا، ”اور ایک بات اور بتاؤں گے چوہدری جی۔“

”انکی کیا بات ہے مائیک؟“ کبیر نے حیرت سے پوچھا
 ”فہد کے ساتھ کھیتوں میں سٹکی بھی تھی چوہدری جی۔ لگتا ہے وہ بھی فہد کا حوصلہ پا کر گھر سے باہر نکل ہے۔ انکی اس کے ساتھ تھی۔“

یہ سنتے ہی کبیر حیران رہ گیا۔ وہ حیرت اور غصے میں بولا
 ”سٹکی... فہد کے ساتھ؟ اس کا مطلب ہے سٹکی بھی... وہ بھی اپنے پر نکالنے لگی ہے۔ نہیں چھوڑوں گا، اب فہد کے دن قریب آ گئے ہیں، اب اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

”تو پھر اس سارے فساد کی جز، فہد ہی کا کام کر دیں؟“ مائیک نے پوچھا
 ”ہاں۔ اور اب جہاں بھی ملے۔ اس کا کام۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رک گیا پھر سوچتے ہوئے مسکرا کر سٹاکا نہ لےجے میں بولا، ”لیکن نہیں۔ پہلے سٹکی کو اٹھا کر پار ڈرے میں پہنچا دو۔ میں کچھ دن فہد کا ترپنا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جیسے حکم چوہدری صاحب! میں آج رات ہی اسے اٹھا لیتا ہوں۔ یہ کام ہو گیا سمجھے۔“ مائیک نے یوں کہا جیسے اس کی اپنی مرضی بھی اسی میں ہو۔ وہ اپنا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ تبھی کبیر نے کہا
 ”اور دیکھو۔ انگوٹوں میں کسی کو کانٹوں کا ن خبر نہیں ہونی چاہئے کہ سٹکی ہے کدھر۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ فہد اسے کیسے تلاش کرتا ہے۔ یہ کھیل بھی کھیل کر دیکھتے ہیں یا۔۔۔ مار تو اسے دینا ہی ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ چوہدری جی۔“ مائیک خوشی سے بولا
 ”چل اب جا، تم صبح وہیں پار دالے ڈبرے پر میرا انتظار کرنا دین آؤں گا۔“ کبیر نے کہا تو مائیک تیزی سے باہر نکلا گیا۔
 چوہدری کبیر سوچ میں گم تھا اور اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔



اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ ماسٹر دین محمد کے گھر صحن میں فہد بستر پر بڑا ہوا تھا کہ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے آہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اسے غصہ محسوس ہوا تو اس نے سر ہانے کے نیچے سے بھٹل نکالا اور آہستگی سے باہر کی جانب لپکا۔ اسے ایک سایہ محسوس ہو کر ہوا دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ سایہ اس کے بھٹل کی رینگ میں آتا تو اس نے کڑک کر کہا

”کڑک جاؤ۔ اور نہ گولی مار دوں گا۔“

وہ سایہ ایک دم سے ٹھٹھک گیا پھر پلٹ کر گن سیدھی کی ہی تھی کہ فہد نے قائل کر دیا۔ وہ سایہ پلٹ کر گرا۔ فہد تیزی سے اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ کھٹکھا اور اندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ٹانگ پر ہاتھ رکھے ہوئے تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ فہد کو آگے

بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسا پھرنا نظر پھیل گیا جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ کر سر جھکا چکا ہو۔ فہد نے اس کے سر پر پٹل کی نال رکھ دی۔ پھر اس کی گن پکڑ کر سر دلچھے میں بولا

”کیوں آئے ہو؟ جتنا دور نہ.....“

یہ کہتے ہوئے فہد نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا تو ماٹھا کھرا ہجے ہوئے بولا

”س... سس... سسلی کو اٹھانے، کئے چوہدری نے حکم.....“

وہ تارہا تھا کہ ایسے میں سسلی نے کمرے سے نکلتی ہوئی یہ بات سن لی۔ وہ ایک دم سے خوف زدہ ہو گئی۔ تبھی شدید غصے میں فہد نے اس سے کہا

”کیا سمجھا ہوا ہے تم لوگوں نے اس گھر کو۔ تم اور حیرے چوہدری کو معلوم نہیں کہ اس گھر کی حفاظت کرنے والا آگیا ہے، پھر بھی پاگل پن کیا ہے تم لوگوں نے؟“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ماسٹر دین محمد اندر سے باہر نکل آیا۔ وہ باہر کی صورت حال دیکھ کر تھمرا گیا۔ ایسے میں، کھادہشت زدہ لہجے میں بولا

”میں چلا جاتا ہوں۔ پھر آئندہ کبھی اس گھر کی طرف مت نہیں کروں گا۔“

”ماٹھے۔ اتیری زندگی اور موت کے درمیان بس ایک لمحہ ہے۔ میں چاہوں تو اس چار دیواری کا تقدس پامال کرنے پر تمہیں ابھی سزا دے دوں۔ لیکن تو کسی کا نوکر ہے۔ تیرے مرجانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔۔۔ حیرتی جگہ کوئی اور آجائے گا۔“ فہد نے کہا تو ماٹھا چونک گیا۔ چند لمحوں سر جھکانے رہا پھر عجیب سے لہجے میں بولا

”مجھے معاف کر دے یا پھر مجھے گولی مار دے۔ میرا مرجانا ہی اچھا ہے۔“

”میں نہیں۔۔۔ تجھے وہ ماریں گے، جن کے لئے اب تو بے کار گھوڑا ہے۔ میں تم پر گولی بھی ضائع نہیں کروں گا۔ جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔“ فہد نے اپنا پاؤں اس پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ماٹھے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو ماسٹر دین محمد کی آواز آئی

”اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کس لئے رات کے اندر میرے میں یہاں آیا ہے؟“

”یہ مجھے مارنے آیا تھا استاد جی، پوچھ میں اس سے۔“ فہد نے اونچی آواز میں بتایا تو ماٹھا پھر سے چونک گیا۔ پھر دکھلاتے ہوئے بولا

”نہیں..... یہاں.....“

”جاؤ یہاں سے، پھر پٹ کر بھی نہ دیکھنا۔ بتا دینا انہیں میں ابھی جاگ رہا ہوں۔“ فہد نے کہا تو ماٹھا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ فہد نے پٹ کر ماسٹر دین محمد سے کہا

”آپ آرام کریں استاد جی، صبح بات کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔ سسلی اور ماسٹر دین محمد حیرت زدہ سے

واپس پلٹ گئے۔ فہد بھر سے اپنے ہستر پر آگیا۔ فہد اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔

فہد منہ ہاتھ دھو کر محن میں دھری کرسی پر آن بیٹھا۔ جس کے پاس ہی چار پائی اور ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ درمیان میں میز تھی۔ سٹلی چائے کا کپ میز پر رکھا اور اس کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ فہد نے کپ اٹھایا تو سٹلی نے کہا ”رات آپ نے ماکے کو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ مجھے اغواء کرنے آیا تھا؟“

”اس لئے سٹلی کہ استاد جی پہلے ہی بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ سچ انہیں مزید خوف زدہ کر دے۔“ فہد نے آہستگی سے کہا

”کیا وہ اس پر خوف زدہ نہیں ہو سکتے کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو کسی کو جان سے ختم کر دیتا، کیا زیادہ بھیاں ک نہیں ہے؟“ سٹلی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا

”سٹلی تم کیوں سمجھتی ہو۔ عزت کا معاملہ مر جانے سے بھی زیادہ واردیتا ہے۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہ اپنی ذات پر ہر طرح کا ظلم سہہ کر صبر کرتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیوں کیا۔ صرف اسی لئے“ اس نے سمجھتے ہوئے کہا ”میں جانتی ہوں فہد۔ لیکن اگر آپ کو ہماری وجہ سے کچھ ہو گیا۔ تو پھر ہم کیا کریں گے۔ یہ خود غرضی نہیں ہے بلکہ احسان کا ایسا بوجھ ہوگا۔ جو ہمیں یسینے دے گا اور نہ ہی ہمیں مرنے دے گا۔“ سٹلی نے ایک دم جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا ”تم ایسا کچھ بھی نہ سوچو، میں اگر یہاں پر ہوں تو یہ میرا اپنا مقدر ہے۔ جس کے لئے میں اپنی جان اٹھلی پر رکھ چکا ہوں تم پر بلا استاد جی پر احسان نہیں بلکہ میں تو اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہا ہوں جو استاد جی نے مجھ پر کیا۔“

”اس بار تو ان کا وار خالی چل گیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کیا آئندہ وہ ایسی اوچھی حرکت نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں یونہی معاف کر دیں گے؟“ سٹلی کے لہجے سے خوف نہیں جا رہا تھا۔ اس پر فہد نے یقین بھرے لہجے میں کہا

”وہ آئندہ بھی ایسی ہی اوچھی حرکت کریں گے۔ انہوں نے ہمیں معاف کیا کرتا ہے۔ ان کا بس چلے تو ہمیں اس دنیا سے ہی نکال دیں۔ لیکن تم متاؤ، کیا ہم مر جائیں؟“

”میں آپ سے وعدہ کر چکی ہوں فہد۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔ چاہے میری جان چلی جائے۔“ وہ عزم سے بولی تو فہد نے مضبوط لہجے میں سمجھا یا

”تو پھر یہ بات جان لو سٹلی، ہم ایک جنگل میں رہ رہے ہیں۔ اور جنگل کا قانون صرف اور صرف طاقت ہوتا ہے۔ پتہ دلی ہے جیسے اپنی حفاظت کرنا آتا ہو۔ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے وہی پتے ہیں۔ انہی پر ظلم ہوتا ہے۔ انہی کا خون بہایا جاتا ہے۔ خود کو مضبوط کرو سٹلی۔“

”میں واقعی خود کو کمزور سمجھتی رہی ہوں۔ لیکن جب سے آپ آئے ہیں۔ میں نے خود کو بہت مضبوط کر لیا ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔“ اس نے فہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سچائی بیان کر دی۔

”ابنوں کو آواز یا نہیں کرتے۔ میں تو گہری اندھیری رات سے سورج نکلنے آیا ہوں۔ جس نے میرا ساتھ دینا ہے، وہ آجائے..... اور بس۔“ فہد نے مسکراتے کہا اور سسلی کی آنکھوں میں دیکھا۔ سسلی نے چہرے ہونے اس کی طرف دیکھا، جذباتی انداز میں کچھ کہنے کے لئے لب و لہجے، مگر کچھ نہ بولی، لبوں پہ آئے لفظوں کو اپنے اندر ہی محفوظ کر لیا۔ شاید اس نے لفظوں میں اظہار کرنا مناسب خیال نہ کیا ہو۔ پھر بولی

”آپ کے لئے ناشتہ لاؤں۔ اباجی تو بچانے کہاں بیٹھ گئے ہوں گے؟“

”نہیں، وہ آئیں گے تو کروں گا۔ تم چائے ایک کپ چائے اور لے آؤ۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سسلی مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد فہد اپنے گھر جانے کی بجائے سراج کے گھر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے امین کو اپنے ساتھ لیا اور نور پور کی جانب چل پڑا۔ اس نے امین سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ تھانے میں ایف آئی آر ضرور درج ہوگی۔

وہ نور پور تھانے جا پہنچے۔ انسپکٹر فون پر بات کر رہا تھا۔ فہد اور امین اس کے پاس جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے ایک ہارن کی طرف دیکھا پھر جان بوجھ کر ان کی طرف توجہ نہیں دی اور بات کرتا رہا۔

”سنا پھر، حیرے لالے کا کیا حال ہے، سنا ہے کافی مال بنا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوسری طرف سے چند لمحے منتظر رہا، پھر فہد کی طرف دیکھ کر بولا، ”ہاں کچھ لوگ بڑے میز سے ہوتے ہیں۔ انہیں الف کی طرح سیدھا کرتا ہی تو ہمارا کام ہے۔“

فہد نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور ریور چیمن کر کر ٹیڈل پر رکھ دیا۔ اس حرکت پر انسپکٹر نے صبر کر دیکھا۔ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”کچھ لوگ باتوں سے نہیں مانتے، انہیں منانا پڑتا ہے۔“

”گلتا ہے تیرا دماغ ٹھیک کرتا ہی پڑے گا۔“ انسپکٹر نے سرد سے لہجے میں کہا

”پہلی بات تو یہ ہے انسپکٹر کہ میرا دماغ ٹھیک ہے اور دوسری بات یہ کہ تم اس کا بل نہیں ہو کہ میرے دماغ کے بارے سوچ سکو۔ خیر!! امین کی ایف آئی آر درج کرو۔“ فہد نے سکون سے کہا

”کبھی ایف آئی آر؟“ وہ انجان ہنستے ہوئے بولا

”وہی جس بے جا کی، جو یہ لکھوانے آیا تھا۔ پھر سن لو، چوہدری کبیر نے اسے اپنے ڈیرے پر رکھا، تشدد کیا اور پھر تم نے اسے حوالات میں رکھا۔“ فہد نے اسے جتایا تو انسپکٹر تھک لگا کر بولا

”بہت مصیبت ہو تم بار۔ میں اپنے خلاف ہی ایف آئی آر لکھوں گا۔“

”اب نہیں لکھو گے تو چند دن بعد لکھو گے۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔ وہ قتل جو کبیر نے کیا اور جسے تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ اندھا قتل بن کر داخل دفتر نہیں ہوگا۔ یہ سن لو انسپکٹر۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”اتنا قانون نہ بھارو، وہ کیس عدالت نے ختم کر دیا ہے۔“ اسپیکر نے عمارت سے کہا

”وہ کیس ری اوپن بھی تو ہو سکتا ہے۔“ فہد نے اطمینان سے کہا تو اسپیکر چونک گیا۔ جبکہ وہ کہتا چلا گیا، ”خیر! وہ تو ری اوپن ہو

گا۔ تم جس بے جا کی ایف آئی آر ابھی درج کرو، چوہدری کبیر کے خلاف.....“

اسپیکر نے بھی سکون سے سنا اور پھر لا پرواہی سے بولا ”ٹھیک ہے اپنی درخواست دے دو، میں اس پر کارروائی کرتا ہوں اور اگر اس

میں تشدد بھی لکھواتا ہے تو اس کا میڈیکل ہوگا، یہ تو پتہ ہوگا تمہیں۔“

”میں تمہارے حیلے اور بہانے جانتا ہوں کہ یہ تم کیوں کر رہے ہو۔ میرے کہنے پر ایف آئی آر لکھو گے تو اچھا ہے ورنہ یہ تو لکھتا تو

پڑے گی۔ یہ تو پتہ ہوگا تمہیں۔“ فہد نے طنز سے لہجہ میں کہا

”ٹھیک ہے، لکھتا ہوں، خیر پہلے میں تفتیش کروں گا کہ یہ تم سے رقم لے کر چوہدری پر الزام تو نہیں لگا رہا۔“ اسپیکر ہنستے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو، ہاں یہ بتا دو عدالت کا حکم ماننا ہے، یا اپنے کسی آفیسر کا۔“ یہ کہہ کر فہد اٹھنے لگا تو اسپیکر ایک دم سے انس

دیا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا

”جلی لکھوا، میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو کیا حیر مار لے گا۔“

جس پر فہد نے امین کو اشارہ کیا تو اپنا بیان لکھوانے لگا۔



چوہدری کبیر کی گاڑی ڈیرے پر آ کر رک گئی۔ وہ تیزی سے گاڑی میں سے نکل کر دالان کی جانب بڑھا۔ ملازمین آگے بڑھ کر

اسے سلام کرتے چلے گئے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا

”سلام چوہدری صاحب۔“

اس پر چوہدری کبیر نے دھاڑتے ہوئے پوچھا

”اوئے، یہ ما کھا کدھر ہے؟“

”ادھر ہی ہے چوہدری صاحب۔ آپ تشریف رکھیں میں ابھی ماتا ہوں اسے۔“ اس نے جلدی سے کہا

”جا جلدی کر..... اس لے کر آ میرے سامنے۔“ کبیر نے غصے میں کہا تو ملازم پلٹتے ہوئے بولا

”جی..... میں ابھی لایا۔“

ملازم چلا گیا اور چوہدری کبیر دالان میں مضطرب سا ٹھہرنے لگا۔ پھر اس وقت رک کر دیکھا جب ما کھا اسی ملازم کے سہارے اس

کے سامنے آ گیا تو اس نے پوچھا

”اوئے ما کھے، ساری رات گزر گئی تمہارا انتظار کرتے ہوئے۔ تجھ سے کام تو کیا ہونا تھا۔ خود کوئی کھ کر ادھر بیٹھے ہو۔“

”میں گیا تو تھا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ فہد پہلے ہی میرے انتظار میں ہے۔ عین وقت پر اس نے۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو چوہدری کبیر نے غصے میں اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا

”تو پھر تم نے اسے گولی کیوں نہیں، رومی۔ خود گولی کھا کر یہاں کیوں آئے ہو۔ دل کرتا ہے اب تجھے گولی مار دوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑے ملازم سے گن پکڑ لی۔ انہی لمحوں میں ماکے کو فہد کی بات یاد آگئی۔ ماکے نے خوف زدہ اور حیرت زدہ سے انداز میں کہا

”آپ بے شک گولی مار دیں، مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ وہاں پر ہے۔ ورنہ میں اسی حساب سے جاتا۔“

تجھی چوہدری کبیر غصے میں پاگل ہو کر اور گن کا بولٹ چڑھاتے ہوئے دھاڑا

”ماکے۔ اتو، ان لے۔ تو بے کار ہو گیا ہے۔ تو اب کچھ نہیں کر سکتا۔“

”ایک موقع اور۔۔۔ چوہدری گئی۔ پھر چاہے گولی مار دینا۔“ ماکے نے عجیب سے لہجے میں کہا

”ماکے۔ اتو ہمارا پرانا دوا دار ملازم ہے۔ اسی لیے تجھے معاف کیا، جا، تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔ اب فہد کو ختم کرنا ہے۔ ورنہ ہو جا، ورنہ میں پہلے تیرا ہی کام نہ کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے کبیر نے گن ملازم کی طرف اچھال دی۔ جسے ملازم نے دیوبھج لیا۔ پھر آگے بڑھ کر کار کی جانب چلا گیا۔ ماکے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ چوہدری کبیر کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔



حبیب الرحمن ڈرائنگ روم بیٹا فون سن رہا تھا کہ مارہ چائے کاڑھے اپنے ہاتھوں میں لے کر آگئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھا اور ایک کپ اپنے پاپا کو دے کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ حبیب الرحمن فون بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوا، تو ماڈ سے بولی

”پاپا۔ آج صبح بڑی خوشگوار ہے۔ بڑے دنوں بعد آپ کے ساتھ یوں چائے پینے کا موقع ملا ہے۔“

حبیب الرحمن اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا

”آج میری آف ہے نا، ویسے وہ تمہاری رپورٹ کی بہت تعریف کی جا رہی ہے۔ مجھے بہت فون ملے ہیں۔ اب بھی یہی بات ہو رہی تھی۔“

”بالکل پاپا، مجھے بھی بہت فون آئے ہیں۔ اصل میں پاپا لوگ تنگ آچکے ہیں ایسے سیاست دانوں سے، وہ اس ماحول سے ٹکنا چاہتے ہیں، تبدیلی چاہتے ہیں۔“ مارہ نے کہا تو اس کے پاپا بولے

”مارہ۔ سیاست پر روایتی جاگیرداروں اور صنعت کاروں کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ حکمرانی سے لے کر مصیبت تک یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو حقیقی عوام ہیں۔ وہ جذباتی نعروں، تصوراتی سبز باغوں اور فلاحی مملکت کے خواب دیکھتے دیکھتے اپنی دوسری نسل بوڑھی کر چکی ہے۔“

”پاپا۔ آپ کا تعلق تو بزنس کیونٹی سے ہے۔ آپ لائن کے کس طرف ہیں عوام میں سے ہیں یا تاجروں کے ساتھ؟“ مارہ فوراً

سوال کر دیا

”بات یہ نہیں کہ میں کس طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ بات یہ کہ میرے دل میں اپنی وطن کے لیے کتنا مثبت جذبہ ہے۔ میں اپنی ملک کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں اگر پرنس کر رہا ہوں تو اس ملک کی عوام ہی میں سے ہوں، جبکہ ہوا یہ ہے کہ روایتی سیاست نے ہمارے وطن کو کس جگہ لاکھڑا کیا ہے۔ کیا ترقی کی ہے ہم نے؟ بلکہ خود کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔“ پاپا نے دکھ سے کہا

”ہم اسے یوں بھی دیکھ سکتے ہیں پاپا کہ مادیت پرستی میں دولت کمانے کی دھن نے کرپشن کی راہ دکھائی اور ہم فقط اپنے لئے سوچتے ہیں۔ ملک کا نہیں سوچا۔“ وہ بولی

”ہائل۔! اب دیکھو۔ ملک کی مجموعی ترقی کس طبقے کے کھاتے میں جاتی ہے وہی نا، جو حکمران رہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس وقت ہمارا وطن ترقی یافتہ ہوتا یا کم از کم ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم وہیں کھڑے ہیں۔ غلامی مملکت کے خواب کو ہم نے چھو بھی نہیں۔ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہے۔“ پاپا نے دکھ میں بیٹے ہوئے لہجے میں کہا

”میں یہ بات سمجھ سکتی ہوں۔ یہ کوئی ذہنی چھپی بات نہیں۔ عوام آج بھی بنیادی سہولیات کو ترس رہے ہیں۔“ مائرہ نے اپنے باپ کی تائید کی۔

”عوام پس رہے ہیں۔ جب تک ایوانوں میں اس کی رسائی نہیں ہوگی۔ ان کے مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ کون کرے گا حل؟“ اس نے کہا مائرہ تیزی سے بولی ”سوری پاپا۔ آپ بھی تو محض طاقت کے حصول کی جنگ لڑ رہے ہیں، سیاست کا کھیل

”میں، ماما ہوں روایتی سیاست محض طاقت کا کھیل ہے۔ لیکن جب ایک طبقہ ہی تمام تر وسائل پر قابض ہو جاتا ہے تو پھر ایسی جنگ کا اخلاقی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتی اس ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے؟“ حبیب الرحمن نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”غربت، جہالت، بے روزگاری“ اس نے کہا

”نہیں۔! حق دار کو اس کا حق نہ ملتا ہے۔ کیا عوام کا حق نہیں کہ انہیں، تعلیم، روزگار، صحت، ان سب کی سہولیات ملیں، انصاف ملے۔ خیر۔! یہ ایک لمبی بحث ہے ایسے میں ہم جیسے لوگوں کو اب میدان میں آنا چاہئے۔ ورنہ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہماری داستان نہ ہوگی داستانوں میں۔“ حبیب الرحمن نے اپنا موقف بتا دیا

”حق تو عوام کو بھی حاصل ہے۔ ایک جمہوری حکومت عوام ہی سے تو بنتی ہے۔“ مائرہ نے کہا

”یہ فقط نظر یہ ہے، حقیقت میں اس ملک کی اکثریت غریب عوام ہے اور ایوانوں میں کتنے فیصلہ دان کے نمائندے ہوتے ہیں؟“

پاپا نے کہ تو مائرہ بولی

”جی پاپا۔! جس طبقے کو شعور آ جاتا ہے۔ وہی اپنی بقاء کی جدوجہد کرتا ہے۔ اگر عوام کو شعور آ جائے اور وہ اپنے جیسا نمائندہ جن

لیس تبھی یہ ممکن ہے۔“

”تو بس۔! اہمیت تمہاری سمجھ میں آگئی۔ اور جو میں نے کہا تھا کہ تجھے دیکھ کر مجھے یہ سب کا خیال آیا تو یہ غلط نہیں۔ آپ میڈیا

کے لوگ بہت بڑا کام کر رہے ہو، شعور مدد ہے ہو، لیکن نرا شعور کیا کرے گا، جب اس شعور کو درست سمت ملے۔“ پاپا نے اسے سمجھایا

”حقیق یو پاپا۔ مجھے اب بہت زیادہ حوصلہ مل گیا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی

”اب میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میڈیا دانشور لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ان پر بڑے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عوام کو درست شعور دیں، ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتائیں۔ ایک قوم بن جانے کی جدوجہد کریں۔ ایک جمہوری ملک میں اصل طاقت عوام ہی ہیں۔ یہ شعور اجاگر کریں کہ وہ اپنی طاقت کو کیسے استعمال کریں کہ یہ ملک ایک فلاحی مملکت بن جائے۔ فلاحی مملکت ہی ہمارا خواب ہے۔“ پاپا نے یوں کہا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

”میں سمجھ گئی پاپا کہ آپ مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں۔ میں پوری کوشش کروں گی۔“ مائرہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”گڈ۔ آپ جہاں پر بھی ہو۔ اپنے دائرہ کار میں کوشش کرو۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے پاپا نے کپ میں سے سب لیا۔ اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ بہت سارا وقت گزر گیا۔ تبھی مائرہ آفس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

مچل جاتے ہی ہاس کا بلاوا آ گیا۔ اس لئے کچھ کئے بغیر وہ ہاس کے آفس چلی گئی۔ وہ جب سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تو ہاس نے کہا ”کل آپ کی رپورٹ آن انیئر ہو جانے کے بعد مجھے بہت فون ملے۔ بہت سر ہٹا گیا ہے آپ کی رپورٹ کو۔ لوگوں نے بہت تعریف کی ہے آپ کی مائرہ۔! بہت خوشی ہوئی آپ اسی محنت اور لگن سے کام کریں۔“

”ٹھیکس سر، یہ میرے لیے اعزاز ہے سر۔! میں سمجھتی ہوں کہ یہ آپ کی وجہ سے ہوا۔ میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے۔“ مائرہ دھجے سے کہا

”وہ ٹھیک ہے، لیکن یہ تمہاری محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ اور بہت سارے لوگ بھی تو ہیں۔ وہ تمہاری طرح کیوں نہیں سیکھتے۔ اصل میں تم اپنے کام کو پوری دیانت داری سے کرتی ہو۔ اسی لیے تمہارے کام میں جان ہوتی ہے۔ اور تم نے ان لوگوں کو بے خواب کیا ہے، جنہیں ہم بہت طاقتور خیال کرتے ہیں۔“ ہاس نے اعتراف کیا

”سر۔! میں سمجھتی ہوں کہ آپ جو کر رہے ہیں، اسے پوری توجہ سے کریں یا پھر نہ کریں۔“ اس نے کہا

”ایسا ہی ہونا چاہیے اور ہاں۔! اب اسی کامیابی کو اپنی منزل نہ سمجھ لینا۔ ابھی تم نے اس سے بہت آگے جانا ہے۔“ ہاس نے سمجھاتے ہوئے کہا، پھر ایک لمحہ کے لئے رُک کر بولا، ”آپ کو بتا دوں کہ اب رضوی صاحب آپ کے میڈ نہیں ہوں گے، انہیں غور شبیے کا ہیڈ بنا دیا گیا ہے، آج سے آپ اپنے شبیے کی ہیڈ ہیں۔ ابھی آپ کو لیٹرل جانا ہے۔ مہارک ہو آپ کو۔“

اس اچانک خوشی پر مائرہ ایک دم سے چونک گئی، تاہم خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

”حقیق یو سر۔! میری محنت اور وقت دونوں، میری کامیابی، میرے پاس لے آئیں گے۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی۔“

”بس یہی جذبہ رہتا چاہیے۔ کامیابی نہیں، کامیابیاں تمہیں ملتی رہیں گی۔ بہر حال جو ذمہ داری بھی لو اس بھرپور انداز میں نبھاؤ۔ اوکے۔ دس یوگنڈ لک“ اس نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی

”تھینک یو سر... آپ مجھے بہت حوصلہ دیتے ہیں۔“

اس پر اس مسکرا دیا تو وہ باہر نکلتی چلی گئی۔

مازہ اپنے آفس میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر اپنا سیل فون نکال کر جعفر کے نمبر پر کال کر دی۔ اس کے چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف جعفر اپنے آفس میں ایک ٹائل دیکھ رہا تھا۔ اس کا سیل فون، بجا تو اس نے اسکرین پر دیکھا۔ تب اس کے چہرے پر حشمت بھری مسکراہٹ آگئی۔ جعفر نے فون پک کر لیا۔

”ہیلو، جعفر... کیا ہو رہا ہے؟“

جعفر نے کام چھوڑ کر کرسی سے ٹیک لگائی اور خوشگوار انداز میں بولا

”کہنے کو تو کہہ سکتا ہوں کہ میں فٹ بال کھیل رہا ہوں۔“

اس پر مازہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی

”تم بھی نا...“

”مازہ، لگتا ہے آج تم بہت خوش ہو۔“ اس نے خوشی سے کہا تو مازہ نے پوچھا

”تمہیں کیسے پتہ کہ میں بہت خوش ہوں آج؟“

”بہت عرصے بعد تمہارے لہجے میں ٹھنکنا ہٹ سنی ہے۔ بہت اچھا لگا مجھے۔“ جعفر نے غور لہجے میں کہا

”ہاں، خوش تو ہوں۔ ایک بہت ہی اچھی خبر ہے اور سب سے پہلے تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔“ اس نے جعفر کے لہجے پر غور کئے بنا کہا

”بولو۔“ وہ آہستگی سے بولا

”میرے کام کو بہت سراہا گیا ہے اور میری ترقی ہو گئی ہے۔“ وہ پر جوش انداز میں تیزی سے بولے

”بہت مبارک ہو، بہت ہی اچھی بات ہے۔ تم اس کی حقارت ہو اور مجھے یقین ہے۔ بہت ساری کامیابیاں تمہارے قدم چومیں گیں۔“ جعفر نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو وہ بولی

”مجھے یہ بتاؤ کہاں ہو تم؟“

”میں گمر ہوں۔“ اس نے بتایا

”اچھا پھر میں آ رہی ہوں۔ ہم اس اچھی خبر کو مل کر سلی بریٹ کریں گے۔ اس میں تم بھی پوری طرح شریک ہو۔“ مازہ نے پر جوش لہجے میں کہا

”میں بختر ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ جیسی عظیم مہمانی...“ اس نے مصنوعی عاجزی سے کہا تو مائرہ اس کی بات

ٹوکتے ہوئے بولی

”اوکے... اوکے، بھڑی سے مت اترو۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر اس کی بات کو سوچتے ہوئے ایک دم سے خوش ہو گئی۔ پھر اس سے زیادہ دیر بیٹھ کر کام نہیں ہوا۔ وہ اٹھی اور جعفر کے پاس جانے کے لئے نکل گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جعفر کے کمر پہنچ گئی۔ وہ اکیلا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے بیک تھے، جن میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جتنی دیر میں اس نے وہ سارا سامان پھیلا یا، جعفر چائے بنا کر لے آیا۔ اس وقت جعفر اور مائرہ دونوں آنے سے سانسے بیٹھ کر کھاتے ہوئے، باتیں کر رہے تھے۔ تبھی مائرہ نے کہا

”کتنی سا وہ سی سلی ریشن ہے میری کامیابی کی، لیکن مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”ہوں! اصل میں انسان انہی میں خوش رہتا ہے، جہاں اسے سراہا جائے، جن کے ساتھ وہ اپنا نیت محسوس کرے۔ یہ حالات ہی ہیں جن سے انسان خود اپنے لیے خوشی کشید کرتا ہے۔“ جعفر اس کی طرف دیکھ کر بولا

”جعفر! یہ کیسے حالات ہیں۔ میں فہد کے لئے اپنے دس میں اتنی محبت رکھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ تو پھر میری محبت اپنا آپ کیوں نہیں منوا پا رہی ہے۔ کیا میری محبت میں کوئی قوت، کوئی کشش نہیں ہے؟“ اس نے انتہائی دکھ سے پوچھا

”اسی بات کو دوسرے پہلو سے سوچو۔ اگر کسی دوسرے کے دل میں بھی اتنی ہی بے لوث اور خالص محبت ہو تو ہمارے لئے تو؟“ جواب دینے کی بجائے اس نے سواں کر دیا۔ مائرہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”میں نے ایک بات کہی ہے تم سے۔ ممکن ہے فہد کے دل میں ایسی ہی محبت کسی دوسرے کے لئے ہو یا میرے دل میں تمہارے لئے ہو۔ ایسے میں ہم کس کو کیا الزام دے سکیں گے۔“ جعفر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مائرہ فرار کے طور پر جھنجھکتے ہوئے بولی

”مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ مجھے... مجھے... نہیں معلوم تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“

”میں تم سے فقط اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ کسی پر بھی شک مت کرو۔ نہ اپنی محبت پر اور نہ کسی کے ظلوں پر۔ یہ دل کے معاملات ہیں۔ جن پر اختیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اپنا اختیار بھی نہیں رہتا۔“ جعفر نے وضاحت کی

”یہی دل ہی تو ہے جو اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ایسے میں زندگی ایک بوجھ لگنے لگتی ہے نا۔“ اس نے تائید چاہی

”مائرہ! زندگی کو بوجھ بھی ہم خود بنا لیتے ہیں۔ جب ہم اپنی ذات پر شک کرتے ہیں۔ تم بس خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔ زندگی کب اور کہاں سے محبت دیتی ہے۔ اسے مت سوچو۔ انعام دار ہونے والی محبت کا احساس کرو۔“ جعفر نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولی

”ہاں۔ از زندگی سے محبت تو خود حاصل کرتا پتی ہے۔“ یہ کہہ کر محبت پاش نگاہوں سے اس کے طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اچھا

چلو، کھاؤ پیو۔ اور کچھ نہ سوچو۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو اس نے قہقہہ لگادیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا

”مجھوڑی ہے۔۔۔۔۔“

پھر ایک دم سے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر خنس دیئے۔



چوہدری جلال حویلی کے ڈرائیونگ روم میں تنہا بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے جناب۔ اس اجلاس پر آپ کا کام یقیناً ہو جائے گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ لیکن آپ بھی تو خیال رکھیں نا؟“ امی

ہاتوں کے دوران فٹنی اور انسپکٹر آگئے۔ چوہدری کو فون پر بات کرتے دیکھ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ بات کرتا چلا جا

رہا تھا، ”ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کروں گا سٹرش،“ چوہدری نے ان کی طرف دیکھ کر انسپکٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا، ”ہاں

بس۔ اجلاس سے دو دن پہلے مجھے مل لیں۔ اچھا خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر چوہدری نے ریسیور رکھ دیا پھر چھوٹے سوچتے رہنے کے بعد فٹنی فضل

دین سے پوچھا

”ہاں بھی انسپکٹر۔ کیا حال ہے تمہارا، کیسے آتا ہوا؟“

”میرا حال تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب، مگر گلن نہیں ہیں کہ اب حالات ٹھیک رہیں گے، بہت مشکل سا معاملہ بن گیا ہے

چوہدری جی۔“ انسپکٹر نے مایوس نہ لہجے میں کہا تو چوہدری نے پوچھا

”ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تو اتنا مایوس لگ رہا ہے۔“

”جس جن کو بڑی مشکل سے بتل بند کیا تھا نا، وہ جن دو بارہ بوتل سے باہر آ گیا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولا

”اُوئے پھلیوں نہ ڈال انسپکٹر، سیدھی بات کر۔“ چوہدری نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا

”نہد آیا تھا آج تھا نا، امین اراکین کو لے کر، جس بے جا کی ایف آئی آر لکھوائے۔ چوہدری کبیر کے خلاف۔“ انسپکٹر نے

طنز پر لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے حیرت اور استعجاب بھرے انداز میں کہا

”وہ؟“

”اوپر سے ڈی ایس پی صاحب کا فون بھی کروا دیا اس نے، درخواست دی تھی اس نے اوپر۔ مجھے وہ ایف آئی آر درج کرنا

پڑی۔“ انسپکٹر نے یوں کہا جیسے اسے بچے ندامت ہو رہی ہو۔ چوہدری جلال نے چوکتے ہوئے اچھٹی غصے میں کہا

”اور تو نے ایف آئی لکھ دی؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔ کیا میں تیرے دماغ میں گولی اتار کر ابھی تیری اوپر جانے کی ایف آئی آر نہ لکھ دوں؟“ چوہدری جلال نے غصے اور حیرت سے کہا تو انسپکٹر خاموش رہا تو اس نے پھر پوچھا دئے بول دئے جب، ہکتا کیوں نہیں ہے؟“
 تبھی انسپکٹر نے ڈرتے ہوئے کہا

”جی، میں اور کیا کرتا۔ بتایا نا جی کہ اس نے ڈی ایس پی کو فون کر دیا۔ اب مجھے ان کا حکم تو ماننا تھا نا چوہدری صاحب۔ اب اللہ جانے آپ کے ڈی ایس پی صاحب سے کیسے تعلقات ہیں؟“

”اوئے انسپکٹر، دوائے بے وقوف تجھے میرے تعلقات کی کوئی عقل سمجھ نہیں ہے۔ تیری یہ جرات، میرے اس سے تعلقات جیسے بھی ہوں، پر تو اپنے اوپر غور کر۔ تو اپنا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکا اور فوراً ایف آئی آر روج کر دی۔ لگتا ہے اب تیرا دانتہ پانی یہاں سے فٹم ہو گیا ہے۔ تو اس قابل ہی نہیں رہا۔“

”اوند چوہدری صاحب۔ میں تو آپ کا خادم ہوں تو کر ہوں آپ کا۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے آپ کے لیے۔ اب یہ فہد آپ کے بھی قابو نہیں آ رہا تو میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔“ انسپکٹر نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر چوہدری جلال کا غصہ اور زیادہ غضب ناک ہو گیا۔
 ”ٹٹو اکیلا، پہلے کیا کرتا تھا اس علاقے میں۔ کس کے بل بوتے پر دندناتا پھرتا تھا۔ کوٹھیاں، بنک چیلنس کیسے ہالیا تو نے۔ یہ سب کچھ اب تیرے کسی کام کا نہیں۔ تیرے یہ بس ایک اشتہاری بندہ ہی کافی ہے۔“

”خدا کے لیے ایک موقع دیں چوہدری صاحب، ابھی تو ایف آئی آر ہی کئی ہے نا۔“ انسپکٹر نے منت بھرے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے ایک لمحہ کو سوچتے ہوئے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا،
 ”ٹھیک ہے، جا، میں دیکھتا ہوں۔“

”بہت شکریہ چوہدری صاحب۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور اسی تیزی سے ہر کی طرف چلا گیا۔ تبھی چوہدری جلال نے نشی کی طرف دیکھ کر کہا

”نشی، یہ فہد کچھ زیادہ ہی بد نکالنے لگا ہے۔“
 ”تو پھر نہ کاٹ دیں نا جی اس کے۔“ نشی نے یوں ن کہا جیسے اس نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو
 ”ٹو ایسا کر، اسے کسی طرح اپنی زمین لینے پر اکسا۔ بندہ لگا اس کے پیچھے۔ جو اُسے غیرت دلائے کہ وہ ہم سے اپنی زمین لے لے۔“ چوہدری نے سوچتے ہوئے کہا تو نشی سمجھتے ہوئے بولا

”سمجھ گیا چوہدری صاحب، سمجھ گیا۔ میں ابھی کسی کے ذمے لگا دیتا ہوں۔“ نشی فضل دین نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند لمحے ایسے ہی کھڑا رہا تو چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا
 ”کیوں کھڑے ہو؟“

”ایک اطلاع ہے چوہدری صاحب۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال لا پرواہی سے بولا

”کیسی اطلاع۔ کوئی خبر کی ہے یا۔۔۔“

”خبر کی نہیں لگتی چوہدری صاحب۔ اوہ، عمر حیات ہے نا۔ جس کا اپنے بھائیوں کے ساتھ جھگڑا تھا زمین کے معاملے

میں۔۔۔“ فشی نے بتایا

”ہاں۔ کیا ہوا؟“ چوہدری جلال نے پوچھا

”عمر حیات نے اپنا گھر اور زمین بیچ دی ہے۔“ فشی نے بتایا تو چوہدری جلال نے پوچھا

”کسے بیچ دی۔ اوہ تو ہم خریدنا چاہ رہے تھے۔ کس نے خرید لی۔“

”فہد نے۔۔۔ سودا ملے ہو گیا ہے۔ کچھ رقم دے دی ہے اور باقی کا نقدات مکمل کر ہونے پر ادا ہو جائے گی۔“ فشی نے بڑے

عجیب سے لہجے میں کہا جیسے اسے خود یہ اچھا نہ لگا ہو۔

”یار یہ فہد کر کیا رہا ہے۔ جہاں ہمارا مفاد ہوتا ہے۔ یہ وہیں پر آ کر وار کرتا ہے۔ خیر۔ امیں دیکھتا ہوں وہ کس طرح زمین لینا

ہے۔ عمر حیات کے بھائیوں کو بیٹام دے دو کہ وہ مجھے آکر ملیں۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”جی، میں ابھی بندہ بھجوادیتا ہوں۔“ وہ تیزی سے بولا

”اور سنو۔ اس معاملے پر گہری نگاہ رکھنی ہے۔ فہد کہیں زمین کا قبضہ نہ لے لے۔“ چوہدری جلال نے کہا

”جی میں آپ کو پوری طرح باخبر رکھوں گا۔“ فشی نے ادب سے کہا تو چوہدری جلال سوچتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا

”اب اس فہد کے بارے میں پتہ کرنا پڑے گا۔ آخر اچھے دھڑلے سے ایسا سب کچھ کیسے کر رہا ہے۔ جا فشی تو جا۔“

”جی چوہدری، جاتا ہوں۔“

جیسے ہی اس نے کہا تو چوہدری جلال نے اُسے جانے کا اشارہ کیا اور فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فشی باہر کی جانب چلا گیا۔

اس کے چہرے پر خوشی کا اظہار تھا۔ چوہدری جلال نے فون اٹھایا، نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ رابطہ ہوتے ہی

اس نے پوچھا

”ہاں جید۔ کیسے ہو؟۔۔۔ اچھا تمہارے ذمے ایک کام لگا رہا ہوں۔ وہ فوراً کر کے مجھے اطلاع دو۔۔۔۔۔ ہاں ہاں بتا رہا ہوں

نا، فہد نامی لڑکا ہے ادھر۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔۔۔۔۔ زمین خریدی ہے اس نے یہاں۔۔۔۔۔ وہ تمہارے آفس تو آئے گا نا۔۔۔۔۔ بس

اس سے اگلی کچلی مصنوعات یعنی ہے، کوئی سراپا مل گیا تو اس کے بارے سب معلوم ہو جائے گا۔۔۔۔۔ ہاں ہاں فوراً، میں تمہارے فون کا انتظار

کروں گا۔“ یہ کہہ کر چوہدری نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے زیادہ موقع نہیں دینا ہوگا۔



دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چوراہے میں فہد، امین، چھا کا اور چند دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بڑی گرما گرمی میں باتیں چل رہی تھیں۔ چھی ایک بندے نے تیز لہجے میں کہا

”ناکے نے جو سراج کو دمک دی ہے نا۔ یہ چوہری جلال کی طرف سے نہیں چوہری کبیر کی طرف سے ہے۔ یہ ناکا، کئے چوہری کا کارندہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔“

”کارندہ کسی کا بھی ہو۔ دمکی تو ان لوگوں کی طرف سے ملی ہے نا۔ کیا یہ گاؤں کے لوگوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ جس طرح ان چوہریوں کا جی کرتا ہے۔ کیا یہ سارے لوگ اسی طرح چلیں۔ انسان نہ ہوئے مٹھنیں ہو گئیں۔“ فہد نے کہا تو امین بولا

”میں ان دمکیوں میں آنے والا نہیں۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں خود ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اور یہاں میرے پیسے کلی ہوں گے علاقے میں جو اپنے دلوں میں یہی خواہش چھپائے بیٹھے ہیں۔“

”وہ وقت بڑی جلدی آنے والا ہے امین۔ جب یہ ظالم خود مند چھپاتے پھریں گے۔ انہوں نے صرف کمزوروں پر ظلم کرنا سیکھا ہے۔“ فہد نے وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ایک بندہ بولا

”یہ تہاری بھول ہے فہد! اگر کوئی سیدھی طرح ان کی بات نہ مانے تو وہ دوسری طرح اس سے بات منوالیتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں خود ڈھیل دے رکھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فہد نے اس کی طرف مسکرا دیکھ کر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بندہ طعنے انداز میں بولا ”مطلب یہ ہے تم نے اپنا گھر تو اچانک لے لیا۔ اب وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اپنی زمین واپس لو۔ اگر تم میں ہست تو اب زمین لے کر دیکھو۔ تمہیں نہ صرف چوہریوں کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ بلکہ یہ بھی جان لو گے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ ہے تم میں ہست؟“

فہد نے چونک کر دیکھا اور پھر قہر سے مسکراتے ہوئے بولا

”میں جانتا ہوں کہ چوہری کیا چاہتے ہیں۔ مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ زمین بھی نہیں ہے، چوہری بھی اور میں بھی۔ یہ وقت بتائے گا۔ زمین کیسے لی جاتی ہے۔“

”اوئے میرے بھائی۔ اچوہری انتہائی بزدل بندہ ہے۔ اگر فہد اس کے راستے کی دیوار بن گیا ہے تو وہ اس دیوار کو گرا کیوں نہیں دیتا۔ زمین تو بعد کا معاملہ ہے۔ اب اگر اس میں ہست ہے تو دوبارہ اپنے ڈنگر باندھ کر دکھائے۔“ امین نے غصے میں کہا تو بندہ بولا

”میں نے کہا نا، وہ تم لوگوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اب اگر اپنی زمین لے گا نا فہد تو اسے ٹک پتہ جائے گا۔“

”اصل میں تصور چوہری کا نہیں کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ تصور لوگوں کا ہے جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کا ظلم سے جا رہے ہیں۔ اُس تک بات کا پنچا دو اب ظلم کے دن تھوڑے ہیں۔“ فہد نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بندہ بولا ”میں اب بھی سمجھتا ہوں فہد! ان کے سامنے تم کچھ بھی نہیں ہو۔ اپنا آپ بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہی حیرے لیے بہتر ہوگا۔“

”اور تم یہ جان لو۔ اب ان کی یہاں حیثیت کچھ نہیں رہے گی۔ یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔“ امین نے جذباتی لہجے میں کہا تو

فہد بولا

”تکوار کے مدار کو لاشی پر نہیں رد کا جاتا اور نہ ہی گولی کو ہاتھ روک سکتے ہیں۔ جنگ جیتنے کے لئے دشمن کے ہتھیار سے بڑا ہتھیار رکھنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہتھیار ہے میرے پاس۔ چوہدری یہ اس کے حواری کسی بھول میں نہ ہیں آؤ چلیں۔“

فہد نے کہا اور اٹھ کر گاڑی کی جانب چل دیا۔ امین اس کے ساتھ جا بیٹھا تو گاڑی چل دی۔ چوپال میں خاموشی چھ گئی تھی۔ فہد نے امین کو گھر چھوڑا اور خود سراج کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

دو پہر ڈھل کر شام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فہد اور سراج آمنے سامنے چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ چوراہے میں ہونے والی بات سن کر سراج نے بتایا

”میں آج ملا تھا چاچے عمر حیات سے۔ فٹی بکلی گیا تھا اس کے پاس، اور اپنی آخر کردادی۔“

”کیا کہا چاچے عمر حیات کو فٹی نے۔ پوری بات معلوم کی؟“ فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو سراج بولا

”ہاں کی۔ وہ فٹی آیا تھا اسے اکسانے کے لیے۔ بلکہ اسے بے ایمانی پر مجبور کرنے آیا تھا۔ جب فٹی اس سے مل کر گیا تو چاچا عمر حیات میرے پاس گھر آ گیا۔ اس نے مجھے ساری بات بتادی۔ اس نے فٹی کو انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب میں زبان دے چکا ہوں۔ رقم وصول کر لی ہے۔ وہ زمین فہد کو ہی دے گا۔“

”انکار سننے کے بعد، ظاہر ہے چوہدری الطہینان سے تو نہیں بیٹھے گا۔ اب وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرے گا۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا

”اصل میں ان دونوں خاندانوں کے درمیان جھگڑا بھی تو چوہدریوں نے کروایا ہے۔ تاکہ یہ زمین وہ لے سکیں اور ہاں، ایک بات اور، چاچے عمر حیات کا یہ کہنا ہے کہ وہ تمہاری رقم بھی دبا جانے کا مارچ دے رہا تھا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے فہد زمین اپنے نام کر والے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ ختم ہو جائے تو وہ الطہینان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دے۔“ سراج نے اسے بتایا تو فہد سوچتے ہوئے ہوئے بولا

”وہ ٹھیک کہتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر لکھت پڑھت کر کے زمین اپنے نام کراؤ۔ کل ہی عدالت چلتے ہیں۔“ سراج نے صلاح دی

”کل ضرور عدالت میں چلیں گے، مگر اس قتل کیس کے لیے جس کی گواہی امین دینا چاہتا تھا، اسے ری اوپن کر دانا ہے۔ چاچے عمر حیات والی زمین کدھر جا رہی ہے، لے لیں گے۔ پہلے امین سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہے۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سراج چوہکتے ہوئے بولا

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سراج۔ خیر تم شام کو گھر آؤ گے تو اس پر تفصیل سے بات ہوگی۔ ابھی میں چلتا ہوں۔“ فہد نے کہا اور اٹھتا چلا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب قسمت مگر کی خصلتیں بدلنے والی ہیں۔



مازہ اپنے گھر سے آفس کے لیے نکل کر پورچ میں اپنی گاڑی کے پاس آئی تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اپنا ٹیک گاڑی میں رکھا اور اور فون کال رسید کرتے ہوئے کہا، ”ہیلو۔۔۔“

دوسری طرف سے کمروری آواز میں کہا گیا
 ”سنو، یہ جو تم اپنی ٹی وی رپورٹ کے لیے آگ سے کھیل رہی ہونا۔ اس کا انجام بہت برا ہے۔ کم از کم تمہارے لیے۔۔۔ تم نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جس کا خیارہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔“

”کون ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ مازہ نے تیزی سے غصے میں کہا
 ”میں نے کہا نا، صرف میری سنو۔ فضول بک بک نہ کرو۔ ورنہ تیری سزا میں زیادہ اضافہ ہو جائے گا، صرف سنو۔ آگ سے کھیلنا بند کرو ورنہ تم اس طرح جل جاؤ گی کہ خود تمہیں پہنچ نہیں چلے گا۔ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا تو مازہ بولی
 ”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم چاہو تو اسے دھمکی سمجھ سکتی ہو۔ تاہم میں اگر تم نے اپنی ٹی وی رپورٹ بتائی ہے تو اب اس کو بھول جاؤ اس کی بیرونی ست کرو، اسی میں تمہاری زندگی ہے۔“

”میں نہیں ڈرتی۔ میں ایسا ہی کرتی رہوں گی۔ تم جیسے بزدل میرا ستر روک سکتے ہیں تو روک لیں۔“ اس نے بے خوفی سے کہا
 ”میں تمہیں صرف سمجھا رہا ہوں۔ ورنہ تم اب تک ہمیشہ کے لیے گہری اور میٹھی نیند سو چکی ہوتی۔ آزمانا چاہتی ہو تو آزمالو۔ تم ہر وقت ہماری نگاہ میں ہو۔“ کسی نے فرماتے ہوئے کہا تو مازہ طعنے لہجے میں بولی
 ”اور میں تمہیں خود ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم تو سامنے نہیں آؤ گے تو۔۔۔“ مازہ نے مزید کہا ناچا مگر اس کے لفظوں کے دوران ہی آنے والا فون بند ہو گیا۔ اس نے غصے میں فون کی طرف دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلتے ہوئے وہ تیزی سے سوچ رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو، مازہ نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سیل سے نمبر پل کروئے۔

اس وقت جعفر اپنے آفس میں کھڑا قائل دیکھ رہا تھا۔ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال رسید کی تو مازہ بولی ”سوری جعفر۔! میں تمہیں آج پھر ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ کیا تم میرے آفس آ سکو گے؟“

”آپ بلائیں، ہم نہ آئیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ ویسے خیریت ہی ہے نا۔“ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا

”آج ایک نیا پراجیکٹ ہے جو میں تمہارے ساتھ مل کر کرنا چاہتی ہوں، اس کے متعلق ڈسکس کرنا تھا۔ ویسے مجھے آج فون ملا ہے۔ کسی نے مجھے دھمکی دی ہے۔“ مائرہ نے بتایا تو جعفر نے سکون سے پوچھا

”کیسا فون؟ کیسی دھمکی؟ اور کب؟“

”ابھی کچھ منٹ پہلے۔“ یہ کہہ کر اس نے تفصیل بتادی۔

”پریشان نہیں ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ، ڈھونڈ نکالیں گی اسے۔“ جعفر نے اسے تسلی دی

”یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یہ دھمکیاں تو ملتی رہتی ہیں، ان کا کیا ہے۔ بس تم جلدی سے آ جاؤ۔“ مائرہ نے کہا

”مجھے بہت خوشی ہوئی مائرہ۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کالج ٹائف والے لون لوٹ آئے ہیں۔“ وہ خوشی سے بولا

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہ بالکل ناکام عاشقوں جیسے لہجے میں مجھ سے بات نہ کیا کرو۔“ وہ ایک دم

شوخی سے بولی تو جعفر نے شرارت سے

”کیا ہو گیا ہے میرے لہجے کو، ویسے مجھے تمہاری ایک بات سے اختلاف ہے۔“

”وہ کیا؟“ مائرہ نے حیرت سے پوچھا

”کیا بندہ محبت میں ناکام بھی ہو سکتا ہے؟ ایسا ہو نہیں سکتا کہ بندے کو محبت بھی ہو اور وہ اس میں ناکام ہو جائے۔“ جعفر نے

گہرے انداز میں کہا تو مائرہ بھی سنجیدگی سے بولی

”تم لاگت اختلاف کرو۔ مگر حقیقت کو جھٹلایا تو نہیں جا سکتا نا۔ دل میں جتنی محبت بھی ہو اور وہ رنگ نہ لاسکے۔ یہ ناکامی ہی تو ہے۔“

”یہاں تصور محبت کا نہیں۔ اس وجود کا ہے جس میں یہ محبت موجود ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ محبت کی راہ پر چلتا آسان ہوتا

ہے۔ بڑے امتحان ہوتے ہیں اس راہ میں۔“ اس نے پر یقین لہجے میں کہا تو مائرہ بولی

”جمل چھوڑ یہ محبت وغیرہ کا فلسفہ۔ زندگی کی حقیقت، محبت سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ بس جلدی سے آ جاؤ۔“

”جیسے آپ کا حکم، بندہ تو ہر وقت حاضر ہے، آ رہا ہوں۔“ جعفر نے خمار آلود لہجے میں کہا تو مائرہ ہنسنے ہوئے بولی

”باز نہیں آؤ گے، ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور پوری توجہ سڑک پر لگادی۔



چوہدری جلال حویلی کے لان میں موجود تھا۔ چوہدری کبیر کی گاڑی آکر پورچ میں رکی۔ وہ اس میں سے وہ نکل کر سیدھا چوہدری

جلال کے پاس آگیا۔ پاس آکر اس نے اپنے باپ کو سلام کیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا

”بابا، میں فہد کی بات کرنے آیا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں آپ اسے ڈھیل دینے چلے جا رہے ہیں۔ چند منٹوں میں اسے شتم کر کے

ساری ٹینشن ختم کی جاسکتی اور آپ ۔۔۔ وہ کہتے ہوئے رک گیا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور سکون سے بولا
 ”نانا! کہہ دو اور کی گولی سے وہ چند منٹوں میں ختم ہو سکتا ہے، لیکن اس کے بعد جو طوفان بدتمیزی اٹھے گا اس کا تمہیں اندازہ
 نہیں ہے۔“

”کیا مطلب بابا۔! کون ہے اس کے پیچھے رونے والا، ماسٹر دین محمد؟“ کبیر نے تیزی سے پوچھا
 ”میں دیکھ رہا ہوں کہ بدوہ سانپ ہے۔ جیسے زور زبردستی سے نہیں، بلکہ متحذروں سے پٹاری میں بند کیا جائے گا۔ کیا آج تک
 تمہیں ایسا ذہن دشمن ملا ہے؟“ چوہدری جلال نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھ کر کہا
 ”مان لیا بابا کہ وہ بہت طاقتور ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے علاقے میں آکر ہمیں ہی للکارے، یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ بعد میں
 جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اس نے بے خوفی سے کہا

”ابھی اس نے کیا ہی کیا ہے، صرف اپنا گھر ہی واپس لیا ہے نا۔ اس کے علاوہ اس نے کیا حیر مار لیا؟“ چوہدری جلال نے نا
 پرواہی سے کہا

”یہی بات تو مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ آپ اسے نظر انداز کیوں کر رہے ہیں۔ علاقے میں جگہ جگہ بیٹہ کر وہ ہمارے خلاف
 باتیں کرتا ہے۔ اور پہلی بار میرے خلاف تھانے میں ایف آئی آر کٹوا دی۔“ کبیر نے گویا اس کے گناہ گنوا دیئے۔

”یہی تو میں نے کہا ہے نا۔ تم جذباتی نہ ہو کر۔ دشمن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بات سمجھ لو کہ وہ ایک ذہین دشمن
 ہے۔ اتنے طویل عرصے بعد اس کا دوبارہ گاؤں میں لوٹ آنا کوئی معمولی بات نہیں، وہ بہت سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہے۔“ چوہدری جلال
 نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”تو پھر کیا ہوا بابا۔! اس کی ساری ذہانت اس کا سوچنا سمجھنا، چند منٹوں کا کھیل ہے۔ مجھے اجازت دیں، میں ابھی اسے ختم کر
 دیتا ہوں۔“ کبیر نے تیزی سے کہا

”نہیں! میں تمہیں ابھی اجازت نہیں دوں گا۔ اسے سیاسی میدان ہی میں مار کر یہاں سے ذلیل و رسوا کر کے بھیجتا ہے۔ وہ
 ساری زمینگی ہمارے لگائے ہوئے زخم کو یاد رکھے۔ وہ سیاست ہی کیا، جس میں اپنے دشمن پر قابو نہ پایا جاسکے۔ میری ہنسی جس کہہ رہی
 ہے۔ فہد صرف ایک مہرہ ہے اس کے پیچھے کوئی گہری چال ہوگی۔“ چوہدری جلال نے یقین بھرے لہجے میں کہا

”کون چل سکتا ہے یہ چال؟“ کبیر نے تشویش سے پوچھا
 ”یہی تو پتہ کرتا ہے۔ دیکھ کوئی بندہ اس طرح خودکشی کرنے یہاں نہیں آ سکتا۔ میں مانتا ہوں اس کے دل میں ہمارے خلاف

انتقام بھرا ہوا ہے۔ وہ مر گیا تو سب ختم ہو گیا۔“ چوہدری جلال نے پھر سوچتے ہوئے لہجے میں کہا
 ”او نہیں بابا۔۔۔ وہ کوئی مہرہ شہرہ نہیں ہے۔ اس نے آتے ہی اپنا ایک تاثر نکال لیا ہے، اور آپ کچھ اور ہی سوچتے گئے۔“ کبیر نے

ایک دم سے باور کرایا

”اتنی دیدہ دلیری پھر بھی نہیں ہوتی۔ سیاست بھی خطرے کی طرح ہوتی ہے، ایک بھی غلط چال چلی اور کھیل ختم، شہہ مات ہوتے دیر نہیں لگتی پھر۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا

”کچھ بھی نہیں ہوگا بابا۔ بس ایک بار آپ مجھے اجازت دیں۔“ کبیر حسرت ناک لہجے میں بولا تو چوہدری جلال نے سخت لہجے

میں کہا

”اپنے غصے پر قابو رکھو کبیر۔ اچھے پہلے ہی ایک قتل کو دبانے میں مشکل ہو رہی ہے۔ میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔“

اپنے باپ کے لہجے پر کبیر ایک دم سے چونک گیا اور حیرت اور غصے کے مٹے جلتے لہجے میں بولا

”بابا۔! میں پھر کہوں گا، آپ اسے ڈھیل دے کر اچھا نہیں کر رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ غصے میں اٹھا اور وہاں سے چلا گیا تو چوہدری جلال گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا۔

شام کے سائے پھیل گئے تو چوہدری جلال حویلی کے کارڈور میں آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ فہد نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا

تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کہاں سے قابو کرے۔ منشی فضل دین نے اس کے قریب آ کر سلام کیا۔ چوہدری نے اس سے پوچھا۔

”منشی! کیا کہتا ہے دو عمر حیات۔ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں؟“

”نہیں چوہدری جی۔ ادھو کسی طرح بھی نہیں مانتا۔ میں نے اسے یقین دلانے کے لئے یہ بھی کہا کہ آؤ چوہدری صاحب سے

بات کر لو مگر وہ حویلی آئے پر راضی ہی نہیں ہوا۔“ منشی نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ چوہدری نے نری طرح چونک کر منشی کی طرف دیکھا،

جیسے اس نے بڑی ہلک محسوس کی ہو۔ چند لمبے خاموش رہ کر چوہدری جلال نے قہقہے سے کہا

”تو اس کا مطلب ہے۔ وہ بھی فہد کی زبان بولنے لگا ہے۔ تم نے سمجھایا نہیں کہ ہم بھجائیت کے ذریعے بھی زمین اس سے لے

سکتے ہیں۔“

”بہت سمجھایا میں نے اسے۔ میں نے بھجائیت کی بات بھی کی مگر اس کی ہنسی دٹ ہے کہ میں نے زبان دے کر رقم لے لی

ہے۔ احکام بھی لکھ کر دے دیا ہے۔“ منشی نے دھیمے لہجے میں بتایا

”منشی! تم جانتے ہو کہ ہم بھجائیت کیوں جلاتے ہیں تاکہ فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کروا سکیں۔ اب یہ بھجائیت ریونیو آفیسر

کے پاس ہوگی۔ ابھی زمین فہد کے نام تو نہیں ہوئی ہے نا۔“ چوہدری جلال نے مسکراتے ہوئے کہا

”میں سمجھ گیا چوہدری صاحب۔! عمر حیات وہاں تو جائے گا۔“ منشی خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا

”اب اگر اسے یہاں کچھ کہتے ہیں تو بتانا یا کہیں بگڑ جائے گا۔ فہد کی نگاہیں ہماری کمزوریوں پر ہوں گی۔ وہ خواہ مخواہ شور مچائے

گا۔ جب ہمارا کام آفیسر خود کر دے گا تو کیا ضرورت ہے یہاں سروردی لینے کی۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا تو منشی بولا

”میں کچھ گیا چوہدری صاحب۔ میں آج ہی چلا جاتا ہوں اور انہیں ساری بات سمجھا آتا ہوں۔“

”تم نور گھر جا کر آفسر کو سمجھاؤ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ اب بچائیت ہوگی اور ہماری مرضی کا فیصلہ ہوگا۔“ چوہدری نے سکون سے کہا
 ”ظاہر ہے، پانی تو انہی آفسروں کے پلوں کے نیچے سے گزرتا ہے۔ زمین نام ہوتا تو ایک طرف، وہ لوگ فائل ہی گم کر دیں۔ تو انہیں کون پوچھنے والا ہے۔“ مٹی نے کہا

”اور ہاں، جانے ہوئے باغ سے کچھ پھول کی ٹوکریاں لے جانا۔ اور اسے بتا دینا کہ ایک دو دن میں ہی بچائیت بلائے۔ ضرورت پڑی تو میں بھی آ جاؤں گا۔“ چوہدری نے اکتاہٹ سے کہا

”جیسے آپ کا حکم۔ میں چلتا ہوں۔“ مٹی بولا اور مٹی واپس پلٹ گیا۔ چوہدری مسکرا اٹھا۔



سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ چاچا سوہنا حسب معمول محن میں تھا بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

”جھا کے۔۔۔ آؤ پتر جھا کے“

چند لمحوں بعد جھا کا اندر سے باہر کر بولا

”ہاں، ابا۔ ابول، کیا بات ہے؟“

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”وہ پتر۔۔۔ آج تو ابھی تک گھر میں ہے، باہر نہیں گیا؟ اپنے کٹڑے سے بھی کوئی بات نہیں کر رہا۔“ چاچا سوہنا اداسی میں یوں بولا جیسے اسے کوئی الجھن ہو۔

”ہاں ابا۔! آج کچھ بھی کرنے کو دل نہیں کر رہا۔ وہ نیند کے ساتھ سراج گیا ہے نا بچائیت میں نور پور۔ رقم تو انہوں نے ادا کر دی ہے اب زمین نام ہی ہوگی۔ بس یہی سوچ آ جاتی ہے کہ کوئی خطرے والی بات نہ ہو۔۔۔“ جھا کے نے تشویش سے کہا تو چاچا سوہنا ایک لمبی سانس کے کر بولا

”زمین نام ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ امگ بات ہے۔ مگر خطرے والی بات یہ ہے کہ بچائیت میں چوہدری جلال خود جائے گا۔ اس لئے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔“

”مگر تو ممکن ہے وہاں خطرہ ہو۔“ وہ تیزی سے بولا

”یہی تو ڈر ہے پتر۔! چوہدری جلال کی بات نہ مانی گئی تو وہ کوئی بھی طوفان کٹھا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس تو ٹنڈوں کی فوج ہے۔“ چاچے سوہنے نے کہا

”اب کیا ہو سکتا ہے بابا۔“ وہ پھر تشویش سے بولا

”اللہ خیر کرے گا۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں نا۔“ اس نے یوں کہا جیسے خود کو تسلی دے رہا ہو۔

”ہاں ہاں! اللہ خیر کرے گا۔ تو آرام کر۔ میں تیرے لیے دوکان سے بوتل لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے چھاکا اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ چاچا سو ہنا کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر خاموشی سے لیٹ گیا۔



دن کا پہلا گزر چکا تھا۔ نور پور پر سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سرکاری عمارتوں میں ریونیو آفس کی گیر دے رنگ کی عمارت کے سامنے چوہدری جلال کی گاڑی آکر رک گئی۔ منشی نے جلدی سے باہر نکل کر چوہدری کے لیے دروازہ کھولا۔ چوہدری جلال بوے کو دفتر سے باہر نکال دیا تھا کہ وہ جس پر فہدی گاڑی آکر رک گئی۔ اگلے ہی لمحے کار میں سے فہد باہر آگیا تو منشی نے تیز مگر آہستگی سے کہا ”یہ ہے وہ فہد۔“

فہد کی نگاہ چوہدری جلال پر پڑی تو اس کے کانوں میں برسوں پہلے کی آواز گونجنی لگی کہ ”میں کی کینوں لوگوں سے کلام نہیں کرتا۔“ اب یہی حال کچھ چوہدری کا بھی تھا۔ برسوں پہلے کا کزور سا لڑکا اب بھر پور جوان ہو کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے تب جس نفرت سے کہا تھا کہ ”میرے استاد کی شان میں گستاخی مت کرو۔“ وہ آج بھی ویسی ہی نفرت اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چند لمحے دیکھتے رہے۔ قہمی منشی نے کہا ”چلیں چوہدری صاحب اندر۔“

چوہدری نے کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے بوے کو دفتر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ سراج اس دوران فہد کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فہد کے کانہ سے پرہاتھ رکھ کر ہلکے سے دہرایا تو وہ بھی اندر کی جانب چل دیا۔ ریونیو آفس کے اندر فہد، چوہدری جلال، سراج، ریونیو آفیسر چاچا عمر حیات اور دوسرے چند معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ریونیو آفیسر نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا

”یہ سب معززین نور پور کے ہیں۔ انہیں میں نے دعوت دی ہے کہ آپ یہاں آئیں تاکہ ہم کسی فیصلے پر پہنچیں۔ جی پہلے چوہدری صاحب! آپ فرمائیں۔“

چوہدری جلال نے سب کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے اپنا موقف کہنے لگا

”مرحیات اور اس کے بھائیوں میں کافی عرصے سے تنازعہ چل رہا ہے۔ ان کا فیصلہ میرے پاس ہی تھا۔ مرحیات کے بھائیوں کا یہ کہنا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی نقد رقم دکھا کر بہت تھوڑی قیمت پر زمین اٹھیا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ بے چارے میرے پاس آئے کہ وہ تو زیادہ قیمت دینے کو تیار ہیں، کیونکہ حق تو مرحیات کے بھائیوں کا بنتا ہے۔ مرحیات کو اگر اپنے بھائیوں سے اچھی رقم مل رہی ہے تو زمین

”فہد صاحب۔ ایہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ خود پر کا بور کھیں۔ پرسکون ہو جائیں پلیز۔“ ریونو آفیسر نے جلدی سے اسے روکتے ہوئے کہا

”اصل میں اس بندے نے میری زمین دبا لی ہوئی ہے۔ اگر واپس کر دیتا تو مجھے نئی زمین خریدنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور جب زمین کا مالک اپنی زمین بیچنے کے لیے راضی ہے تو یہ ہچکچاتی کون ہے جو دوسروں کا وقت برباد کر رہا ہے۔“ فہد نے صاف لفظوں میں کہا تو دوسرا معزز بولا

”جس نے زمین ہچکچی ہے وہ کیا کہتا ہے؟“

اس پر ریونو آفیسر نے عمر حیات سے پوچھا

”عمر حیات۔ کیا آپ نے اپنی زمین ہر ضامندی و رغبت اور پوری قیمت پر فروخت کی ہے؟“

”جی بالکل۔ مجھے پوری ادائیگی ہو گئی ہے۔ یہ اس چیک کی نقل ہے جو فہد نے مجھے دیا ہے۔ رقم میرے اکاؤنٹ میں ہے۔ رقم

مجھے مل گئی۔“ اس نے صاف انداز میں اپنا بیان دے دیا

”اگر آپ کے بھائی لینا چاہیں تو ۱۲ اتنی رقم تو وہ بھی دے رہے ہیں۔“ ریونو آفیسر نے پوچھا

”میں ان کے ہاتھوں زمین بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ کم تو کیا۔ ایک ٹکا بھی نہیں دیتا چاہتے۔ یہ میں جانتا ہوں، اس کی وجہ میرے

اپنے خاندانی معاملات ہیں۔ میں نے زمین فہد کو بیچ دی ہے۔ فقط عدالت ہی میں نہیں ہر جگہ میرا یہی بیان ہے۔“ عمر حیات نے کہا

”اب کیا کر سکتے ہیں چوہدری صاحب۔! مالک رقم لے چکا ہے۔ اس نے راضی خوشی اپنی زمین بیچ دی۔“ ریونو آفیسر نے

چوہدری کی طرف دیکھ کر کہا

”اس کا فیصلہ تو اب عدالت میں ہوگا۔ جو اس کے بھائیوں کا قانونی حق ہے۔“ یہ کہتے ہوئے چوہدری اٹھنے لگا تو فہد نے طعنے

انداز میں کہا

”میدان چھوڑ کر مت بھاگو چوہدری۔ اس طرح تم ان معزز لوگوں کے فیصلے کی توہین کر رہے ہو۔“

”اگر تم میں ہمت ہے تو اپنی زمین واپس لے لو۔“ چوہدری جلال نے اپنی طاقت کے خوار میں وہ کہہ دیا جو نہیں کہنا چاہیے

تھا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔ وہاں پر موجود سب لوگ اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ بلاشبہ یہ ان سب لوگوں کی ہنگامی۔ کافی دیر تک

ان کے درمیان خاموشی مچائی رہی۔ تب ریونو آفیسر نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا

”تو پھر کیا فیصلہ ہے آپ لوگوں کا؟“

”حق تو فہد ہی کا بنتا ہے۔“ ایک معزز نے کہا تو اس کی تائید وہاں موجود سب نے کر دی۔ اس پر ریونو آفیسر نے فیصلہ کن انداز

میں کہا

”فہد۔ آپ اطمینان رکھیں۔ زمین آج ہی آپ کے نام کر دیے ہیں۔“

”ٹھیک ہو۔ آفیسر۔“ فہد سکون سے بولا

”لیکن اب آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔ آخر وہ علاقے کا ایم این اے ہے۔ میرا تو زیادہ سے زیادہ تبادلوں کر دے گا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔“ ریونیو آفیسر نے پھیلکی سی مسکراہٹ سے کہا تو فہد سر ہلاتے ہوئے بولا

”میں جانتا ہوں سر۔“

ریونیو آفیسر نے وہاں آئے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے ساتھ اٹھ گیا۔ سراج اور فہد بھی باہر نکلتے چلے گئے۔

”کیا چوہدری اتنی آسانی کے ساتھ زمین سے دستبردار ہو جائے گا؟“ سراج نے پوچھا تو فہد نے دنگھ سے کہا

”نہیں سراج ابھی کہاں۔ اب جا کر تو میں نے سانپ کے تل میں ہاتھ ڈالا ہے۔“

”وہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں، سانپ کے تل میں ہاتھ؟“ سراج نے حیرت سے پوچھا

”ہاں۔ ادھ چاہے عمر حیات کی اسی زمین کو حاصل کے لیے بڑے لمبے عرصے سے محنت کر رہا تھا۔ اسی نے ان بھائیوں میں

پھوٹ ڈلوائی ہوئی تھی۔ میں اس وقت پر جب چاہا عمر حیات بے بس ہو گیا تھا، یہ زمین میں نے لے لی۔ تم کہہ سکتے ہو سراج یہ زمین میں

نے چوہدری سے چھینی ہے۔“ فہد نے سنجیدگی سے کہا

”واقعی فہد، وہ اس چوٹ کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور کرے گا۔ اب ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“ سراج

نے سوچتے ہوئے کہا

”میں تو کہتا ہوں وہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرے میرے ساتھ۔ کوئی دار کرے مجھ پر، جس کا میں خود دفاع کروں اور اسے اس کی

اوقات بتاؤں کہ تھانے پکھری کی سیاست کرنے والے، صرف لوگوں کو خوف زدہ کر کے ہی اپنی حکمرانی قائم رکھ سکتے ہیں۔ عوام کو فائدہ

نہیں دے سکتے۔“ فہد نے غصے میں کہا جیسے اس کا خود پر بس نہ چل رہا ہو، برسوں بعد اپنے اس دشمن کو سامنے دیکھا تھا، جس کے لئے اس

نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ اس کی حالت سے بے نیاز سراج نے عمارت سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا

”یار ایسے لوگ ایوانوں میں جا کر کیا کرتے ہیں۔“

”صرف اپنے مفادات کا تحفظ، یہ قومی مفاد کیا سوچ سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ جڑ اسی بننے کے قابل نہیں ہوتے۔ جن

کے ہاتھوں میں بے روزگاروں کے لیے نوکریاں دے دی جاتی ہیں اور وہ ان کی بولی لگاتے ہیں۔“ نف نے ایسی سوچ پر۔“ فہد نے غصے

میں عمارت سے کہا تو سراج بولا

”خیر اب ہمیں سوچنا ہے کہ چوہدری کیا کر سکتا ہے؟“

”جو بھی کرے، میں تو ہر وقت تیار ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک دوسرے دفتر کی جانب چل پڑا، جہاں زمین اس

کے نام ہوئی تھی۔

قسمت مگر آج نے تک ان میں خاموشی رہی۔ یہاں تک کہ گاؤں کا چورہا آگیا۔ سراج وہیں اتر کر رک گیا جبکہ فہد چلا گیا۔ وہاں کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سراج ایک جگہ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا تو ایک بزرگ نے پوچھا ”اے سراج، کیا بنا پر زمین کے فیصلے کا۔ سنا ہے تم بھی نور پور گئے تھے۔“

”ہونا کیا تھا، چاچے عمر حیات نے زمین نیچی، فہد نے خریدی۔ اللہ اللہ خیر ملا۔ زمین فہد کے نام ہو گئی۔“
 ہائیں۔ اچھی ایسا ہو گیا، چوہدری نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہوتے ہوئے زمین کیسے فہد کے نام ہو گئی؟“ وہاں موجود ایک ہندو نے حیرت سے تبصرہ کیا

”جیسے ہوتی ہے۔ اے چوہدری کا صرف خوف طاری ہے تم لوگوں پر۔ ڈرتے ہو تم لوگ۔ اس لیے وہ ظلم کرتا ہے۔
 ورنہ وہ کوئی اتنا دلیر نہیں ہے۔“ سراج نے کہا

”بات دلیر یا بزدل کی نہیں، وہ طاقت ور ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ تم لوگوں کو پتہ اس وقت لگے گا جب زمین کا قبضہ لو گے۔ قبضہ لینا ہی تو سب سے بڑا کام ہے۔“ اس بزرگ نے خوف زدہ انداز میں کہا

”چاچا عمر حیات تو انکی قبضہ دے رہا ہے۔ وہ تو۔“ سراج نے کہنا چاہا تو دوسرا ہندو بات کاٹ کر بولا
 ”وہ نہیں۔ اس کے ہوائی زمین پر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ چوہدری بھی ان کے ساتھ ہے۔ تیری رجشیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایویں ہی خوش نہ ہوتے پھر دو۔“

”تم لوگ یونہی ڈرتے رہو اور دوسروں کو ڈراتے رہو اس سے لیکن اب ہم نہیں ڈر لے والے۔ قبضہ بھی لے لیں گے۔“ سراج نے دلیری سے کہا

”جب لوگے تبھی نا۔“ پہلے نے طنز یہ انداز میں کہا
 ”تم لوگ بھی بیہوش ہو، ہم بھی بیہوش ہیں۔“ سراج بولا
 ”دیسے وہاں پر ہوا کیا۔ یہ تو بتاؤ۔“ بزرگ نے پوچھا تو سراج رو داتا نے لگا۔



جھٹرا پنے گھر کے ڈرائینگ روم میں باہر جانے لے لئے تیار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اپنا سیل فون نکال کر نمبر پیش کر دیے۔

دوسری طرف مائرہ بیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔ سیل فون بجنے پر چونک اٹھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے تو مسکراتے ہوئے فون رسچ کرتے ہوئے بولی

”ہیلو جعفر، کہہ کیا بات ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے؟“ جعفر نے غماز بھرے لہجے میں کہا تو مائرہ نے شوخ انداز میں جواب دیا

”کام کر رہی ہوں۔ تمہاری طرح مزدوری نہیں۔“

”اب اگر میں کہوں کہ آؤ، کہیں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ہیں اور کچھ باتیں کرتے ہیں، تو کیا کہو گی؟“ اس نے شرارت سے کہا تو

مائرہ مسکراتے ہوئے بولی

”میں یہ کہوں گی کہ میرے پاس فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے تو پھر؟“

”تو پھر تم ایک بہت ہی اہم نوز سے محروم رہ جاؤ گی۔“ اس نے سکون سے کہا۔ اس پر مائرہ چھپکتے ہوئے بولی ”نوز

کیسی نوز؟“

”وہ جس نے تمہیں دھمکی دی تھی نا۔ میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔“ جعفر نے عام سے لہجے میں کہا تو مائرہ خوش ہوتے ہوئے بولی

”واؤ... کیسے؟ کیسے تلاش کیا؟“

”میں نے ان کی ساری انظار مشن لے لی ہے۔ اور خود ایکشن کروں گا اور بہت جلد وہ گرفتار ہو جائیں گے۔“ اس نے بتایا

تو مائرہ ہر جوش ہوتے ہوئے بولی

”اوکے! مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس دھمکی دینے والے کو مجھے ایک بار دکھانا ضرور۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا، اتنی جلدی تم نے

انہیں کیسے تلاش کر لیا، وہ کس ٹینک۔۔“

”میر صبر، اتنی جلدی کیا ہے۔ اندر کا صفائی جاگ اٹھا ہے۔ میں بتا دوں گا لیکن ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ جعفر نے اپنی

ہنسی دہاتے ہوئے کہا تو مائرہ چل سی ہوتے ہوئے، مگر پیار کے ساتھ بولی

”ہلا لے رہے ہوتا۔“

”بالکل بھی نہیں، بس تم سے ملنے کا بہانہ بنا رہا ہوں۔“ اس نے صاف کہہ دیا۔

”یہ بات ہے، تو چٹو ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر بعد یہاں سے نکلتے ہوئے تمہیں کال کروں گی۔ وہیں پارک میں ملے ہیں۔ میں

نے تم سے ایک بات بھی کرنی ہے۔ اب کہیں ڈیوٹی کا بہانہ کر کے نہ نکل جانا۔“ مائرہ نے پیار سے کہا

”ٹھیک ہے جناب، میں انتظار کروں گا۔ آنکھیں فرش راہ کر کے۔“ یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ چھٹی مائرہ

بھی فون بند کرتے ہوئے خیالوں میں کھو گئی۔ پھر بہت ہی پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے ایک دم شرما گئی۔

شام کے سائے تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے۔ جعفر اور مائرہ دونوں پارک میں ٹھپکتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ باتیں کرتے ایک

بچہ پر جا کر بیٹھ گئے تو مائرہ نے پوچھا

”ہاں اب بتاؤ جعفر... کیسے معلوم ہوا تمہیں اس کے بارے میں؟“

”یہ بہت آسان تھا۔ میں اس گینگ کے پیچھے کافی دنوں سے ہوں۔ اور دوسرے طریقوں کے علاوہ میں ان کے نمبرز بھی چیک کر رہا ہوں۔ بس وہ نمبر میرے سامنے آ گیا تو میں جان گیا کہ وہ کون ہے۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا تو مائرہ نے تجسس سے پوچھا ”کون ہیں وہ؟“

”وہی جن کے بندے ہم نے اندر کئے ہوئے ہیں۔ بہت پریش ہے ان کے بارے میں کہ میں ان کو چھوڑ دوں۔ نوٹوں کی گندیاں اٹھائے پھر رہے ہیں۔“ وہ بولا

”اور تم مان نہیں رہے نا۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی بات نہیں بنے گی تو وہ تمہیں جانی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟“ مائرہ نے تیزی سے کہا

”ہاں تو اور کیا پیار کریں گے۔ اس کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں، موت تو آتی ہے۔“ جعفر نے کہا تو مائرہ تڑپ کر بے ساختہ بولی ”اللہ نہ کرے۔“ پھر جعفر کے احساس کرنے پر خود ہی شرما کر کہا، ”محرم کا کیا ہوتا ہے وہ۔ خیر کیا تم نے ان کو پکڑنے کا پلان کر لیا ہے؟“

”ہاں کر لیا ہے۔“

”دیکھا جعفر۔ اگر دوست ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو بڑے سے بڑے مسئلے حل ہو جائیں۔ جیسے تم نے کوشش کر کے ان دھمکی دینے والوں کا تلاش کر لیا۔ ویسے تمہارا میرے لیے پریشان ہونا مجھے بہت اچھا لگا۔“ وہ شرما تے ہوئے بولی تو جعفر کو بہت اچھا لگا۔ تبھی وہ پیار سے بولا

”ایک تم ہی تو میری دوست ہو۔ بلکہ دوست سے بھی بڑھ کر جس کا خیال رکھنا ہی، میری زندگی ہے۔ اس تعلق میں اک اعتبار ہی تو ہے۔ ان ہوتا ہے نا، اور مائرہ یہ تعلق ہر کسی سے ہو بھی نہیں سکتا۔“

”بالکل جیسے میں اور تم۔! کتنے برس سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ دوست ہیں، ساتھ پڑھے۔ پھر ملتے بھی رہے۔ فہد کے چلے جانے کے بعد ہم اچانک ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے۔ ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہماری قربت اعتبار اور مان کا اظہار ہی تو ہے۔“ مائرہ اپنی سوچ واضح انداز میں کہہ دی

”مجھ پر اعتبار کرنے کا اور مان دینے کا بہت شکریہ مائرہ۔“ وہ اس کے لفظوں سے سرشار ہوتا ہوا بولا

”شکریہ کہہ کر مجھے چھوٹا ست کر دو جعفر۔! حقیقت یہ ہے کہ فہد کے جانے کے بعد، جس طرح میں ٹوٹ گئی تھی اور جیسا مجھے سہارا تم نے دیا، اس پر تو میں تمہاری احسان مند ہوں۔ وہ نبھانے کب لوٹ آئے گا۔ میرے انتظار کی اذیت تم نے کم کی ہے جعفر۔“ وہ اداس ہوتے ہوئے بولی تو جعفر نے کہا

”میں تمہارا دوست ہوں نا۔ میں نے ہی خیال نہیں رکھنا تو پھر کسی اور نے خیال کرنا تھا۔“

”تم فقط میرے دوست ہی نہیں، اس سے بھی بہت کچھ بڑھ کر ہو۔ ہم ایسا کیوں نہیں کرتے، ہم دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تمہارا ساتھ نہ صرف حوصلہ دیتا ہے بلکہ نیوز کی دنیا میں تھلک بچا سکتے ہیں۔“ مائرہ نے اچانک کہا اور کہہ کر مسکرا دی اس پر جعفر بھی مسکراتے ہوئے بولا

”ضرور! ایسا اچھا ہے، سارا دن تمہیں یاد کر کے پور ہونے سے تو بہتر ہے۔“

اس پر مائرہ نے ہانکا سا قہقہہ لگایا تو اک جلت رنگ کا سا احساس چاروں طرف بکھر گیا۔ وہ کچھ پر تک خاموش رہے۔ پھر جعفر نے کہا

”آؤ، کہیں سے کھانا کھاتے ہیں۔“

اس پر مائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا

”چلو، کھانا بھی تمہاری پسند کا میری طرف سے۔“

دونوں ایک ساتھ اٹھے اور پارک سے باہر کی جانب چل دیئے۔ سورج مغرب میں اتر چکا تھا۔



رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ چوہدری جلال حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریونیو آفس سے واپسی پر چوہدری جلال بہت غصے میں تھا، کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس سے بات کر سکے۔ ان اس کا قصہ کم ہوا تھا تو فحشی بھی اس کے پاس آ کر تبصرہ کرتے ہوئے بولا

”گلتا ہے ریونیو آفسر اس کے ساتھ مل گیا ہے۔ حالانکہ میں رات اس سے مل کر اور اسے بتا کر آیا تھا۔ اور فہمہ اس نے بھی ذہانت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ویسے اگر وہ عمر حیات والی زمین لے گیا۔ تو ہماری شکست ہوگی۔ کم از کم ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔“

”اُونٹیں کوئی شکست نہیں ہے۔ میں خود اس کا زور دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں تک کیا کرتا ہے۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ چاہے وہ اس کی اپنی زمین کا ٹکڑا ہے یا عمر حیات سے خریدی ہوئی زمین۔“ چوہدری جلال نے بڑے سکون سے کہا

”چوہدری صاحب ایک طرف اسے آپ ڈچین کہہ رہے ہیں اور دوسری جانب اس کا زور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سمجھ نہیں آئی بات۔“ فحشی نے الجھتے ہوئے کہا

”میں نے اس کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ اسے کس حد تک جانے کی اجازت دینی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں فحشی، کہ اس علاقے کے لوگ ہمارے ساتھ کس حد تک وفادار ہیں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو اس کے لہجے میں شکوے اور غصے کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اس پر فحشی نے الجھتے ہوئے رائے دی۔

”آپ کی باتیں آپ ہی جانتیں۔ لیکن میرا یہ خیال کہتا ہے کہ اب اسے ڈھیل نہیں دی جاسکتی۔ وہ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، اب اس کا راستہ روکنا ہی ہوگا۔ لیکن کیسے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر چوہدری جلال خاموش سے سوچنے لگا۔ چھی پورج میں گاڑی رکتی ہے۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چھی چوہدری کبیر فیسے میں دھننا تا ہوا اندر آ گیا، اس نے ایک نگاہ اپنے باپ پر ڈالی اور دانت پیٹتے ہوئے پوچھا

”باباجی۔ اید میں کیا سن رہا ہوں۔ اس فہد کے بچے نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔“
 اس پر چوہدری جلال نے اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ کبیر کے اندر آگ دھڑ دھڑ جسنے لگی۔
 چوہدری جلال اپنے بیٹے کے اندر کو کچھ چکا تھا۔ وہاں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کا اندر عیاں کر رہی تھی۔ وہ ایک دم سے خوف کھا گیا کہ یہ آگ کہیں اس کے اپنے فرمن ہی کو نہ لگ جائے۔ اس لئے بڑے قفل سے بولا
 ”بدتمیزی نہیں، یہ اس کے اندر کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ اس کے اندر اتنی آگ بھری ہوئی ہے۔ لگتا ہے وہ بچپن سے اسی آگ میں جل رہا ہے۔“

”بابا۔ اس سے پہلے کہ اس کے اندر کی آگ ہم تک پہنچے، اسے اس کی اپنی آگ ہی میں جلا دینا چاہیے۔“ چوہدری کبیر نے انتہائی غصے میں کہا تو چوہدری جلال بولا

”کیسے؟ کیا اسے تم گولی مار دو گے؟ یہ گولی مارنا جتنا آسان ہے۔ ہمارے لیے یہ اتنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ ہمارا سیاسی کیرئیر واؤپر لگ جائے گا۔ یہ تم کیوں نہیں سمجھتے ہو۔ وہ اگر یہاں واپس آیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی آیا ہے۔“
 ”اس کی ساری سوجھیں، اسی کے ساتھ فتم ہو جائیں گی بابا۔ ریونٹو آفس میں اس کی بدتمیزی کا یہی مطلب ہے کہ اس نے ہمیں لٹکا رہا ہے۔ اس کا جواب تو ہمیں دینا ہی ہوگا۔“ وہ جیزی سے بولا

”کبیر۔ اگر ہم فقط جاگیر دار ہوتے تو اب تک اس کی زبان گدی سے نکال کر زبان پر رکھ دیتے۔ اور نہ ہی اس کی اتنی اوقات ہے کہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جائے۔ وہ ساری عمر بھی لگا رہے تو ہمارے قد کو نہیں چھو سکتا۔ معاملہ کچھ اور ہے۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر نے الجھتے ہوئے پوچھا
 ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟“

”میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ حالات پر غور کرو۔ اور پھر فہد کا گاؤں میں آ جانا۔ یہاں کے ڈی ایس پی نے یونہی فون نہیں کر دیا تھا۔ تمہارے خلاف پہلی بار جس بے جا کی ایف آئی آر درج ہونا، یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ میں نے بتا کیا ہے۔ ڈی آئی جی سے کہلوا یا گیا تھا۔ کوئی طاقت ہے جو ہمارے خلاف ہو چکی ہے۔ فہد ایک نقاب ہے۔ اصل طاقت کا چہرہ اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔“
 چوہدری جلال نے یوں کہا جیسے وہ معاملے کو تہہ تک پہنچ گیا ہو۔ اس پر چوہدری کبیر نے انتہائی حقارت سے کہا

”تو پھاڑ دیتے ہیں یہ نقاب۔ دیکھتے ہیں پھر کون سامنے آتا ہے۔ آپ اس کھیل کو جتنی دیر تک سمجھیں گے، اس وقت تک سارا

کھیل بگڑ چکا ہو گا بابا۔ مجھ سے جو ہو سکا، میں وہ کروں گا، لیکن فہد کا یہ صاف کرنا بہت ضروری ہے۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔“
وہ دونوں باپ بیٹا باتیں کر رہے تھے کہ اس دوران ٹشی فون سیٹ لے کر قریب آ گیا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا تو
ٹشی نے سودا خانہ انداز میں کہا

”یہ جی منشر صاحب کا فون ہے۔“

چوہدری نے بڑے سکون سے فون پکڑا، اور کان سے لگا تا ہوا بولا

”جی منشر صاحب۔! کیسے یاد کر لیا ہمیں۔“

”پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس ہے، آپ فوراً آ جائیں۔ یہ اجلاس، اسمبلی سیشن سے پہلے بہت ضروری ہے۔ ایم این اے حضرات

کو گرانٹیں دی جا رہی ہیں۔ پھر مت کہے گا کہ ہم نے آپ کو خبر نہیں دی۔“

چوہدری کبیر چند لمحے رک کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا پھر غصے میں اٹھ کر چل دیا۔ چوہدری فون کرتے ہوئے اسے دیکھتا رہا

مگر روکا نہیں۔ وہ اس کی آنکھ میں اترا ہوا خون دیکھ چکا تھا، لیکن پھر بھی وہ مسلسل بات کرتا رہا۔

”یہ اجلاس کب ہے منشر صاحب؟“

”کل صبح، آپ بس آ جائیں۔“

”میں آج ہی نکل رہا ہوں۔ اور کوئی بات؟“

”نہیں بس آپ آ جائیں، باقی باتیں ادھر ہو جائیں گیں۔ اللہ حافظ۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ چوہدری نے بھی فون واپس ٹشی دے دیا اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی تھی۔ یہ خوشی عارضی

تھی۔ جیسے ہی اسے کبیر کا خیال آیا۔ وہ اپنی سوچوں میں کھو گیا۔ وہ اٹھ اور اندر چلا گیا۔ وہ کاریڈور میں آیا تو اس کا سامنا بشری بیگم سے ہوا۔

چوہدری خاموشی سے آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُسے سوچ میں گم دیکھ کر بشری بیگم نے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا

”کیا بات ہے۔ آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔“

”بیگم۔ آج تک میں نے دنیا داری کے بے شمار بکھڑوں کو کسی پریشانی کے بغیر ختم کیا ہے لیکن ایک جگہ آ کر میں تھوڑا پریشان

ضرور ہو جاتا ہوں اور وہ ہے حیرانیا کبیر۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”کیا ہوا اسے، آپ اس کی کسی بات سے پریشان ہیں؟“ بشری بیگم نے خود پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

”اس کا غصہ، سوچے کچھ بغیر کسی پرچہ دوڑنا۔ میں، ماماہوں کہ طاقت ہوگی ہمارے پاس تو یہ لوگ ہمارے سامنے سر نہیں

اٹھا سکیں گے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ ہر جگہ طاقت کا استعمال غلط بھی ہوتا ہے۔ اسے سمجھاؤ، جہاں طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں طاقت

استعمال کرتے ہیں۔ اور جہاں عمل مندی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں عمل سے کام لیتے ہیں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو بشری بیگم بولی

”آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے آپ نے کبھی ایسے نہیں سوچا تھا۔ کبیر جو مرضی کرتا پھرے آپ نے کبھی اسے نہیں روکا تو کا تھا۔ اب کیا ہو گیا ہے؟“

”اس کے منہ کو خون لگ گیا ہے بیگم۔ میں مانتا ہوں کہ میں اسے کبھی نہیں روکا تو کا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ وحشی ہو جائے۔“ وہ سنجی سے بولا

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا، میں اسے سمجھتی ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا ہے، وہ بہت چڑچڑا ہوا گیا ہے۔ یوں جیسے وہ کسی معاملے میں بہت بے بس ہو۔“ بشری بیگم نے کہا تو وہ چوہدری نے چونک کر دیکھا اور پھر پوچھا ”ایسی کیا بات ہے۔ کس معاملے میں وہ بے بسی محسوس کر رہا ہے؟“

”میں نے اس پر بہت سوچا ہے چوہدری صاحب، میں نے کوشش بھی کی ہے اس سے اگلوٹنے کی مگر وہ کچھ بولتا ہی نہیں ہے۔ میں خود اس کے رویے سے پریشان ہوں۔“ بشری بیگم نے بے بسی سے کہا

”اس معاملے کا تو فوراً پتہ چلنا چاہئے۔ کیا بات ہے وہ؟ یہ بہت ضروری ہے“ چوہدری جلال نے تیزی سے کہا ”وہ میرے پاس رہے تو مجھے کچھ معلوم ہو۔ یہاں ہوتا ہے تو زیادہ وقت ڈیرے پر گزارتا ہے۔“ تو بشری بیگم نے ٹھک کر کہا تو چوہدری جلال سوچنے والے انداز میں بولا

”تمہارا یہ مشورہ بالکل ٹھیک تھا کہ ہمیں اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ تم نے اس سلسلے میں اس سے بات کی؟“

”آپ کچھ فائل کریں گے تو میں اس سے بات کروں گی۔“ بشری بیگم نے کہا

”تم اس سلسلے میں اس سے بات کرو۔ ہم چند دن میں فیصلہ کر ہی دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ تو بشری بیگم اس کے ساتھ ہی چل دی۔ وہ دونوں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

چوہدری کبیر غصے میں حویلی سے نکلا اور واپس ڈیرے پر چلا گیا۔ جہاں تھا نیدار آگیا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کھانا دھرا ہوا تھا اور وہ بڑی بے دردی سے کھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خیمیا نہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہڈی ایک طرف پھینک کر پھر دوسری اٹھائی۔ کبیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی تھا نیدار نے کہا

”نکے چوہدری جی، جب بھی آپ کی دعوت کھائی ہے۔ سچ پوچھنا۔ تو اس کا سوا دہائی کچھ اور ہوتا ہے۔۔۔ جنس آ جاتی ہے۔“

”اور تمہیں یہ بھی پتہ ہو گا کہ میں ایسی دعوت کیوں کرتا ہوں۔“ چوہدری کبیر نے اس کی طرف دیکھ کر سرد سے لہجے میں کہا

”وہ تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا، جب آپ نے دعوت کے لیے مجھے پیغام بھیجا تھا۔ سمجھ گیا تھا اسی وقت۔ ہاں آپ بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟“ اس نے کھانے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے پوچھا

”یہ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ ایک بندہ ہی قابو میں نہیں آ رہا۔ سنا ہے وہ تمہیں بھی قتل کرنے میں دھمکیاں دے کر آیا تھا۔“

کبیر نے تشویش زدہ لہجے میں کہا

”حالانکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ پانی ہمیشہ ہمارے پلوں کے نیچے سے ہو کر گذرتا ہے۔ کچ پوچھو تاؤڑھے چوہدری صاحب بہت ناراض ہوئے تھے مجھ پر۔ میں اس دن سے فہد کی تاک میں ہوں کہ میرے ہتھے چڑھے اور میں اپنا کام دکھا دوں۔ پورا پلان میرے ذہن میں تیار ہے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔“ تھانیدار نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”کیا کہتے ہو پھر تم اس کے بارے میں۔ حالات سازگار کرو۔ نہال کروں گا۔“ کبیر نے پوچھا

”کیوں گنہگار کرتے ہو گئے چوہدری جی، پہلے بھی ہم آپ ہی کا کھاتے ہیں، ان نوکریوں میں بھلا کیا رکھا ہوا ہے۔ میرے لیے اتنی ہی کافی ہیں کہ وہ مجھے چوہدری صاحب خوش ہو جائیں اور مجھے یقین ہے کہ چوہدری جی... ایک حیرت سے تین شکار کروں گا۔“ تھانیدار نے کھانا چھوڑ کر اسے یقین دلایا

”واہ! میں بھی تو سنوں، ایسا کون سا تیر ہے تمہارے پاس؟“ کبیر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”میں یہ کھانا کھالوں پھر آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں کہ کرنا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ادیار بھی تو بہت کچھ پڑا ہے تیرے سامنے۔ کھانی سوچ کر۔ تو بیٹھا اور کھانا کھا، میں ابھی آتا ہوں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“

کبیر نے اٹھتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے، میں انتظار کرتا ہوں“

یہ کہہ کر وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چوہدری کبیر باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر فکر اور سوچ کے طے جملے ناثرات تھے۔ وہ اپنے لوگوں کو روکنے جا رہا تھا، جو اس نے فہد کے لئے تیار کئے تھے۔ اب وہ چاہتا تھا کہ پہلے تھانیدار والا معاملہ دیکھ لے، پھر اگلی کوئی بات کرے گا۔



فہد اور، مسز دین محمد، دامان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں سلسلی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ فہد اس کی آمد پر اس کی جانب متوجہ ہوا تو سلسلی نے پوچھا

”جلس دہ زمین تو ہوئی۔ یہ گاؤں میں مگر خریدنے کی ضرورت کیا تھی۔ آپ کے پاس اپنا مگر تو ہے۔“

”اگر کچ پوچھو تو میں نے یہ مگر تمہارے لیے خریدنا ہے سلسلی۔“ فہد نے سکون بھرے لہجے میں کہا تو سلسلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”میرے لیے، وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے سلسلی کہ تم نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں پر گاؤں کی بچیوں کے لیے سکول بناؤ۔ انہیں تعلیم بھی دو اور ہنرمند بھی بناؤ۔“ پھر جو تم چاہو۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”میں تو کر لوں گی مگر...“ وہ کہتے کہتے رک گئی

”مگر کیا، میں اور استاد جی ہیں ناقہاری مدد کے لیے۔ کیوں استاد جی؟“ اس نے کہتے ہوئے پوچھا تو ماسٹر دین محمد نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”اچھی بات ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ دراصل تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے بندے کو شعور ملتا ہے۔ علم ہی حیوانیت سے انسانیت کی طرف لاتا ہے۔ مگر جس کام کا بیڑا تو نے اٹھایا ہے۔ یہ تکمیل تک پہنچنے کا تو فائدہ مند ہو گا۔ ورنہ مایوسی کے بادل مزید گہرے ہو جائیں گے۔ ادھر وادھر مشن لوگوں کا حوصلہ توڑ کر رکھ دے گا۔ لیکن۔۔“

لیکن کیا استاد جی، آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“ فہد نے تیزی سے پوچھا تو ماسٹر دین محمد نے کہا

”ہتر۔! اس گاؤں کے سکول پر عرصہ ہوا تالا پڑا ہوا ہے۔ اصل مشن تو وہ ہے کہ اس سکول کا تالا کھولا جائے، بچے اس میں جا کر پڑھیں۔ بات صرف تالا کھولنے کی نہیں ہے۔ یہ چوہدری کی طاقت کو چیلنج کرنے والی بات ہوگی۔“

”میں جانتا ہوں استاد جی، آپ دعا کریں۔ اللہ رب العزت ہمیں استقامت اور قوت دے۔ یہ بھی ہو جائے گا۔“ فہد نے اسے حوصلہ دیا

”بھری دعائیں تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں بیٹا۔“ ماسٹر دین محمد نے جذب سے کہا تو سلسلی بولی

”بعض اوقات ہم اپنے بارے میں غلط اندازے لگا کر خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیا چوہدری

”میں کسی بھی طرح کی خوش فہمی نہیں ہوں۔ میں چوہدری جیلاں کی فرعونیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ کیا ہونے والا ہے اور وہ کیا کر سکتا ہے۔ میں ہر طرح کے حالات کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔ کیا تم تیار ہو؟“ فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو سلسلی نے اپنے باپ کا خیال کرتے ہوئے مدحیرے سے کہا

”میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو مایوسی نہ ہو۔ میں آپ کے مشن میں ہر ساتھ دوں گی۔ کھانا لائوں؟“

”لے آؤ۔“ وہ اس کی بات سمجھتے ہوئے بولا

”میں ابھی لائی۔“ سلسلی یہ کہہ کر اٹھی اور تیزی سے اندر کی جانب چلی گئی۔ اور وہ دونوں ہاتھیں کرنے لگے۔

فہد کے ذہن میں تھا کہ اس وقت سراج اپنے ڈیرے پر سے آنے والا ہے۔ فہد نے اسے گھربلا یا تھا۔ اسے یہاں ہاتھیں کرتے ہوئے اور کھانا کھاتے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ تیزی سے باہر نکلا اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

اس وقت سراج اپنے ڈیرے پر رانی کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ رانی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن اندھیرے میں اس کا گورا بدن چاندنی کی طرح چمک رہا تھا۔ اگرچہ وہ غریب گھر کی تھی۔ لیکن حسن اس پر نوٹ کر آیا تھا۔ یہی دیکھتے ہوئے سراج نے کہا

”رانی، آج میں نور پور گیا تھا، پر تیرے لئے کچھ لانے کا وقت ہی نہیں ملا۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں یہاں تم سے فرمائشیں کرنے نہیں آئی۔ تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ پتہ ہے کتنی مشکل سے آتی ہوں یہاں میں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو حویلی والوں نے مجھے نہیں چھوڑنا۔“ رانی ٹھک کر بولی

”کیا ہوگا؟ بدنام کر دیں گے، نا تو کر دیں۔ اچھا ہے، جو رکاوٹ ہماری شادی میں ہے وہ خود بخود دور ہو جائے گی۔“ سراج نے تیزی سے کہا

”تم نے سوچ لیا اور ہو گیا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ پتہ ہے پارگاؤں والوں نے تو یہ بھی طے کر لیا ہے کہ جلد از جلد میری منگنی کے لئے آجائیں۔ اور تم ہو کہ بات نہیں کر سکتے اپنی اماں سے۔“ رانی نے دھکی ہوئے ہوئے کہا

”اوائے تجھے کس طرح سمجھاؤں کہ میں نے کر لی ہے اماں سے بات۔ غیر برادری میں رشتہ مانگنا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔ وہ کوئی موقعہ دیکھ کر بات کریں گے۔ اور تو کیوں گھبراتی ہے، رشتہ آرام سے نہ دیا تو میں عدالت میں نکاح کر لوں گا۔“ سراج نے اسے آسان سے حل بتایا تو رانی سر پ کر بولی

”نہ ہا نہ، ایسے سوچنا بھی مست۔ اور ہاں! میں نے سنا ہے تو امین والے معاملے میں عدالت جائے گا، چوہدریوں کے خلاف؟“

”ہاں تو اور کیا، انہوں نے ظلم تھوڑا کیا ہے۔“ سراج نے دکھ سے کہا تو رانی بولی

”اور یہ تو نے فہد کے ساتھ کیا باری لگالی ہے۔ پتہ ہے حویلی والے اس کے کتنے خلاف ہو گئے ہیں۔“

”کتنے، یہی نا کہ اسے جان سے مار دیں گے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو رانی ڈرتے ہوئے بولی

”معاذ ایسے ہی ہے سراج۔ نکا چوہدری تو اتنے غصے میں ہے کہ میں کیا بتاؤں وہ سمجھتا ہے کہ فہد نے دڑھے چوہدری سے بدتمیزی کی ہے۔“

”کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ میں ساتھ تھا۔ اس نے اپنا حق لینے کے لئے جائز بات کی ہے۔“ سراج نے بتایا

”ہات تو تم ٹھیک کہتے ہو سراج۔ یہاں میرا لوگ بھلا تم جیسے غریبوں کو کہیں انسان سمجھتے ہیں۔ وہ سخت غصے میں ہے۔ میرا تو دل ڈرتا ہے۔ کہیں وہ...“ رانی کہتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

”ہم انہیں انسان نہیں سمجھتے۔ تو غم نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سراج نے اسے حوصلہ دیا

”دیکھ سراج تو اپنا خیال رکھ۔“ رانی حسرت سے بولی سراج اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا

”تو میری فکر چھوڑ اپنا خیال رکھا کر۔ آجھے چھوڑ دوں، پھر مجھے فہد کے پاس جانا ہے۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ سراج نے کہا تو رانی اٹھ گئی۔ دونوں کھیتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چلتے چلے گئے۔

وہ رات گزر گئی۔ قسمت مگر پر مچ کے سورج نکلنے کو تھا۔ ایسے طلحے اندھیرے میں ایک شخص کھیتوں کے راستے پر آ رہا تھا کہ اس کی

نگاہ ایک ایسے بندے پر پڑی جو اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ وہ متحسّس ہو کر تیزی سے اس کے قریب گیا۔ اسے پلٹ کر دیکھا تو وہ امین آرائیں تھا، جس کی سانسیں ختم ہو چکیں تھیں اور مردہ پڑا تھا۔ وہ شخص خوف زدہ ہو کر چمک گیا۔ اس نے ڈرے ہوئے انداز میں گاؤں کی طرف دیکھا اور تیزی سے پلٹ کر چل دیا۔

اس وقت فہد اور سراج دونوں مسجد سے پلٹ کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔ فہد کے سر پر رومال اور سراج کے سر پہ پرنا تھا۔ وہ آکر صحن میں بھی چار پائی پر بیٹھ گئے تو سراج نے اونچی آواز میں کہا

”چما کے اوئے چما کے... یار چائے لے آ۔“

”یار اس چما کے کا یہ تو سکون ہو گیا ہے، چائے تو بتا دیتا ہے۔“ فہد نے خوش دلی سے کہا تو اندر سے کوئی جواب نہ پا کر سراج نے پھر اونچی آواز میں پکارا

”اوئے کدھر گیا ہے تو؟“

اسنے میں چما کا باہر سے خوف زدہ اور دہشت زدہ سا اندر آ گیا۔ فہد نے اسے دیکھا تو تشویش سے پوچھا

”اوئے کیا ہوا تجھے؟“

”وہ وہ امین“ چما کے کے منہ سے لفظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ اس پر سراج نے تیزی سے پوچھا

”کیا ہوا امین کو؟“

”اس کی لاش... وہ کھیتوں میں... اسے کسی نے مار دیا ہے۔“ وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا

”کیا بکواس کر رہا ہے، تو جھوٹ بول رہا ہے۔“ سراج نے ایک دم سے کہا تو چما کا خود پر کا پو پاتے ہوئے بولا

”میرا یقین کر دو۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ میں اپنے گھر سے سیدھا ادھر آ رہا تھا۔ راستے میں مجھے پتہ چلا،

میں نے وہاں جا کر دیکھا۔“

یہ سنتے ہی سراج ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ فہد نے اس کا بازو پکڑ کر باہر کی جانب ہاتھ ہوئے کہا

”جل جلدی چل، دیکھتے ہیں۔“

وہ تینوں تیزی سے باہر کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

فہد نے گاڑی وہاں جا کر روکی، جہاں کھیتوں میں لوگ کھڑے تھے۔ وہ تیزی سے باہر نکلے اور اس طرف بڑھے جہاں امین پڑا

ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سراج ہلک ہلک کر رونے لگا۔

”فہد، یہ کیا ہو گیا یار... میں تو اسے جیتا جاگتا گھر چھوڑ کے آیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اکڑوں ہو کر زمین پر بیٹھا اور پاٹلوں کی

طرح اس کے گال تھچھاتے ہوئے بولا، ”اٹھ امین اٹھ، تو ایسے نہیں کر سکتا، تو مجھ سے روٹھ کر نہیں جا سکتا، ابھی تو ہم نے چودھریوں سے

بدلہ لینا ہے۔ ابھی تو تیرے سر پر سہرا بٹھا ہے یار، اٹھ ایسے نہ کر، چل گھر چلیں، ماں انتظار کر رہی ہوگی۔“

تبھی فہد نے اسے قابو میں کرتے ہوئے کہا

”ہوش کر سراج ہوش۔“

”کیا ہوش کروں، یہ دیکھ امین قتل ہو گیا ہے، یہ مجھے چھوڑ کر چھا گیا ہے۔“ سراج دھواڑیں مار کر روتے ہوئے بولا۔ چھا کے نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال تو سراج کے گلے میں پڑا پر تا فہد نے اتار کر امین پر ڈال دیا۔ جس پر سراج مزید رونے لگا۔ فہد بھی اپنے آنسو صاف کرنے لگا۔ اس نے ہیکے ہوئے لہجے میں کہا

”اٹھاؤ امین کو، گھر چلیں۔“

وہاں پر موجود لوگوں نے امین کے بے جان وجود کو اٹھایا۔ سراج بہت غصہ حال ہو رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں نے امین کی لاش کو اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور پھر سب وہاں سے چل دیئے۔

امین کے قتل نے پورے قسمت مگر ہی میں نہیں بلکہ پورے علاقے میں خوف، غم اور دکھ محسوس کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چوہدریوں کی دہشت بھی اپنے اثرات میں اضافہ کر چکی تھی۔ ہر جگہ اسی بات کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس دن چوراہے پر کوئی کھیل نہیں کھیلا گیا۔ چوراہے پر چاچا سوہنا، حنیف، دوکاندار اور دوسرے کئی لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”بہت ہی بر ہوا یا ر امین کے ساتھ۔ بے چارہ اپنے دوست کے قتل کی گواہی دیتے دیتے خود اس کے پاس جا پہنچا۔“ حنیف دوکاندار نے دکھ سے کہا

”ساتھادہ چوہدریوں کے خلاف عدالت میں جانا چاہتا تھا۔ ایف آئی آر تو اس نے کٹا دی تھی۔ شاید اس کا بھی جرم تھا۔“ ایک

بندہ بولا

”کیا ٹو یہ کہتا چاہتا ہے کہ اسے چوہدریوں نے قتل کیا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے پوچھا تو وہ بندہ بولا

”نہ... نہ... میں یہ نہیں کہتا۔ میں نے تو جو ساتھادہ کہہ رہا ہوں۔“

”کیوں ڈرتے ہو یار، پہلی بار تھانے میں چوہدری کبیر کے خلاف رپٹ درج ہوئی ہے اور پہلی بار کسی نے چوہدری کے خلاف سراٹھایا۔ اس کی سزا تو امین کو ملنی ہی تھی۔ تم لوگ یونہی خوف زدہ ہو رہے ہو اور گوگلے بن کر مُردوں کی طرح بیٹے رہے ہو۔ آج امین کی باری تھی، ہل تم میں سے کسی ایک کی باری ہوگی۔“ چاچا سوہنا انتہائی دکھ سے بولا

”اوند چاچا نہ، کیوں اپنے گلے میں عذاب ڈالتے ہو۔ یہاں ہوتا کیا ہے سب جانتے ہیں۔“ حنیف دوکاندار نے تیزی سے کہا

”کیا ایسی انسانیت ہے یار، جو آواز بھی ظلم کے خلاف اٹھی، وہی دہادی گئی ایسا صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم ڈرتے ہیں۔... کیا

اس قسمت مگر کی قسمت یہی ہے۔ اس کے ہاں مردہ ہیں؟... ظلم ہے یا ظلم“ یہ کہتے ہوئے چاچا سوہنا رو دیا۔ اس کی آواز رندہ گئی تھی

”نہ زود چاچا، رُونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ بس یہ امید رکھنی چاہئے کہ اس قسمت مگر کی قسمت بدلے گی۔“ پاس بیٹھے ہوئے ایک بندے نے کہا تو چاچا سو ہوتا ہوا، ”قسمت اس دن بدنی ہے، جب تم اپنی قسمت بدلنے کا سوچو گے۔ ایسے تو قسمت نہیں بدلتی یا۔“

”کون نہیں چاہتا کہ اس ظلم سے نجات نہ ملے کوئی تو ایسا ہو جو، ان چودہ بیویوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرے۔“ اس بندے نے یاسیست سے کہا

”ہم باتیں ہی کرتے رہ جائیں گے۔ ہوتا، ہونا کچھ نہیں ہے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا

”تیرے جیسے مایوس بندے لوگوں کا حوصلہ پست کرتے ہیں۔۔۔ وہ امین چند دن رہا، لیکن ان چودہ بیویوں کو وحشت ڈالے رکھا۔“

مرد تھانہ وہ۔“ چاچا سو ہوتا تیزی سے بولا

”پر چاچا۔! اپنی جان سے بھی تو گیا ہے نا۔“ حنیف دوکاندار نے کہا تو ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

سارا دن انہیں نور پور کے ہسپتال میں گزر گیا۔ پولیس کو رپورٹ کی گئی، پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لیتے ہوئے انہیں سہ پہر ہو گئی۔ ڈاکٹر نے یہی رپورٹ دی تھی کہ تشدد کے بعد اس کے سر میں بہت قریب سے گولی ماری گئی تھی، جس سے موت واقع ہو گئی تھی۔

تھانیدار نے بڑی خاموشی کے ساتھ ایف آئی آر درج کر لی تھی مگر نامعلوم افراد کے خلاف۔

شام ہونے تک قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تازہ قبر پر سب لوگ افسردہ کھڑے ہیں۔ قبر پر پھول چڑھائے ہوئے تھے۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ فہد، سراج، چاچا سو ہوتا، چھاکا، مولوی اور قسمت مگر کے دوسرے کئی لوگوں کے چہروں پر دکھ پھیلا ہوا تھا۔ سراج بہت غم سے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ زور زور ہاتھ لیکن آہ دیکھا نہیں کر رہا تھا۔ سب کے درمیان میں کھڑے ہوئے مولوی صاحب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تو وہاں سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرتے ہی سراج بلک پڑا۔ تبھی فہد اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے لگا۔ سراج اس کے کاندھے سے لگ کر رونے لگا۔ فہد نے اسے خود سے الگ کر کے سمجھ کے انداز میں کہا

”سراج، جتنا روتا ہے ایک باری رولو، پھر نہیں روتا۔“

”بہت۔۔۔ بہت۔۔۔ ظلم کیا۔ ان چودہ بیویوں نے میرا بھائی امین پر۔۔۔“

”میں نے کہا نا۔۔۔ اب تو رد لے جتنا روتا ہے۔۔۔ اب رونے کی باری ان کی ہے۔ ابھی مبر کر لے۔“ فہد نے دانت پیستے

ہوئے کہا تو سراج بولا

”وہ بے چارہ۔۔۔۔۔“

اس نے کہا چاہا لیکن نیگل میں کچھ نہیں کہہ پایا۔ فہد نے اسے پھر اپنے ساتھ لگایا تو سراج آہستہ آہستہ سر ہٹا کر خود پر قابو پانے لگا۔ سب قبر سے ہٹتے چلے گئے تو وہ دونوں بھی چل پڑے۔ قسمت مگر کی تاریخ میں ایک حریف ظلم رقم ہو گیا تھا۔



سر پہ ہو چکی تھی۔ فہد اپنے گھر نہیں گیا بلکہ سید حالو رپور تھا نے چلا گیا۔ اس وقت فہد تھا نے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سراج تھا۔ قریب ہی ایک سپاہی افسر وہ کھڑا تھا۔ ایسے میں تھانیدار آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے طرہ انداز میں فہد کی طرف دیکھا۔ چند لمبے دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا

”ہاں بولو، کیسے آئے ہو؟ ... کوئی نئی ایف آئی آر لکھوائے ... یا پھر کسی افسر کا فون کروانے ... یا پھر قانون جھاڑنے آئے ہو۔“

”تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ امین کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ فہد نے خود پر قابو

رکھتے ہوئے کہا

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ”قتل“ ہوا ہے۔ وہ خود بھی اپنی زندگی سے تنگ آ کر مر سکتا ہے۔ ابھی تو میڈیکل رپورٹ صرف یہ

تصدیق کرتی ہے کہ فائر اس کے سر میں لگا۔ یہ تحقیق تو ابھی باقی ہے کہ وہ کیوں مرا؟ کیسے مرا؟ یا خودکشی کر لی اس نے؟“ تھانیدار نے

حقارت سے کہا تو سراج نے اسے غصے میں دیکھا

”تیرے لہجے سے لگتا ہے کہ تو اس قتل کو بھی ناکوں میں بند کرنے کی سوچ رہا ہے لیکن یاد رکھنا، میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں

گا۔“ فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو تھانیدار بولا

”تم امین کی موت کو قتل ہی کیوں کہہ رہے ہو۔ کیا یہ قتل تم نے کیا ہے۔ تم بھی اس کو قتل کر سکتے ہو؟“

تھانیدار نے کچھ اس طرح عجیب لہجے میں بات کی تھی کہ فہد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جس پر سراج نے انتہائی غصے میں کہا

”تیری ذہنیت سامنے آئی گئی ہے تو سن لے۔ خود کو ٹھیک کر لے اور چوہدریوں کے خلاف“

”ہونہ۔! ممکن ہے تو نے اپنے بھائی کو جانیداد کے لیے قتل کیا ہو۔ اور نام چوہدریوں کا لگا رہے ہو۔“ تھانیدار نے اس کی بات

کاٹ کر کہا، پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا، ”اور تم دونوں غور سے سن لو میری بات۔ اب میرے ساتھ ادھے لہجے میں بات نہیں کرنی۔

ورد بہت بچھتاؤ گے۔“

”کون کتنا بچھتا رہا ہے، یہ تو وقت بتائے گا۔ لیکن میری بات یاد رکھ، خود کو ٹھیک کر لے۔“ فہد نے سر دیکھ کر کہا تو تھانیدار اس کی

طرف دیکھ کر بولا

”اور تو بھی سن لے فہد تم بھی اس قتل میں شامل تحقیق ہو۔ جب بھی قسمت مگر سے باہر جانا ہو تو تھا نے میں حاضری لگوا کر جانا۔“

”تو اپنے آپ کو اس علاقے کا دادا نہ سمجھ، تجھ سے جو ہو سکتا ہے تو کر اور اب میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں یہ تجھے بہت جلد معلوم

ہو جائے گا۔ چل آ سراج پہلے اسے سمجھالیں۔“ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا کر بولا

”تو نے کیا سمجھانا ہے، پہلے خود سمجھ لے، اب تیرے ساتھ کیا ہوگا۔“

یہ کہہ کر اس نے فہد لگا دیا۔ جس پر سراج غصے میں آگ بگولا ہو گیا۔ اس کی حالت بہت خراب ہونے لگی۔ وہ تھانیدار اس کے

بھائی کی لاش پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اسے بے قابو ہونا دیکھ کر فہد نے اسے پکڑا اور اسے لے کر وہاں سے چل دیا۔ تھانیدار اُن کو جاتا ہوا مزے سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر وہی خبیثانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

والہی پر دونوں خاموش تھے۔ راستے میں ان کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ فہد مسلسل سوچ رہا تھا کہ اب تھانیدار کے ساتھ کیا کیا جائے۔ اسے یہ پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ یہ تھانیدار ان چوہدریوں سے مل چکا ہے اور امین کا قتل انہی لوگوں نے کیا ہے۔ اس نے سراج کو اس کے گھرانہ اور اپنے گھر کی جانب چلا گیا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ وہاں پٹ گیا تاکہ ماسٹر دین محمد کے گھر جائے اور اپنے دماغ کو ڈراما سکون دے۔ وہ قتل سے ان کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی کار میں آ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کار بڑھاتا اسے چھاکا دکھائی دیا جو دوڑتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ کار سے باہر نکل آیا۔ چھاکا خوف زدہ تھا۔ اس نے چھاکے سے پوچھا

”اڈے چھاکے کیا ہوا ہے تجھے، خیر تو ہے؟“

اس پر چھاکے نے اپنی پھولی سانسوں میں فہد کو بتایا

”وہ۔۔۔ سراج جا رہا ہے۔۔۔ کچے چوہدری کو مارنے۔۔۔ ابھی گن لے کر نکلا ہے۔“

”چوہدری کبیر کو مارنے، تو نے روکا نہیں اسے؟“

”بہت روکا میں نے، مگر میری اس نے ایک نہیں سنی۔“ چھاکے نے کہا تو فہد یوں

”کل، جلدی کر بیٹھ۔“

وہ دونوں جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور اس طرف چل دیئے، جدھر چھاکے نے بتایا تھا۔

جلدی ہی وہ سراج تک جا پہنچے جواپنی بانیٹک پر جو پٹی کی طرف جا رہا تھا۔ فہد نے اس کی بانیٹک کو کراس کیا اور اس کے آگے جا کر کار

روک لی۔ سراج نے بھی اپنی بانیٹک روکی تو فہد اور چھاکا کار سے باہر نکل آئے۔ انہیں دیکھ کر سراج نے دور ہی سے کہا

”میرا راستہ نہ روک فہد، میں نے آج کبیر کو مار دیتا ہے۔“

فہد نے اس کے پاس پہنچ کر قتل سے کہا

”پھر کیا ہوگا؟ صرف ایک چوہدری مرے گا بس۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اس نے تیرے بھائی کو مارا ہے۔ جانتا ہوں بہت ظلم کیا

ہے تم لوگوں پر کیا اسے مار دینے سے ان کی سزا ختم ہو جائے گی؟“

”دروغ کرتا ہے کہ ان کا سارا خاندان مار دوں۔ بیچ ختم کروں ان کا۔ پر اب تو۔۔۔“ سراج نے کہا تو فہد نے اس کی بات کاٹ کر کہا

”پر اب تو صرف کبیر کو مار سکتا ہے بس۔ ان کا ایسا بیچ مارنا ہے کہ وہ زندہ بھی رہیں اور مرنے کی خواہش کریں۔ ایسی سزا دینی ہی انہیں۔“

”پتہ نہیں وہ وقت کب آئے گا فہد، آئے گا بھی یا نہیں آئے گا۔ جانے دے مجھے میں ان کی نسل تو ختم کر دوں گا نا۔“ سراج نے

غضب ناک ہوتے ہوئے کہا

”دیکھ میری بات سن، وقت ہمارے ہاتھ میں کچھ آگیا ہے۔ اب دیر نہیں ہے۔ تو اسے مار کر سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا تو تیرے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ ان چودہویوں کے ظلم سہنے کے لئے جھوڑ دے گا انہیں؟ تیری پوز می ماں عدالتوں کے دھکے کھائے گی۔ سوچ...“ فہد نے کہا تو سراج بے بسی میں اپنا سر ہٹتے ہوئے بولا

”کیا کروں... بزدلوں کی طرح جیوں۔“

”میں تمہیں بزدلی کا سبق نہیں دے رہا ہوں اور نہ ہی انہیں معاف کرنے کا کہہ رہا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ واپس پلٹ جا، میں تجھے بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے فہد نے اس کی گن پکڑی۔ سراج چند لمبے سوچتا رہا اور پھر بے بسی سے اپنا سر جھکا دیا۔ ”آج میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ، چھا کالے آتا ہے تیری بائیک۔“ فہد کے کہنے پر سراج بائیک سے اتر ا اور اس کے ساتھ گاڑی میں آگیا۔



فی دی جینٹل کے آفس میں میں جعفر اور مائرہ دونوں آنے سے پہلے ہی ہٹے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ جعفر بہت دلی ڈریسنگ کھائی دے رہا تھا۔ مائرہ کے چہرے پر ہلکی ہلکی غصہ اور عین تھی۔ اس نے فائل ایک طرف رکھ کر پوچھا ”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔ لگتا ہے خود کو ہی تیار کرتے رہے ہو آج۔“ ”مجھے آج کہیں جانا ہے۔ ایک اہم میٹنگ ہے۔ خیر۔ ادھ دھمکی دینے والے کو میں نے پکڑ لیا تھا۔ بے چارے اپنے پاس کی محبت میں مارے گئے۔ اگر تم اسے دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتی ہو۔“ جعفر نے گہری سنجیدگی سے کہا تو مائرہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے گہرے لہجے میں بولی

”تمہارے خیال میں محبت کیا ہے جعفر۔! بتا سکو گے کچھ؟“

اس کے یوں کہنے پر جعفر نے چوٹ کھنے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور دھیمے سے لہجے میں بولا

”مطلب۔ اتم کچھ سمجھتا چاہ رہی ہو...“ یہ کہہ کر اس نے بات کا حرح لینے والے انداز میں کہا، ”خیر... محبت۔ ایک ایسا سنہری جذبہ ہے... جو پورے وجود کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے... یہ جب اپنا آپ منواتا ہے تو پھر... کسی دوسرے احساس نہیں رہتا۔“ ”یوں تمہارے خیال میں محبت ایک جذبہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سوچنے والے انداز میں اسے سے پوچھتے ہوئے کہا، ”تم نے کبھی سوچا جعفر؟ یہ جذبات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے... کبھی کم کبھی بہت زیادہ۔ کسی بھی جذبے کو سوچ کر دیکھو۔“ مائرہ نے بھی حرح لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

”تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تمہارا مطلب ہے محبت ایک جذبہ نہیں ہے؟“ جعفر نے پوچھا

”محبت جب دل میں اتر آتی ہے تو پھر یہ ڈالوں ڈول نہیں ہوتی۔ سمندر کی لہروں جیسی نہیں کہ چاند لگتا تو ان میں مدد جہر آگئی،

ورنہ ساحل سے سرکراتی رہے۔ محبت تو ایک روئیے کا نام ہے۔ وجود میں ضم ہو کر اس کا حصہ بن جاتی ہے۔" مائرہ نے جذب سے کہا، اس پر جعفر بولا

"ہاں تو تمہاری ٹھیک ہے۔ محبت جب تک وجود کا حصہ نہیں بنتی، اس میں کشش جیسی قوت بھی نہیں آسکتی۔ روپیہ تو خوشبو کی مانند ہوتا ہے، جو اپنے اظہار کے لیے کسی کا تاج نہیں۔ محبت کھیل نہیں ہے مائرہ۔ اور اس وقت تو قلعی نہیں، جب انسان ہونے اور نہ ہونے کی صیغہ پر مصوب، انتظار کر رہا ہو کہ زندگی نئے دلی ہے یا پھر موت جیسی مایوسی میرا مقدر ہے۔"

"او جعفر۔! یہ تم کیسی مایوسی والی باتیں کر رہے۔ زندگی بھر پور رنگوں سے ہماری مختصر ہے۔ ہم چاہیں اور جیسا چاہیں اس سے رنگ سمیٹ سکتے ہیں۔ جب اعتبار اور مان ہوں زندگی کے سارے رنگ ہمارے وجود میں آؤ جھٹکتے ہیں۔" مائرہ نے خوش دلی سے کہا

"ہاں۔! بہت سارے لوگ اس تعلق کی آگہی کے لیے مدتوں انتظار رہتے ہیں۔" جعفر نے کہا

"کیا انہیں انتظار نہیں کرنا چاہئے؟" مائرہ اٹھلاتے ہوئے بولی

جعفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کر کے اسے اپنی بات کا یقین دلاتی ہے۔ اس پر جعفر خوش ہوتے ہوئے بولا

"اس پر امید باندھی جاسکتی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ تم اگر آنا چاہو تو۔"

"جعفر پلیز۔! مجھے ابھی بہت کام ہے۔ جیسے ہی فرصت ملی۔ میں تمہیں کال کروں گی۔، پھر جو بھی تم پلان کرو، میں حاضر ہوں

گی۔" مائرہ نے پیار سے کہا تو جعفر بولا

"اوکے۔! بڑی خوش۔! اب میں چلتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور باہر کی طرف چلا گیا۔ مائرہ اسے پھر پورا آنکھوں سے یوں دیکھتی رہی کہ جیسے وہ اسے بہت اچھا لگ رہا

ہو۔ انہی لمحات میں اسے اپنی ماں سے ہونے والی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ ان لمحات کو سوچتے لگی۔

اس وقت وہ اپنے بیڈروم میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔ لیپ ٹاپ اس کی گود میں تھا اور وہ اس میں ابھی ہوئی تھی۔ اتنے میں ہاؤسنگ

سکرے میں آ گئی۔ جس کا احساس مائرہ کو نہیں ہوا۔ وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تو وہ چونک گئی۔ جیسی ہاؤسنگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا

"مائرہ۔! بیٹی یہ کیا ہے۔ تم اپنے آفس کا کام بھی یہاں اٹھالاتی ہو۔ جب سے میں نے تم سے تمہاری شادی کا ذکر کیا ہے، تم کچھ

زیادہ ہی مصروف نہیں ہو گئی ہو؟"

"ماما۔! میں ایک نوز جمنل کے لئے کام کرتی ہوں۔ اور نوز ہر وقت آتی رہی ہیں۔ مجھے ان کو دیکھنا ہوتا ہے۔ اب زیادہ ذمہ

داری ہے۔ مجھ پر۔" مائرہ نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا

"اب ایسا بھی نہیں ہے کہ صرف مائرہ ہی پورا نوز جمنل چلا رہی ہے۔ وہ نہیں ہوگی تو جمنل بند ہو جائے گا۔ بیٹی۔! کام کے وقت

کام اور آرام کے وقت آرام کرتے ہیں۔ خیر۔ اتم نے مجھے کچھ بتانا تھا۔۔۔ پہلے یہ لیپ ٹاپ تو رکھنا ایک طرف۔۔۔

مارہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر لیپ ٹاپ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی

”لیس ماما۔ ارکھ دیا۔ اور میں نے کیا بتانا تھا آپ کو۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”مارہ۔ اتمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تم سے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی اور تم نے سوچنے کے لیے مجھ سے چند دن مانگے

تھے۔ میں اب تک تمہارے جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔“ بانو بیگم نے اسے یاد دلانا چاہا تو وہ بولی

”اواچھا۔ اسوری ماما۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔“

”تو پھر کیا کہتی ہو تم؟“ بانو بیگم نے پوچھا تو مارہ نے سنجیدگی سے کہا

”ماما۔ میں نے اچھی طرح سوچا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ابھی میں نے شادی نہیں کرنی۔ کم از کم دو سال تک

نہیں۔ پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

”سنو مارہ۔ اتم اکلوتی ہو اور میں تمہارے سنے اچھا می سوچوں گی۔ ایسے رشتے نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ جنہیں تم ذرا بھی

امیت نہیں دے رہی ہو۔“ بانو بیگم نے اسے احساس دلایا

”نہیں ماما۔! میں ان لوگوں میں کوئی خامی تو نہیں نکال رہی ہوں۔ پسند اور ناپسند کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے انہیں امیت

دی ہے تو ان کے بارے میں سوچا۔ سچ پوچھیں ماما۔! میں ابھی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں ہوں۔“ مارہ نے الجھتے ہوئے کہا

”شادی کے لئے بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ یہ وقت نکل جائے تو پھر بہت مشکل ہوتی ہے۔“ بانو بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”ماما۔! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے بے بسی سے کہا

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ مگر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ وہی میں جانتا چاہتی ہوں کہ آخر تمہارے دماغ میں کیا

چل رہا ہے۔“ بانو بیگم نے پوچھا

”میں نے کہا ہے ماما۔! ایسا ویسا کچھ نہیں ہے۔ ہو گا وہی، جو آپ چاہیں گی۔ آپ اطمینان رکھیں پیاز۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔

میرے دل میں جو کچھ ہوا۔۔۔ وہ میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔ کیونکہ آپ دنیا کی سب سے سویت ماما ہیں۔“ مارہ نے اس کے گلے میں

باغیں ڈالتے ہوئے کہا

”بیٹی۔! میں چاہوں تو تمہیں کہیں نہ جانے دوں۔ لیکن بیٹی کو بیاہنا ہی چاہتا ہے۔ ہمیں کسی امتحان میں مت ڈالنا۔ میں تمہارے

فیصلے کا انتظار کروں گی۔“ بانو بیگم نے کہا تو وہ بولی

”آپ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں۔ میں نے جب کہہ دیا ہے تو ابھی کچھ عرصہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں پیاز۔ پھر جو آپ

کہیں گی۔ میں وہی کروں گی۔“

”میں تمہیں یونہی خوش دیکھنا چاہتا ہوں مازہ، تم یونہی ہنسی مسکراتی رہو۔“ جعفر نے اس کی طرف دیکھ کر پیار سے کہا تو مازہ

شرارت بھرے انداز میں بولی

”اب چلیں، واپس جاتے ہوئے تمہارے اس محبت والے ٹاپک پر باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔“ مازہ نے کہا تو دونوں

ایک دم سے فہد لگا کر ہنس دیئے۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر نکل دیئے۔



روشن دن کی صبح تھی۔ سلسلی ابھی تک اپنے جگن میں کام کر رہی تھی کہ دروازہ بجا۔ سلسلی دروازہ کھولنے کے لیے گئی تو سامنے فہد تھا۔

وہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ دروازہ لگا کر دالان میں آئی جہاں وہ بیٹھ چکا تھا۔ سلسلی نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”کیا آج آپ پھر نو رپور چار ہے ہیں؟“

”یہ تو اب روز کا آنا جانا ہے۔ چارے عمر حیات والی زمین والے معاملے میں کئی لوگوں سے ملنا پڑا اور کاغذی کارروائی میں بڑا

وقت لگ رہا ہے۔“

”تو کیا سارا کام ختم نہیں ہو گیا۔ اب مزید کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے پوچھا

”نہیں۔ ابھی اتنی جلدی کہاں۔ زمین تو میرے نام ہو گئی ہے اور جو گھر ہے نا، وہ میں نے تمہارے نام کیا ہے۔ وہ کاغذات اس

فائل میں ہے۔ کچھ دستخط کرنے ہیں۔ وہ کر دو۔“ فہد نے فائل اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا تو سلسلی نے حیرت سے پوچھا

”گھر۔۔۔ میرے نام۔۔۔ وہ کیوں؟“

”وہاں تم نے ایک ادارہ بنانا ہے۔ ایک انسٹیٹیوٹ۔۔۔ جہاں تم اپنی ان خواہشوں کی تکمیل کر سکو۔ جو تمہارے دل میں

ہیں۔ یاد ہے۔۔۔ میں نے تمہیں کہا تھا۔ تم اڑان بھرنے کا حوصلہ کرو۔ طاقت میں دوں گا۔“ فہد نے سکون سے کہا تو سلسلی بولی

”مجھے یاد ہے فہد۔ اور میں نے حوصلہ کر لیا ہے۔ اب کیا ہوتا ہے۔ مجھے یہ سوچنے کی بھی پروا نہیں ہے۔“

”زندگی ہمیں بہت کچھ دے گی سلسلی۔ اب ہمیں اپنے حصے کی خوشیاں اکٹھی کرنی ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہو گا جب ہم زندگی کے اس

سفر میں ایک ساتھ چلتے رہیں گے۔“ فہد نے کہا تو سلسلی نے بات کو دیکھتے ہوئے سر ہلادیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ شرارتی نہیں تھی۔ اس کے

چہرے پر زعمی سے بھرپور ایک عزم چمک رہا تھا۔ سلسلی نے فائل سیدھی کرتے ہوئے کہا

”نا نہیں دستخط کر دیتی ہوں۔“

فہد نے اسے قلم تھمایا۔ اس نے قلم پکڑ کر جہاں فہد نے کہا وہاں دستخط کر دیئے۔ فہد فائل سمیٹ کر اٹھنے لگا۔

”آپ بیٹھیں، میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ سلسلی نے کہا

”نہیں ابھی مجھے جانا ہے، ہار گاڑی میں سراج بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ سلسلی

دروازے تک گئی۔ سراج گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فہد گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ سلمیٰ اسی کے خیالوں سے لپٹی واپس بچن میں آ کر کام کرنے لگی۔

قسمت مگر کیٹکیوں سے نکل کر فہد اور سراج گاڑی میں سڑک پر آ گئے۔ ابھی انہوں نے تھوڑا سا ہی سفر کیا تھا کہ انہیں سڑک کے درمیان ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ وہ لمحہ قریب آتے گئے، لیکن کسی نے گاڑی نہ ہٹائی۔ انہیں بہر حال اپنی گاڑی روکنا پڑی۔ تبھی سامنے کھڑی کار میں سے ماکھا نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بٹل تھا۔ وہ نظر اٹا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے آ کر بٹل کی نال فہد کے ماتھے پر لگاتے ہوئے کہا

”فہد! تیری زندگی اور موت کے درمیان ایک لمحہ ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تجھے موت کی نیند سنا سکتا ہوں۔ یہی کہا تھا نام نے؟“ ماکھے نے اسے یاد دلایا تو فہد بولا

”ماکھے! ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میرے مالک تجھے حکم دیتے ہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے تو میرے راستے میں نا آ یا کرو۔“

”تو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر پاگل ہو گیا ہے۔ یا حواس کھو بیٹھا ہے۔ میں تیری موت ہوں موت۔“ ماکھے نے کہا تو فہد نے کہا

”تو مجھ دیر کس بات کی ہے۔ چلا گولی۔“

اس کے ساتھ ہی وہ ایک دم سے کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ماکھا لڑھک گیا۔ فہد نے اپنا بٹل اس پر تان لیا۔ سراج نے دوسری طرف سے نکل کر اس کے ساتھیوں پر گن تان لی۔

”بول، اب کس کی موت ہے، بول؟“ فہد نے پوچھا

”یار آج اس کا کام تو کرای دیتے ہیں۔“ سراج نے کہا

”اپنا بٹل یہاں پھینک۔ ادھماگ جا یہاں سے۔ اور ہاں اپنے مالکوں سے کہنا۔ ہمت ہے تو خود میرا سامنا کریں، کبیر سے کہنا مرد بن مرد۔“

ماکھا بٹل پھینک کر اٹھا اور چل دیا۔ اس کے ساتھی گاڑی میں بیٹھے تو وہ بھی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ فہد اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی کار میں بیٹھ کر چل دیا۔



چھپا کا اپنے گھر کے صحن میں چار پائی پر بیٹھا، اپنے مرنے کو یادام کھلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہاتھیں کر رہا تھا۔

”دیکھ شہزادے، تیرا مقابلہ جب ہوتا ہے تب ہونا ہے۔ تو نے اس وقت جیتنا ہے یا ہار جانا ہے۔ مجھے عزت دینی ہے یا بے عزتی کروا دینی ہے۔ وہ تو جب ہوگا تب دیکھ جائے گا۔ پر تو اب میری بے عزتی کیوں کروا رہا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر مرغابول اٹھا جیسے اسے چھانکے کی بات کی سمجھ آ رہی تھی۔ اسی لئے چھا کا بولا،

”نہیں میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھا ہے۔ اب تیری شکایتیں بھی آنا شروع ہو گئی ہیں۔ تیرا لوگوں کے گھر میں بھلا کیا کام۔ تجھے ادھر کھانے کو نہیں ملتا کیا۔ تجھے با دام کھلاتا ہوں، میوے کھلاتا ہوں۔“

اس کی ان باتوں کے دوران چاچا سوہنا گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہ بہت مر جھایا ہوا تھا۔ پریشان حال، بال بکھرے ہوئے۔ وہ آکر اس کے پاس گھن میں کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا

”یار یہ تیرے گلزار کا مقابلہ کب ہوتا ہے۔“

وہ بولا تو اس کے لہجے میں یاسیست بھری ہوئی تھی اس پر چھا کا جذباتی ہو کر بولا

”جب دارا، تمہی، مجھے مقابلے کے لیے لٹکارے گا۔ ہر سال اس کا گلزار جیت جاتا ہے۔ اس سال نہیں جیتے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے تو اسے تیار کر۔ اس کے کھانے پینے کے پیسے مجھ سے لے لیا کر۔“ چاچے سوہنے نے کہا تو چھا کے نے چونک کر

اپنے باپ کو دیکھا پھر حیرت سے بولا

”اب، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ بجائے طے میسے دینے کے ڈانٹنے کے، مالقا تو رقم خرچ کر رہا ہے۔ خیر تو ہے نا، تو میرا لبا ہی ہے نا۔“

”پتر چھا کے، یہ زندگی بڑی عارضی شے ہے۔ ایک طرف تو یہ کھیل کھاتا ہے نا۔ تو دوسری طرف دکھوں کا گھر ہے یار۔ تو میری

ایک بات مان لے پتر۔“ چاچا سوہنا بڑے دکھ سے بولا

”ابا، تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ بول، بات کہا ہے۔“ چھا کے نے تیزی سے پوچھا

”دیکھ پتر۔ تیرے سوا میرا ہے کون اس دنیا میں۔ تو ایسے کر۔ فہد کا ساتھ چھوڑ دے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا، آج پھر

سمجھا رہا ہوں اس بے چارے امین کا حال دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے یار۔“ چاچے سوہنے کی زبان پر آ کر وہ خوف آئی گیا۔

”اب، تیرے پتر چھا کے کی اگر اس علاقے میں دس دیکھ ہے نا تو وہ ایویں ہی نہیں ہے۔ میرے دل میں نہ جانے کب سے چوہدریوں

کے خلاف نفرت ہے۔ میں غریب نہ نا، ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اب فہد یہ کر سکتا تو میں اس کا ساتھ کیوں نہ دوں۔“ چھا کا بولا

”پر تمہیں ان کے خلاف کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے۔“ چاچے سوہنے نے پوچھا

”ابا، ابھی تو نے کہا ہے نا امین کے انجام پر تیرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ تو کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ ہم انسان ہیں

ابا۔ میرا دل بھی ایسی ہی روتا ہے۔ کس نے ان چوہدریوں کو ظلم کرنے کا حق دیا ہے۔ بتا مجھے کس نے حق دیا ہے، میرے اللہ نے تو حق

نہیں دیا انہیں۔“ چھا کا انتہائی غصے میں بولا

”فہد نے تو اپنے بچپن کا انتقام لیتا ہے، مگر تو؟“ چاچے سوہنے نے حیرت سے پوچھا تو چھا کا نفرت سے بولا

”رب نے اسے جرات دی کہ وہ ان ظالموں کے سامنے آکھڑا ہوا ہے ابا۔ آج تو اور میں کیا ہیں، وہی کچی کے کچی۔ کسی کا شادی

وہ آگیا یا کوئی خوشی تھی ہوگئی تو کچھ مل گیا۔۔۔ کیا اچھی زندگی گزارنے کا حق کسی کی کوئی نہیں۔۔۔ گاؤں کے سکول پر تھلا لگوا کر یہاں کے بچوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دئے۔۔۔ بتا! میں یہ گلہ کس سے کروں تجھ غریب لہانے سے۔۔۔ یا ان ظالم چوہدریوں سے۔۔۔ میری طرح نجانے کتنے کیوں کے بچوں پر تعلیم اور اچھی زندگی کے دروازے بند کئے ہیں۔۔۔ کس نے؟۔۔۔ بس۔ ابھی میرا انتقام ہے۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے پتر، پروہ بڑے طاقت ور لوگ ہیں۔“ چاچے نے کہا تو چھا کا بولا

”جتنے مرضی طاقت ور ہوں۔ فہدا اگر ان کے مقابلے پر آن کھڑا ہوا ہے تو میرا بھی حق بنتا ہے کہ اس کا ساتھ دوں۔ یہ زندگی تو آنی جانی ہے۔ اور پھر ہماری زندگی ہے بھی کیا۔ چوہدری ہم پر اپنے کتے چھوڑ دیں تو کیا کر لیں گے ہم۔ میں فہدا کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا، اب ہی تو پتہ چلنا ہے میری دس کچھ کا۔“

چاچا سوہنا اس کی بات سن کر چند لمحوں کے لئے کھڑا سوچتا رہا پھر بڑے ہی دھمکی لہجے میں بولا

”جیسے تیری مرضی پتر، زندگی تیری ہے، تو جیسے گزار۔ ہم نے تو گزار لی۔“

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چلا گیا۔ تبھی مرغا اونچی آواز میں بولا تو چھا کے نے جھڑک کر کہا

”اڈے بھل چپ کر، یہ مت سمجھ کہ میں جذباتی ہو کر تیرے آلا ہے بھول جاؤں گا۔ اب اگر۔۔۔“

وہ بات پوری نہیں کر پایا کہ مرغا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ گیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رو گیا۔



شام بادل رہی تھی جب سہلی اپنے مکان میں اکیلی بیٹھی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کی ساری سوچوں کا محور فہدی تھا۔ وہ سارا دن اسی کے بارے سوچتی رہی تھی۔ وہ جب اس کی زندگی میں نہیں تھا تو کیسا تھا، ایک اچڑ، دیران اور خوف بھری زندگی، اب جب کہ وہ ان کی زندگی میں تھا تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ امیدیں، خواہشیں اور خواب پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ ایسے میں دروازے کے باہر کارر کتنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ فہدا اندر آ گیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ فہدے نے اس کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا

”یہ لو، چاچے عمر حیات والا گھر تیرے نام ہو گیا ہے۔ اور میری یہ خواہش ہے سہلی، اگر میں نہ بھی رہوں تو پھر بھی تیرے حصے کی خوشیاں تجھے دے جاؤں۔“

”مجھے ایسی خوشیوں کی کوئی خواہش نہیں ہے اور پھر میں پوچھتی ہوں۔ وہ کیسی خوشی ہوگی۔ جو آپ کے بغیر ہو۔“ اس نے فائل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو فہدا بولا

”وقت اور حالات کا بھروسہ کبھی بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں۔ محبت میں گزرے ہوئے لمحے خوشیوں کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سہلی! ابھی تو اس کی شروعات ہوئیں ہیں۔ منزل تک پہنچنے کے اس سفر میں نجانے کیا کچھ ہمارا خستہ ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ انھیں یادوں کے سہارے حاصل کی گئی خوشیاں ادھوری ہوتی ہیں۔ مجھے ایسی خوشیاں نہیں چاہیں۔“ سلسلی نے بے ہاکی سے کہا

”تم دعا کرنا۔ اور اساتھ ہمیشہ رہے۔ میں تو محض آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ کب، کہاں نبھانے کیا ہو؟ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے۔ یہ لو۔“ فہد نے اس کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا

”ہاں یہ تو ہے۔“ یہ کہہ کر رکی پھر اچانک خیال آتے ہی بولی، ”زمین نام تو ہوگئی، کیا آپ ذہنی طور پر تیار ہیں کہ زمین کا قبضہ لینے وقت کہیں چوہدری لوگ کچھ گڑبڑ نہ کریں۔“

”دیکھو! ابھی چارے عمر حیات کی بنی کی شادی ہے۔ یہ بخیر عافیت گزر جائے اور چاچا خود قبضے کے لیے کہے گا تو ہم قبضہ لیں گے۔ تب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ قبل از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فہد نے کہا تو سلسلی بولی

”ہاں۔ اب یہ ٹھیک ہے۔ انہیں بھی پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ آؤنا۔ بیٹھو۔ کھانا کھا کر جاییے گا۔“

”نہیں! اب اس میں نے فائل دینا تھی۔ اور یہ کاغذ اسے سنبھال کر رکھنا۔ بلکہ اسے ایک نظر دیکھ بھی لیتا۔ مجھے ابھی گھر جانا ہے کچھ کام ہے ابھی۔“ فہد نے بتایا

”کچھ دیر رک جاتے۔ ابھی اب آ جاتے۔“ سلسلی نے اصرار کرتے ہوئے کہا

”میں جلدی آگیا تو ادھری آؤں گا۔ تم دروازہ کالو۔ میں چلا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ سلسلی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

قسمت مگر پر رات اتر آئی تھی۔ فہد صحن میں چارپائی پر یوں بیٹھا ہوا تھا، جیسے پرانی یادوں میں کھویا ہوا ہو۔ اسے میں سراج کے ساتھ بابا نعمت علی آگئے تو وہ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے ساتھ بڑے تپاک سے ملا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے۔ تبھی سراج نے کہا

”فہد! یہ بابا نعمت علی ہے۔ چوہدری کے مزارع۔ تمہاری جو زمین چوہدری کے قبضے میں لی ہوئی ہے، یہ اسی پر کام کرتے ہیں۔ یہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔“

”جی بابا جی۔ اتنا کہیں، کیوں ملنا چاہتے تھے؟“ فہد نے پوچھا تو بابا نعمت علی نے کہا

”ہات یہ ہے پتر! جب تک تم نے عمر حیات کی زمین نہیں خریدی تھی، اس وقت تک ہم بھی سمجھتے رہے کہ تم واپس چلے جاؤ گے ... یہاں نہیں رہو گے۔ لیکن اب ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ تم یہاں ہی رہو گے۔“

”میں اب یہیں رہوں گا۔ میرا مرنا جینا اب یہاں کے لوگوں کے ساتھ ہے۔“ فہد نے مضبوط لہجے میں کہا تو بابا نعمت علی نے بڑے غم سے لہجے میں کہا

”میں اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ چوہدری اب تمہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس نے میرے بیٹے نذیر سے کہہ دیا ہے کہ تم

جب بھی زمین کا قبضہ لینے کی کوشش کرو تو تمہیں...." وہ کہتے ہوئے رک گیا تو دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں بعد فہد نے کہا

"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے باباجی۔ کیا آپ مجھے دھمکی دینے آئے ہو؟"

"ارے نہیں۔! پہلے پوری بات تو سن لو۔ کوئی دھمکی نہیں ہے۔" سراج نے جلدی سے کہا تو بابا نعمت علی بولا

"میں اس قتل و غارت سے بچنا چاہتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ یہ خونی کھیل کیلا جائے اور وہ بھی ہمارے ہاتھوں۔ نقصان ہمارا ہو گا یا

حیرا، چوہدریوں کا کیا جائے گا۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں، مکمل کرباات کریں۔" فہد نے پوچھا تو سراج نے کہا

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ چوہدری نے اس کے بیٹے نذیر کو آگے کر دیا ہے اور اس کے ساتھ چند غنڈے بد معاش لگا دیئے

ہیں۔ تاکہ تم کسی بھی طرح زمین کا قبضہ نہ لے سکو۔ نہ اپنی زمین کا اور سر حیات والی زمین کا یہ بابا نعمت علی نہیں چاہتا کہ کوئی خون خرابہ ہو۔ یہ

صلاح لے کر آئے ہیں۔"

"کیسی صلاح؟" فہد نے پوچھا

"ہم تمہاری زمین چھوڑ دیتے ہیں۔ تم اپنی زمین کا قبضہ لے لو۔ اس طرح ہم درمیان سے ہٹ جائیں گے۔" بابا نعمت علی نے

جلدی سے کہا

"کیا پھر چوہدری جلال تمہیں اپنا مزارع رکھے گا؟ تمہارے پاس زمین نہیں ہوگی تو پھر کیا کر دو گے۔ میرے پاس مزارع رہو

گے؟" فہد نے پوچھا

"وہ اللہ مالک ہے۔ ہم نے یہاں کسی کا مزارع نہیں رہنا۔ کسان کو زمین بہت۔ ہم نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ ہم صرف یہ

چاہتے ہیں کہ تم ہمیں کھڑی فصل کی رقم دے دو۔ تاکہ لوگوں کو اور چوہدری کو پتہ چل جائے کہ ہم نے تمہاری زمین چھوڑ دی ہے۔" بابا نعمت

علی نے کہا

"کھڑی فصل کی رقم تو میں دے دوں گا۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ کہہ رہے ہو؟" فہد نے شک آلود

لہجے میں پوچھا

"بات پورے گاؤں کے سامنے چو پال ہوگی۔ ہم لکھ کر رقم لیں گے۔ پٹواری ہوگا۔ یہ معاملہ چسپ کر نہیں کریں گے۔ میرے

ہتھ کو کوئی طعنہ نہیں دے گا کہ ہم نے ڈر کے مارے ایسا کیا ہے۔ رقم بھی گاؤں والے ملے کر دیں گے۔" بابا نعمت علی نے اصول کی بات کی تو

فہد نے کہا

"اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ خون خرابہ نہ ہو۔ یہاں گاؤں میں امن رہے۔ اگر تم لوگوں کو چوہدری

اپنی زمین سے بے دخل کر دیتا ہے تو میں دے دوں گا زمین، کیوں سراج؟“

”ہم نے یہاں رہنا ہی نہیں ہے ہتر، چوہدری ہمیں حزارع نہیں بد معاش بنانا چاہتا ہے۔“ بابا نعمت علی نے کہا تو سراج اپنا سر

ہلاتے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے وہ جیسے آپ کی مرضی، کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر یہ معاملہ حل ہو جاتا ہے تو اور کیا چاہئے۔“

”تو بس پھر۔ یہ سب تم دیکھ لو کیسے کرنا ہے اور کیا کرنا ہے۔“ فہد نے یہ سراج کی ذمہ داری لگا دی۔

”میں دیکھ لوں گا۔“ سراج فوراً مان گیا پھر بابا نعمت علی کی طرف دیکھ کر بولا، ”ٹھیک ہے بابا۔ بات طے ہو گئی۔ امن امان سے

سارا معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ ہم کل ہی بات کر لیتے ہیں۔ زیادہ وقت لیا تو شاید بات بگڑ جائے۔“

”ٹھیک ہے، اللہ تم لوگوں کو زندگی دے۔ نذر کے چھوٹے چھوٹے بیج ہیں۔ ان کے سر پر باپ کا سایہ سلامت رہے۔ اچھا

اب میں چلا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے بابا نعمت علی اٹھ گیا۔ دونوں نے اس سے ہاتھ ملائے تو بابا چلا گیا۔ وہ دونوں بیٹھ کر اسی موضوع پر بات کرنے لگے۔

اگلے ہی دن کی شام، قسمت نگر کے چوراہے میں بچا بخت کی صورت وہاں پر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک

بزرگ مانتھن بیٹھا ہوا تھا۔ اس بزرگ نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا

”مصلح سفائی اور امن کے ساتھ اگر کوئی معاملہ حل ہو جاتا ہے تو اس سے بڑھ کر اور بات کیا ہے۔ فہد ہتر نے اب گاؤں میں رہنے کا

فیصلہ کر لیا ہے اور اس نے اپنی زمین تو واپس لیتی ہے۔ نعمت علی نے یہ اچھا سوچا ہے کہ خون خرابے سے بچ جائے۔ ہاں تو فہد ہتر کیا کہتے ہو تم؟“

”بابا نعمت علی سمجھتا ہے کہ میری زمین کے لیے ان چوہدریوں نے آکر نہیں لڑنا۔ انہی حزارعوں کو اس نے لڑواتا ہے۔ خون انہی

حزاروں کا بہنا ہے۔ یہی ہوتا آرہا ہے اب تک؟ سب جانتے ہیں کہ چوہدریوں نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ اب اگر لڑنا پڑا تو

بابا نعمت علی یا پھر اس کے چتر کو لڑنا پڑے گا۔ نقصان کس کا ہوگا اور فائدے میں کون رہے گا۔ سب جانتے ہیں۔“ فہد نے کھل کر بات کی تو

بزرگ نے کہا

”نعمت علی! کیا یہ بات تم نہیں سمجھتے ہو کہ چوہدریوں کی اجازت کے بغیر تم زمین فہد کے حوالے کر رہے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ

ناراض نہیں ہوں گے؟“

”میں نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ بس اپنی فصل کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ پھر مجھے زمین کا لالچ رہے گا اور نہ

چوہدریوں کی ضرورت۔ میں نے زمین فہد کے حوالے نہیں کرتی۔ چھوڑ دینی ہے۔ اور اصل بات یہ کہ میں حزارع تو ہوں غنہ بین کر نہیں رہنا

چاہتا۔ میں نے نہیں لڑنا۔“ بابا نعمت علی نے کہا

”اگر تجھے فصل کی رقم مل جاتی ہے تو کیا تم زمین کا قبضہ چھوڑ دو گے۔“ بزرگ نے پوچھا

”جی چھوڑ دوں گا۔ یہاں رہتا ہوں تو چوہریوں کے لیے لڑنا پڑتا ہے فصل کی رقم مل گئی تو کہیں اور جا کر کام کر لوں گا۔ زمین میں چھوڑ دوں گا۔“ بابا نعمت علی نے کہا

”کیا خیال ہے فہد چر؟“ بزرگ نے پوچھا تو فہد بولا

”ہم آپ کے پاس اسی لئے تو بیٹھیں ہیں کہ آپ رقم کے معاملے میں جو فیصلہ کر دیں ہمیں قبول ہوگا۔ باقی رہا زمین کا قبضہ وہ میں لے لوں گا۔“

”چلو یہ اچھا ہوا، ہم ابھی مشورہ کر کے رقم طے کر لیتے ہیں۔“ بزرگ نے کہا اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک محتول رقم بتاتے ہوئے پوچھا

”فہد کیا یہ رقم تجھے قبول ہے جو ہم نے بتائی ہے؟“

”جی، آپ کا فیصلہ سرائگھوں پر۔ میں تین دن بعد اسی وقت عصر کی اذان سے پہلے رقم ادا کروں گا۔“

اتنے میں سراج نے کچھ رقم نکال کر بزرگ کو دیتے ہوئے کہا

”یہ لیں کچھ رقم ابھی لے لیں۔“

”بزرگ نے وہ رقم پکڑی اور نعمت علی کو دیتے ہوئے کہا

”مکن لو، اب فیصلہ ہو گیا ہے۔“

نعمت علی نے رقم مکن کر جیب میں ڈالی تو وہاں موجود لوگ اٹھ کھڑے۔ فہد کے لئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ قسمت بگڑ کے لوگ اب اس کا وجود تسلیم کرنے لگے تھے۔ انہیں یہ احساس ہو گیا تھا، کوئی تو ہے جو چوہریوں کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔

اسی شام فہد اپنے گھر میں بیڑ پر لیٹا ہوا یہ سوچوں میں گم تھا۔ ایسے میں سراج نے آکر دیکھا تو خشک گیا۔ سراج نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا

”فہد، ابہت پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔ کہیں فیصلہ۔“

”اوٹیں، بات فیصلے کی نہیں، اور یہ سچ ہے کہ میں پریشان ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے اتنی رقم ادا کرنا پڑے گی۔“ فہد نے کہا

”کیا تمہارے پاس اتنی رقم نہیں ہے؟“ سراج نے پوچھا تو فہد سوچتے ہوئے بولا

”ہے، اتنی رقم ہے میرے پاس۔ وہ میں نے اس لیے رکھی تھی کہ میں نے سسٹی کو ایک ادارہ بنا کر دیا تھا۔ وہ رقم میں نے اس پر خرچ کرنا تھی۔ اب ایک طرف سسٹی سے کیا ہوا وعدہ ہے اور دوسری طرف میری آبائی زمین۔ مجھے ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔“

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ اس نے پوچھا

”یہی تو سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ ایک طرف میری انا ہے اور دوسری جانب وعدہ۔ مجھے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب تو کرنا پڑے گا۔ اور پھر سراج۔ اتم یہ محسوس نہیں کرتے ہو کہ اتنی زیادہ رقم کیوں؟“ فہد نے کہا

”یہ تو بظاہریت کا فیصلہ تھا نا... جیسے تم نے قبول کیا۔ تم وہاں کچھ کہتے تو ممکن ہے یہ رقم کم بھی ہو سکتی تھی۔“ سراج بولا تو فہد نے سنجیدگی سے کہا

”نہیں۔ میں فیصلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ سوچ رہا ہوں کہ اتنی آسانی سے زمین کی داہیسی کہیں ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہے؟“

”ہاں! میں نے بھی اس پر سوچا تھا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ فیصلہ گاؤں کے بزرگوں میں ہوا ہے۔ اور وہ اس کے ضامن ہیں۔ اب اگر سارا گاؤں ہی ہمارا مخالف ہے۔ ہمارے خلاف سازش کرے پھر ہمارے لیے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔“ سراج نے سمجھایا لیکن اتنی آسانی سے؟ بابا نعمت علی اور اس کے بیٹے نذیر کا مان جانا۔ وہ چوہدری کی حکم حدود کی کیسے کر سکتے ہیں۔ میرا دل مارتا ہے۔ یہ ہمارے خلاف سازش نہیں۔“ فہد نے الجھتے ہوئے کہا

”بابا نعمت علی کا یہ فیصلہ اچانک نہیں۔ وہ بہت پہلے سے میرے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کرتا تھا۔ خیر۔ اتم کہو، اپنی انا کا انتخاب کرتے ہو یا اپنے وعدے کا۔“ سراج نے پوچھا

”تم کیا کہتے ہو؟“ فہد نے رائے چاہی

”دونوں۔ از میں بھی داہیسی لیں گے اور وعدہ بھی پورا کریں گے۔ ساری رقم کی ادائیگی میں کروں گا۔۔۔ تم اپنی رقم اپنے وعدے کے لیے بچا کر رکھو۔“ سراج نے حسی لہجے میں کہا

”سراج۔ ایہ تم؟“ وہ حیرت سے بولا

”کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ زبان دی ہے تو اب اس سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ وہ چاہے کئی کو بھی دی ہے۔ تو پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سراج نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”مجھے تمہاری دوستی پر مان ہے سراج۔ اب مجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ دیکھنا ہے۔ چوہدری کب وار کرتے ہیں۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سراج نے پوچھا

”کیا تمہیں اس کی امید ہے؟“

”ہر وقت، یہ ان کے لیے بہت بڑا زخم ہوگا۔“ فہد نے حسی انداز میں کہا تو پھر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔



شہر پر شام اتر آئی تھی۔ مارہ اپنے آفس میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ ابھی گھر جائے یا نہیں۔ اسے اپنی ماما کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کل بھی وہ اپنی ماما سے سہمنا نہ کرنے کے باعث اپنے گھر دیر سے گئی تھی لیکن اس کی ماما بالو نیگم ٹی وی لاناؤنج میں صوفے پر بیٹھی ٹی وی کی جانب متوجہ تھی۔ وہ اسی کی منتظر تھی۔ کیونکہ جیسے ہی مارہ نے آکر اپنا لپ ٹاپ اور دوسری چیزیں ایک جانب رکھیں تو بالو نیگم نے اس دوران ٹی وی کی آواز کم کر کے پوچھا

”جہیں چند دلوں سے کیا ہو گیا ہے، اتنی مصروف ہو کر اپنی ماما کے لئے بھی تھوڑا وقت نہیں نکال پارہی ہو۔“

تبھی مائرہ نے سعید کی سے کہا

”ہاں ماما، میں نے خود اپنے آپ کو مصروف کر لیا ہے۔“

”وہ کیوں۔ بات کیا ہے؟“ ہانو بیگم نے حیرت سے پوچھا تو مائرہ بولی

”بس ماما! اور کچھ کرنے کے لئے نہیں ہے نا تو میں نے خود کو اپنے کام میں زیادہ مصروف کر لیا ہے۔ اس میں کوئی پریشان

ہونے والی بات تو نہیں ہے۔“

”مائرہ! میرے بچے۔ تم لاکھ کوشش کرو۔ مگر مجھ سے اپنا جھوٹ نہیں چھپا پاؤ گی۔ مجھے بتاؤ۔ بات کیا ہے۔ تم کیوں افسردہ سی

رہنے لگی ہو۔“ ہانو بیگم نے پیار سے چکارتے ہوئے پوچھا تو مائرہ بولی

”کچھ نہیں ماما! ناظرہ بھی میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کام کروں۔ اور بس۔“

”میں کہتی ہوں بیٹی۔ اشادی کے لئے ہاں کر دو۔ ایک نئی زندگی کی شروعات کرو گی تو بہت زیادہ Change بھی آ جائے

گا۔“ ہانو بیگم نے سمجھایا

”آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھتی ہیں کہ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ اور میں اس میں فی الحال کوئی Change نہیں چاہ

رہی ہوں۔ ابھی میری ساری توجہ اپنے کام کی طرف ہے۔“ مائرہ نے کہا تو وہ بولیں

”کام تمہارا صرف ایک بہانہ ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں جب کہہ رہی کہ وہ سب کچھ میرے ساتھ شیئر کرو جو تمہارے

دماغ میں چل رہا ہے تو اس سے تمہارے لئے بہت ساری آسانیاں ہوں گی۔“

”ماما! زندگی میں آنے والے حالات کبھی کبھی ایسے دوراہے پر آتے ہیں کہ کسی بھی قسم کا کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں جاسکتا صرف

وقت کا انتظار کیا جاتا ہے۔ چاہے تو یہ وقت ہمارے دامن میں خوشیاں بھر دے یا پھر غم ہمارا مقدر بن جائے۔“ مائرہ نے ایک طویل سانس

لے کر کہا تو ہانو بیگم تڑپ کر بولیں

”اللہ نہ کرے بیٹی! غم تمہارا مقدر بنے۔ کیا میں جان سکتی ہوں کہ تم ایسے کسی وقت کی منتظر کیوں ہو؟“

”بتاؤں گی، ضرور بتاؤں گی آپ کو، میں فریش ہو کر آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ہانو بیگم اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ ماں تھی، سمجھ رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی دکھ تو

اس کی بیٹی کو اندر ہی اندر سے کھا رہا ہے۔ وہ اپنی ماما کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے سرشام گھر جانے کوں نہیں کر رہا تھا۔ اپنے آفس

سے نکلتے ہوئے جعفر کا خیال آیا تو اس نے کال کر کے پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اپنے گھر پر تھا۔ مائرہ نے اسے وچیں رکھنے کا کہا اور اس کے

پاس پہنچ گئی۔

جعفر نے پلیٹوں میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر میز پر رکھیں اور پھر خود بیٹھ گیا۔ اسنے میں مائرہ دو کپ چائے لڑے میں رکھے نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے وہ لڑے لاکر میز پر رکھی اور ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا ”دیکھو جعفر۔ اچائے جیسی بھی ہو، پی لینا۔ خیرے مت کرنا۔ میں نے اپنی طرف سے بہت اچھی چائے بنائی ہے۔“

”یہ جو تم اسٹیکس لڑی ہو۔ ان کے صدفے میں یہ بد ذائقہ چائے بھی پی لوں گا۔“ جعفر نے ہنستے ہوئے کہا تو مائرہ نے مصنوعی غصے میں کہا

”ایویں بد ذائقہ۔ ابھی چائے پی نہیں۔ ڈاکٹرنے ہارے پہلے ہی پتہ چل گیا۔ بدگمانی نہیں کرتے۔ بہت بری بات ہے یہ۔“

”میں۔ اور تمہارے ہارے میں بدگمانی۔۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا میڈم۔ تمہیں بھی پتہ ہے، میں نے زندگی میں چند خاص لوگوں ہی سے تعلق بنائے ہیں۔ تم ان میں سے خاص الخاص ہو۔ تمہارے ہارے میں بدگمانی۔ ناممکن۔“ جعفر نے کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو مائرہ بولی

”ہاں جعفر۔ انہوں کے ہارے میں بدگمانی کرنا بھی بے ایمانی ہوتی ہے۔ جسے ہم اپنا کہہ دیں تو پھر کیا پتا ہے بدگمانی کے لیے۔ اب اگر کوئی ساتھ نہ چلے۔ ہم سفر بن کر بھی راستہ میں چھوڑ جائے تو بندہ کیا کر سکتا ہے۔“

”مائرہ۔ آج میرے ساتھ ایک وعدہ کرو۔“ جعفر نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”کیسا وعدہ؟“ اس نے چہ کھتے ہوئے پوچھا

”دیکھو۔ اتم فہد کو نہیں بھرا سکتی، میں یہ ماننا ہوں۔ لیکن ہر وقت جی سوچتے رہنا، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم یہ کیوں نہیں مان لیتی کہ وہ تمہارا اہم سفر بھی بنائی نہیں تھا۔ تو پھر اس سے گلہ کیسا؟“ جعفر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”ہاں۔ اتم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن۔“ مائرہ نے کہنا چاہا تو جعفر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ اتم خود اس دائرے میں سے نکلتا نہیں چاہتی۔ میں یہ بھی ماننا ہوں کہ تمہیں اس سے محبت ہے، لیکن کیا مائرہ۔ محبت حاصل کر لینے ہی کا نام ہے؟ حاصل کر لیا ہی محبت ہے تو سوری میڈم۔ یہ خود غرضی ہے۔ سووے بازی ہے۔ بد پار ہے۔“

”تم آئیڈل باتیں کرتے ہو۔ میرے اندر بڑی محبت، جو مجھے فہد کو بھرنے ہی نہیں دیتی، یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کا انکار کیسے کرو گے؟“ مائرہ نے بے بسی سے کہا

”میں انکار کرنے کے لیے نہیں کہتا اور نہ ہی اس محبت کی حقیقت کو جھٹلاتا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اسی محبت کو اپنی قوت بناؤ۔ اسے اپنی کمزوری مت بناؤ۔ تمہاری محبت میں قوت ہوئی تو لوٹ آئے گا۔ ورنہ اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے۔“ جعفر نے اسے سکھایا

”شاید تم میری بات اب بھی نہیں سمجھو۔“ مائرہ نے کہا

”میں سمجھتا ہوں۔ ایک ایک بات سمجھتا ہوں مائرہ۔ اب یہاں بیٹھ کر کڑھتے رہنے سے، اسے یاد کر کے آہیں بھرنے سے کچھ نہیں

ہونے والا۔ تمہاری محبت تمہاری کمزوری بن جائے، کیا یہ تمہاری ذات کی توہین نہیں ہے مائرہ؟ اٹکھار محبت کے اور بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ خود کو مضبوط بناؤ۔“ جعفر نے کہا تو مائرہ سوچنے ہوئے انداز میں بولی

”مجھے ایسے ہی کرنا چاہیے۔ میں اسے کبھی گلہ نہیں دوں گی کہ وہ میرا ہمسفر نہیں بنا۔ لیکن میری محبت..... اس کے لیے ہمیشہ رہے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چونک کر جعفر کو دیکھا اور پھر بولی، ”تم کیا وعدہ چاہتے ہو؟“

”یہی جو تم کہہ رہی ہو۔ اپنے دس میں محبت رکھو، لیکن بات بات ہے بات اس کا اظہار نہ کرو۔ خود کو مظلوم نہ بناؤ۔ مضبوط بنو۔ فہر کو ذور رہ کر بھی احساس دلاؤ کہ تمہارے دل میں اس کے لیے کتنی محبت ہے۔ وہ تمہارے ہمسفر نہ بنا۔ اس پر وہ افسوس کرے۔ تم نہیں۔“

”ہاں، ایسا ہی ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں جعفر۔! آج سے نہیں بلکہ ابھی سے۔“

”ٹھیک ہے۔ یہی بہتر ہوگا۔“ جعفر نے کہا تو ان کے درمیان ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ تبھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا،

”تم بیٹھو۔! میں دوبارہ بنا کر لاتی ہوں۔“ مائرہ نے کہا اور کپ اٹھا کر پین کی طرف چلی گئی۔ تو جعفر کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے سکون سے صوفے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

ایسے ہی وقت حبیب الرحمن پر سکون سے انداز میں بیڈ پر نیم دراز اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ہانو بیگم آکر بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ گئی۔ حبیب الرحمن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ہاں بیگم صاحبہ۔! فرمائیں آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اب سکون سے کہو۔“

”دو ہی بات، جو میں آپ سے کبھی آرہی ہوں، مائرہ کی شادی۔ ایک دو دن میں وہ لوگ کینیڈا سے آجائیں گے۔ ظاہر ہے بات تو چھ گئی۔ انہیں کیا کہیں گے کہ باپ کے پاس فرصت نہیں اور بیٹی پروا نہیں کرتی۔“ ہانو بیگم نے جتنی سے کہا تو حبیب الرحمن سکون بولا

”بیگم۔! تم اتنی پریشان کیوں رہتی ہو۔ جب اس کی شادی کا وقت آیا تو میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ مجھے احساس ہے۔ میری بیٹی ہے وہ۔ اکلوتی بیٹی۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نے اس کی شادی کب اور کہاں کرنی ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔! اب شادی کا اور کیا وقت ہوگا۔ پھر ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ہماری دہلیز پر کھڑا ہے۔ ایسے چانس زندگی میں روز بروز نہیں آتے۔“ ہانو بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا

”تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ مائرہ شہر کے ایک بڑے بزنس مین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ مائرہ کی اپنی ایک شخصیت ہے جو میری ذات سے ہٹ کر اس نے خود بنائی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کروں گا۔ جو مائرہ کی اوٹ میں پڑے تک مجلس اور جائیداد پر نگاہ رکھے۔ اور مائرہ کی ذات سے آگاہ نہ ہو۔ کبھی تم بیگم۔“ حبیب الرحمن نے صاف انداز میں کہا تو ہانو بیگم بولی

”ہمارے رشتے دار تو ایسے نہیں ہیں کہ ان میں.....“

”نیکم۔! جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں مائرہ کے ہارے میں اچھی طرح جاتا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔ اور میں خود بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے الگ ہو۔ وہ ہر پل میری نگاہ میں ہے۔ میں نے اگر اسے اجازت دی ہے تو میں ہی اس کا نگہبان بھی ہوں۔“ حبیب الرحمن نے سمجھا یا تو بانو نیکم نے دھمکے لہجے کہا

”آپ نے یہ سب باتیں مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہیں؟“

”اس لیے کہ تم پہلے اتنی پریشان نہیں تھی۔ اور پھر نیکم میں اس کی شادی کر کے اس کی شخصیت، اس کی ذات کو نہیں چلنا چاہتا۔ میں چاہتا تو اسے بزنس میں لے آتا، لیکن مجھے اس کی پرواہ ہے۔ اس کی خوشیاں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔“ حبیب الرحمن نے کہا

”اب مجھے اس کی کوئی فکر نہیں۔ آپ جہاں بہتر سمجھیں۔۔۔ وہیں اس کی شادی کر دیں۔“ بانو نیکم نے مان لیا

”ہم دونوں کی مرضی سے زیادہ مائرہ کی خوشیاں ہمیں دیکھنی ہیں۔ ہماری ایک ہی اولاد ہے کیا ہم اسے بھی خوشیاں نہیں دے سکیں گے۔ اپنی مرضی مسلط کریں گے۔ نہیں، ہم اسے زندگی کی ساری خوشیاں دینے کی کوشش کریں گے۔“ حبیب الرحمن کے لہجے میں بیٹی کا بھار گھلا ہوا تھا۔

”کیوں نہیں۔! ہم تو اپنی گفٹار چکے۔ اب اس کی زندگی ہے۔“ بانو نیکم نے کہا تو حبیب الرحمن بولا

”اور ہر والدین کی طرح میں بھی اس کی بہترین زندگی کا خواہاں ہوں۔ تم پریشان ہونا چھوڑ دو۔ وقت آنے پر سب کچھ ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ بند پر دروازہ ہو گیا۔ اس نے سائیڈ لیپ بچھا دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اب وہ سونا چاہتا ہے۔ بانو نیکم بھی سو جانے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کے ذہن سے بوجھ اتر گیا تھا۔



صبح کی روشنی میں چوہدری جلال کا ریڈور میں بیٹھا اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ رانی اس کے لئے چائے لے کر آئی تو اس نے دیکھ کر چائے رکھ دینے کا اشارہ کیا۔ پھر اخبار پر لگا ہیں جاتے ہوئے بولا

”نیکم سے کہو۔ مجھے آج شہر جانا ہے۔“

”جی، ابھی کہہ دیتی ہوں۔“ رانی نے مودب انداز میں کہا اور فوراً پٹ گئی۔ اس کے جاتے ہی منشی فضل دین آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسی چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”اوئے! ابھی منشی کیسے آتا ہوا اس وقت۔ خیر تو ہے نا۔“

”ابھی تو خیر ہی ہے۔“ منشی فضل دین نے کہا تو چوہدری جلال نے چوہکتے ہوئے پوچھا

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

تب منشی فضل دین نے چوراہے میں ہونے والی ساری بات بتا دی۔ چوہدری جلال کا چہرہ خسمے میں بھر گیا۔ وہ اپنے خسمے پر قابو

”میں نے غریب سے جو کہا تھا وہ اسی کا الٹ کرنے جا رہا ہے۔ وہ لوگ ڈر گئے ہیں یا انہیں ہم پر یقین نہیں رہا۔“

”اب ان کے دل کی بات کا تو نہیں پتہ، وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن اس طرح فہد تو آرام سے اپنی زمین لے جائے گا۔ پھر اس کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔“ منشی فضل دین نے کہا

”ہاں۔! بات اب گاؤں کے لوگوں میں آگئی ہے۔ نعمت علی کو روکا تو پورا گاؤں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا، پھر سوچنا ہوا بولا، ”نہیں اب فہد کے بارے ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔ سہیں اسے روکنا ہوگا۔“

”جی چوہدری صاحب۔! میں نے نمبردار کو پیغام بھجوایا ہے کسی قیمت میں بھی زمین فہد کو نہ ملے۔“ منشی نے کہا تو چوہدری جلال نے تیزی سے کہا

”نمبردار کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ پھر بھی اگر وہ کوئی کوشش کرے تو کرنے دے۔ اب میں دیکھتا ہوں۔ تو جا اور اس معاملے میں کوئی بھی بات ہو، وہ مجھے بتاتا۔“

”جی چوہدری صاحب۔! جیسے آپ کا حکم۔“ منشی فضل دین نے کہا اور پلٹ گیا۔ چوہدری نے قریب پڑا فون کا رسیور اٹھا لیا پھر نمبر پش کرنے کے بعد چند لمبے انتظار کرتا ہے اور رابطہ ہو جانے پر بولا

”ہاں۔! میں چوہدری جلال بات کر رہا ہوں۔ تمہا نیدار۔ غور سے سن، جو میں نے تمہیں کہا تھا۔ وہ کر دے۔ اب فہد کو زیادہ وقت نہیں دینا۔“

فون پر تمہا نیدار کو ہدایت دے کر اس نے رسیور رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر غصہ اب بھی موجود تھا۔ منشی فضل دین وہاں سے نکلا تو سید حانفت علی کے گھر کی طرف چلا گیا۔ نعمت علی اپنے گھر سے نکل کر گلی میں سے آ رہا تھا کہ سامنے سے منشی اسے مل گیا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو منشی نے کہا

”اچھا ہوا نعمت علی تم مجھے مل گئے ہو۔ میں تمہاری طرف ہی جا رہا تھا۔“

”خیر تو ہے نا؟ کس لیے جا رہے تھے۔ مجھے بلوایا ہوتا۔“ نعمت علی نے کہا

”اوئے نعمت علی۔! یہ تو نے کیا بے وقوفی کی ہے۔ فہد کو اس کی زمین دے دی اور وہ بھی چوہدری صاحب سے پوچھے بنا۔ تمہیں پتہ نہیں ہے چوہدری صاحب اس پر کتنا ناراض ہو سکتے ہیں۔ تم نے نہ پوچھا۔ نہ کسی سے بات کی۔ مجھ سے ہی کوئی صلاح مشورہ کر لیتے۔“ منشی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا

”دیکھ منشی۔! اگر ایسی بے وقوفی کر کے میں خون خرابے سے بچ سکتا ہوں تو یہ بے وقوفی ہی سہی۔ میں نے اور میرے بچوں نے اس زمین پر جو محنت کی ہے، میں نے تو وہ معاوضہ مانگا ہے۔ اب اس معاملے میں مجھے کسی سے صلاح مشورے کی ضرورت نہیں۔“ نعمت علی سکون سے بولا تو منشی نے غصے میں کہا

”عجیب بات کرتا ہے تو۔ یہ زمین تجھے چوہدری نے دی ہے۔ تو ان کا حراز ہے، نہ کہ فہد کا؟“

”میں مانتا ہوں کہ زمین چوہدریوں نے دی لیکن کافدوں میں نام تو میرا ہی چلتا ہے۔ تھانے کچھری میں تو نام میرا ہی بولے گا۔ اور پھر چوہدریوں نے ہمیں کیا دیا ہے۔ تسلی، دوا سے، وہ پہلے کون سا ہماری پوری محنت ہمارے پلے ڈالتے آئے ہیں۔ جو چوہدری کہتا ہے، اگر ایسا دیا کچھ ہو گیا تو بوجھ ہم پر ہی آتا ہے۔“

”یہ تو کس طرح کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔ چوہدری صاحب نے تم پر کتنا احسان کیا تمہیں رہنے کے لیے گھر اور بھیتی کے لیے زمین دی۔ اب اس کے احسانوں کا بدلہ تو ایسے دے رہا ہے۔“ فشی حریہ لہجے میں بولا تو نعمت علی نے انتہائی سختی سے کہا

”احسانوں کے بدلے میں وہ میرے ہی بچوں کا خون مانگ رہا ہے۔ وہ میرے بچوں کو فہد سے لڑانا چاہتے ہیں۔ نقصان تو ہمارا ہی ہو گا۔ چوہدری تو اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔ تھانے کچھری بھگتا پڑا تو ہمیں ہی بھگتنا ہو گا۔“

”تو کسی اور کی زبان بول رہا ہے نعمت علی۔ اچھا ایسے کر۔ اچھی رقم تو فہد سے لے رہا ہے۔ اتنی میں دیتا ہوں۔ زمین میرے حوالے کر دے۔ پھر میں جانوں اور فہد۔ چوہدری صاحب بھی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ فشی نے کہا تو نعمت علی حتیٰ لہجے میں بولا

”میں اب بچائیت میں زبان دے چکا ہوں۔ اب مجھے کوئی دو گنا معاوضہ بھی دے تو میں زمین فہدیٰ کو دوں گا۔ ہاں اگر وہ رقم کی ادائیگی نہ کرے گا تو پھر تمہیں دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔“

”میں ایسی کسی بچائیت کو نہیں مانتا، جس میں میرا اپنا کوئی فیصلہ نہ ہو۔ اب فہد زمین لے یا نہ لے۔ رقم کی ادائیگی کرے یا نہ کرے۔ لیکن تو اپنی سزا سوچ لے۔ یہ چوہدریوں سے غداری ہے فہداری۔ یہ جس کی تو زبان بول رہا ہے نا، وہ بھی تجھے نہیں بچا پائے گا۔“ فشی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا

”ڈھمکیاں نہ دے فشی۔! میں نے جو فیصلہ کرنا تھا وہ کر لیا۔ اب جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔“ نعمت علی نے لا پرواہی سے کہا تو فشی بولا:

”تمہارا یہ چاؤ بھی پورا ہو جائے گا نعمت علی۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دابھس مڑ گیا۔ نعمت علی پریشان سا دھیں کھڑا رہ کر سوچنے لگا۔ پھر سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اسی دن دوپہر کے بعد سراج چر رہا ہے میں گیا۔ اس نے حنیف دوکاندار کے پاس جا کر پوچھا

”یار یہ چھاکا نہیں آیا ادھر؟“

”ابھی تک تو نہیں آیا۔ اور نہ ہی چاھا سوتا آیا ہے۔ اللہ خیر کرے، پتہ نہیں کدھر ہیں۔“ حنیف دوکاندار نے بتایا۔ تو سراج نے کہا

”یار وہ صبح سے نہیں آیا۔ وہ ادھر آئے نا تو اسے کہنا کہ فوراً ڈیرے پر آ جائے۔ ویسے میں اس کا گھر سے پتہ کرتے ہوئے ڈیرے پر جاؤں گا۔“

لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ چودا رہے میں پولیس وین آ کر رکی۔ وہ دونوں ہی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وین میں سے

تھانیدار باہر نکلا۔ اس نے دوکان پر کھڑے سراج کی طرف دیکھا اور اس طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے سراج کے قریب جا کر طویہ لہجے میں کہا

”ہاں بھی سراج، کدھر گیا وہ تیرا فہد۔ دوبارہ اس نے تھانے کا پکڑ نہیں لگایا۔ کوئی نیا قانون ہی سکھا جاتا۔“

”مجھے نہیں پتا اور نہ مجھے تمہاری بات کی سمجھا آ رہی ہے۔“ سراج نے تجنی سے کہا اور یہ کہتے ہوئے وہ جانے لگا تو تھانیدار نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

”بات سن اؤ سراج، جسے تو دوست بنائے پھرتا ہے، وہ تیرا دوست نہیں اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ حتیٰ اور تجنی بات کہہ رہا ہوں۔“

”تو اور تیری حتیٰ تجنی بات۔ راستہ چھوڑ میرا۔“ سراج نے تجنی سے کہا تو تھانیدار ہنس کر بولا

”دیکھ، تیرے بھائی امین کو اسی فہد نے قتل کروایا ہے۔ اب تک میں نے اس پر ہاتھ اس لئے نہیں ڈالا کہ مجھے کوئی پکا ثبوت نہیں ملا۔ تحقیق کر رہا ہوں۔ جس دن بھی مجھے پکا ثبوت مل گیا۔ گرفتار کر لوں گا۔ پھر تجھے محل سمجھ آئے گی۔“ اس نے کہا تو سراج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بڑے طویہ لہجے میں بولا

”دیکھ انپکڑ۔ تو جو مرضی کہہ اور تو جس کے اشارے پر یہ سب کہہ رہا ہے نا، میں وہ بھی جانتا ہوں۔ میں انصاف کے بے حدالیت جاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے بھائی کا خون کس نے کیا ہے۔“

”اؤ بے محول ہو گیا ہے تو، یہ وقت ثابت کرے گا سراج۔ میرے پاس ایسے ایسے ثبوت ہیں کہ فہد کو پھانسی سے نہیں بچا سکے گا۔ اب کسی ڈی ایس پی، ایس پی کا فون بھی اس کے کام نہیں آئے گا۔ بتا دینا اسے کہ کوئی دھڑی سٹارٹس تلاش کر لے ابھی سے، مگر وہ بھی اس کے کام نہیں آئے گی۔“ تھانیدار نے عقارت سے کہا

”اؤ بے انپکڑ، تو مجھے بتا۔ فہد کیوں میرے بھائی کا قتل کروائے گا۔ وہ تو اس کی مدد کر رہا تھا۔“ سراج نے تجنی سے کہا تو تھانیدار نے کہا

”اس لیے میری جان کہ اس کے پاس چوہدریوں کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ امین کا مدعا، چوہدری کیبر پر ڈال دے گا۔ مجھے پتا ہے وہ بڑی کوشش کر رہا ہے۔ مگر اس کی کوئی کوشش اس کے کام نہیں آنے والی۔ تو میرے ساتھ تعاون کر یا نہ کر، میں نے اسے گرفتار کرنا ہے۔ بس شام تک ٹھہر جا۔“

”تو نے جو کرنا ہے کر، میں چلا ہوں۔“

سراج نے کہا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ تھانیدار نے طویہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اپنی دین میں بیٹھ کر

چلا گیا۔

ٹھہری ہوئی شام میں سکون گھلا ہوا تھا۔ ایسے میں سسلی اور فہد دونوں محن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہی باتوں کے دوران

سسلی نے پوچھا

”آپ مجھے ایک بات بتائیں۔“

”پوچھو۔“ فہد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی

”میں اکثر سوچتی ہوں کہ آپ نے زمین بھی خرید لی، اور یہاں پر رہنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ لیکن چودہویں کے ساتھ جو آپ کی مخالفت ہے۔ اس سے ہم جہن سکون سے تو نہیں رہ سکیں گے۔ کوئی نہ کوئی معاملہ تو چلتا رہے گا۔ اب وہ تو اپنی زمینیں چھوڑ کر جانے سے تو رہے۔“

”تم نے ایسے کیوں سوچا کہ ہمیشہ ہی چودہویں کے ساتھ مخالفت رہے گی۔ ہو سکتا ہے کبھی ہماری ان کی صلح ہو جائے۔ وہ ہماری مخالفت نہ کریں۔“ فہد نے کہا

”یہ جو دن بدن بات بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سے تو نہیں لگتا کہ کبھی صلح ہوگی اور وہ ہماری مخالفت نہیں کریں گے۔ صلح تو تب ہوگی نا۔ جب کوئی ایک ہار مانے گا۔“ سسلی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”ہار مان جانے سے صلح نہیں ہوتی۔ چودہویں سیاست دان بھی تو ہے۔ وہ جب بھی اپنے آپ کو کمزور پائے گا۔ صلح کرے گا۔ مگر تم ایسے کیوں سوچتی ہو؟ تم وہ سوچا کرو جو تمہیں کہا گیا ہے۔“ فہد نے کہا

”دیا تو تب سوچا جاسکتا ہے نا، جب سکون ہو اور آپ جس طرح کے انٹرویو کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے لیے سرمایہ بھی چاہیے۔ اور۔“ سسلی نے تشویش سے کہا

”یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں سسلی۔ میں یہ سب کروں گا۔ تم پریشان مت رہا کرو۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ ایک تہی میرا حوصلہ ہو۔“ فہد نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا

”مجھے حوصلہ کون دے گا۔ آپ نا، جب آپ کو پریشان دیکھتی ہوں تو دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ آپ کو بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اب میری ساری امیدیں آپ سے ہیں۔“ سسلی نے گھال چہرے کے ساتھ کہا

”کون کس کی امید ہے اور وہ اس پر کتنا پورا اترتا ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا نا۔ اب ہم دونوں ایک راستے پر نکل پڑے ہیں تو رستے میں کئی طرح کی الجھنیں، خطرات اور مصیبتیں آئیں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا حوصلہ ہوں گے نا تو یہ راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔ تم اوٹ پٹائی مت سوچا کرو۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

”میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سوائے گھر کا کام کرنے کے۔ اب میں سوچوں بھی نہیں نا“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی ”سوچو۔ لیکن مثبت سوچو، بہت اچھا سوچو۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر تم بہت معروف ہو جاؤ گی۔ تمہیں یہ گھر کے کاموں

کی فرصت بھی نہیں ملے گی۔ اور یہاں تک کہ میرے بارے میں بھی سوچ سکوگی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو سسلی بولی

”اب ایسا کوئی وقت نہیں آئے گا کہ میں آپ کو بھول سکوں۔ یہ آپ جانتے ہیں۔“

”اچھا!۔“ فہد نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ سسلی شرمائی، پھر اٹھتے ہوئے بولی

”اچھا میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی اور فہد مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا۔

چائے پی کر فہد اپنے گھر آ گیا۔ چھانگ محن میں بیٹھا ہوا تھا۔ فہد نے اس کے پاس جا کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”یہ سراج نہیں آیا ابھی تک، شام ہونے کو آ رہی ہے۔ آج وہ ملائی نہیں۔“

”وہ نور پور گیا ہے یا۔ ارقم لینے۔ مجھے بتا کر گیا تھا۔ اللہ خیر رکھے گا۔! وہ آ جائے گا۔ رقم کوئی اتنی زیادہ نہیں ہے۔ تو پریشان نہ

ہو۔“ چھانگ نے کہا

لفظ اس کے منہ سے نکلتے تھے کہ چھانگ دھڑ دھڑ ہنپتے لگا، اس کے ساتھ کسی نے زور سے پکارا۔

”فہد باہر آؤ۔!“

”یہ کون ہو سکتا ہے؟ چھانگ! جلدی سے گن لے کر آؤ۔“ فہد نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو چھانگ تیزی سے بولا

”دیکھ تو لیں۔ لیکن نہیں پہلے میں گن لاتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے چھانگ اٹھا۔ اٹھنے میں فہد دروازے تک چلا گیا۔ اس نے پچھلے کھولا تو سامنے پولیس وین کھڑی تھی۔

دروازے کے سامنے پولیس والے تھے۔ سب سے آگے تھانیدار کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے، یوں کس طرح۔۔“ فہد نے پوچھنا چاہا تو تھانیدار نے حقارت سے کہا

”کبھی نہ کراؤ، چپ، میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں، چلو آگے لگ۔“ تھانیدار نے اپنے ریوالور سے اسے وین میں بیٹھ

جانے کا اشارہ کیا

”لیکن کس جرم میں؟“ فہد نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو تھانیدار اسی لہجے میں بولا

”یہ تھانے چل کر مٹاتے ہیں۔ کون سا جرم ہے، گرفتاری کے آرڈر بھی دیں ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے عملے کو بد لے ہوئے

تخت لہجے میں کہا

”چلو گھسیٹ کر ڈالو اسے وین میں۔“

”ٹھہرو! میں چلتا ہوں۔“ فہد نے سکون سے کہا تو بدلتے ہوئے پولیس والے رک گئے۔ فہد نے پلٹ کر دیکھا تو اسے چھانگ

کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے دیکھ لیا ہے۔ فہد وین میں خود جا کر بیٹھ گیا تو پولیس وین چل پڑی۔

پولیس دین تھانے کے باہر آ کر رکی تو اس میں سے فہد اور پولیس والے باہر آئے۔ پولیس والے یوں فہد کو اپنے جلو میں لے کر اندر آئے جیسے وہ کوئی بہت بڑا مجرم ہو۔

تھانیدار حوالات سے سامنے آ کر رکھا اور فہد کی طرف طنز پر انداز میں دیکھ کر ادنیٰ آواز میں بولا
 ”اوئے رفیق! اگل جلدی ذرا حوالات کھول اور مزہم کو ڈھک دے اندر۔“

”انسپکٹر! میرا جرم کیا ہے مجھے کیوں گرفتار کر کے لائے ہو۔“ فہد نے سکون سے کہا۔ اس کے لہجے میں خوف کا شاہد تک نہیں

تھا۔ اس پر تھانیدار نے اسے تحارت سے دیکھا اور طنز پر لہجے میں بولا

”کو بہت بھولا بن رہا ہے یاں، تجھے اب بھی پتہ نہیں چلا تو نے کیا کیا ہے۔“

”میں نے کچھ کیا ہے یا نہیں کیا، میں تم لوگوں کو چھتا ہوں، مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ تاکہ پھر بعد میں تم لوگوں کو یاد رہے کہ

مجھے کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا تو تھانیدار اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا

”اویار بتا دیجے ہیں۔ اتنی جلدی بھی کس بات کی ہے۔۔۔ اوئے رفیق! اوئے، کدھر مر گیا ہے تو۔“

”یہ غلط بات ہے انسپکٹر! تم مجھے وجہ بتائے بغیر حوالات میں نہیں ڈال سکتے۔“ فہد نے یوں کہا جیسے اسے چڑا رہا ہو۔ تبھی تھانیدار

نے بھڑک کر کہا

”تو پھر کیا کرے گا۔۔۔ ہمیں روئے گا، چلائے گا یا ہمیں مار ڈالے گا۔ سن۔ ابھی ہم چوہدری جلال ایم این اے صاحب کو

تمہاری گرفتاری کا بتاتے ہیں تا تو وہ ہمیں بتائیں گے کہ تمہیں کس جرم میں پکڑا ہے۔ تم نے امین ارائیں کا قتل کیا ہے یا کروایا پھر تمہیں بتا

دیں گے۔“ اس پر فہد چونک گیا۔ اس پر قتل کا مقدمہ بنایا جا رہا تھا اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولا

”انسپکٹر! ٹھیک ہے تو مجھے گرفتار کر کے لے آیا ہے لیکن اگر میرا جرم چوہدری نے ہی بتاتا ہے تو پھر میری گرفتاری تمہیں پہلے

پڑے گی۔ اس وقت کو یاد کر کے پھتاؤ گے کہ تم ہی مجھے گرفتار کر کے کیوں لائے۔“

اتنے میں ایک سپاہی نے آ کر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ تو تھانیدار نے طنز پر لہجے میں کہا

”یار، یہ سو دے بازی ہم پھر کریں گے۔ تو ابھی یہاں آرام کر، سکون کر یہاں۔“

”تم بھی سن لو اور اپنے چوہدری کو بھی بتا دینا۔ میرے لیے یہ چیزیں کوئی وقعت نہیں رکھتی ہیں۔“ فہد نے کہا اور یہ کہتے ہوئے وہ

خود حوالات میں داخل ہو گیا۔ سپاہی نے کنڈا مار کے تالا لگا دیا۔ فہد نے گوم کر تھانیدار کو دیکھا تو وہ خباثت سے مسکرا دیا۔ چند لمحے اس کی

طرف دیکھتے رہنے کے بعد تحارت سے سر جھٹک کر باہر کی طرف چلا گیا۔ فہد ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ فہد کو پتہ تھا کہ اس کے کیا

ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے، لیکن اتنی جلدی ہو جائے گا، اس کا اندازہ نہیں تھا۔

قسمت مگر میں یہ خبر جھگ کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ پولیس فہد کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ جو بھی یہ خبر سنا اس کا یہ سوال ضرور ہوتا کہ کیوں پکڑ کر لے گئی؟ اس کے جواب میں جو بات بتائی جاتی وہ سبھی کو حیران کر دیتی۔ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ فہد بھی امین اراکین کو قتل کروا سکتا ہے۔ چوراہے میں ہر کوئی اسی بات کو لئے بیٹھا ہوا تھا۔

حنیف کی دوکان کے سامنے لوگ جمع تھے اور یہی باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی انہیں بتا رہا تھا

”یار سنا ہے فہد کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ سچ میں ایسا ہو گیا ہے۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”تو اور کیا۔ ابھی یہاں میرے سامنے سے پولیس لے کر گئی ہے اسے۔ اس میں جھوٹ والی کیا بات ہے۔“

”لیکن اس نے کیا کیا تھا؟ کیوں پکڑ کر لے گئی اسے پولیس۔“ دوسرے آدمی نے پوچھا

”یار تو عجیب بندہ ہے کیا تجھے نہیں پتہ جو بندہ بھی چوہدریوں سے مخالفت مول بیٹا ہے اس بندے کی زندگی میں ہر سکون رو سکتی

ہے بھلا۔“ حنیف دوکاندار نے اس کی عقل پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا تو تیسرا آدمی یقین سے بولا

”ہاں یار۔ اس فہد نے تو گاؤں میں آتے ہی پہلے دن موہے کو مار کر چوہدریوں کو لگا دیا تھا۔ پھر ایسا تو ہونا ہوتا تھا اب پتہ نہیں

چوہدری اسے اتنے دن قتل کیوں دیتے رہے ہیں۔“

”یار۔ اس کی لاش پش بھی تو تھی نا، چوہدریوں نے دیکھا ہو گا وہ کتنے پانی میں ہے۔ اب اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ چلا تھا اپنی زمین

لینے اب بے چارہ جیل میں پڑا ہو گا۔“ حنیف دوکاندار نے کہا

”عمر حیات کی زمین بھی اب اسے نہیں ملنے والی۔ وہ رقم بھی ڈوب گئی سمجھو چوہدری اس کا قبضہ ہی نہیں لینے دیں گے۔“ ایک

بندے نے اپنی رائے دی۔

”وہ اب جیل سے باہر آئے گا تو قبضہ لے گا نا، نہ اپنی زمین ملی نہ عمر حیات سے خریدی زمین ملی۔ دونوں طرف سے۔۔۔ خیر ہمیں

کیا۔“ ایک آدمی نے کانڈھے اچکاتے ہوئے کہا تو وہاں پر مختلف تبصرے ہوتے رہے۔ تبھی حنیف دوکاندار نے رازدارانہ انداز میں کہا

”تم سب کو پتہ ہی نہیں ہے کہ فہد پکڑا کیوں گیا ہے۔ آج ہی قحانیدار نے سراج سے کہا تھا کہ امین اراکین کا قتل اس نے کروایا

ہے۔ اسی جرم میں وہ پکڑا گیا ہے۔“

وہاں پر موجود جس بندے نے بھی یہ بات سنی، اس نے دس سے یقین تو نہیں کیا لیکن منہ سے بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ اس انکشاف

پر لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور متر متر ہوتے چلے گئے۔

چوہدری جلاں اپنی حویلی کے کاریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بڑا پر سکون ہے۔ اتنے میں

غشی آ گیا تو چوہدری نے اسے دیکھتے ہوئے بولا

”ہاں یوں غشی۔ کیا کہتے ہو؟“

”پولیس نے فہد کو کڑیا ہے اور حوالات میں بند بھی کر دیا ہے۔ تھانیدار پوچھ رہا تھا کہ ایف آئی آر میں کیا لکھا ہے اور مدعی کے بتانا ہے آخر قتل کا کیس اُس پر ڈالتا ہے۔“

اس کے بتانے پر چوہدری جلال نے مسکراتے ہوئے کا تھانہ انداز میں کہا

”ہونہ۔ اس فہد نے تو ایک جھٹکا بھی نہیں سہا اور اب پڑا ہے حوالات میں۔ اب اسے وہاں سے نہیں نکلے دوں گا۔“

”اس کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے ایویں دیر کرتے رہے، اسے علاقے کی فضا خراب کرنے کا موقعہ ہی نہیں دینا چاہئے تھا۔“ منشی فضل دین نے سر جھٹکتے ہوئے کہا

”اوئے منشی، اندھیرے میں تیر چلانا فضول ہوتا ہے۔ ہدف کو اپنے نشانے پر لا کر جب تیر چلایا جاتا ہے تو وہ عین نشانے پر لگتا ہے۔ یہ تو ابھی اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا

”جی چوہدری صاحب واقعی اب اسے پھڑکنے کا موقعہ نہیں ملنا چاہئے وہ تھانیدار کو پھر کیا بتاؤں جی میں؟“ منشی نے پوچھا

تو چوہدری جلال نے آگے بڑھ کر دفتر کے ساتھ کہا

”منشی۔ اتم یہ باتیں اچھی طرح جاننے ہو کہ کرنا کیا ہے بس اسے اب گاؤں میں واپس نہیں آنا چاہئے۔“

”ہاں یہ تو اسے کہہ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے الجھن ہے کوئی مذکور کی مدعی تو اسے چاہیے ہو گا نا جی؟“ منشی نے الجھتے ہوئے کہا

”اُویار۔ اکبر کو مسلوب ہے کہ کیا کرنا ہے، اس سے پوچھو۔ یہ کہہ کر وہ خود کلائی کے سے انداز میں بولا، ”اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے پیچھے آتا کون ہے۔ دیکھوں تو سبھی اس کی پہنچ کہاں تک ہے اور وہ کتنے پانی میں ہے۔“

”جی میں نگے چوہدری صاحب سے ملتا ہوں۔ اب میں دیکھ لوں گا سب کچھ، اس کے بارے میں جڑ بات بھی ہوئی میں آپ کو بتا دوں گا۔ ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ اُمیدوار کو فون کر دیتا ہوں۔“

”اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے مجھ سے مت پوچھا کر منشی۔ اب جا۔ مجھے کچھ سوچنے دے۔“ چوہدری جلال نے کہا تو منشی جلدی سے پلٹ گیا اور چوہدری جلال پھر بونجی ٹیلنے لگا۔



ماسٹر دین محمد اپنے گھر کے مچن میں پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سہمی اس کے پاس بیٹھی بے چین ہو رہی تھی۔ جمجھی اس نے کہا

”اب کیا ہو گا ابابی۔ اُفہد کو پولیس والے“

”کچھ نہیں ہوتا پتر۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ ایک دن ایسا ہی ہوتا ہے۔ چوہدری اسے بونجی ڈھیل نہیں دے رہے ہیں۔ آخر انہوں نے اپنا آپ دکھا دیا۔“ مسٹر دین محمد نے افسردگی سے کہا تو سہمی جلدی سے بولی

”انہوں نے تو جو کرنا تھا کر لیا۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے اسے کس طرح پولیس کے چنگل سے نکالنا ہے۔“ یہ کہہ کر لمحہ بھر خاموشی کے بعد وہ ڈرتے ہوئے پوچھا، ”آپ جانیں گے اباجی۔“

”ظاہر ہے ہتر۔! میں نے ہی جانا ہے۔ تم مجھے کچھ رقم دے دو میں جاتا ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے سوچتے ہوئے کہا

”اور اگر آپ کی بھی نہ سنی گئی؟“ سلمیٰ نے تشویش سے پوچھا تو ماسٹر دین محمد نے کہا

”ہتر۔! میں اپنی طرف سے تو پوری کوشش کروں گا کہ فہد کو لے آؤں آگے اللہ مالک ہے۔ ہم تو اپنی سی کوشش ہی کر سکتے

ہیں نا۔“

”میں لاتی ہوں۔“ سلمیٰ انھیں لگی تو اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ساتھ ہی سراج کی آواز آئی

”استادجی، میں ہوں سراج۔“

”آ جاؤ سراج۔!“ ماسٹر دین محمد نے جواباً کہا تو سراج اندر آ کر ماسٹر دین محمد کے پاس بیٹھ گیا۔

”وہ فہد کو۔“ ماسٹر دین محمد نے کہنا چاہا تو سراج بولا

”جی استادجی۔! میں آپ کو یہی بتانے آیا ہوں کہ میں آگیا ہوں اور اب تمہارے چارہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ کرتا

ہوں آپ گھر ہی میں رہیں۔ اور بس دعا کریں۔“

یہ کہہ وہ اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ ماسٹر دین محمد نے اسے نہیں روکا۔ وہ چلا گیا تو سلمیٰ نے جیسے میں کہا

”چھوہری اب اپنا زور دکھائیں گے نا، انہوں نے کہا تھا کہ فہد کی زمین ہی اس کے گلے پڑ جائے گی۔“

”دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ تم نماز پڑھ کر اس کے لیے دعا کرو۔ میں بھی دعا کرتا ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے سکون سے کہا تو سلمیٰ چند

لمحے یونہی کھڑی رہی، پھر پلٹ کر اندر کی طرف چلی گئی۔

سراج نے تمہارے اندر آ کر دیکھا۔ حوالات میں فہد دیوار کے ساتھ ٹپک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ سراج پر پڑی تو اسے

کر سلاخوں کے پاس آگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سراج سے پوچھا۔

”کیا نا۔ کوئی ملا یہاں پر... یا سارے غائب ہو گئے ہیں؟“

وہاں صرف تمہارے کافی بیٹھا ہوا ہے۔ میری تو وہ دہت ہی نہیں سنتا۔ جی کہہ رہا ہے کہ تمہارے دار آئے گا تو جو بات کرنی ہے اسی

سے کر لیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا راجاں بوجہ کہ یہاں سے چلا گیا ہے۔“ سراج نے اس نے طرف دکھ کر بخجیدگی سے کہا

”یہ محفل تمہارا خیال نہیں، حقیقت یہی ہے کہ اب وہ یہاں تمہارے نہیں آئے گا۔ اب جو کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔“ فہد نے کہا

”تو پھر بتاؤ نا مجھے کیا کرنا ہے، کیا کروں، کس کے پاس جاؤں۔“ سراج نے تیزی سے پوچھا تو فہد بولا

”ایک وکیل کا بندوبست کر کے فوراً اسے یہاں لے آ۔ باقی میں ساری بات اسے سمجھ دوں گا کہ کرنا کیا ہے۔“

”بس۔ اور منٹ اس سے زیادہ نہیں۔“ فہد نے یہ کہتے ہوئے فون کا دیسور اٹھالیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا، سپاہی باہر کی جانب چلا گیا۔

اس وقت محمود سلیم اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے پاس پڑا سیل فون بج اٹھا۔ محمود سلیم نے اسکرین پر نمبر

دیکھے اور فون اٹھا لیا اور کہا

”ہیلو۔“

”پاپا، میں بات کر رہا ہوں فہد۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو محمود سلیم نے حیرت اور جذباتی انداز میں پوچھا

”تم فہد تم خیریت سے تو ہونا؟“

”ہاں پاپا میں ٹھیک ہوں، بس ذرا سی مشکل آٹن پڑی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”ذرا سی مشکل؟ تم تو ذرا سی مشکل سے گھبرائے والے نہیں ہے۔ بلکہ کیا بات ہے؟ فوراً بولو۔“

”پاپا، میرے پاس تھوڑا سا وقت ہے پولیس نے اچانک اسٹے کے زور پر مجھے گرفتار کر کے حوالت میں ڈال دیا ہے وہ مجھ پر قتل

ڈالنا چاہتے ہیں۔ تھانیدار سمجھیں چوہدری جلال کا زور خرید ہے۔ اس وقت میں حوالت سے بات کر رہا ہوں۔“ اس نے تفصیل بتادی

”کون سے تھانے کی حوالت؟“ محمود سلیم نے پوچھا

”میں قسمت نگر کے“ اس نے بتایا

”یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو کہ وہ تم پر قتل ڈالیں گے؟“ محمود سلیم نے پوچھا

”اسی انسپکٹر نے دے بے لفظوں میں دھمکی لگائی ہے اور اپنے راستے سے ہٹانے کو یہ چوہدری جلال کا منصوبہ ہے۔“ فہد نے بتاتا

”کسی وکیل سے رابطہ کیا؟“ محمود سلیم نے پوچھا

”ابھی تک تو نہیں ہوا۔“ فہد نے بتایا

”وہ قتل کیس ڈال رہے ہیں تم پر، خیر کوئی بات نہیں، میں اسے دیکھتا ہوں۔ تم نے بالکل پریشان نہیں ہونا۔ میں سب ٹھیک کر لیتا

ہوں۔ تم بس جتنا رہنا۔“ محمود سلیم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”پاپا میں بہت محتاط تھا۔ اچانک ہی انہوں نے۔“ فہد نے بتانا چاہا لیکن اسنے میں سپاہی اس کے پاس آ گیا۔ فہد اسے دیکھا،

سپاہی نے اشارہ کیا۔ تو فہد نے کہا، ”او کے پاپا فون بند کرنا مجبوری ہے۔“

”او کے اپنا خیال رکھنا۔ گھبراتا نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ محمود سلیم نے کہا تو اس کے ساتھ ہی فہد نے فون بند کر دیا۔

سپاہی فون اٹھا کر چلا گیا۔ فہد حوالت کی دیوار کے ساتھ ٹپک لگا لی۔

فہد کی وہ رات حوالت میں گزر گئی۔ قسمت نگر پر اچھی خاصی دھوپ چمک رہی تھی۔ فہد حوالت میں تھا اور اس کی پاس سرانج کھڑا

ہاتھیں کر رہا تھا۔

”میں نے رات ہی وکیل کا بندوبست کر لیا تھا۔ مگر اس نے رات کے وقت یہاں آنے سے انکار کر دیا۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے، وہ ابھی کچھ دیر میں آتا ہوگا۔ کہہ رہا تھا کہ وقت پر پہنچ جائے گا۔“

اس سے پہلے کہ فہد جواب دیتا، تھانیدار اندر آ گیا۔ اس نے رُک کر انہیں طنز پر انداز میں دیکھا اور پھر ان کے قریب آ کر بولا ”اوئے سراج کتنا پاگل ہے تو کیسے راز و نیاز کر رہا ہے تو اس کے ساتھ، جب تجھے پتہ چلے گا کہ یہ تیرا کتنا بزدل دشمن ہے، جب تیرا کیا حال ہوگا۔ مجھے تو یہی سوچ کر دکھ رہا ہے۔“

”تیرے پاس کوئی ثبوت ہے۔ یا پھر تجھے چودہریوں کی زبان بولنے کی اتنی عادت پڑ چکی ہے کہ تیری اپنی سوچ ختم ہو گئی ہے۔“ سراج نے فحشی سے کہا تو تھانیدار نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”میرے پاس ایسا کیا ثبوت ہے کہ جسے تم تو کیا کوئی بھی نہیں جھٹلا سکے گا۔ ابھی کچھ لمحوں ہی میں تجھے پتہ چل جائے گا۔“ سراج نے پریشانی میں فہد کی طرف دیکھا۔ جسے وہ خود الجھن میں پڑ گیا۔

”ایسا کیا ثبوت ہے تیرے پاس؟“

سراج نے پوچھا تو تھانیدار نے جواب نہیں دیا بلکہ باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچھے میں چاچا سو حناظر حال سا تھانے میں داخل ہوا ہے۔ جب تھانیدار نے فہد کی جانب اشارہ کر کے پوچھا

”اوجا چا دیکھ یہ بی بی ناوہ شخص، پہچان اسے اور بتا کون ہے یہ؟“ چاچے سوہنے نے جھجکتے ہوئے کہا ”یہ فہد ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اوجا چا، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بتا کہ امین کے قتل کا اس سے کیا تعلق ہے۔“ تھانیدار نے کہا

”اس نے امین کا قتل کیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس نے امین کو قاتل مارا ہے یہاں۔“ چاچے سوہنے نے اپنی کتیشی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو سراج نے بری طرح چمک کر اس کی طرف دیکھا۔ فہد کی آنکھوں میں بھی حیرت اتر آئی تھی۔

چاچے سوہنے نے تھانیدار کی طرف دیکھ کر مرے ہوئے لہجے میں کہا

”یہ فہد! امین ارنکس سے کہہ رہا تھا کہ چودہری کبیر کے خلاف بیان دے ورنہ تجھے مار دوں گا۔ ایسی ہی کوئی بات چل رہی تھی

ان کے درمیان۔“

تھانیدار نے طنز پر انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”کتنا بھولا ہے سراج۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے چاچے سوہنے سے کہا، ”تو آچا چا بیان لکھو اپنا، کیسے دیکھا تھا اسے تو نے۔“ یہ کہتے

ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ سراج کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ اس نے انتہائی غصے میں فہد کی طرف دیکھا پھر غصے اور بے بسی کے ملے جلے

جذبات میں کہا

”یہ کیا کیا تو نے فہد سرے۔۔۔ ہی بھائی کو مار دیا تو نے۔۔۔ ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا تو نے ایسا؟“

”یہ بہت بڑی سازش کر رہے ہیں سراج۔ اسے بگھنے کی کوشش کرو۔ میں ایسا کیوں کروں گا یا۔۔۔ پاگل مت بنو اس سازش کو

سمجھو۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو سراج نے انتہائی سختی سے کہا

”مجھے اپنا یا رمت کہہ فہد۔ اتو آستین کا وہ ساپ ہے جو اپنے پالنے والے کو ڈس لیتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ تیرا اس نے بگاڑا

ہی کیا تھا، کیوں کیا تو اسے قتل؟ وہ چشم دید گواہ تیرے ہی پار کا باپ ہے۔ وہ کیوں جھوٹ بولے گا تیرے خلاف۔۔۔۔۔ وہ تیرے سامنے کہہ

گیا ہے کہ تو امین کا قاتل ہے، قاتل۔“ سراج نے اونچی آواز میں کہا۔ غصے کی شدت میں سراج کی آواز پھٹ گئی۔ اس نے فہد کو سلاخوں

میں سے پکڑنے کی کوشش کی کہ سپاہی نے اسے آکر پکڑ لیا۔

”اُوئے چل ہٹ اوجھر۔“

اس نے سراج کو دھکیل کر ایک طرف کیا تو اس نے فہد کی دیکھ کر کہا

”ان لوگوں سے تو اگر بچ بھی گیا تو میں تجھے مار دوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔ یاد رکھ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“ سپاہی اسے دھکیل کر

باہر کی جانب لے گیا۔

تھانیدار دور بیٹھا فہد کی طرف دیکھ کر ہنسا رہا۔ پھر چاچے سوچنے سے کہا

”اُدو چاچا لگا یہاں اپنا انگوٹھا اور کر دے پکی اپنی بات۔“

تھانیدار نے سفید کاغذ اس کے سامنے رکھا اور اس پر انگوٹھا لگوا دیا۔ اس نے کاغذ کی طرف دیکھا پھر فہد کی طرف دیکھ کر کہہ

دیا۔ فہد نے غصے میں اس کی طرف دیکھ۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔



حویلی کے ڈرائیونگ روم میں چوہدری جلال اور وکیل دونوں ڈرائیونگ روم میں صوفوں پر بیٹھے خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہے

تھے۔ چوہدری جلال نے سنجیدہ لہجے کہا

”یہ اچھا کیا آپ نے وکیل صاحب کہ آپ فوراً ہی یہاں آ گئے، ورنہ ایسی باتیں فون پر تو نہیں کی جاسکتی تھیں۔“

”آپ کا پیغام ملا تو میں فوراً آ گیا۔ باقی مجھے فٹشی نے ساری بات بتا دی ہے آپ فرمائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ وکیل نے پوچھا

”بس یہی کہ اس لڑکے نے یہاں خاصا اودھم مچایا ہوا تھا۔ خواخواہ ڈسٹرب کر رہا تھا۔ اسے آج عدالت لے جائیں گے۔ ایک تو

میں چاہتا ہوں کہ اس کا جسمانی ریمانڈ زیادہ سے زیادہ ہو تاکہ اسے کچھ تھوڑی بہت فصیحت تو دی جاسکے۔“ چوہدری جلال نے سوچتے

ہوئے لہجے میں کہا تو وکیل بولا

”جی ہاں کل ایسے ہی ہوگا۔“

”اور دوسرا اس کی اب قطعاً ضمانت نہیں ہوتی چاہئے۔ چشم دید گواہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو جو چاہئے وہ بتادیں۔ وہ ہو جائے گا۔ کسی طرح بھی کوئی قانونی کمزوری نہیں ہوتی چاہئے۔ وہ اب مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چاہیے۔“ چوہدری جلال نے حتمی انداز میں کہا

”میں ابھی تھانیدار سے بات کر لیتا ہوں۔ اور جو بھی ضروری لوازمات ہوئے وہ میں خود پورے کر لوں گا۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وکیل نے یقین دلایا

”مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ خیر۔ اوہ میں چند دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے مشورہ کروں اپنے کبیر پتر کے بارے میں سیاست میں لے لی آؤں۔ اور کچھ نہیں تو اس دفعہ انکیشن میں ایم پی اے تو بن ہی جائے گا۔ سیاست میں آئے گا تو کچھ دنیا داری کی سوچ بوجھ بھی آئے گی نا۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”نکے چوہدری کو ایم پی اے بنانا تو آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ جس پر ہاتھ رکھتے ہیں وہ اسمبلی ممبر بن جاتا ہے۔ میرے رائق جو حکم ہے وہ بتائیں، میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وکیل نے اٹھساری سے کہا

”میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے معاملات دیکھ لیا کریں۔ وہاں فور پور کے لوگوں میں اسے سیاسی طور پر متعارف کروائیں۔ کبیر کو کوئی سیاسی سوچ بوجھ دیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ اس نے یہاں سا راقوت کھیل کود میں گزارا ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا

”میں سمجھ گیا چوہدری صاحب یہ کوئی اتنا مشکل معاملہ نہیں ہے۔ بس نکے چوہدری صاحب فور پور میں تھوڑا وقت دیا کرے۔ میرے پاس آ جایا کرے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا تھقہ لگاتے ہوئے کہا، ”آپ کے سامنے کوئی سیاسی مخالفت تو ہے نہیں وہ ایک بے چارہ ملک فحیم ہوا کرتا تھا۔ وہ بھی آپ سے دوہرا انکیشن ہار کے تھک چکا ہے۔“

”ہاں۔ امیری اجازت کے بغیر تو اب وہ بے چارہ لوکل کونسلر بھی نہیں بن سکتا، ویسے کیا کرتا ہے وہ آج کل۔ اس نے سیاسی منظر پر تو کیا ہوتا ہے، اس بے چارے کے بارے میں کبھی کبھہ سنا بھی نہیں۔“ چوہدری جلال ہلکا سا ہنس کر یو لاء وکیل نے تھوہ لگاتے ہوئے کہا

وہ ہوگا اور سہد ہوگی اور اس نے کیا کرتا۔“

وکیل اور چوہدری دونوں جسنے لگے۔ چند لمبے بعد وکیل نے اٹھتے ہوئے کہا

”لیس چوہدری صاحب اب اجازت دیں مجھے تھانیدار سے بھی ملنا ہے۔ پھر فور پور بھی پہنچنا ہے اور وقت پر عدالت بھی جانا ہے۔“

”چلیں ٹھیک ہیں۔“ چوہدری جلال نے کہا اور اس سے ہاتھ ملایا وکیل باہر کی جانب گیا۔ چوہدری اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے لمحوں پر قاتمانہ مسکراہٹ تھی۔

چوہدری جلال ڈرائنگ روم میں ہی تھا کہ رانی نے اس کے سامنے چائے لاکر رکھ دی۔

”چائے بنا دوں؟“ ”نہیں رکھ کر رانی نے پوچھا

چوہدری جلال ابھی جواب نہیں دے تھا کہ اندر سے چوہدری کبیر وہاں آ گیا۔ چوہدری جلال نے اسے دیکھ کر کہا

”اوائے کبیر! ادھر آ بیٹھ میرے پاس، کہاں جا رہا ہے؟“

وہ آ کر بیٹھ گیا تو رانی خود بخود چائے بنانے لگی۔

”بابا میں ضرور آپ کے پاس بیٹھتا مگر وہ فہدنا اسے۔“ چوہدری کبیر نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال حقارت بھرے انداز میں بولا

”او! تو پریشان نہ ہو۔ وہ آیا تھا وکیل، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ وہ عدالت میں سب دیکھ لے گا۔ تو سکون سے بیٹھ۔“

اس دوران رانی نے چائے بنا کر پیالی چوہدری جلال کے سامنے رکھ دی۔

”اسے رہنما ٹرپر یہاں تھانے میں لانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ۔“ چوہدری کبیر نے کہنا تو چوہدری جلال اس کی بات کا مٹے

ہوئے بولا

”کہانا میں نے فہد جیسے سناپ کو مارنے کے سارے منتر اسے سمجھا دیئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں سیاست، قتل، ہم نے کیا اور ڈال

فہد پر دیا۔ یہ ٹھنڈے دماغ کا کام ہے بیٹا۔“

رانی چونک گئی۔ چائے کی پیالی چوہدری کبیر کو دیتے ہوئے اس کا ہاتھ ڈرا سا لرز گیا۔ مگر باتوں میں باپ بیٹے نے اس طرف توجہ

نہیں دی۔ چوہدری کبیر اپنی دھن میں کہہ رہا تھا

”پر بابا سیاست بھی تو طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی نا۔ یہ کہتے ہوئے کبیر نے چائے کی پیالی پکڑ لی تو رانی وہاں سے چلی

گئی۔ چوہدری جلال اسے سمجھا رہے ہوئے کہنے لگا۔

”ساری زندگی بچی کھیل کھیے ہیں بیٹا۔ سیاست کے لیے بڑا ٹھنڈا ہونا پڑتا ہے۔ دشمن کو گھیر کر وہاں لے آؤ، جہاں اسے قابو کر

سکتے ہو۔ یہی سیاست ہے۔ اندھا دھند طاقت کا استعمال تو قوت کو ضائع کرنے والی بات ہے نا بیٹا۔“

”بابا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن آپ یہ مانیں کہ آپ نے فہد کو کچھ زیادہ ہی وقت دے دیا تھا۔ اب تو وہ بچ نہیں سکتا۔“

چوہدری کبیر کی سوئی فہد پر اٹکی ہوئی تھی۔

”ہاں، کچھ زیادہ ہی وقت لگا۔ وہ بدکا ہوا بہت تھا، اس لیے اسے گھیرنے میں وقت لگ گیا۔ لیکن اب جو اس کا بندوبست کیا ہے،

وہ پکا ہے۔ اور ہاں وہ تمہانیدار بہت منافق بندہ ہے اس پر ضرور نگاہ رکھنا وہ کسی بھی وقت ہمیں دھوکہ دے سکتا ہے۔“ چوہدری جلال نے اسے

پھر سمجھایا۔

”جی بابا۔ میری پہلے ہی اس پر نظر ہے۔ میں نے اسے قابو ہی اس طرح کیا ہوا ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ لگا تو

جان سے جائے گا۔“

”خیر۔! وہ وکیل آیا تو میں نے اس سے تمہارے بارے میں مشورہ کیا۔ تاکہ تمہیں سیاست میں لایا جائے۔“ چوہدری جلال

نے بتایا اور دونوں چائے پیتے ہوئے اسی موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ رانی افسردہ سی دیوار کے ساتھ لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یہ جان کر بہت دکھ ہوا تھا کہ امین اراکین کا قتل تو انہوں نے کروایا اور پھنسا فہد کو دیا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر اندر چلی گئی۔



ایک فہد کے حوالات میں جانے سے کیا کچھ ہو گیا تھا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ قسمت مگر میں فہد کا ایک تاثر بن چکا تھا۔ لوگ اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ اعتماد بکھرا ہوا تھا۔ جس نے بھی فہد کے ساتھ امید باندھی تھی، وہ ایک بار تو خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کی سوچ بدلنے لگی تھی۔

چوراہے میں حنیف دوکان دار کی دوکان پر لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا ”یار، ایسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کو فہد نے قتل کیا ہے۔ امین کی تو فہد کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو پہلے ہی چورہویوں کے خلاف عدالت میں جانے کے لیے ان کی مدد کر رہا تھا۔“

”یار۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے مگر پھر کیا ان چورہویوں کی ہیں۔ چورہویوں کے خلاف فہد کے پاس کوئی ٹیکا ثبوت نہیں تھا۔ اس نے خود امین کا قتل کر کے کئے چورہوی پر ڈال دیا۔ یہ چاہے سوچنے لے اس کا بھانپا پھوڑ دیا۔ جس نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا۔“ حنیف دوکاندار نے انہیں سمجھایا

”ہاں یار اگر چاہا سو ہتھاندہ کیا تو نکال چورہوی اب تک بچس چکا ہوتا۔ فہد نے تو سراج کو ان چورہویوں کے خلاف استعمال کرنا تھا۔“ ”تو دیکھ اس فہد کی چالیں، کس طرح منہا مینا بن کر لوگوں کی ہمدردیاں لے کر عمر حیات دلی زمین لی اور اب اپنی زمین واپس لے رہا تھا۔“ حنیف دوکاندار نے یقین بھرے لہجے میں کہا

”اب ہو گا کیا؟“ وہیں بیٹھے ایک آدمی نے پوچھا تو حنیف دوکاندار بولا ”اب ہوتا کیا ہے۔“ فہد کو عدالت میں پیش کریں گے۔ پھر اسے جیل بھیج دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صد پھر مقدمہ چلے گا۔ اور پتہ نہیں اس کا فیصلہ کب ہو گا۔“

”ویسے یار چورہوی تو چورہوی ہیں، ان کا بھلا کیا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔“ ایک آدمی نے کہا ”ہاں یہ تو ہے، وہ جلدی پشتی طاقت در بونگ ہیں۔ یہ کل کے لڑکے ان کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“ حنیف دوکاندار نے حقارت سے کہا

”کل چمڑا تو مجھے سودا دے۔ میں وہ لے کر گھر جاؤں۔“ وہیں کھڑے ایک گاؤں نے کہا تو حنیف دوکاندار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بتا کیا ہوتا ہے۔“

وہاں پھر موجود لوگ اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق باتیں کرنے لگے۔ فہد کے لئے سب میں مایوسی تھی۔

سراج کا ذریعہ ویران تھا۔ سراج تھا ایک چار پائی پر بیٹھا ہوا بے حد جذباتی اور ہاتھ اسے تھانیدار کی کبھی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس نے کہا تھا

”اُوئے سراج کتنا پاگل ہے تو۔۔۔ کیسے راز و نیاز کر رہا ہے اس کے ساتھ۔۔۔ جب تجھے پتہ چلے گا کہ یہ تیرا کتنا بڑا دشمن ہے۔۔۔ تب تجھے پتہ چلے گا۔“

دوسری طرف اسے فہد سچا لگ رہا تھا۔ اس کی ہاتھی دماغ میں گھوم رہی تھی

”کل ضرور عدالت میں چلیں گے مگر اس قتل کیس کے لیے جس کی گواہی امین دینا چاہتا تھا اسے ری اوپن کروانا ہے۔ چاہے عمر حیات والی زمین کدھر جا رہی ہے وہ لے لیں گے۔ پہلے امین سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہے۔“

تجھی اسے چاچا سوہتا اور اس کی بات یاد آ گئی۔

”اس نے امین کا قتل کیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس نے امین کو فائر مارا ہے۔“

سراج ایک دم ہی سے بے چین ہو گیا۔ اسے کچھ کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چاہے سوہنے کے علاوہ کوئی اور بات کرتا تو شاید وہ بھروسہ نہ کرتا۔ اس نے تھانیدار کی بات پر بھی یقین نہیں کیا تھا۔ چاہے سوہنے نے اس کی آنکھیں کھولی کر رکھ دیں تھیں۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور نہایت دکھ سے بڑبڑایا

”یہ تو نے اچھا نہیں کیا فہد، میں اب تجھے نہیں چھوڑوں گا تو نے میرے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اضرائی انداز میں دونوں ہاتھوں کو مسلے لگا۔

بابا نعت علی اپنے گھر کے سجن میں پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں اس کا بیٹا نذر اس کے پاس آ کر دوسری چاچائی پر بیٹھ گیا جہاں نذری کی بیوی صفیہ بھی بیٹھی تھی۔ اپنے باپ کو پریشانی کی حالت میں بیٹھا دیکھ کر پوچھا

”ابا کیا بات ہے اتنا پریشان کیوں ہے؟“

”پریشانی والی بات تو ہے نا، وہ فہد اندر ہو گیا ہے پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس پر اب قتل کیس پڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں اب باہر کب آتا ہے۔ ہم نے اس سے فصل کی رقم بھی لے لی ہے کیا کریں۔“ نعت علی نے کہا

”ابا کہتا تو ٹھیک ہے۔ اب یہ چوہدری ضرور ہمیں بھی گنگ کریں گے۔“ نذیر نے یثویش سے کہا

”اُوئے گنگ نہیں، وہ تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیں گے میں نے کیا سوچا تھا۔ اب ہو کیا گیا ہے۔“ نعت علی نے ناسف سے کہا

تو صفیہ بولی

”ہاں بابا تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چوہدری تو بہت غصے ہوں گے۔“

”کیوں نہ ابا، ہم چوہدری سے معافی مانگ لیں۔ اتنا ڈرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر اس نے ناراض ہونا ہوتا تو اب تک ہم سے بات کر چکا ہوتا۔“ نذیر نے کہا

”اوجھیں ہتر۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ابھی تو ان کی ساری توجہ فہد کی طرف ہے۔“ نعمت علی بولا

”بابا تو آرام سے سوچ۔ نذیر ابھی سوچتا ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی حل تو نکل آئے گا نا؟“ صفیہ نے تسلی دینے والے انداز میں کہا

”اب جو ہوگا، وہ تو جھکتا پڑے گا۔ ممکن ہے اللہ سائیں کوئی راستہ نکال دے۔“ نعمت علی نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا

تو نذیر بولا

”تو فکر نہ کر اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ تو آرام کر۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ تو صفیہ بھی اٹھ گئی۔ نعمت علی سوچ میں پڑ گیا۔ اب ان حالات میں وہ کیا کرے۔

ماسٹر دین محمد اپنے گھر کے دالان میں اُبلے کپڑے پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ تاہم وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسنے میں سہمی جائے گا یہ لے کر اس کے پاس آئی۔ ماسٹر دین محمد نے بے دلی سے پیالہ پکڑا تو سہمی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولی

”اباجی، آپ مایوس کیوں ہو رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے گا آپ کسی سے ملیں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔“

”کس کے پاس جاؤں ہتر، دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم یہاں ہوتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر پا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ سراج سمجھ دار ہے لیکن۔“

یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ کہہ نہیں پایا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے گہرے تاثرات پھیل گئے تھے۔

”میری تو چوہدریوں نے سازش کی ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ فہد کسی کا قتل کرے اور وہ بھی امین کا۔ انہوں نے انتہائی چالاکي سے سراج کو فہد سے الگ کر دیا ہے۔ الگ کیا، دشمن بنا دیا ہے۔ بڑی گہری سازش کی ہے انہوں نے۔ سہمی نے بے حد جذباتی ہو کر کہا

”ہاں، وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اصل میں وسائل سارے انہی کے قبضے میں ہیں نا، ان کا استہساں وہ اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ خیر میں جانتا ہوں پورا دروہاں چا کر کسی کی مدد دیتا ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا

”اللہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالے گا۔ اس کا مجھے بھروسہ ہے، آپ مایوس نہ ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی پھر بڑے عیا جذباتی لہجے میں بولی، ”کاش میں لڑکا ہوتی اور اب بھی اباجی اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں جاتی ہوں تھا نے اور۔۔۔“

ماسٹر دین محمد نے سہمی کی بات سنی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ کس قدر کہتے کہتے خاموش ہو گئی تھی۔ تبھی وہ بولا

”تو کیا کرے گی وہاں جا کر؟“

”اور کچھ نہ کر سکی تو کم از کم فہد سے یہ تو پوچھ سکتی ہوں کہ اب کیا کرنا ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں تو کیا ہوا، کیا میں اس مصیبت کی گھڑی میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی؟ آپ میرے ساتھ چلیں قحانے یا پھر مجھے جانے کی اجازت دیں۔“ سلمیٰ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔

”دیکھ میرا ہتھوڑاں کا تھانیدار کوئی اچھا بندہ نہیں ہے۔ تیرا دہاں جانا ٹھیک نہیں۔ تیرے جانے سے کیا ہو جائے گا۔ میں کرتا ہوں ناکوش، جاتا ہوں نا میں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے منہ کے قریب خیال لے جاتے ہوئے رکھ دی۔

”ابا بھئی آپ میری بات کا برا محسوس نہیں کریں گے۔ یہاں فہد کا ہمارے سوا ہے کون؟ اسی نے اس کے لیے کچھ کرنا ہے جیسے بھی ممکن ہو۔ ورنہ وہ تو چاہتے ہیں کہ فہد کو جیل بھجوا دیں تاکہ وہ جو ان کی راہ میں دیوار بن گیا ہے اسے گرا دیں۔“ سلمیٰ نے لجالت سے کہا۔

”نہیں پتر۔! تو نے پریشان نہیں ہونا میں دیکھنا ہوں نا میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ تو نے بس اپنا خیال رکھنا ہے۔ میں چلتا ہوں، دروازہ بند کر لو۔“

یہ کہتے ہوئے ماسٹر دین محمد کافی افسردہ انداز میں اٹھ گیا۔ سلمیٰ نے بے بسی کے انداز میں اپنے باپ کو دیکھا اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ گیٹ پار نہیں کر گیا۔ اس نے دروازہ لگایا اور اندر آ گئی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چانک اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ دل سے دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بند تھے لیکن اس کے اندر شور تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”اے میرے پروردگار۔! اے اپنی حفاظت میں رکھنے والے مالک کل کائنات، تو فہد کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ مجھے یقین ہے تو ہمیں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ تو نے ہی فہد کو ہمارے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے پروردگار۔! ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے لیکن تجھ سے مدد تو مانگ سکتے ہیں نا۔ اے قدرت والے قادر۔! تو فہد کی حفاظت فرما نا۔ اسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنا۔ تو جانتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اے اللہ! اے ان خالوں سے بچانا جو نہیں چاہتے کہ لوگ امن و سکون سے رہیں۔ اے اللہ۔! تو فہد کی حفاظت فرما نا (آمین)۔ یہ دعا مانگ کر وہ پرسکون ہو گئی، جیسے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ وہ چند لمبے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔



فہد حلات کے اندر بیٹھا ہوا باہر دیکھ رہا تھا کہ قحانیدار بے یقینی سے ٹہل رہا ہے۔ اٹنے میں اس کی نگاہ سامنے پڑی۔ اکھا نیزہ قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو قحانیدار نے اکتائے ہوئے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اُوئے جلدی آاُوئے، اتنی دیر لگا دی تو نے۔“ بھرم ”کوہدالت بھی تو لے کے جاتا ہے۔“

”اوسرکار۔! ہم تو حکم کے غلام ہیں جیسے ہی کئے چوہدری نے یہ امانت دی، لے کر آ گیا ہوں، یہ لیں۔“ یہ کہتے ہوئے ماکھے نے اپنی جیب میں سے رومال میں لپیٹی ہوئی چیز اس کے سامنے کر دی۔ قحانیدار نے اسے کھولا تو اس میں ریوا لور تھا۔ جسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”اچھا تو یہ ہے آؤ قتل۔“ مگر فہد کی طرف منہ کر کے بولا، ”اس رپوالور سے فہد نے امین کو قتل کیا۔“

اس پر فہد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہلکے سے مسکرایا۔ اس نے فہد کو پھنسانے کا پورا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ تبھی فہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”بہت مہنگا پڑے گا تمہیں انسپکٹر، اتنی ہی اڑان اڑ، جتنی تو اڑ سکتا ہے۔“

”چشم دید گواہ بھی موجود ہے اور آؤ قتل بھی مل گیا ہے۔ اب تجھے لے کر چلتے ہیں عدالت، وہاں سے لیس گے تیرا بھانڈا اور پھر لے آئیں گے تجھے یہاں اور پھر جو تیرے ساتھ ہوگا۔ تو بار دیکھے گا۔ سب کچھ قانونی ہوگا۔“

یہ کہہ کر تھانیدار نے لہجہ لگا دیا۔ جس میں ماکھے کا ہلکا سا ہتھکڑی بھی شامل تھا

”جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے، میں مانتا ہوں کہ اس قسمت نگر میں اندھیر مگر ہے۔ لیکن قسمت کے فیصلے کیا ہیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔“ فہد نے خود اعتمادی سے کہا

”لیکن اس وقت تیری قسمت کا فیصلہ تو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے قریب کھڑے سپاہی کی طرف دیکھ کر کہا، ”جل اؤ اے نکال اسے، لگا اس کو جھکڑی اور لے چلیں اس عدالت، پھر واپس بھی آتا ہے۔“

تھانیدار حکم دے کر اپنی میز کی جانب بڑھ گیا۔ سپاہی حوالات کا دروازہ کھولنے لگا۔ ماکھا کینہ تو زنگاہوں سے فہد کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فہد نے انتہائی سنجیدگی سے انہیں دیکھا، جیسے وہ بے چینی محسوس کر رہا ہو۔

کاغذی کاروائی کے بعد انہوں نے فہد کو جھکڑی لگائی۔ تھانیدار اس کی طرف دیکھ کر طویہ انداز میں ہنسا اور اپنی ٹوپی اٹھا کر اٹھ گیا۔ اس وقت تھانیدار کے ساتھ سپاہی، فہد کو لگی جھکڑی پکڑے تھانے کے اندرونی دروازے سے باہر آئے۔ انہی لمحات میں وہ تینوں ہی سامنے دیکھ کر چوکتے ہوئے رک گئے۔

تھانے میں ایک پولیس جیب آکر رکی تھی۔ اس میں بیٹھا ہوا جعفر غضب ناک لگا ہوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ اے ایس پی کی وردی میں تھا۔ وہ جیب سے اترتا ہوا ان کی جانب بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس فورس تھی۔ فورس میں بہت سارے پھرے دہاتی تھے جنہیں تھانے دار بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان سب کو دیکھ کر تھانیدار ایک لمحے کو گھبرا گیا۔ اس نے فوراً ہی سیلوٹ کیا تو سپاہی نے بھی سیلوٹ مار دیا۔ جعفر نے انہیں غضب ناک لگا ہوں سے دیکھا۔ وہ فہد سے قطعاً اجنبیت برت رہا تھا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو۔ فہد کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اتنے میں ایک اے ایس آئی تیزی سے آگے بڑھا اور تھانیدار کے پاس آکر بولا

”ہمارے نئے اے ایس ای صاحب۔“

جعفر نے قریب آکر انتہائی رعب دار انداز میں پوچھا

”کون ہے یہ مزم؟ اور اسے کہاں لے کر جا رہے ہو؟“

”سر۔ اقل کیا ہے اس نے، آگہ قل بھی برآمد ہو گیا ہے، رہیماظر کے۔“ تھانیدار نے تیزی سے کہا

”اسے بٹھاؤ ادھر، پہلے میں گفتیش کروں گا، پھر اسے لے کر جانا اس کی ہتھکڑی کھولو اور اسے کرسی پر بٹھاؤ۔“ جعفر نے کہا تو

تھانیدار بولا

”سرجی بڑا خطرناک مجرم ہے، ہتھکڑی کیسے۔“

”انسان بن، اور وہ کام کرو جس کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے۔ چل۔“ جعفر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو سپاہی نے جلدی

سے فہد کی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ انہیں اس جگہ لے گیا جہاں تھانیدار کی بیڑھی۔ جعفر اس کی کرسی پر بیٹھ کر تھانیدار سے بولا۔ ”کل اب

کتابیں راجن میں اس مقدمے کا اندراج کیا ہے۔ چل شاہاش۔“

تھانیدار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تھانیدار جلدی سے کتابیں لے آیا۔ جعفر میز کے عقب میں پڑی کرسی پر بیٹھا ہوا

کتابیں دیکھنے لگا۔ تھانیدار کو اس نے سامنے کھڑا کیا تھا اور فہد کو اس نے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ اس نے کتابیں دیکھ کر تھانیدار سے پوچھا

”یہاں روزنامے میں کچھ درج نہیں۔ تجھے اتنی جلدی ہے اسے عدالت لے جانے کی۔ پرچہ نامعلوم کے خلاف ہے تو اسے

عدالت لے کر جا رہا ہے؟“

اس دوران فہد کے سامنے وہی سفید کاغذ آگیا، جس پر چاچے سوہنے کا انگوٹھا لگا ہوا تھا۔ اس نے جعفر کی توجہ اس کی طرف دلائی۔

جعفر نے اس سفید کاغذ کو دیکھا تو فہد نے کہا

”یہ چشم دید گواہ کا بیان ہے۔“

اس پر جعفر نے انتہائی غصے اور سخت لہجے میں پوچھا

”اوئے یہ کیا ہے اوئے، اس کا مطلب ہے تو جھوٹا قتل ڈال رہا ہے اس پر، تجھے شرم نہیں آتی۔ اس لیے تجھے جلدی تھی عدالت

جانے کی۔ سن اب یہی کاغذ تیرے گلے کا پسندایا دوں گا۔ ورنہ تو جانتا ہے کہ تو نے کیا کرنا ہے۔“

”صاحب جی یہ کاغذی کاروائی ہے باقی آپ جیسے کہو گے، ہوگا تو وہی ناجی۔“ تھانیدار نے لہجے سے کہا۔ وہ اسی لمحے بدل گیا تھا۔

”تو چل ڈرا ادھر ہو کر بیٹھ، میں ابھی تجھ سے بات کرتا ہوں۔“ جعفر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تھانیدار وہاں سے ہٹ کر کچھ

دور بیٹھ گیا تو جعفر نے اسی سپاہی کو بلالیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے قریب آ کر کھڑا ہوا۔

”جی سر۔“

”اوئے جی سر کے بچے، نوکری کرنی ہے یا اس کے ساتھ جیل جانا ہے، فوراً بتا؟“ جعفر کے پوچھنے پر وہ سپاہی ایک دم سے گھبرا

گیا، اس نے جلدی سے کہا

”جی کرنی ہے مائی باپ، نوکری کرنی ہے۔“

”تو چل پھر شروع ہو جا۔ بتا یہ سارا معاملہ کیا ہے؟“ جعفر کے پوچھنے پر اس نے ایک نگاہ تھانیدار پر ڈالی اور اسے جو مصوم تھا وہ اس نے بتا دیا۔ تھانیدار کا پول کھل گیا تھا۔ سپاہی نے سارا سچ اس کے سامنے بیان کر دیا تو جعفر نے غضب ناک لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ابھی اور اسی وقت اس چشم دید گواہ کو لے کر آ، جلدی۔“

جعفر نے تھانیدار کو حکم دیا تو وہ سپاہی سمیت تیزی سے باہر چلا گیا۔

باہر پولیس فورس کھڑی تھی۔ تھانیدار ان میں سے بیشتر لوگوں کو جانتا تھا۔ ان سے جب تھانیدار نے معلومات لیں تو اسے پتہ چل کہ یہ یہاں ایس بی رات ہی ٹرانسفر ہو کر آیا ہے۔ راتوں رات اس نے اے ایس بی کا جاولہ یونی نہیں ہو گیا تھا۔ اس کے تو پاؤں کے سے زمین کل گئی۔ اسے اسوس ہونے لگا کہ فہر پر ہاتھ ڈالنے میں اس نے جلدی کی ہے۔

تھانے میں موجود مٹی نے فوراً ہی چائے کا بندوبست کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد فہر اور جعفر دونوں آئے سامنے بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ جعفر نے سب لیتے ہوئے انس کر کہا

”دیکھ تیرے گاؤں میں آکر میں ہی تجھے چائے پلا رہا ہوں۔ اسے کہتے ہیں وقت اور حالات جس کی دسترس میں ہوں۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔ لیکن یہ جنگ ہے۔ اس میں ہمارا اور جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ تم سناؤ کیسے آگئے۔۔۔ اچا نک یہاں پر؟“

اس کے یوں کہنے پر جعفر نے سکون سے کہا

”میں کل شام کے بعد اپنے گھر پر تھا۔ جب تمہارے پاپا کی فون کال مجھے ملی۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے مجھے

ساری صورت حال بتا کر کہا

”فہر بارے ساری صورت حال میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ اور اب وہ وقت آ گیا ہے بیٹا، جب ہم اس کی مدد کو پہنچیں۔“

تب میں نے ان سے کہا کہ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکلتا ہوں۔ لیکن پاپا نے کہا

”ایسے نہیں، پورے اقدار رات کے ساتھ۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میز پر پڑا ہوا ایک لفافہ اٹھا کر مجھے دیا۔ جسے کھاتے ہوئے میں

نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تب انہوں نے بتایا۔ وہ میرے ٹرانسفر کے آڈرز تھے۔ قسمت مگر کے قریب ہی نور پور قصبہ، جس میں یہ

علاقہ قسمت نگر آتا ہے۔ میں فوراً جا کر وہاں کا چارج لے لوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آئی جی صاحب ان کے بہت اچھے دوستوں میں سے

ہیں۔ ایک تو وہاں نور پور کا ڈی ایس پی نیازی، پہلے بہت زیادہ ہی سیاسی دباؤ میں تھا۔ دوسرا خان ظفر اللہ میرا ویسے ہی جاولہ کرانا چاہ رہا

تھا۔ دس منٹ میں ہو گئے آرڈر۔ بس میں نے آڈرز لئے اور رات ہی آکر یہاں کا چارج لے لیا۔ نیازی تو پہلے ہی تیار بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی

رات ہی چلا گیا۔ باقی معاملات بعد میں ہوتے رہیں گے۔“

”مطلب تجھے پاپا نے یہاں بھیجا ہے؟“ فہر نے کہا تو جعفر نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا

”ہوں۔“ جمی اس نے چونک کر فہر کو سمجھاتے ہوئے کہا، ”ابھی میں تمہارے لیے اجنبی رہوں گا۔ کیونکہ میں ان کا اور چوہدری

جلال کا بیڑا اس پوری طرح کھینچا ہوا ہوں۔ بس خاموش رہنا۔“

”ٹھیک ہے، اسٹاؤ مارہ کیسی ہے؟“ فہد نے پوچھا

”مارہ ٹھیک ہوگی۔ پر تمہیں اس سے کیا، چھوڑو اس کا ذکر۔“ جعفر نے لاپرواہی سے کہا تو فہد بولا

”نہیں، بارودہ ہماری بہت اچھی دوست ہے۔“

”میں تمہاری ابھی بات کروا دیتا مگر یہاں سنگل کا مسئلہ ہے۔“ پھر سامنے بڑے لینڈ لائن فون کو دیکھ کر کہا، ”چاہو تو ابھی اس

سے رابطہ کرلو۔“ جعفر نے کہا تو فہد بولا

”کرتے ہیں پہلے ان کا معاملہ ختم کرلو۔“

”ہوں، یہ ضروری ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے تھانے کے نشی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔



چاچا سو ہوتا ہے گھر کے صحن میں چار پائی پر انتہائی افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بہت رقت آمیز انداز میں گارہا تھا۔

”کیا حال سناواں دل دا۔ کوئی عمر راز نہ ملدا۔ مندھوڑی سرپائم۔ سارا تنگ سوڑو نہ جائم۔ کوئی ٹھمن نہ ویڑے

آئم۔۔۔ ہتھوں آکٹا عالم کھلدا۔“

وہ گاتے ہوئے ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ چند لمبے اسی خاموشی میں گزر گئے پھر پاگلوں کی، اندادھر ادھر دیکھتے ہوئے اوپر

آسمان کی طرف دیکھا اور اچانک رو پڑا۔ وہ ہلک ہلک کر رو رہا تھا۔ تبھی چاچا سو ہوتا انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگا، ”چشم دید گواہ، تو نے

دیکھا قتل ہوتے ہوئے۔۔۔ امین کا قتل۔ خون۔ یہ کیسی دنیا ہے۔ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔۔۔ کون جانے کس کے پلے کیا پڑ جائے

۔۔۔ کوئی نہیں جانتا، بس یہ سارے سرہ کے روتے ہیں۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔“

اتنے میں اس کا دروازہ بجا اور ایک سپاہی اندر آ گیا۔ وہ چاچے سوہنے کے پاس آ کر بولا

”اوجا چا چل تجھے تھالے بلار ہے ہیں۔ وہاں وڈا افسر آیا ہے۔“

”وڈا افسر، وہ کیا کہتا ہے؟“ چاچا سو ہوتا خود کھڑکی کے سے انداز میں بولا جیسے وہ پاگل ہو رہا ہو۔ تبھی سپاہی نے ڈرتے ہوئے کہا

”وہ تجھے بلارہا ہے۔ تو اٹھ چل جلدی کر۔ میں تجھے رستے میں بتاتا ہوں، تو قافٹ چل۔“

چاچے سوہنے نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پیچھے چل دیا۔

چاچا سو ہوتا اور سپاہی آگے پیچھے تھانے میں داخل ہوئے۔ چاچے سوہنے نے دیکھا، وڈا افسر، تمنا نیدار کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

اور تمنا نیدار اس کے سامنے کھڑا ہے تو سپاہی کی سمجھائی ہوئی بات اسے سچ معلوم ہونے لگی۔ جعفر نے چاچے سوہنے کی طرف دیکھ کر پوچھا

”یہ ہے چشم دید گواہ؟“

”جی جی جی ہے۔“ تھانیوار نے اٹھاتے ہوئے کہا تو جعفر نے چاچے سوہنے سے مخاطب ہو کر کہا

”بیٹھو بزرگو۔“ یہ کہہ کر اس نے سپاہی سے کہا، ”اسے پانی پلاؤ۔“

”نہیں صاحب جی، اس کی ضرورت نہیں، آپ حکم کریں، مجھے کیوں بلایا ہے؟“ چاچا سوہنا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے

ہوئے بولا

”یہ بتاؤ، تم نے امین کے بارے میں کیا دیکھا؟“

چاچے سوہنے نے سب کی طرف دیکھا اور انتہائی جذباتی انداز میں بولا

”آپ وڈھے لوگ ہیں، جیسے پہلے لکھا، ویسے ہی اب لکھ لیں۔“

اس پر جعفر نے چونکتے ہوئے پوچھا

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم، کیا تم پر کوئی زبردستی ہوئی ہے؟“

”بولو چاچا بولو، سچ بول دو، اصل بات کیا ہے؟“

فہد نے کہا تو جعفر نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”بولو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بولو چاچا تمہیں ہر طرح کا تحفظ ہے، پولو مت ڈرو۔“

وہاں تھنے میں سب اس کے بونے کے منتظر تھے۔ تبھی چاچا سوہنا ڈرتے ڈرتے بولا

”پرسوں رات میں اور میرا ہتھرا شفاق گھر پر تھے۔“



چھاکا تیار ہو کر باہر جانے کے لئے معین میں آیا تو چاچے سوہنے نے اسے دیکھ کر پوچھا

”اوئے کدھر جا رہا ہے تو اس ویلے؟“

”بچہ کروں کہ سراج ابھی آیا ہے کہ نہیں۔ ورنہ پھر مجھے اکیلے ہی تھانے جانا پڑے گا۔ فہد کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا نا

کیونکہ اک ہی تو چھاکا ہے اس پنڈ میں جس کی پورے علاقے میں دس پوچھ ہے۔“ چھاکے نے کہا تو چاچا سوہنا بولا

”اوجان دے پتر، تو کیا کر سکتا ہے۔ تجھے تو کوئی تھانے میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ ادے ہماری اوقات ہی کیا ہے۔“

”بات اوقات کی نہیں، دوستی کی ہے، میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر چھاکا باہر جانے لگا تو اتنے میں ان کا دروازہ کھلا اور ماکھا اپنے

بندوں کے ساتھ دھڑ دھڑا اندر آ گیا۔ ماکھے کو اس طرح اندر آتے دیکھ کر چھاکا بولا

”اڈے ماکھے۔ تجھے قیڑ نہیں ہے کہ کسی کے گھر کیسے آتے ہیں۔“

ماکھے نے جواب نہیں دیا بلکہ اسے گریبان سے پکارتے ہوئے بولا، ”بس، اب آواز نہیں نکالتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چھ کے کو دھکادے کر اپنے ساتھ آئے لوگوں سے کہا، ”لے چلو اسے۔“

”یہ، یہ..... کیا کر رہے ہو ماکھے؟“ چاچے سوہنے نے کہا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران اس کیساتھ آئے بندوں نے چھ کے کو پکڑ لیا۔ تب ماکھے نے حقارت سے کہا

”ذات کی کوڑھ کر لی اور پھتیروں کو چھسے۔ پنڈ کی تھاں تھاں پر دونوں چوہدریوں کے خلاف باتیں کرتے ہو، برا بھلا کہتے ہو چوہدریوں کو۔ ظلم کرتے ہیں چوہدری.... جمل، ڈیرے پر وہیں مل کر تم سے بات کرتے ہیں۔“

”دیکھ ماکھے تو چھ کے کو چھوڑ دے۔ میں تیرے ساتھ چل ہوں۔ یہ تو پاگل ہے، میں جا کر چوہدری سے معافی مانگ لوں گا۔“

چاچا سوہنا منت بھرے انداز میں بول تو، ماکھے نے انتہائی تھیک سے کہا

”اُوئے چلو آگے لگو، وہیں ڈیرے پر مل کر بات کرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ماکھا باہر کی جانب نکلا تو اس کے ساتھ آئے بندے ان دونوں کو آگے لگا کر باہر کی جانب چل دیئے۔

ماکھے نے ان دونوں کو لے جا کر ڈیرے پر پھینک دیا۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری کبیر کی کار ڈیرے میں داخل ہوئی۔ کار روک کر

چوہدری کبیر باہر آیا۔ اس کے سامنے چاچا سوہنا اور چھ کا بندھے ہوئے پڑے تھے۔ کبیر نے ان کی طرف بڑے غصے سے دیکھا اور ان کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر چاچا سوہنا منت بھرے انداز میں بولا

”چوہدری ہم سے ایسا کیا جرم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ ہمیں باندھ کر یہاں لے آئے ہیں۔“

اس پر چوہدری کبیر نے اس کی طرف نہایت حقارت سے دیکھا اور پھر غصے میں بولا

”اُوئے سوہنے۔ اچو کوں میں بیٹھ کر ہمارے خلاف باتیں کرتا ہے اور تیرا یہ ہتھ، ہمارے دشمنوں کے ساتھ دن رات پھرتا ہے ہمارے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اُوئے یہ کوئی جرم ہی نہیں ہے؟“

اس کے یوں کہنے پر چاچا سوہنا خوف زدہ ہو کر بولا

”چوہدری جی، ہم کی کمین، ہماری اوقات ہی کیا ہے جو آپ کے خلاف سوچیں بھی، منہ سے کوئی بات نکل گئی ہوگی۔ معاف کر

دیں چوہدری صاحب، آئندہ چھ کا کبھی ان کے ساتھ نظر نہیں آئے گا۔“

”اُوئے نظر تو یہ اب ویسے بھی نہیں آئے گا۔ تجھے پتہ ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ یہ بھی ایسا عائب ہو گا کہ.....“

چوہدری کبیر نے غصے میں کہا تو چاچا سوہنا تڑپ کر بولا

”نہ نہ گئے چوہدری صاحب نہ خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ یہ بے وقوف ہے۔ فہد کے پاس ملازمت کرتا ہے۔ میں نے عرض

کیا ہے تا اب یہ کبھی ان کے پاس نہیں جائے گا پوچھ لیں چاہئے اس سے پوچھ لیں۔“

”میں پوچھتا نہیں سوہنے، حکم دیتا ہوں۔ اس کے مر جانے سے علاقے کے لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ جو بندہ بھی ہمارے خلاف سوچے گا، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اُوئے لے جا مکھے اسے۔ شکل گم کر اس کی۔“ چوہدری کبیر نے اسی غرور سے کہا تو چھاکے نے غضب ناک لگا ہوں سے چوہدری کبیر کی طرف دیکھا۔ چاچا سوہنا شدت سے بولا

”خدا کے لیے رحم کریں کئے چوہدری جی، خدا کے لیے رحم کریں۔ معاف کر دیں اسے، معاف کر دیں۔“

لیکن چاچے سوہنے کی ایک نہیں سنی گئی۔ مکھے اور دوسرے ملازمین چھاکے کو کھینچ کر اندر لے گئے۔

”ہونہد معافی، اس وقت یاد نہیں آیا جب ہمارے خلاف فہد کا ساتھ دے رہے تھے۔“ چوہدری کبیر نے کہا تو چاچا سوہنا بے دم

سا ہو گیا۔

”رحم کریں چوہدری جی رحم۔“ چاچے سوہنے نے منت کرتے ہوئے کہا تو چوہدری کبیر نے سوچتے ہوئے کہا

”ایک ہی صورت ہے سوہنے، تیرا پتر فٹا سکتا ہے، جیسا ہم کہیں دیا کرنا ہوگا۔“

”میں ویسا ہی کروں گا آپ حکم دیں۔“ چاچا سوہنا تیزی سے بولا

”تو پھر سن۔ تو امین ارا نہیں کے قتل کا چشم دید گواہ ہے۔“

یہ سن کر وہ حیرت سے بولا

”یہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تو نے امین ارا نہیں کو اپنی ان آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کا قاتل فہد ہے۔“

چاچے سوہنے نے پاگلوں کی طرح اسے دیکھا اور سر سراتے ہوئے بولا

”یہ، یہ کیا چوہدری جی۔“

”اس کی گواہی تم قاتل نے اور عدالت میں دو گے۔ اگر یہ گواہی نہیں دی تو تیرا پتر نہیں رہے گا۔ یہی تیری سزا ہے۔ بول تو چشم دید

گواہ ہے، تو گواہی دے گا؟“

یہ سن کر چاچا سوہنا پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولا

”ہاں چوہدری جی، میں امین ارا نہیں کے قتل کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اس کا قتل ہوتے دیکھا ہے، میں گواہی دوں گا، میں

گواہی دوں گا۔ پر میرا پتر توفیق جائے گا نا؟“

”ہاں، پھر تیرا پتر فٹا جائے گا۔ ورنہ سمجھو، وہاں پر پہنچ گیا۔“ چوہدری کبیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”نہیں چوہدری جی، ہم آپ کی رعایا ہیں، ہو گا وہی جو آپ کہیں گے۔“ چاچا سوہنا روتے ہوئے بولا

”جل ٹھیک ہے جا بھل جا کر قاتل نے میں کو ہی دے دیا، تیرا پتر گھرا جائے گا۔ اب جا شکل گم کر اپنی جمل۔“

چاچے سوہنے نے بے بسی سے کیر کی طرف دیکھا اور روتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ آگے جاتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر چوہدری کیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔



چاچا سوہنا اپنی روداد سنا کر غموش ہو گیا۔ تنیدار ایک طرف پریشان کھڑا تھا۔ فہد ایک کرسی پر براجمان تھا۔ جعفر نے تنیدار کی طرف غضب ناک انداز میں دیکھا پھر سخت لہجے میں پوچھا

”کیا یہ غلط کہہ رہا ہے؟“

”سُرتی، میرا اس میں کیا قصور؟ یہ کس سے بیک میل ہوا، کیسے ہوا؟ مجھے تو اس کا علم نہیں، اس نے جو بیان دیا میں نے وہ لکھ لیا۔“ تنیدار نے اپنا دامن پپے کی کوشش کی تو جعفر نے دھاڑتے ہوئے پوچھا

”خالی پیچہ پر؟ میں سمجھ گیا کہ اس میں تیرا کتنا قصور ہے۔ تیرے جیسے کالے لوگوں نے ٹھکے کی حالت بری کی ہوئی ہے۔ سنو! میں نہ تو تمہیں محفل کروں گا، اور نہ ہی تیرا یہاں سے تبادلہ ہونے دوں گا۔ تو جانتا ہے کہ یہ تیرے لیے کتنی بڑی سزا ہوگی۔“

تنیدار یہ سن کر ایک دم سے چکرا گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہینٹر ابد لٹے ہوئے کہا

”سُرتی، میرا قصور نہیں ہے۔ آپ جو حکم کریں گے، میں تو وہی کروں گا ناجی۔“

”تو پھر ایسا کر، فوری طور پر چھاکے کو لے کر قتل والی جگہ پر پہنچ، میں وہ موقع دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب میں نے یہ نہیں سنا کہ وہ چوہدری کے ڈیرے پر نہیں تھا۔“ جعفر نے کہا تو تنیدار فوراً ہی سیلوٹ مارتے ہوئے بولا

”میں سمجھ گیا ناجی، میں جانتا ہوں ناجی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ فوراً پلٹ گیا۔ اس کے جانے کے بعد چاچے کی طرف حوجہ ہو کر جعفر نے پوچھا

”ان بندوں کو جانتے ہو تم؟“

”جی وہ چوہدریوں کے نوکر چاکر ہیں، خاص کر نکلے چوہدری کے۔“

”جاؤ چاچا۔ ابھی کچھ دیر تک تیرا بیٹا آئے تو بتاتا۔ میں ابھی نہیں ہوں۔“

جعفر نے کہا تو چاچا سوہنا ممنونیت سے بولا

”بہت مہربانی، بڑا شکر یہ، میرے پاس دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ہے صاحب ناجی۔“

”تم جاؤ میں تم سے بعد میں ملوں گا۔“ جعفر نے کہا

چاچا وہاں سے چلا گیا۔ جی فہد نے کہا

”تمہیں نہیں اندازہ یہاں لوگ کس قدر خوف زدہ ہیں۔ جب تک چوہدریوں کا یہ خوف ختم نہیں ہوگا۔ لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں

کریں گے۔“

”ہوں میں سمجھتا ہوں خیر۔“ یہ کہہ کر اس نے قہانے میں موجود دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے کا سوچا اور انہیں اپنے پاس بلانے لگا۔



کارڈرائیو کرتے ہوئے مائرہ کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اس نے اپنی کار جعفر کے گھر کے سامنے کار روکی اور پھر اتر کر بتل دے دی۔ چند لمحے انتظار کرنے بعد اس نے دو ہاتھ بتل دی تو گھر کا ملازم باہر آ گیا اس نے مائرہ کو پہچانتے ہوئے کہا

”جی مائرہ صاحبہ آپ آجائیں اندر؟“

مائرہ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا

”جعفر کہاں ہے۔ وہ فون کیوں نہیں پک کر رہا ہے خیریت تو ہے نا؟“

”جی فون کا تو مجھے پتہ نہیں، ویسے وہ کل شام کے یہاں نہیں ہیں۔ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ مجھے بھی انہوں نے فون پر بتایا تھا۔ کل شام سے وہ یہاں گھر نہیں آئے۔“

اس پر مائرہ نے حیرت سے پوچھا

”تبادلہ؟ وہ کہاں، کیا وہ یہاں نہیں ہے؟“

”جی نہیں۔ ان کا چانک ہتھلک کی دور کے قصبے نور پور میں ہو گیا ہے۔“ ملازم نے بتایا

”خیریت ہے، مجھے بتایا ہی نہیں اس نے۔ فون بھی نہیں مل رہا ہے۔“ مائرہ نے حیرت بھرے احوال میں کہا تو ملازم بولا

”بتایا تا کہ وہ چانک یہاں سے نکلے ہیں اور بہت جلدی میں تھے۔ اور آپ انہیں اندر نہیں۔ میں چائے بناتا ہوں آپ کے لئے۔“

”نہیں میں اب چلتی ہوں۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ اچھا، اس سے جب بھی رابطہ ہو میرے ہارے میں بتانا۔“ مائرہ نے کہا اور کار کی جانب الٹی تو ملازم نے کہا

”جی بہتر۔“

مائرہ مڑ کر کار میں جا بیٹھی اور اگلے چند لمحوں میں وہ کار بڑھا کر چلی گئی۔

مائرہ اپنے آفس میں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔ ایسے میں اس کا سیل فون بجا۔ پہلے تو وہ اس کا کوئی اندازہ نہ کرتی رہی۔ پھر سرسری سا فون سکرین دیکھ کر چونک کر فون اٹھا لیا۔ فون رسد کر کے مائرہ نے تعجب سے کہا

”ہیلو۔!“

”میں فہد بات کر رہا ہوں مائرہ۔! کیسی ہو؟“

اس کی آواز سن کر مائرہ خوشی سے جھوم اٹھی

”فہم تم۔۔۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے کہ یہ بات کر رہے ہو۔ کیسے ہوتم۔ ٹھیک تو ہوتا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ کیا میں نے پہلے کبھی بات نہیں کی؟ فہم نے کہا تو وہ بولی

”تو پھر آج اتنے عرصے بعد تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا۔ تم ٹھیک تو ہوتا؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تمہارا کیا مطلب، میں ٹھیک نہیں ہوں گا۔ تبھی تمہیں فون کروں گا۔ کیا تم یہی اس لگائے بیٹھی ہو۔“ وہ ہنستے

ہوئے بولا

”نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ یہ اچانک تمہارا فون آنا، تو شاید۔۔۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”میں نے اس وقت فون کیوں کیا۔ اس کی تفصیلات میں پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت مجھے تمہاری یاد آئی تو میں نے فون کر

لیا۔ خیر چھوڑو۔ ابتداء کیا چل رہا ہے سب۔“ اس نے خوشدلی سے کہا

”سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بس تمہاری کمی شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ اب تو مانا نے بھی میری شادی کے لیے کہنا چھوڑ

دیا ہے۔ تم سناؤ۔ کیسے ہو۔ تمہارا جی لگ گیا ہے وہاں پر۔ کب آ رہے ہو وہاں؟“ مائرہ نے پوچھا تو وہ دھیرے سے بولا

”پتہ نہیں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خیر۔ تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں پھر فون کروں گا، اللہ حافظ“

”میں انتظار کروں گی۔ اللہ حافظ“ مائرہ نے کہا تو دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ وہ حیرت سے فون کو دیکھتی رہی پھر اپنے

خیالوں میں کھو گئی۔



حویلی کے پورج میں کار کھڑی ہوئی تھی۔ چوہدری جلال حویلی سے باہر نکلا۔ وہ کار میں بیٹھنے لگا تو سامنے سے منشی کو تیز خیز آتا

دیکھ کر چوک گیا۔ منشی حمزہ سے قریب آیا تو چوہدری جلال نے پوچھا

”اوئے خیر تو ہے منشی تجھے؟“

”وہ تمہانیدار، فہم کو عدالت نہیں لے جا سکا۔ تمہانے میں اچانک کوئی نیا اے ایس پی آ گیا ہے۔“ منشی نے مودب لہجے میں اور

پھولی سانس کے درمیان کہا تو چوہدری جلال چمکتے ہوئے بولا

”نیا اے ایس پی؟ میری اجازت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے۔ کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پیدائش رات کیا ہو گیا ہے؟“

”جی چوہدری صاحب، پتہ کریں، یہ کوئی جعلی نوکری نہ ہوں۔“

”کہتا کیا ہے وہ نیا اے ایس پی؟“ چوہدری جلال اس کی بات نظر انداز کر کے بولا

”ابھی تمہانیدار کا پیغام آیا ہے۔ اس نے بندہ بھیجا ہے۔ اسی نے تفصیل بتائی ہے۔ اس نے آنے ہی فہم کی اٹھڑی اتروادی۔ کہتا

ہے میں خود تفتیش کروں گا۔ اس نے تو آتے ہی تمہانیدار کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پتہ کریں جی یہ تارلوں ہو کیسے گیا؟“ منشی نے حمزہ سے کہا

”میں ابھی نور پور ہی جا رہا ہوں۔ وہاں جاتے ہی معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا بات ہوئی ہے۔ تم کبیر سے کہو وہ تھانے کے معاملات کا خیال رکھے۔“ چوہدری جلال نے لا پرواہی سے کہا تو منشی بولا

”جی میں کہہ دیتا ہوں۔ دیکھیں چوہدری صاحب اگر معاملہ الٹا ہو گیا تو بہت قسط ہو جائے گا۔“

”اُوے تو اب یوں ڈر رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں نا۔ تمہیں جو کہا ہے وہ کرو۔“ چوہدری جلال نے اسے ہنسرکتے ہوئے کہا تو وہ

مردوب لہجے میں بولا

”جی چوہدری صاحب“

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چوہدری جلال کاہر میں بیٹھا تو کار چل پڑی۔ منشی حویلی کی طرف بدھتا چلا گیا۔



سہمی اپنے کمرے میں اداس بیٹھی ہوئی سوچوں میں کھوئی تھی کہ اسے دستک کی آواز آئی۔ وہ چونک گئی جیسے کوئی خوشی کی نوید مل گئی ہو۔ وہ فوراً اٹھی اور باہر کی جانب لپکی۔ وہ واہانہ پن میں دروازے تک گئی۔ اس کے انداز میں اضطراب تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا، سامنے فہد کھڑا تھا۔ اس نے خوشی سے اسے راستہ دیا تو وہ اندر آ گیا۔ دونوں محن میں آئے تو سہمی نے دبی دبی خوشی میں پوچھا

”آپ آ گئے، کیوں لے گئے تھے آپ کو؟“

”ہاں میں آ گیا اور کیوں لے گئے تھے۔ اس کا مجھے بھی نہیں پتہ۔ لیکن تم نے بنا پوچھے پوچی دروازہ کھول دیا۔ کوئی اور بھی ہو

سکتا تھا۔“ فہد نے کہا تو سہمی بولی

”میں آپ کی دستک پہچانتی ہوں۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ آپ ہی ہیں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“

”سہمی! اتنا یقین ہے میری ذات پر؟“ فہد نے پوچھا

”ہاں۔ اب تو خود سے بھی زیادہ ہے۔ اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

اس پر فہد نے چونک کر اسے دیکھا اور بات بدلتے ہوئے پوچھا

”استاد جی کہاں ہیں؟ وہ پریشان تو ہوں گے؟“

”ہاں۔ اوہ بہت پریشان تھے۔ مگر کوئی خیر خبر بھی تو نہیں تھی آپ کی۔ ان کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ میں نے انہیں دوا کی

دے دی۔ اب وہ اندر پڑے سو رہے ہیں۔ انہیں جگا دوں؟“ سہمی نے تیزی سے کہا

”نہیں سونے دوا انہیں۔ میں انہیں کچھ دیر بعد آ کر مل لوں گا۔ ابھی مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ بس یہی بتانے آیا تھا کہ اب

پریشان نہیں ہوتا۔“ فہد نے کہا تو سہمی جلدی سے بولی

”آپ آؤ نا، کچھ کھا لو آپ نے کچھ نہیں کھایا ہو گا؟“

”نہیں، ابھی نہیں، میں بس بتانے آیا تھا کہ میں ٹھیک ہوں واپس آ گیا ہوں، پریشان نہیں ہونا۔“ فہد نے کہا تو وہ زیادہ

اغتراب سے بولی

”آپ کچھ دیر تو بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بنا کر ماتی ہوں پھر باتیں کریں گے۔“

اس پر فہد نے اس کے چہرے پر دیکھا پھر ذرا سوچ کر بولا

”جلی بناؤ چائے، میں بیٹھتا ہوں۔“

یہ سن کر سہلی جیسے خوشی سے نہاں ہو گئی۔ وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ فہد اسے مسکراتے دیکھتا ہوا صحن میں پڑی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔



قسمت نگر اور نور پور سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں عزیز آباد تھا۔ ملک نعیم کا ذریعہ اسی گاؤں سے باہر تھا۔ ملک نعیم بڑا خدا ترس انسان تھا۔ لوگوں کو اس سے بہت ساری امیدیں رہتی تھیں۔ دو بار اس نے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ اس کا مقابلہ چوہدری جلال سے ہوتا اور وہ دونوں بار الیکشن ہار گیا تھا۔ وہ لمبے قد کا باریش اور عقیدہ انسان تھا۔ اگرچہ اس کی شخصیت بارعب تھی لیکن وہ اندر سے بہت نرم دل واقع ہوا تھا۔ اس وقت ملک نعیم ڈیرے کے ایک کمرے میں صوفے پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں اس کا مزارع بخشو اندر آ گیا۔ ملک نعیم نے اسے اخبار کے اوپر سے دیکھا اور خوشگوار انداز میں پوچھا

”اوئے آ بخشو، کیا حال ہے تیرا۔ اتھاری بیٹی کی شادی تو ٹھیک ٹھاک ہو گئی ہے نا؟“

”جی ملک صاحب آپ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں بھی بتانے اور آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ آپ میری مدد نہ

کرتے تو میں اپنی بیٹی۔۔۔۔۔“

تبھی ملک نعیم نے اس کی بات کا نٹے ہوئے عاجزی سے کہا

”اوئے بخشو شکر ادا کر اس سوہنے پروردگار کا، جس نے مجھ دیا اور میں نے تمہیں دیا۔ اس میں میری کیا مہربانی ہے بھلا۔“

”نہیں ملک صاحب، جتنا آپ نے دیا، اتنا میں ساری زندگی نہیں کما سکتا تھا میری بیٹی عزت سے اپنے گھر رخصت ہو گئی۔“

بخشو نے ممنونیت سے کہا تو ملک نعیم نے کہا

”اچھا، اچھا، ٹھیک ہے۔ اب خدا کے لیے اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے پھرنا جو تھوڑی بہت نیکی کی ہے وہ بھی ضائع ہو جائے۔“ لفظ

اس کے منہ ہی میں تھے کہ اتنے میں اس کا خاص ملازم کریم دادا اندر آ کر بولا

”ملک صاحب۔ اوہ باہر نیا سائیس پل آیا ہے، کہہ رہا ہے کہ آپ سے مناجا ہوتا ہے۔“

”نیا سائیس پل؟ وہ یہاں کیوں، خیر بلاؤ اسے اور بخشو اب تو جا۔“ ملک نعیم نے کہا تو کریم دادا ہار چلا گیا۔

”اللہ آپ کا بھلا کرے، اللہ آپ کو اور زیادہ دے۔“

یہ کہتے ہوئے بخشوی باہر چلا گیا تو جعفر اندر آ گیا۔ ملک فہیم نے اٹھ کر اس سے ملایا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے جعفر نے کہا

”ملک فہیم صاحب مجھے جعفر رضا کہتے ہیں۔“

”پلیز تعریف رکھیں جعفر صاحب۔“

دونوں آنے سے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے تو جعفر نے کہا

”میں نے آج صبح ہی نور پور میں چارج لیا ہے اور آج ہی مجھے قسمت نگر میں ایک تفتیش کے لیے جانا پڑا۔ وہیں سے مجھے آپ

کے بارے میں معلوم ہوا تو سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے، فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ ملک فہیم نے پوچھا

”ملک صاحب، خدمت میری نہیں اپنے علاقے کے لوگوں کی کیجئے۔ انہیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔“

جعفر کی یہ بات سن کر ملک فہیم ایک لمحے کے لئے چمک گیا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا

جعفر صاحب، میں نے دو بار ایم این اے کا الیکشن لڑا ہے اور دونوں بار ہار گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاقے کے عوام مجھے

نہیں چاہتے۔ باقی جو مجھ سے ہو سکتا ہے، وہ میں کرتا رہتا ہوں۔“

”عوام آپ کو نہیں چاہتے، کیا صرف یہی وجہ ہے؟“ جعفر نے پوچھا تو ملک فہیم نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، دیکھیں عوام پر خوف کی فضا طاری ہے کہ نجانے کیا ہو جائے گا۔ یہ

فصلہ گردی ہے اور جو کچھ چوہدری جلال کرتا ہے، شاید وہ مجھ سے نہ ہو سکے۔ بس ایسی ہی وجوہات ہیں۔“

”ملک صاحب، اگر آپ مایوس نہیں ہوئے اب بھی آپ میں ہمت اور حوصلہ ہے۔ تو آپ انہیں میرے آفس، مجھے آپ سے

بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔“ جعفر نے ایک دم سے کہا تو ملک فہیم نے مسکراتے ہوئے کہا

”میں اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوا جعفر صاحب۔ اس نے جو کام مجھ سے لیا ہے خود ہی لے لے گا۔ میں ایک دو دن

میں آپ کے ہاں آؤں گا اور آپ سے مل لوں گا۔“

”تو یہ طے ہوا میں آپ کا انتظار کروں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔“ جعفر نے کہا

”ایسے کیسے جاسکتے ہیں۔ آپ کچھ کھائے پئے بغیر تو نہیں جاسکتے آپ۔“ ملک فہیم نے خوشگوار لہجے میں کہا

”پھر کسی، بہت سارے مواقع آئیں گے، ابھی وقت نہیں ہے۔“ جعفر یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ ملک فہیم بھی ساتھ میں اٹھا۔

دونوں باہر کی جانب چل پڑے۔

انہی لمحات میں سراج کے ڈبرے پر سراج اور رانی، دونوں ایک کھیت کے کنارے بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ اس کے

چہرے پر حیرت کے ساتھ غصہ بھلا ہوا تھا۔ اس نے منتشر لہجے میں کہا

”رائی۔ ایہ کیسی دنیا ہے بندہ کس پر اتھار کرے؟“

”اگر تم فہد کے حوالے سے بات کر رہے ہو تو تم غلط سوچ رہے ہو۔“ رائی نے کہا

”کیا مطلب تم اس طرح کیسے کہہ سکتی ہو؟“ اس نے پوچھا تو رائی بولی

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سراج۔ چودہویں نے تمہیں اور فہد کو الگ الگ کرنے کی بہت بڑی سازش کی ہے۔ یہ فہد کے قتل والی

بات بھی غلط ہے۔ یہ سب میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

”تم نے؟“ سراج نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا تو رائی سر ہلاتے ہوئے بولی

”ہاں ہاں، میں نے سنا۔ یہی بات بتانے تو میں یہاں تک، اس وقت یہاں تک آئی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ساری رواد سنا دی۔ سراج ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا

”تم سچ کہہ رہی ہو نا؟“

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ خیر۔ اب اگر تم فہد سے الگ ہو ہی گئے ہو تو ایک طرح سے ٹھیک ہی ہوا ہے۔ جو ہونا تھا

سراج، وہ تو ہو گیا۔ باقی زندگی سکون سے گزارنے کے لیے تم چودہویں سے صلح کر لو۔“

”یہ تیری سوچ ہے نا۔ خیر تو اب جاگھر، باقی باتیں پھر کریں گے۔“ سراج نے تیزی سے کہا تو رائی نے فہم ہوتے ہوئے کہا

”سراج کیا ہو گیا ہے تمہیں، میں نے تمہیں غلط مشورہ نہیں دیا۔ یہ بہت اچھا موقع ہے۔ تم مجھے آسانی سے حاصل کر سکتے ہو۔“

اس پر سراج نے اضرائی انداز میں کہا

”میں سوچتا ہوں ہم اس پر پھر بات کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم کرتے رہنا بات، اچھا میں چلتی ہوں پھر۔ کرنا میرا انتظار۔“

یہ کہہ کر وہ جھٹکتے ہوئے اُٹھی تو سراج بھی اٹھ گیا۔ سراج اپنی سوچوں میں محوم کر رہ گیا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہو کیا گیا

ہے۔ رائی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر بل دی۔ الجھ ہوا سراج پھر وہیں بیٹھ گیا۔

چاچا سوہنا اس صورت لئے اپنے گھن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر یوں رکھے ہوئے تھے، جیسے اپنا سب

کچھ لٹا آیا ہو۔ اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں یہ شعر پڑھے

”چلتا فلک اندیشے آون نہ نہ صفاں قطراں ... دس نہیں چلدا میرا قسمت ہتھ مہاراں“

اتنے میں مرغا بولا تو چاچے سوچنے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سے چھا کا اندر آ گیا تھا۔ چاچا سوہنا انتہائی

خوشی میں بڑھ کر اسے گلے لگایا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان زلموں کو دیکھا جہاں تشدد کے آثار تھے۔ اس

نے بڑے درد مند لہجے میں کہا

”تو ٹھیک تو ہے نا ہر؟“

”ہاں ابا، میں تو ٹھیک ہوں پر تو نے چنگا نہیں کیا فہد کے ساتھ؟“ اس نے دیکھی بچے میں کہا

”تو جانتا ہے چھاکے میں نے ایسا کیوں کیا؟ تیری زندگی کا سواں تھا ہر۔“ چاچا سوہنا بھی دکھ سے بولا

”اور ابا تو بھی جانتا ہے، ایک چھاکے کے مر جانے سے قسمت مگر میں تو کیا، کہیں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اگر فہد کو کچھ ہو

جاتا تو بہت سارے لوگوں کی قسمت میں اندھیرا چھا جاتا۔“ چھاکے نے اس کی اہمیت بتائی

”تجھے کیا پتہ چھاکے، اوراد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ محبت جب آزمائش میں پڑتی ہے نا تو کچھ بھی قربان کرنے کے لیے سوچتا

نہیں پڑتا۔“ چاچا سوہنا دردمندی سے بولا تو چھاکے نے کہا

”ابا، اتنی عمر مگر مٹی ان چوہدریوں کو تھوڑا لے والا کوئی پیدا نہیں ہو سکا۔ اب اگر کوئی آگیا ہے تو اس کے ہاتھ اور بازو ہم ہی نے

مضبوط کرنے ہیں یہ بات تو کیوں نہیں سمجھتا، اور پھر وہ بھی ہماری ہی ہاتھوں ابا؟“ چھاکا رو دینے کو تھا۔

”میں سب سمجھتا ہوں پتر اور مجھے اپنی لطفی کا احساس تھا، یہی وجہ ہے کہ میں نے وڈھے افسر کے سامنے ساری بات کج کج بتادی

۔ اب جو وہ گادہ دیکھا جائے گا۔“ چاچے نے کہا تو چھاکا دکھ سے بولا

”اب میں تو ساری حیاتی فہد کو نہ دکھانے کے رائق نہیں رہانا، کیسے سامنا کر پاؤں گا اس کا؟“

”تو فکر نہ کر میں جا کو معافی مانگ لوں گا اس سے۔ مان جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں سوچتا رہا جیسے اسے کہنے کو لفظ تلاش کر رہا

ہو، پھر جلدی سے بولا، ”دیکھ تیرا لکڑ تیرے ہاتھ کتنا اداس ہو گیا ہے۔ جا جا کر اسے کچھ کھلا پڑا باقی اللہ سائیں بھڑ کرے گا۔ میں وڈھے افسر کو

بتاؤں کہ تو گھر آگیا ہے۔“

”وہ نور پور واپس چلا گیا ہے۔“ چھاکے نے بتایا

”اچھا چل تو آرام کر میں ابھی آتا ہوں۔“ چاچے نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔ چھاکا ڈھال سا چار پانی پر لیٹ گیا۔



سہ پہر ہو چکی تھی۔ حویلی کے لان میں دونوں باپ بیٹا لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اسنے میں مٹھی فضل دین آ کر

ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ تب چوہدری کبیر نے پوچھا

”ہاں بھئی مٹھی! اسنا وہ فہد والے سناٹے کا کیا ہوا؟“

”چوہدری جی۔ اس اے ایس پی نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ اس جگہ گیا، جہاں نقل ہوا تھا۔ موقع دیکھنے۔“

یہ سن کر دونوں باپ بیٹے نے مٹھی کی طرف دیکھا۔ پھر چوہدری کبیر نے پوچھا

”یہ اصل میں ہوا کیا ہے۔ کچھ پتہ چلا آپ تو مجھے تھے نور پور؟“

”دہیں سے یہ پتہ چلا ہے کہ اس اے ایس پی کا جادو خود آئی جی نے کیا ہے۔ اس جادو لے کے بارے ڈی ایس پی کو بھی رات ہی مظلوم ہوا تھا۔ ایسے جادو لے۔ ایویں نہیں ہو جاتے۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا

”ممکن ہے یہ ملک نصیم کا کوئی کھیل ہو؟“

”نہیں! ایسا ممکن نہیں ہے۔ ملک نصیم اتنا بڑا کھیل کھیلنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کے پاس اتنی طاقت ہے۔ اب فہر کو چوہدری سنجیدگی سے سمجھانا ہوگا۔ یہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ چوہدری جلال نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر نے چوہدری سے پوچھا

”کیا خطرناک ہو سکتا ہے بابا۔ وہ کوئی لوہے کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔ ایک گولی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے۔“

”میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کبیر وہ کتنی جلدی حالات سے باہر آتا ہے۔ اب سمجھتا ہے کہ وہ کس کی وجہ سے باہر آیا۔ مجھے کوئی اور ہی کہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے پیچھے کون ہے۔ اسے تلاش کرنا ہوگا۔ میں نے ایک بندے سے پتہ بھی کروایا لیکن اس نے کوئی خاص معلومات نہیں دیں۔“ چوہدری جلال اس کی گولی کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا

”تو پھر آپ سیدھے آئی جی سے ملیں۔ اور اس سے بات کریں۔“ چوہدری کبیر نے صلاح دی۔

”ہاں۔! بات کرنا پڑے گی۔ کوئی نہ کوئی سراپہ تو ضرور وہاں سے ملے گا۔“ چوہدری جلال نے پرامید لہجے میں کہا تو فنی فضل دین نے کہا

”بات یہ بھی سوچنے والی ہے چوہدری صاحب کہ اے ایس پی اچانک اس کے پیچھے تھانے کیوں پہنچ گیا۔ اور اسے کسی ضمانت کے بغیر چھوڑ دیا۔ کیا راز ہے اس میں؟“

”ہاں۔! یہ بات بھی غور کرنے والی ہے۔ کہیں ہمارا کوئی دشمن انہیں استعمال نہ کر رہا ہو۔ جو بڑے غیر محسوس انداز میں ہم پر وار کر رہا ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا

”ایسا کون ہو سکتا ہے بابا۔“ چوہدری کبیر نے پوچھا

”نہی تو اب سمجھتا ہوگا۔ میں خود دفتر سے بات کرتا ہوں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو فنی فضل دین نے کہا

”جی ٹھیک ہے جی، میں ابھی فون لا دیتا ہوں۔“

”اور کبیر۔! تم تھانیدار کو بلا کر تفصیل پوچھو، دیکھتے ہیں کون ہے ہمارا چمپا ہوا دشمن۔ جادو اور اسے ڈرے پر ہٹا کے پوچھو۔“

چوہدری کبیر نے جواب نہیں دیا بلکہ اٹھ کر چل پڑا۔ چوہدری جلال سوچ میں گم ہو گیا۔ فنی فضل دین نے اس کی طرف دیکھا اور واپس حویلی کے اندر کی جانب پٹ گیا۔

چوہدری کبیر صوفے پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اس کے قریب فرش پر بیٹھا کھانگن صاف کر رہا تھا۔ ایسے میں تھانیدار وہاں آ

گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر چوہدری کبیر نے طنزیہ انداز میں پوچھا

”اؤئے ابھی تھانیدار صاحب، بڑا پریشان لگ رہا ہے۔ کیا بات اے ایس پی نے کچھ زیادہ ہی سمجھ دیا ہے تمہیں؟“

”چوہدری تو میری چھوڑ دیے تھے کہ وہ چھوڑ دیا ہے سوچنے کا حق؟“ یہ کہہ کر اس نے ایک لمبے کو خاموش ہو کر چوہدری کبیر کی آنکھوں میں دیکھا پھر بولا: ”میں جانتا ہوں۔ تمہارے ذہن پر سے کوئی تمہاری مرضی کے بغیر بندہ نہیں لے جاسکتا۔ لیکن اے ایس پی نے چھپہ بھی نہیں مارا اور بندہ تم لوگوں کو خود ہی پھورنا پڑا، کیوں؟“

”یہ تو کیسی بات کر رہا ہے۔“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا تو تھانیدار بولا

”نکے چوہدری جی، میں مانتا ہوں کہ تم لوگوں کا رعب و ہراس پورے علاقے پر ”تھا“۔ مگر اب نہیں رہا۔“

اس پر چوہدری کبیر نے ہنرک کر کہا

”اؤئے یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب تم لوگوں کی صرف بڑھک رہ گئی ہے۔ کر کچھ نہیں سکتے۔ کیا فائدہ ایم این اے ہونے کا ایک ڈی ایس پی کا جاولہ ہو گیا اور پتہ ہی نہیں چلا۔ مان لو کہ اب علاقے پر گرفت ہی نہیں رہی، تم لوگوں کی تو افسروں میں بھی وہ بات نہیں رہی۔“ تھانیدار نے طنزیہ لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر نے غصے میں کہا

”گلتا ہے آج اے ایس پی کی جھڑکیوں سے تیرا داغ خراب ہو گیا ہے۔ اور تو کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔“

”میں زیادہ نہیں بولا بلکہ تم لوگوں کو اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی زعم ہے۔ ایک بندہ تم لوگ کا یونٹیں کر سکے۔ ڈھسے چوہدری صاحب ایک ڈی ایس پی سے کام نہیں لے سکے۔ فہد نے اپنی مرضی کا اے ایس پی لگو الیا۔“ تھانیدار نے حقیقت اسے بتائی تو ہنرک کر بولا

”اب دیکھنا۔ اب ہوتا کیا ہے؟“

”نہیں نکے چوہدری جی، میرا مشورہ یہی ہے کہ اب بڑھکیں مارنا چھوڑ دیں اگر کچھ کر سکتے ہو تو کر لیں ورنہ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ چوہدری کبیر ایک دم سے غصے میں اس قدر آگیا کہ اس کی آنکھوں سے خون اترتا ہوا محسوس ہونے لگا۔



سورج غروب ہو چکا تھا۔ فہد اپنے گھر کے مگن میں بیٹھا کچھ کاغذات پڑھنے میں غم تھا۔ اتنے میں اس کا دروازہ بھی تو وہ چونک

گیا، پھر اس نے پوچھا

”کون ہے آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔“

وہ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں اسے سراج دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ پر کسی بھی قسم کے جذبے سے

عاری تھا۔ فہد کسی غیر متوقع صورت حال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ سراج آگے بڑھ کے قریب آیا تو اس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے آثار پھیل گئے۔ فہد تھوڑا سا پرسکون ہو گیا۔ سراج نے قریب دیکھتے ہوئے کہا

”میں بہک گیا تھا فہد، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں یا، ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ سوچ نہیں آئی کہ دشمنوں کا وار ہے۔ میں دوستی کا حق ادا نہیں کر سکا۔ فہد میں تیری دوستی کے لائق تو نہیں ہوں پر میں تیری منت تو کر سکتا ہوں کہ تو مجھے معاف کر دے؟“

”بات بکنے یا نہ بکنے کی نہیں ہے سراج، یقین کی ہوتی ہے۔ انہوں پر یقین ہونا تو انسان کبھی نہیں بہکتا۔ میں نے تم پر سب سے زیادہ اعتماد کیا تھا۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ دشمن کتنا گھٹیا ہے۔ پھر بھی تم اس کے دھوکے میں آ گئے؟“ فہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بے خوف تھا نا، اس لیے ان کے دھوکے میں آ گیا۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں اور اپنی معافی میں ایک ہی لفظ کہنے کا حق نہیں رکھتا، مگر تجھے اس بات کا تو یقین ہو گا نا کہ میرے غلوں میں کہیں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“ سراج نے شرمندگی سے کہا تو فہد بولا

”شیشے میں ہل آ جائے نا تو پھر خیر کیا جاتے ہو اب تم۔“

”معافی مانگتے آیا ہوں۔“ اس نے کہا اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔ فہد نے اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے چند لمحے خود پر قابو پا تا رہا، پھر مشکل سے بولا

”نہیں کرو یا، دشمنوں نے بہت اوجھاوار کیا تھا۔ میں بھی تیری جگہ ہونا نا تو بہک جاتا چھوڑ بس۔ اب آگے کی سوچ۔“ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”میں بہت شرمندہ ہوں یا کہ تم پر اعتماد ہی نہیں کیا۔ میں کتنا غلط سوچتا رہا ہوں۔“ سراج کی ندامت شتم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کیے آنسو چھلک پڑے۔ تو فہد بولا

”کہنا نا، شتم کر اس بات کو آجیٹہ“

”تیرا بزدل ہے یا، میں ہی بے یقین تھا کہ تجھ پر یقین ہی نہیں کیا۔“ سراج نے آنسو پونپھٹے ہوئے کہا

”چل یا چھوڑ اس قصے کو بیٹھ جا اب“ فہد نے کہا

”بیٹھو کیسے؟ اس چھاکے کو تو لے کر آئیں نا، جیسے مجھے معاف کر دیا، ویسے اے بھی معاف کر دے۔ تجھے ساری حقیقت کا شاید نہیں پتہ۔“ سراج نے کہا

”مجھے معلوم ہے یا رادو مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اب انہوں نے کیا کرنا ہے۔ کہنے دشمن کا دار بڑا گھٹیا ہوتا ہے۔ چل چھاکے کو لے آئیں۔ اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔“ فہد نے ایک دم سے کہا تو وہ دونوں باہر کی طرف چل دیے۔



حبیب الرحمن اور بانو بیگم اپنے گھر کے ڈرائیجک روم میں ناشتے کی میز پر تھے۔ اسٹن میں مائرہ بڑے خوش گوار موڈ میں وہیں آگئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے خوشی بھرے لہجے میں کہا

”گڈ مارننگ پاپا، گڈ مارننگ ماما۔“

”ماشا اللہ! آج تو بہت بھاری لگ رہی ہو۔“ بانو بیگم نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اور بہت خوش بھی، کیا بات ہے؟“ حبیب الرحمن نے خوش ہو کر دیکھتے ہوئے پوچھا

اس دوران وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”جی پاپا۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ اور بات؟ بات تو کوئی بھی نہیں ہے۔ بس ویسے ہی آج خوش ہوں۔“

”کھنکھ میرے جاسوس بیٹے کو کوئی نئی اسائنمنٹ تو نہیں مل گئی ہے کیا؟“ حبیب الرحمن نے پوچھا

”جاسوس یہ کیا بات ہوئی پاپا؟“ مائرہ خوشگوار حیرت سے بولی

”اب یہ معافی جاسوسی ہی کرتے ہیں تحقیقاتی رپورٹنگ کے نام پر۔ تم بھی Investigative رپورٹنگ کرتی ہو۔“

حبیب الرحمن نے کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی

”تو پاپا میں جاسوس تو ہڈی ہوں۔“

”کچھ بھی ہے آج میری بیٹی بہت خوش نظر آ رہی ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔“ بانو بیگم نے پیار سے کہا

”ماما بندے کا موڈ خوشگوار بھی تو ہو سکتا ہے۔“ مائرہ نے منمناتے ہوئے کہا تو حبیب الرحمن بولا

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہم تو تمہیں بہت خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ایسے ہی ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہا کرو۔“

”کیا لوگی بیٹا۔“ بانو بیگم نے پوچھا تو مائرہ بولی

”بس جس لوگ! مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے پاپا کو دیکھا تو ادھر آ گئی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس میں جوس لیا پھر سپ لینے لگی۔ تبھی حبیب الرحمن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ابھی میرے ذہن میں پلان آیا ہے کہ اس آف کو ہم سب گھر پر رہیں گے۔ اور تمہارا فلوٹ باریبی کیو ہوگا۔“

”بس پاپا، بہت دن ہو گئے، ہم سب ایک ساتھ پھر پور دن متائیں گے۔“ اس نے پر جوش انداز میں کہا۔ گلاس رکھ کر وقت دیکھا

اور پھر اٹھتے ہوئے بولی، ”میں چلتی ہوں دیر ہو گئی جائے۔ اللہ حافظ ماما، اللہ حافظ پاپا“

”اللہ حافظ“ دونوں نے ایک ساتھ کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مائرہ پورچ میں آکر گاڑی کی جانب بڑھی تھی اس کا فون بج اٹھا۔ وہ فون رسپو کرتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔

”ہیلو۔“ مائرہ نے کہا

”کیسی ہوا مازہ؟“ دوسری طرف جعفر نے پوچھا تبھی مازہ نے فیسے میں کہا

”او جعفر! تم؟ تم کہاں غائب ہو گئے ہو۔ نہ بتا کر گئے ہو اور ادرفون بھی بند کیا ہوا ہے؟“

”بتاتا ہوں، ذرا صبر تو کرو۔ اتنا غصہ بھی ٹھیک نہیں، بتاؤ کیسی ہو؟“ جعفر نے سکون سے کہا

”میں تو ٹھیک ہوں، تم کہاں ہو، کدھر کا لے پانی ہو گیا ہے تمہارا ٹرانسفر، کچھ پتہ تو چلے اوہ تم غائب ہوئے، اوہر فہد کا فون آگیا

کل۔“ وہ ایک دم سے بولی

”میں اپنے بارے بھی بتاتا ہوں، مگر وہ تم فہد کے فون ہارے تاری تھی۔“ جعفر نے جیسے ہوئے کہا تو وہ پر جوش لہجے میں بولی

”جعفر! میں بتاؤں۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ فون فہد کا ہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز سن کر بھی اچھی خاصی بدلی

ہوئی تھی۔“

”پھر کیسے یقین آیا کہ وہ واقعی فہد کا ہی تھا۔“ جعفر نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا

”تھا نہیں، وہ ہے۔ کچھ کوں تو مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے مجھ سے بات کی۔ ویسے میں پہلے ڈر بھی گئی تھی۔“ اس

نے پر شوق لہجے میں بتایا

”وہ کیوں؟“ اس نے جیڑی سے پوچھا

”اس لیے کہ میں نے سوچا، وہ کہیں مصیبت میں نہ ہو۔ ہم نے ہی اسے کہا تھا کہ جب اسے ضرورت پڑے گی تو وہ ہمیں ضرور

پکارے گا میں نے پوچھا بھی تھا۔“ مازہ نے کہا جعفر نے پوچھا

”پھر اس نے کیا کہا؟“

”اس نے کہا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ خوش ہے اور حراسے میں ہے۔ ویسے بات بڑی مختصر ہوئی۔ پتہ نہیں وہ کہیں مصروف

تھا۔ ہم اسے یاد ہیں۔ وہ ہمیں بھولا نہیں، میں اس پر ہی بہت خوش ہوں۔“ وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولی تو جعفر نے کہا

”مازہ! اتنے برس کی رفاقت محض چند ہفتوں میں پا چند مہینے میں بھلائی نہیں جاسکتی ہے۔ ہم اسے یاد ہیں اور بہت اچھی طرح

یاد ہیں۔ اس کا پیار ہم سے ویسا ہی ہے۔“

”جعفر! وہ ہمارے پاس نہیں آسکتا؟ کیا ہم اس کے پاس نہیں جاسکتے؟ میرا مطلب ہے۔ ایک دو دن کے لیے۔ اسے زیادہ

ٹھگ نہیں کریں گے۔ ہماری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور اس کے بارے میں بھی پتہ چل جائے گا۔“ مازہ نے کہا تو جعفر نے مشکل سے ہنسی

روکتے ہوئے کہا

”بہت اچھا خیال ہے بتاؤ کسی دن بھی پروگرام بنا لو چلے چلتے ہیں اس کے پاس۔ ویسے یہ دیکھنا بھی چاہیے کہ آخر وہ وہاں کر کیا

رہا ہے۔ مگر ایک بات تو ہم بھول ہی گئے۔ جانا کہاں ہے؟ اس کے گاؤں کا تو ہمیں پتہ ہی نہیں ہے، تمہیں پتہ ہے۔ بتایا اس نے؟“

اس پر مائرہ ایک دم حیرت زدہ اور شرمندہ ہو گئی، اسی شرمندگی میں اس نے کہا

”تم ہونا تو مجھے اس انظارِ مشن کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں اس کا پتہ ہے۔“

”تو پھر سنو۔! میں اس کے پاس تھا اور اب اس سے کچھ فاصلے پر ایک قصبے میں قیامت ہوں۔ میں آنا کا نام یہاں کیوں آیا۔ یہ بھی

سن لو۔“

یہ کہہ کر اس نے ساری رد وادب مختصر انداز میں بتادی۔ وہ حیرت اور دکھ کے ساتھ سن چکی تو جذباتی انداز میں بولی

”میں کسی نجی کمپنی سے فوراً بات کرتی ہوں کہ وہ وہاں پر سیل فون سرورس دے۔ مجھ سے رابطے میں رہنا، مجھ سے جو ہو سکا میں

کروں گی اور بہت جلد وہاں تمہارے پاس آؤں گی۔ اللہ حافظ۔“ یہ کہتے ہوئے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے فون بند کر دیا

اور کہتے ہی لمبے یونی ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھی رہی۔ پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے کار سٹارٹ کی اور ہل دی۔



عصر کا وقت ہونے والا تھا جب ماسٹر دین محمد اور فہد دونوں دالان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر دین محمد نے اس سے پوچھا

”فہد بھڑ۔! کیا تمہیں یقین ہے کہ نعمت علی رقم لینے کے بعد تمہاری زمین تمہارے حوالے کر دے گا۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اپنی بات سے کمر سکتا ہے؟“ فہد نے رائے لی

”مجھے یہ شک ہے اس لیے ہے کہ نعمت علی ساری زندگی چھ ہدایوں کا حزرار رہا ہے۔ اور اب اس کی آئندہ نسل بھی چھ ہدایوں

کے حزرار ہی ہے۔ ممکن ہے کہ چھ ہدایوں ہی نیا سے اس کام پر لگایا ہو۔“ ماسٹر دین محمد نے اپنی رائے دی تو فہد یوں

”اسی لیے میں نے گاؤں کے چھ بزرگوں کے سامنے اسے رقم دینی ہے۔ اگر وہ رقم لے کر پھر گیا تو کیا ہوا۔ ہم نے جو وعدہ کر لیا

ہے۔ اسے تو اب نبھانا ہے۔“

”ہاں۔ تم بھی صحیح کہہ رہے ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا تا رقم ڈوب جائے گی۔ چلو، کوئی بات نہیں، تم اپنا وعدہ نبھاؤ۔“ ماسٹر دین

محمد نے کہا

اسنے میں سستی اندر سے آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی۔ اس نے وہ لا کر فہد کو دے دیتے ہوئے کہا

”فہد۔! یہ لیس آپ کی امانت آپ دیکھ لو، اتنی ہی رقم ہے جتنی آپ نے مجھے سنبھال کر رکھنے کے لیے دی تھی۔ کیا اتنی ہی رقم ان

لوگوں کو دینی ہے؟“

”وہ جو سراج والی رقم دی تھی، وہ اس میں شامل ہے تاہم نے دیکھ لی ہے پوری ہے؟“ فہد نے پوچھا

”ہاں وہ اس میں شامل ہے، میں نے دیکھ لی تھی۔ پوری ہے۔“ سلسی نے بتایا

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ اچھا استاد جی، وہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے عصر سے پہلے وقت دیا تھا۔ تھوڑا سا وقت

رہتا ہے۔“ فہد نے ماسٹر دین محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ہاں تم چلو۔ میں بھی آتا ہوں، وضو کر کے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس دوران فہد نے ٹوٹوں کی ایک گڈی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی اور باقی رقم اسی طرح پوٹلی میں باندھ کر واپس سسلی کو دے دی۔ تبھی سسلی نے کہا

”فہد! اپنا خیال رکھئے گا۔ خدا نخواستہ وہاں کچھ ایسی دکنی بات نہ ہو جائے۔“

”کیا ہو سکتا ہے؟“ فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”کچھ بھی، ان چوہدریوں کا کیا اعتبار۔“ سسلی نے کہا

”اللہ کرم کرے گا۔ تم پریشان نہیں ہونا۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ فہد نے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

قسمت گھر کے چوراہے میں لوگ اکٹھے تھے۔ ہانفت اور اس کا بیٹا نڈیا چکا تھا۔ پاس ہی سراج تھا جسے دیکھ کر ایک بزرگ نے پوچھا

”کیوں بھی سراج، ابھی تک فہد نہیں آیا۔ اسے رقم دینا یا دیکھی ہے کہ نہیں؟“

”آ جاتا ہے جی، ابھی آ جاتا ہے وہ اپنے وعدے کے مطابق رقم ادا کرے گا۔“ سراج نے انہیں یقین دلایا

”کیا اسے علم نہیں کہ ہم نے نماز کے وقت تک اس کا انتظار کرنا ہے۔ ہم اسے لوگ اس کے مختصر ہیں۔“ بزرگ نے کہا

”بزرگو! آپ پریشان مت ہوں۔ بس وہ آنے ہی والا ہوگا اور نماز کے وقت سے پہلے ہی آئے گا۔“ سراج نے حتمی اعلان میں

کہا تو ہنٹ علی نے جس سے کہا

”اچھا چلو آ جاتا ہے وہ۔“

فہد کے نہ ہونے سے جو ایک بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت ختم ہوگئی، فہد کی گاڑی وہاں چوراہے میں آ کر رکی۔ سب لوگ

اس کی طرف دیکھنے لگے۔ فہد کا ریسے اتر کر ان کی طرف آگیا۔ اس نے آتے ہی سلام کیا تو سبھی نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ بیٹھ

گیا تو اسی بزرگ نے پوچھا

”فہد بھتر، کیا تم اپنے وعدے مطابق رقم دے رہے ہو؟“

اس پر فہد نے اپنی جیب میں سے ٹوٹوں کی گڈی نکال کر اس بزرگ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا

”یہ لیں، مگر پوری کر میں۔“

اس بزرگ نے وہ رقم لے کر ہنٹ علی کو دے دی۔ وہ گھٹنے لگا۔ وہ رقم مگن چکا اور اس نے ہنٹ علی کو دی تو بزرگ نے کہا

”لھیک ہے رقم آگئی، آج سے زمین فہد کے حوالے، میں پنڈاری سے کہہ دیتا ہوں۔ سب دعا کرو پ سائیکس ہم پر کرم

کرے۔ وہ سب دعا کرنے لگے۔ قسمت گھر کی تاریخ نے ایک نیا رخ لے لیا تھا۔ حالات بدلتے ہی لوگوں کی سوچ بھی تبدیل ہونے لگی

تھی۔ سبھی لوگ وہاں سے اٹھ گئے تو فہد بھی سراج کے ساتھ وہاں سے اپنے گھر آگیا۔

سہمی اپنے گھر چارپائی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان فہد کی طرف تھا۔ ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتی تھی۔ ایسے میں دستک ہوئی تو اس نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فہد اندر آ گیا۔ سہمی اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی واپس اسی چارپائی کی جانب بڑھی جہاں اسکی کتاب پڑی تھی۔ فہد نے اس کے قریب آ کر ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا

”یہ کاغذ دو اور اسے سنبھال کر رکھ دو۔ یہ معاہدہ نامہ ہے۔ جو ابھی ہوا۔“

”اتنی دیر ہوگئی آپ کو وہاں۔ کافی دیر کے گئے ہوئے تھے آپ۔“ سہمی نے وہ کاغذ پکڑتے ہوئے پوچھا

”وہاں سے تو میں آ گیا تھا۔ بس ادھر گھر میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہیں باتیں کرتے، چائے پیتے دیر ہوگئی۔ دیکھا، کچھ بھی نہیں

ہوا، تم یونہی خواہ مخواہ ڈر رہی تھی۔ استاد جی باہر ہیں کیا؟“ اس نے بتاتے ہوئے پوچھا تو سہمی نے کہا

”ہاں۔ اتھوڑی دیر ہوئی ہے انہیں گئے ہوئے۔ نماز پڑھ کر ہی آئیں گے۔“

”اچھا، وہ تمہارے پاس کچھ خرید رقم پڑی ہوئی ہے نا؟“ فہد نے پوچھا

”جی، وہ محفوظ ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا

”تم ایسے کرو، اس میں سے اپنے لیے کچھ چیزیں خرید لو جو تمہارا دل چاہے۔“ فہد نے کہا

”نہیں۔ اب میں اپنے لیے چیزیں نہیں خریدوں گی۔ بلکہ میں جو اپنا سکول بناؤں گی۔ اب اس کے لیے چیزیں خریدنی ہیں۔“

سہمی نے وہی جواب دیا جس کی فہد کو توقع تھی۔ اسی لئے اس نے کہا

”وہ جب موقع آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ تم لکڑیوں کرتی ہو۔“

”فہد۔! میں نے ہی اس کی لکڑی کرنی ہے۔ آپ نے ہوم ورک کا کہا تھا، وہ میں نے پورا پلان کر لیا ہے اور ہاں یاد آیا۔ بابا

عمر حیات کی طرف سے شادی میں شامل ہونے کا بیجام آپ کے لیے آیا ہے۔“

”آپ اور ہم کیا ہم سب کو آیا ہے اور جو استاد جی کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“ فہد نے کہا

”لیکن کماتا آپ نے ادھر ہی کماتا ہے۔ میں آج آپ کی پسند کا بنا رہی ہوں۔“ سہمی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”چلو ٹھیک ہے۔ ویسے تمہیں کیسے پتہ کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔“

”آپ کو پتہ نہیں۔ میں آپ کے لیے کتنا سوچتی ہوں خود سے بھی زیادہ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے شرما گئی تو فہد بھی مسکرا دیا

۔ وہ شرما تے ہوئے اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ فہد اٹھا اور باہر کی جانب چلا گیا۔ سہمی کچن میں کھڑی پیار بھری نگاہوں سے اسے جاتا ہوا

دیکھتی رہی۔



چوہدری کبیر اپنے ڈیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں انسپکٹر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ آگ بگولا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے ماکھا لے آ کر کہا

”وہ جی، فہد نے اپنے وعدے کے مطابق رقم کی ادائیگی کر دی ہے۔ نعمت علی اور اس کے بیٹے نذیر نے رقم لے کر زمین فہد کے حوالے کر دی ہے۔“

اس بات نے اسے مزید آگ لگا دی۔

”اس کا مطلب ہے وہ سمجھائے بھی نہیں سمجھے۔ اس کی تو اب انہیں سزا ضرور ملے گی۔ چلو آؤ میرے ساتھ دیکھتے ہیں کون زمین کا قبضہ لیتا ہے اور کون دیتا ہے ان کی حسیں یاد رکھیں گی کہ حکم عدولی کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اپنی گاڑی کی بجائے بڑھا۔ جب تک اس نے گاڑی سٹارٹ کی، ملہ زمین بھاگ بھاگ اس کے ساتھ بیٹھتے چلے گئے۔ گاڑی ڈیرے سے باہر چلی گئی۔ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی فہد کی زمین کے پاس آ کر رک گئی۔ سامنے ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے۔ چوہدری اور ملا زمین نے باہر آ کر دیکھا۔ وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس لئے سرسرا تے ہوئے چوہدری کبیر بولا

”یہاں پر کوئی بھی نہیں ہے؟ قبضہ لینے والا اور قبضہ دینے والا۔ آؤ چلیں۔“ یہ کہہ کر وہ واپس گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے چل دیا۔

چوہدری کبیر کی گاڑی قسمت مگر کے چوراہے میں آ کر رکی۔ وہاں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اسے دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ چوہدری کبیر نے حنیف دوکاندار کو آواز دی تو وہ بھاگ کر قریب ان کے قریب آ گیا تو چوہدری کبیر نے اس سے پوچھا

”اوتے، یہاں نذیر ایتھا ہمارا مزارع؟“

”آج دیکھ تھا میں نے۔ یہاں فہد سے اس نے رقم لی ہے۔ پٹواری بھی تھا۔ اس کے سامنے زمین کی کاشتکاری سے دستبردار ہونے والے کاغذ پر انگوٹھا لگایا ہے۔ گاؤں کے بہت سارے لوگ یہاں جمع تھے۔“ حنیف دوکاندار نے حمزہ سے وہ تفصیل بھی بتادی جو اس نے نہیں پوچھی تھی۔ اس پر چوہدری کبیر نے حنیف دوکاندار کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کھائی کے سے انداز میں غصے سے کہا

”چلو اس کے گھر چلتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھائی۔ تبھی حنیف دوکاندار دوکان کی طرف چلا گیا تو چھانکے نے سرٹکاں کر انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا

”اللہ خیر کرے۔ نکا چوہدری بڑے غصے میں ہے۔ کہیں۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے سوچ کر گزر گیا۔ جیب دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس سے رہا نہیں گیا وہ بھی پیچھے ہٹ چکا تھا۔

بابا نعمت علی کی بھونپا اپنے گھر میں چار پائی پر بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اس کی سرری توجہ اسی طرف تھی۔ ایسے میں دونوں باپ جیٹا گھر میں آ گئے۔ بابا نعمت علی ایک چار پائی پر بیٹھا ہے تو صفیہ جلدی سے اٹھ گئی تو وہاں نذیر بیٹھتے ہوئے اپنی جیب سے رقم نکال کر اپنی بیوی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا

”یہ لے بھاگوالے۔ ایرقم سنبھال کے رکھ۔ اب جو کرنا ہے اس رقم ہی سے کرنا ہے۔“

”تو کیا فہد نے اتنی رقم دے دی؟ لگتا ہے وہ بڑا امیر بندہ ہے۔ بڑی دولت ہے اس کے پاس۔“ صفیہ نے لوٹوں کی گڈی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو بابا نعمت علی بولا

”شکر کرو۔ میں نے تم لوگوں کی بات مان لی اور اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی دو رقم دے دے گا۔ وہاں اس کی زمین پر چوہدری کے ڈگروں کا چارہ ہی اگتا ہے۔ بھلا وہ اس کا اس نے میری بات مان لی۔“

”اوا اب اس نے بھی سوچا ہوگا کہ عدالت کچہری کے چکروں میں کیا پڑیں۔ اپنی زمین لینے کے لیے اس کے پاس یہی آسان راستہ تھا۔ ورنہ وہ لاٹجھڑ کر تو زمین لے نہیں سکتا تھا۔“ نذیر نے اپنے رائے دی۔

”وہ کچھ نہ کچھ طاقت رکھتا ہے، ورنہ ایسی ہی تھانے سے نہ آ جاتا وہ۔ جس طرح پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی اور یہ لوگوں کو یقین ہے کہ اسے چوہدریوں نے ہی پکڑوایا تھا۔ کیا وہ اتنی جلدی واپس آ جاتا؟“ بابا نعمت علی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”بات تو ٹھیک ہے لیکن وہ لاٹجھڑ کر زمین نہیں لے سکتا تھا۔ جس طرح چوہدری نے کہا تھا مجھے اس میں تو فہد کا ہتھ ہی صاف ہو جانا تھا۔“ نذیر نے کہا

”اب تم ان چوہدریوں سے بچ کر رہنا اور فہد سے بنا کر رکھنا اور جو تو نے دوکان بنانے کا سوچا ہے نا، اسے خوب عقل سمجھ سے چلانا۔“ بابا نعمت علی نے اسے سمجھایا تو صفیہ نے کہا

”یہ بڑا اچھا ہوا ہے کہ اب ہم حرا رہیں رہے ورنہ نذیر کے بعد میرے بچے بھی انہی کی غلامی کرتے رہتے۔ اب ہم اپنی مت کریں گے۔ اپنا کھائیں۔ چوہدریوں کی غلامی سے تو بچے۔ اب میرے بچے بھی پڑھ لکھ جائیں گے۔“

”اُسی لیے تو یہاں سے جا رہے ہیں۔ تو جا اور اس رقم کو اندر لے جا کر سنبھال اور پھر ہمیں کچھ کھانے کے لیے دے۔ بہت بھوک لگی ہے۔ وہاں سارا دن گزر گیا ہے۔“ نذیر نے کہا تو صفیہ اندر کی طرف چلی گئی۔ نعمت علی پھر سے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا

”اب تو چند دن ادھر ادھر رہنا۔ چوہدری کے ہتھے لگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو جا ہے گا کہ ہم اس کے حرا رہیں۔ اب ہم نے ادھر نہیں رہنا۔“

”جی بابا جاری تیاری تو ہے۔ بس آج کل میں نکل جائیں گے۔ زیادہ دقت یہاں گزارنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ نذیر نے کہا اور چارپائی پر لیٹ گیا

کچھ ہی دیر بعد صفیہ ان کے لئے کھانا لے کر آ گئی۔ دونوں باپ بیٹے نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ صفیہ برتن اٹھا کر اندر گئی تو اس نے

میں ان کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو نذیر ٹپ کر اٹھا۔ ایک گن لئے ہوئے بد معاش ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔ نذیر نے اس کی طرف دیکھ کر انتہائی غصے میں کہا

”اُوے تیری جرات کیسے ہوئی میرے گھر میں یوں داخل ہونے کی۔“

”اور تجھے جرات کیسے ہوئی پوچھنے کی۔ یہ گھر چوہدریوں کا ہے، جسے چاہیں اور جب چاہیں دے دیں۔“ بد معاش نے حقارت

سے جواب دیا

”کیا کو اس کر رہا ہے تو اگل باہر درندہ مٹکے دے کر۔۔۔“ نذیر نے کہنا چاہا لیکن اس بد معاش نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

”تجھے باہر لے جانے کو تو میں اندر آیا ہوں، چل باہر۔“

یہ سن کر نذیر ٹھٹھک گیا، اس نے کہا

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

بد معاش منہ سے کچھ نہیں بولا، مگر اس کی طرف کر کے ہاں ہٹنے اشارہ کیا۔ نذیر کو جب اس نے مگر پوائنٹ پر رکھ لیا تو وہ تینوں سہم گئے۔ نذیر اس کے آگے لگ کر ہر آگیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چوہدری کبیر کی گاڑی اس کے گھر کے سامنے تھی اور وہ غضب ناک انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انتہائی غصے میں نذیر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گاڑی میں سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”اُوے نذیرے۔ اتھاری یہ جرات کیسے ہوئی ہم سے پوچھے بغیر تم نے معاہدہ کر لیا۔ رقم بھی پکڑ لی اور قبضہ بھی دے دیا؟“

اجنے میں بابا نعمت علی دونوں ہاتھ جوڑتا ہوا آگے بڑھا اور منت بھرا انداز میں چوہدری کبیر سے بولا

”معاف کر دیں جی چوہدری صاحب، میں بتاتا ہوں کہ میں نے۔“

”بھونک نہیں، ساری شیطانی ہی تیری ہے بڑھے۔“ چوہدری کبیر نے کہا تو نذیر تڑپتے ہوئے بولا

”اُوے چوہدری۔ تمیز سے بات کر۔ ہم تیرے حزرارے تھے۔ غلام نہیں، ہم نے زمین کا نہیں، اپنی فصل کا سودا

کیا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر چوہدری کبیر کا دماغ ایک دم سے گھوم گیا، اس نے انتہائی غصے میں کہا

”اچھا تو اب تیری زبان بھی چلنے لگی ہے، نکات کے رکھ دوں گا۔“

”نہیں چوہدری جی، میں کہہ رہا ہوں نا میں۔۔۔“ بابا نعمت علی نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا

”میں اپنے خلاف کسی کو سوچتے بھی نہیں دیتا اور تم میرے سامنے بات کر رہے ہو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ غضب ناک ہو کر آگے بڑھا ہے اور اس نے نعمت علی کے اس قدر زور سے چھڑ مارا کہ وہ ٹکڑا کر دوڑ چا گیا۔

اس پر نذیر پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور چوہدری کبیر کو لٹکارتے ہوئے کہا

”بس کراوے چوہدری۔! میں نے اپنی مرضی سے پیسے لیے ہیں۔ میں حزرارے ہوں۔ کوئی غلام نہیں۔ میرے ابا کا اس معاملے

میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اب اس سے آگے ہاتھ مت بڑھانا۔“

”اوائے۔! تو بھی میرے سامنے بولتا ہے تیری یہ اوقات۔۔۔“ چوہدری کبیر نے غصے کی شدت سے کہا اور اس پر چھٹروں، گھونسلوں کی ہارش کر دی۔ اس دوران نعمت علی اسے روکا، منت کرتا رہا، صفیہ نے بھی آکر ہاتھ جوڑے۔ چوہدری کبیر کو روکتی رہی۔ وہاں بہت سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں چھا کا بھی یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، لیکن کسی میں یہ جرات نہیں ہوئی کہ وہ چوہدری کبیر کو روک لیتے۔ چوہدری کبیر نے اپنے قریب کھڑے گن بردار سے گن پکڑ لی اور اس کے بٹ سے نذیر کو مارنے لگا، تبھی نذیر پاس کھڑے ایک فنڈے کی طرف لڑکھڑا کر گیا اور اگلے ہی لمحے اس سے گن چھین لی۔ ہاتھ میں گن آتے ہی اس نے گن کا رخ چوہدری کبیر کی طرف کر کے بولٹ مار دیا۔ تبھی سننا چھا جاتا ہے۔ وہاں موجود ہر شخص نے اپنی سانسیں روک لیں۔

نذیر نے چوہدری زمان پر گن تانی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر قہر برس رہا تھا۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا

”بہت ہو چکا چوہدری، تم لوگ غریبوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے، تمہارے لیے ہم جیسے حارث صرف جانور ہیں۔ جن کی رسی جس طرف چاہے موڑ دی۔ جب چاہا کسی کو بے عزت کر دیا۔“

اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا دیکھتے علی تیزی سے آگے بڑھا اور گن پکڑتے ہوئے بولا

”نکس نذیرے، اپنا ہاتھ روک لے، ہم یہاں رہیں گے ہی نہیں۔ چھوڑ دے۔“

”نکس بابا۔! یہ جس کو جب چاہیں دھکے مار دیں، مانئیں ذلیل کریں، بے عزت کر دیں، خدا اپنے ہوئے ہیں یہ بے غیرت۔“

وہ گن چھڑاتے ہوئے اپنے باپ کی دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ اس کی توجہ مٹی ہوئی تھی۔ تبھی چوہدری زمان نے ایک لمحے کو اس کی جانب دیکھا اور پھر انتہائی تیزی سے نذیر کی طرف گن سیدھی کر کے فائر کر دیا۔ نذیر سمیت کبھی لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اگلی ہی لمحے نذیر لہو میں لت پت زمین پر جا گر اور ترپنے لگا۔ ہر بندہ ساکت رہ گیا۔ تبھی چوہدری زمان انتہائی عقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اوائے۔! سب لوگ سن لو۔ اب کسی نے بھی ہمارے خلاف سوچنے کی جرات کی تو اس کا انجام اس نذیرے سے بھی بدتر کیا جائے گا۔ کوئی بھی شک، شبہ میں نہ رہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے چاروں طرف لوگوں کی جانب دیکھا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھا اور بیٹھ کر چلا گیا۔ صفیہ دھاڑیں مارتے ہوئے بھاگ کر اپنے شوہر کے پاس گئی۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ وہاں ہر کوئی خاموش تھا۔ چھا کے کے چہرے پر بے تحاش غصے کے ساتھ ایسا افسردہ تاثر طاری تھی، جس میں انتہائی بے بسی تھی۔ روتی ہوئی صفیہ کی مدد کو کوئی نہیں پہنچا۔ بابا نعمت اور صفیہ نذیر کے بے جان وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار رہے تھے۔ ان کی تو زندگی اجڑ گئی تھی۔

رات ہونے تک قسمت گھر کے قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ نعمت علی کے ساتھ کچھ لوگ قبر پر مٹی ڈال چکے تھے۔ تازہ پھولوں کے ساتھ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ سر ہانے چراغ جلا دیو گیا تھا۔ لوگوں نے دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ آہستہ قبرستان سے نکلنے چلے گئے۔

پولیس اپنی کارروائی کر کے جا چکی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بھی وہی بتایا تھا، جسے سارے قسمت مگر نے دیکھا تھا۔ نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی تھی، جس کا کوئی مدعی نہیں تھا۔

رات کے ایسے ہی وقت حویلی کے ڈرائنگ روم میں چوہدری جلال اور بشری بیگم بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ایسے میں رانی نے اندر آئی اور مودب لہجے میں بول

”وہ باہر نشی آیا ہے، آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔“

”ہاں۔ ابلاؤ اسے۔“ چوہدری جلال نے عام سے انداز میں کہا تو رانی پلٹ کر دروازے کے باہر چلی گئی۔ بشری بیگم اپنا آئینل درست کرنے لگی۔ ننھی نشی فضل دین تیزی سے اندر آیا اسے دیکھ کر چوہدری جلال نے حیرت سے پوچھا ”ہاں نشی! کیا بات ہے، خیر تو ہے؟“

”خیر ہی تو نہیں ہے جی،“ نشی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا تو چوہدری جلال پر سکون انداز میں بولا

”کیوں کیا ہوا ہے؟“

”وہ حزارع نعمت علی ہے ناجی، اور اس کا بیٹا نذیر۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا

”اوائے آگے بول، چپ کیوں کر گیا ہے۔“

”جی، اس نذیرے کو نکے چوہدری نے کچھ دیر پہلے قتل کر دیا ہے۔“ نشی نے ایک دم سے کہہ دیا تو چوہدری جلال اور چوہدری

نے چونک کر دیکھا پھر چوہدری جلال نے پوچھا

”کیرا ب کدھر ہے؟ کیسے ہوا یہ؟“

”نگے چوہدری جی تو ڈیرے پر آ گیا ہے۔ اور۔۔۔“

اس نے یہ کہہ کر سرری روادو سنا دی۔ ساری بات سن کر چوہدری جلال بولا

”ہوں! کیر سے کہو ذرا یہاں آئے۔ تم فون کر کے وکیل کو بلاؤ۔ میں دیکھتا ہوں۔“

”جی بہتر، میں فون کر کے ہی ڈیرے پر جاتا ہوں۔“

نشی یہ کہہ کر وائس پٹ گیا اور چوہدری سوچ میں پڑ گیا۔ جمی بشری بیگم نے تشویش سے کہا

”چوہدری صاحب! اب کیا ہوگا۔ یہ کیر نے۔۔۔۔“

”پہلے کیا ہوتا ہے، کیر کو پہلے کچھ ہوا ہے کبھی، کچھ نہیں ہوتا اُسے۔“

”یہ لڑکا بڑا اقرا ہوا گیا ہے۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو اس نے مار دیا۔ یہ اس نے ٹھیک نہیں کیا ہے۔ میرا بہت دل بھرا رہا

ہے۔“ یہ کہتے ہوئے بشری بیگم رو دی۔

”حوصد رکھو بیگم حوصلہ کیا ہوا ہے تمہیں، کیر کے سامنے یہ بات مت کرتا۔ مان لیا کہ اس نے یہ غلط کیا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ

نہیں کہ تم میرے بیٹے کو بزدل بنا دو۔ میں نے کہا ہے نا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ کچھ نہیں ہوتا۔“ چوہدری جلالا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیڑے پر سکون انداز میں باہر کی جانب چلا گیا۔ بشری بیگم سوگوارسی سوچوں میں ڈوبی وہیں سوگوار بیٹھی رہی۔



دن چڑھ آیا تھا، بابا نعمت علی کے گھر کے باہر زمین پر درزی بچہ کائی سارے لوگ بیٹھے ہوئے دعا مانگ رہے تھے۔ ان میں فہد اور سراج نمایاں تھے۔ وہ سبھی مسجد میں نماز پڑھتے کے بعد سیدھے اسی کے پاس چھپ گئے تھے۔ دعا مانگ کر ذرا سی دیر میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر فہد نے تعزیت کرتے ہوئے کہا

”بہت الموس ہوا بابا نعمت علی، ہم سب نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔“

”ہاں فہد بیٹا۔! میں نے امن چاہا تھا۔ سوچا تھا ہم مزارع چوہدریوں کا حکم نال نہیں سکیں گے۔ تمہاری اور ان کی لڑائی میں مارے تو بھی نے جانا تھا۔ یہی سوچا تھا۔ مگر کیا معلوم وہ ہمیں معاف تو کیا کریں گے۔ نظر انداز بھی نہ کر سکے۔ میرے پتر کی میری بی بی لگا ہوں کے سامنے۔“ یہ کہتے ہوئے بابا نعمت علی رونے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر اسے دلا سا دیتے بولا

”میں نے بھی یہی چاہا تھا اس لیے آپ کو رقم دی تھی کہ امن رہے اور بات نہ بڑھے۔ چوہدریوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور ہمیشہ کی طرح کمزور پر ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں آئے۔“

”ہاں۔! میں تمہیں ہی نہیں۔ کسی کو بھی کچھ نہیں کہتا، مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے، بس میری قسمت میں ہی ایسا ہوتا تھا۔ بڑھاپے میں یہ دکھ بھی دیکھنا تھا۔ میرا مقدر ہی ہر گیا۔“

”کسی کے ظلم کو آپ اپنا مقدر کیوں کہتے ہو بابا۔ کم از کم ظلم کو تو ظلم کہیں نا، آپ لوگ خود ہی اسے اپنا مقدر اور قسمت مان لیں گے تو پھر وہ ظلم کرتے رہیں گے۔ ظالم کا ہاتھ تو روکنا ہو گا نا بابا۔“ فہد نے غصے میں کہا

”ہم کیا کر سکتے ہیں میرے جیسا غریب آدمیان چوہدریوں کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ان کا اور ہمارا کیا مقابلہ۔“ نعمت علی نے بے بسی سے کہا تو سراج بولا

”بابا تم ان کے خلاف کچھ کرنے والے تو ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم کریں گے ان ظالموں کا مقابلہ؟“

”کب تک کرو گے ان کا مقابلہ؟ ان کے ہاتھ اٹھنے لے رہے ہیں۔ جہاں تک ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں جانتا ہوں پتر، اگر وہ نذیر کو ختم کر سکتے ہیں تو کسی اور کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ میں ایسی کوئی بات سوچنا نہیں چاہتا۔ جو ہوتا تھا، وہ ہو گیا۔ میں کچھ نہیں کرنا چاہتا۔“

نعمت علی نے اسی بے بسی سے کہا تو سراج بولا

”ہم لوگوں کی یہی سوچ تو انہیں حوصلہ دے دیتا ہے اور وہ ظلم پر ظلم کرنے چلے جا رہے ہیں۔ تم جیت تو کرو بابا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

”نہیں۔ اسراج پتر۔! میں کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ میں کوئی ہمت نہیں کرنا چاہتا۔ مجھ میں نہیں ہے حوصلہ۔“ نعمت علی نے سر فٹنی میں ہلاتے ہوئے کہا تو فہد بولا

”ابا۔! ہم کوئی زور زبردستی نہیں کرنا چاہتے۔ تم سوچ لو پھر بتا دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم کس طرح کے غم بھرے حالات میں سے گزر رہے ہو۔“

”مجھے اب کیا سوچنا ہے فہد۔! میری تو ساری سوچیں ہی ختم ہو گئی ہیں۔ ایک بیٹا تھا وہ بھی منوں مٹی تلے جا سو یا۔ نہیں میں نے اب یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔ چلے جانا ہے یہاں سے۔ مجھے کچھ نہیں کرنا۔ کچھ نہیں کرنا مجھے۔“ نعمت علی نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا تو فہد اور سراج نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر فہد نے سوچتے ہوئے کہا

”چلو، جیسے تمہاری مرضی۔! اچھا، اب ہم چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چل دیا۔ اس کے ساتھ دوسرے کئی لوگ بھی تھے۔ فہد تو اپنے گھر کی جانب چل دیا تو کچھ لوگ چوراہے کی طرف چلے گئے۔

چوراہے پر موجود لوگوں کو ایک بہت بڑا موضوع مل گیا ہوا تھا۔ کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ ان میں چاچا سوہتا جو بڑے دھیمان سے ان کی سنتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بندہ کہہ رہا تھا

”یار نذیر بے کا بڑا دکھ ہو ہے۔ کل یہاں کتنا ٹھیک ٹھاک خوش ہاش ہمارے درمیان تھا اور آج بے چارہ ہم میں نہیں رہا۔“

اس پر حنیف دوکاندار نے کہا

”ہاں یار۔! اگر یہ فہد والا معاملہ درمیان نہ ہوتا تو انہوں نے اس نذیر بے کو کیا کہتا تھا۔ وہ تو ان کا حزرار تھا۔“

”بس یار۔! اس کی ایسے ہی لکھی ہوئی تھی۔“

وہاں موجود ایک دوسرے شخص نے کہا تو حنیف دوکاندار طوریہ لہجے میں بولا

”ایسے لکھی ہوئی نہیں تھی۔! اس میں باپے نعمت نے لالچ کیا۔ فہد نے اسے رقم کالا لچ دیا اور وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چوہدری انویس ہی کسی کو سزا نہیں دیتے۔ مالک کی دفا داری کرنے کی بجائے فہد کا ساتھ دینے لگے۔“

”میں نے تو یہ سنا ہے کہ انہوں نے چوہدری سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ خود ہی رقم کی بات کی اور لے کر ہضم کرنا چاہتے تھے۔“ ایک تیسرے بندے نے جھک لیا

”اصل میں یہ سارا چکر فہد کا چلایا ہوا ہے نا۔ وہ اپنی زمین واپس لینا چاہتا تھا۔ یہ بات بھرا کون نہیں جانتا۔ اس کا ہی کیا دھرا ہے سب۔ وہ انہیں لالچ نہ دیتا۔ تو آج نذیر ہمارے درمیان ہوتا۔“ حنیف دوکاندار نے جوش سے ان کی طرف دیکھ کر کہا

”اور کیا اب چوہدریوں سے فہد کو تو نہیں سکنا تھا نا۔ یہی کرنا تھا۔“

پہلا شخص بولا تو اس پر چاچے سوہنے نے سرائٹے ہوئے کہا

”اوسن اُوئے حنیف، کچھ تو انصاف کی بات کرو، اس میں بھلا فہد کا کیا قصور ہے۔ بابا نعت علی خود گیا تھا فہد کے پاس اور تم یہاں ملے ہوئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کے درمیان یہاں۔ اور پھر مجھے یہ بتا، چوہدری کون ہوتے ہیں اتنی بڑی سزا دینے والے۔ یہ تم لوگ تو جانتے ہوتا کہ وہ زمین فہد کی تھی۔ ویسے بھی اس سارے واقعے میں فہد کا قصور کیا ہے؟“

”اویس کر چاچا۔ اب نعت نے غلطی کی اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ باقی رہی سزا دینے یا نہ دینے کی بات۔ تو طاقتور کے سامنے کون رک سکتا ہے۔ وہ تو جوجی آئے گا، کرے گا۔“ حنیف دوکاندار نے لا پرواہی سے یوں کہا جیسے وہ چوہدریوں کی بات کر رہا ہو۔

”طاقت کا نشہ کمزوروں پر ہی کیوں اترتا ہے۔ فہد اسی گاؤں میں ہے۔ سب کے سامنے پھر رہا ہے۔ اس نے بھی تو اپنا گھر واپس لیا تھا۔ اسے کچھ کیوں نہیں کہتے تمہارے یہ چوہدری۔“ چاچے سوہنے کے لہجے میں حقارت اتر آئی تھی۔

”ہاں۔ ایہ بات تو ہے۔ فہد یونی چوہدریوں سے ٹکر لینے آ گیا۔ اسے اب تک کیوں نہیں کچھ کہتے یہ چوہدری۔“ وہاں موجود ایک بندے نے ہاں میں ہاں ملائی تو حنیف دوکاندار نے ٹٹک کر کہا

”چلو مان لیتے ہیں کس کے پاس عقل سمجھ ہوگی۔ کوئی نہ کوئی شے ضرور ہوگا۔ پر حقیقت یہ ہے کہ فہد کے ساتھ دینے پر نڈیرے کا قتل کیا ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھنا ہے۔ کوئی کس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

”کوئی دوسرا اگر فہد کا ساتھ دے گا تو اس کے ساتھ بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ایک نے کہا

”تو چاچا۔ ایساں بیٹھ کر چپ چاپ یہ کٹوری کھیل ایویں فہد کی تعریفیں مت کیا کر، پہلے کیا ہوا ہے تیرے ساتھ؟“ حنیف

دوکاندار نے اسے یاد دلایا تو چاچا سوہنا بولا

”وہ تیرے چوہدریوں کی بے خبری تھی، طاقت کے زور پر لوگوں کو خوف زدہ کرتے ہیں۔ وہ چوہدریوں کی طاقت نہیں کمزور لوگوں کا گھٹیا حربہ تھا۔ میرا ساتھ بھی تو پھر فہد نے دیا۔ اس کا جگر دیکھ۔ اُوئے جاؤ اُوئے، تم لوگوں کو خوف نے مار دیا ہے۔ تم تو پہلے ہی مرے ہوئے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے دھیان ہو کر کٹوری کھیلنے لگا۔ دوسرے لوگ کچھ دیر خاموش رہے پھر ادھر ادھر بکھر گئے۔ قسمت گھر میں یہی موضوع زیر بحث تھا۔

سسی اپنے گھر کے کھن میں انتہائی افسردہ بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر سوگواریت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے میں ماسٹر دین محمد گھر میں داخل ہوا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہو چار پائی پا کر بیٹھ گیا۔ چند لمبے خاموشی سے گزر گئے تو سسی نے دھیمے لہجے میں پوچھا

”دفنا دیا نہ میرا اتنی جلدی دفنا دیا گیا۔“

ماسٹر دین محمد نے ایک طویل سر آہ بھرتے ہوئے کہا

”اور پھر۔ اکب تک ایسا نہ کرتے وہ، ان کا کوئی رشتے دار بھی تو نہیں تھا۔ جس کے انکار میں وہ جنازہ رکھ چھوڑتے۔“

”ابا جی۔ اس کا قتل ہوا ہے۔ چوہدری کبیر نے اسے لوگوں کے سامنے اسے گولی مار دی۔ اتنا بڑا ظلم ہو گیا اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، یوں جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو؟“ سلمیٰ نے غصے میں کہا تو ماسٹر دین محمد نے اسکی طرف دیکھا۔ سلمیٰ کے لہجے میں جو آگ تھی اس نے بخوبی محسوس کی تھی۔ اسی لئے دھیمے لہجے میں بولا

”یہ کون سا اس علاقے میں نئی بات ہوئی ہے۔ کیا کرتے وہ نذیر کے بے جان جسم کو؟“ تھانے اور ہسپتالوں میں لے گئے، کون سستان کی۔۔۔ وہی کاروائی اور ان چوہدریوں سے کیا مقابلہ بھلا ان کا۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا

”وہ ان کا مزارع ہی تھا۔ کوئی زر خرید غلام تو نہیں تھا۔ پرانے وقتوں کا ان کے ساتھ تھا۔ کوئی بھی اچھا سلوک کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایسا کیا جرم کر دیا تھا۔۔۔ انہوں نے تو لڑائی جھگڑے اور فساد سے بچنا چاہا تھا۔“ اس نے دکھ سے کہا

”بھئی تو ان کی غلطی تھی۔ چوہدری کا مزارع ہو کر اس نے زمین فہد کے حوالے کر دی۔ اور چوہدریوں سے پوچھے بغیر رقم بھی لے لی، یہ ان کی نظروں میں جرم نہیں تو اور کیا ہے؟“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمیٰ حیرت مانی

”زمین کون سا چوہدریوں کی ملکیت تھی۔ انہوں نے بھی تو فہد کی زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ چلو یہ بھی مانا کہ ان کی غلطی تھی۔ کیا اس کی اتنی بڑی سزا نذیر کی بیوی صفیہ اس کے بیچے۔۔۔ وہ تو بے یار و مددگار ہو گئے نا، چوہدریوں نے ذرا بھی نہیں سوچا کہ ان کا کیا ہوگا؟“

”ہجر۔ اب جگ میں ہار یا جیت کا فیصلہ کسی کے حق میں بھی ہو۔ جہاں میدان جنگ کی ہوتی ہے۔ انہوں نے غلط فیصلہ کیا یا نہیں کیا اس زمین نے ہی نذیر کی بھی جان لے لی۔“ ماسٹر دین محمد نے دکھ سے کہا

”ابا جی۔ اس زمین نے نذیر کی جان نہیں لی۔ چوہدریوں کی ضد لگے اور غرور لے لی ہے۔ وہ اس علاقے کی ہر شے کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں یہاں تک کہ انسانوں پر بھی انہا حق جتاتے ہیں۔ وہ جب چاہیں کسی کو بیوہ کر دیں۔ جب دل چاہا بچے قہیم کر دیں۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے ابا جی؟“ سلمیٰ نے احتجاجی لہجے میں کہا

”میں کب کہتا ہوں یہ ظلم نہیں ہے۔ مگر کیا کر سکتے ہیں ہم بتاؤ، کچھ نہیں ہو سکتا نا۔ یہ جلنے کڑھنے والی باتیں ہی کر سکتے ہیں ہم۔“ ماسٹر دین محمد آہستگی سے بولا

”یہ لوگ چپ چاپ کس ظلم سہتے رہتے ہیں۔ آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ خوف کے اندھیرے میں اپنی اپنی جگہ ظلم سہتے جا رہے ہیں۔“ سلمیٰ نے دکھ سے کہا تو ماسٹر دین محمد خوفزدہ انداز میں بولا

”چھوڑو، ان باتوں کو، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم نہ سوچا کرو ایسی باتیں۔“

”کیوں نہ سوچوں، ایک عورت کو بیوہ کر دیا گیا۔ بچوں کو قہیم بنا دیا اور ہم سوچیں بھی نہ۔ میں جاؤں گی صفیہ کے پاس۔ مجھ سے جو ہو سکا، میں اس کے بے کردوں گی۔“ سلمیٰ نے اھر ردی سے کہا تو ماسٹر دین محمد تیزی سے بولا

”کیا کرو گی تم؟ کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھ کر آنسو بہا لو گی۔ اسے قہل دلا سے دے دو گی اور اپنے دل میں چوہدریوں کے لیے

ظہرت لے کر آ جاؤ گی، بس۔“

”میں کچھ نہ کچھ تو کروں گی نا۔ چاہے مجھ سے کچھ ہو سکا یا نہ ہو سکا۔“ وہ حقیقی لہجے میں بولی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ماسٹر دین محمد نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور بے بسی سے سر جھکا لیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی، سسلی اکیلی ہی صفیہ کے گھر جا پہنچی۔ صفیہ غم سے مڑھال تھی۔ وہ دونوں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ صفیہ سسلیوں میں ردو رہی تھی۔ سسلی اس کے پاس غم زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ صفیہ کا دکھ کیا ہے۔ جب وہ دل کا بوجھ ہلکا کر چکی تو صفیہ بولی ”میں سمجھتی ہوں سسلی اس میں فہم کا یا کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ چوہدریوں نے میرے شوہر کو لڑنے مرنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اور میرے سر نے جو کیا وہ غلط تھا یا ٹھیک، ان چوہدریوں کو قہور ابہت میرے بچوں کا خیال بھی نہیں آیا۔“

”انہوں نے ظلم کیا ہے۔ اتنی بڑی سزا؟ پھر وہ کون ہوتے ہیں اتنی بڑی سزا دینے والے۔ انہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے؟“ سسلی نے صفیہ میں کہا

”سسلی۔! کوئی انہیں پوچھے یا نہ پوچھے مگر میں اپنے شوہر کا انتقام ضرور لوں گی۔“ صفیہ نے پرجوش لہجے میں ایک عزم سے کہا تو سسلی نے چہکتے ہوئے پوچھا

”کیا کرو گی تم، اکیلی عورت تھالے پھروں میں کیا کر سکو گی۔ کون پوچھے گا تمہیں؟“

”کوئی بھی نہ پوچھے۔ میں اپنی کوشش تو ضرور کروں گی۔ مجھے یقین ہے وہ جواد پر نیلی جھٹ والا ہے نا۔ میری مدد ضرور کرے گا۔

میں انصاف کا ہر دروازہ کھٹکھٹاؤں گی، میں چوہدریوں کو معاف نہیں کروں گی۔“ صفیہ کے لہجے میں ویسا ہی عزم تھا

”دیکھ لو۔! اتہار یہ صفیہ اور انتقام کی باتیں وقتی نہ ہوں۔“ سسلی نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا

”نہیں سسلی۔! ایسا نہیں ہوگا۔ میں کل تک انتظار کروں گی۔ میرے سر نے کچھ نہ کیا تو پھر میں خود ہا ہر نکلوں گی۔“ صفیہ نے کہا

”صفیہ۔! اگر تم ہمت کرو۔ تو چاہے تیرا کوئی ساتھ دے نہ دے، مگر میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سسلی نے

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو صفیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر بولی

”تم۔! سسلی تم میرا ساتھ دوں گی؟“

”ہاں۔! میں۔۔۔۔۔ تم دیکھنا۔ آج جن کے خوف سے لوگ دبے ہوئے ہیں کل یہی ہماری طاقت بن جائیں گے۔ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔“ سسلی نے حوصلہ مند لہجے میں کہا

”نہیں۔! میں نے فیصلہ کر لیا ہوا ہے، میں اپنے شوہر کا انتقام ضرور لوں گی۔ چاہے وہ جتنے بھی طاقتور ہیں۔ میں انتقام لے لوں گی یا پھر زندہ نہیں رہوں گی اپنے بچوں کے ساتھ جل مروں گی۔“

یہ کہہ کر صفیہ نے اپنے آنسو صاف کر دیے۔ صفیہ کا عزم بھرا چہرہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، وہی اس کے دل

میں بھی ہے۔ اسے دیکھ کر سلسلی کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ چوہدریوں کے بارے میں جو نفرت اس کے اندر ہے، ویسی ہی صفتیں میں بھی موجود ہے۔



حویلی کے کاریڈر میں چوہدری جلال اور منشی فضل دین آسنے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ چوہدری بڑے کروفر اور پرسکون انداز میں جبکہ منشی مودب انداز میں کافی گھبرایا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی گھبراہٹ تھی

”چوہدری صاحب۔ اگلے رات ہی وہ غریبے کو دفن دیا گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر لوگوں کو سمجھا دیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ بابا نعمت علی کسی بھی قسم کی کوئی کارروائی کرے گا۔“

”اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے نا۔“ چوہدری جلال نے پوچھا تو منشی نے کہا

”جی، جی، وہ تو میں نے اسے اچھی طرح سمجھ دیا ہے۔ میں رات کچھ دیر بیٹھا رہا ہوں اس کے پاس اور آتے ہوئے میں نے کچھ نوٹ بھی اس کی منگنی میں دے دیے تھے۔ اب تک اگر اس نے کچھ نہیں کیا تو پھر بھی نہیں کرے گا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ وہ فہم بھی تو انہیں ورغلا سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کوئی کوشش نہیں کرے گا۔ اس نعمت علی کا کوئی پکا بندہ بست کرنا تھا۔“ چوہدری جلال نے تشویش سے کہا تو منشی بولا

”میرا نہیں خیال کہ نعمت علی کسی بھی قسم کی کارروائی کرے گا۔ وہ تو خود بے چارہ معافی مانگ رہا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی۔ وہ کہاں فہم کی باتوں میں آنے والا ہے۔ آپ فکرنہ کریں جی۔“

”نہیں۔ نہیں منشی۔ کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تو ایسے کر، اسے یہاں بلا۔ میں کروں گا اس سے بات۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اندر سے کیا ہے؟“ چوہدری جلال نے کہا تو منشی سر ہلاتے ہوئے بولا

”جیسے آپ کا حکم میں ابھی کوئی بندہ اس کو بلانے کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ آپ خود کر لیجئے گا بات۔“

”ہاں۔ ایسے ہی کرو۔ وہ آج شام سے پہلے پہلے میرے پاس آجائے۔“ چوہدری جلال نے حکم دیا

”جی، وہ آجائے گا۔“ منشی نے یقین سے کہا اور پھر ایک لمحے بعد جھجکتے ہوئے بولا، ”ایک بات کہنا چاہتا ہوں آپ سے؟“

”ہاں بولو منشی۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ چوہدری جلال نے کہا تو منشی بولا

”جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ یہ معاملہ ہمیں دب جائے گا اور پھر آپ خود نعمت علی سے بات کر لیں گے۔ لیکن۔ اب وقت ہے کہ آپ کئے چوہدری کو زیادہ ڈھیل دیں۔ ورنہ معاملات اس قدر خراب ہو سکتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں نہیں رہ سکیں گے۔“

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو منشی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں میرے خیال میں تو اسے ڈھیل دینی ہی نہیں چاہیے تھی۔ لیکن اب کیا

کریں۔ منہ زور گھوڑے کو لگام دینے میں بھی ذرا وقت تو لگتا ہے۔“

”جی۔ آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ لیکن لگام دی جائے تبھی نا۔“

مٹھی نے خوشامد انداز میں کہا تو چوہدری جلال اسے سمجھاتے ہوئے بولا

”یہ معاملہ دب جائے تو پھر میں اسے سمجھاتا ہوں۔ بلکہ سمجھانا کیا ہے۔ اسے ریشمی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں پھر،

خیر۔ اعلیٰ کے لوگوں کا رد عمل کیا ہے؟“

”کچھ اتنا خاص نہیں ہے۔ انہیں کیا پڑی ہے کہ کسی کا خواہ مخواہ ساتھ دیتے پھریں۔ وہ فہم کے آنے سے ذرا الجھل ہوئی تھی، وہ

ساری ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ سکون ہے اب ہر طرف۔ تمنا دار نے اپنا کام دکھا دیا ہے۔ اب تک کوئی مدعی سامنے نہیں آیا۔“ مٹھی نے سب

اچھا کی رپورٹ دے دی تو چوہدری جلال نے سر ہلایا اور اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے۔ میں نے بلوایا ہے وکیل کو، کوئی مشورہ کرتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے چوہدری جلال اندر چلا گیا اور مٹھی کافی دیر تک کاریڈور میں بیٹھا سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ وکیل جمیل اختر آ گیا۔

ڈرائیونگ روم میں وکیل جمیل اختر صوفے پر بیٹھا گہری سوچ میں تھا اور مٹھی قریب خاموش کھڑا تھا۔ اگلے لمحے میں چوہدری جلال آ گیا

تو وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوہدری جلال خوش دلی سے کہا

”بیشیش بیشیش وکیل صاحب بیشیش تحریف رکھیں۔“ یہ کہہ کر وہ بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وکیل اس کی جانب متوجہ

ہوتے ہوئے بولا

”جی چوہدری صاحب۔! فرمائیں۔“

”وہ آپ نے مذہب کے بارے میں سن لیا ہوگا۔ جو ہمارا حزرار تھا اور اسے اپنے کبیر نے۔“ چوہدری جلال نے کہا

”جی میں نے سنا ہے یہ اپنے مٹھی نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ اب اس معاملے کو دیکھنا تو پڑے گا میں دیکھتا ہوں۔“ وکیل

نے ہولے سے کہی تو چوہدری جلال بولا

”وکیل صاحب۔! آپ بڑی ڈھیلی سی بات کر رہے ہیں کیا بات ہے۔ آپ کو ہم پر یقین نہیں رہا یا آپ کی وکالت کو کچھ ہو

گیا ہے؟“

”چوہدری صاحب۔! بات یہ نہیں ہے۔ ابھی اسی طرح کا ایک معاملہ نکلتا ہے۔ اس کی ابھی گرد تک نہیں بیشیش۔ کوئی فیصلہ

سامنے نہیں آیا۔ تو ایک اور معاملہ سامنے آ گیا ہے۔“ وکیل نے جواب دیا

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس معاملے کو حل نہیں کر پائیں گے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اگر آپ نہیں کر سکتے

تو۔۔“ چوہدری جلال نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو وکیل نے سمجھانے والے انداز میں کہا

”نہیں۔ اس معاملے کو حل کرنا مشکل ہے، ناممکن نہیں۔ کیونکہ اس معاملے کو حل کرنے میں وقت لگے گا۔“

”کیا مشکل ہے اس میں وکیل صاحب، مجھے بتاؤ۔ میں اسے دور کر دوں گا۔ اور وقت یہ کیا کہہ رہے آپ؟“ چوہدری جلال نے اٹھتے ہوئے پوچھا

”یہی تو اصل مسئلہ ہے چوہدری صاحب۔ ایہ معاملہ حل نہیں ہوگا۔ بلکہ اسے دبا نا پڑے گا۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی بھی مدعی اٹھ کر اٹھو اور اس نے کئے چوہدری کا نام لے دیا، تو بہت زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ دوسرا اگر ملک قسیم اگر سیاست دان ہے تو وہ اس میں ضرور دلچسپی لے گا۔ یہ معاملہ اس سے چھپا نہیں رہ سکے گا۔ وہ ضرور اسے اُچھالے گا۔ اور تیسرا فہد یہاں سر پر موجود ہے۔ حل ہوتا ہوا معاملہ بھی ہگز سکتا ہے۔“ وکیل نے بتایا

”اس معاملے کو دہانے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟“ چوہدری جلال نے پھر پوچھا

”سیدھی سی بات ہے۔ ہمیں کامعاہ ہے، ہمیں وہاں دیں۔ نذیر کے کواحقین کو راضی کرنا پڑے گا۔ تاکہ ان میں سے کوئی بھی مدعی نہ بن جائے۔ پھر کوئی چاہے جو مرضی کرے۔ کم از کم قانونی گرفت نہیں ہوگی۔“ وکیل نے سمجھایا تو چوہدری جلال نے کہا

”آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے۔“

”اور آپ یہ بات چوہدری کہہ کر کوئی اچھی طرح سمجھ دیں کہ اگر انہوں نے سیاست کرنی ہے۔ تو عوام کا دس جیتیں۔ اس طرح تو نہیں چلے گا۔ اب زمینی حقائق کچھ دوسری طرح کے ہیں۔“ وکیل نے سمجھایا

”آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی کہ ایسے کیا زمینی حقائق ہیں جو آپ کو خوف زدہ کر رہے ہیں۔ خیر! ان کے کواحقین میں اتنی جرات نہیں کہ وہ ہمارے سامنے کھڑے ہوں۔ جن لوگوں کو ضروری ہے۔ آپ انہیں مل لیں۔“

چوہدری جلال نے حقارت مبرے لہجے میں کہا تو وکیل بولا

”ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ اب مجھے اجازت۔ میں بہت جلدی میں آیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ فون پر مجھے بتا دیں کہ کیا ہوتا۔“ چوہدری جلال نے کہا تو وکیل نے اٹھتے ہوئے چوہدری جلال سے ہاتھ ملایا اور ہاتھ لٹکا چلا گیا۔ سبھی چوہدری نے منشی کی طرف دیکھ کر کہا

”منشی! ادوہ کیا نام ہے اس کا۔ نعمت علی۔ میں نے اسے بلائے کو کہا تھا۔“

”جی شام کو جو انے کا کہہ تھا اُسے۔ وہ آجائے گا۔“ منشی نے تیزی سے کہا تو چوہدری جلال بولا

”دھیان سے، بہت دھیان سے، ابھی جاؤ، وہ کہیں نکل نہ جائے اور اسے سب سمجھا بھی دینا، سمجھ گئے نا؟“

”جی میں سمجھ گیا۔“ منشی نے کہا اور وہ بھی باہر کی جانب چل دیا۔ چوہدری جلال وہیں بیٹھا ہوا، سوچوں میں کھو گیا۔ اسے حالات کی سمجھ آرہی تھی۔



رات کا ابھی پہلا ہی پہر تھا۔ بابا نعمت علی اور شعی دونوں حوٹلی کے اس کاریلے دور میں کھڑے تھے، جہاں ملنگھی سی روشنی تھی، اور وہیں چوہدری جلال ایک صوفے پر بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابا نعمت نے قریب جا کر اسے سلام کیا تو چوہدری جلال نے چند لمحوں کے بعد کہا:

”نعمت علی! تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟“

”جی، چوہدری صاحب! میں جانتا ہوں۔ مجھے ٹھٹھی نے ساری بات بتا دی ہے۔“ اس نے دھیرے سے جواب دیا تو چوہدری

جلال نے کہا:

”دیکھ نعمت علی! جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ تم لوگوں کا کتنا قصور ہے۔ یا تم لوگوں کو کسی نے بہکا دیا۔ ان باتوں کا کوئی فائدہ

نہیں ہے۔ یا پھر بتاؤ۔ کوئی فائدہ ہے؟“

”نہیں سرکار کوئی فائدہ نہیں۔“ بابا نعمت علی دھیمے سے بولا تو چوہدری جلال نے رعب سے کہا:

”تو پھر یہ وقت ان باتوں کے سوچنے کا نہیں۔ سوچیں گے یا نہیں سوچیں گے، اس سے تمہارا چٹا تو واپس نہیں آ جائے

گا۔ لیکن! مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے۔“

”آپ بڑے لوگ ہیں۔ آپ ہی ہمارا احساس کریں لیکن چوہدری صاحب! اب میں یہاں نہیں رہوں گا یہاں سے کہیں دور چلا

جاؤں گا۔ میں پہلے بھی یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ بابا نعمت علی ڈرتے ہوئے کہ

”میں تمہیں روک تو نہیں سکتا۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ میں تو تمہارا احساس کرتے ہوئے تمہارا خیال کرتے

ہوئے تیری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ چوہدری نے کہا اور اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا چوہدری صاحب؟“ بابا نعمت علی نے حیرت سے پوچھا تو چوہدری جلال نے کہا:

”یہ تھوڑی سی رقم ہے اسے اپنے پاس رکھ۔“ چوہدری جلال نے کہا تو نعمت علی نے بولنا چاہا لیکن چوہدری نے ہاتھ کے اشارے

سے اسے منع کرتے ہوئے بولا، ”تو اگر یہاں سے جانا چاہتا ہے تو چلا جا، جہاں مرضی جاؤ یا پھر یہیں رہنا چاہو تو رہو۔ میں تمہیں تھوڑی

زمین دے دیتا ہوں تو اس پر کتنی ہاڑی کرتا رہ، تجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ اپنا کھانا پیارو۔“

”میں..... میں کچھ سمجھا نہیں؟“ بابا نعمت علی نے الجھتے ہوئے پوچھا تو چوہدری جلال نے کہا:

”یہ رقم اٹھاؤ یہ تیری ہے۔ اور جو میں نے کہا۔ اس پر سوچ لو۔ اگر کوئی بات تمہیں سمجھ نہیں آئی تو یہ فنی تمہیں سمجھا دیتا ہے بولو

۔ کیا کہتے ہو، رقم لے کر سب کچھ بھول جاتے ہو یا.....“

”میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا۔ آپ کی کہنا چاہ رہے ہو۔“ بابا نعمت علی نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھ کر نوٹوں کی گڈی اٹھا لی۔ جب

چوہدری جلال نے کہا:

”اور یہ تمہیں یاد رہے گا کہ اس معاملے کی کسی کوکالوں کاں خبر نہ ہو؟“

”نہن... نہن... نہیں جی، کسی کو نہیں ہوگی خبر۔“ بابا نعمت علی خوف زدہ لہجے میں بولا

”تو بس پھر جاؤ۔ جو تمہیں کرنا ہے۔ وہ منشی کو بتا دیتا۔ یہاں رہ کر کھیتی باڑی کرنی ہے یا یہاں سے چلے جانا ہے اب جاؤ۔“

چوہدری جلال نے غوث سے کہا تو بابا نعمت علی بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا

”جی، میں بتا دوں گا۔ بتا دوں گا میں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی منشی بھی نکلا گیا۔ چوہدری جلال کے چہرے پر پریشانی ختم ہو گئی تھی۔

بابا نعمت علی گھر میں آیا تو صفیہ کمرے غم زدہ حال بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ تبھی بابا نعمت علی نے اندر آ کر دیکھا۔ اس کی نگاہ سونے ہوئے بچوں پر پڑی۔ پھر صفیہ کی طرف دیکھتا ہوا قریب پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صفیہ سے بات کیسے کرے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا

”صفیہ! اپنی تمہیں پتہ ہے نا چوہدری جلال نے مجھے بلایا تھا۔ میں گیا تھا اس کے پاس۔“

یہ سن کر صفیہ نے طعنیہ انداز میں پوچھا

”کیا حکم دیا ہے اس نے؟“

”وہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ لگا چوہدری بچ جائے۔ اس لیے وہ ہمیں زمین دینے کو بھی تیار ہے اور یہ رقم دی ہے۔“ بابا نعمت علی نے بے بسی سے کہا اور چوہدری کی دی ہوئی رقم اس کے سامنے رکھ دی۔ صفیہ نے اس رقم کو دیکھا بھی نہیں بلکہ بڑے غصہ سے لہجے میں پوچھا

”تم نے کیا کہا بابا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بیٹی، ہم چوہدریوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے۔ یہاں رہیں گے تو لوگوں کے طعنے مار دیں گے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ ہم یہاں سے دور نکلیں اور چلے جائیں۔“

”بابا! ابھی تو نذیرے کی قبر والی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی۔ اور تم یہاں سے جانے کی بات کر رہے ہو۔ اور یہ جو تو نے رقم میرے سامنے رکھ دی ہے کیونکہ نذیر کا خون بہا ہے یا اس کے خون کی قیمت، کیا تمہاری نگاہ میں نذیر کے خون کی اتنی ہی قیمت تھی؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم کمزور اور بے بس ہیں۔ ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ تم غلط سوچ رہی ہو۔ یہاں رہے تو نذیر کا غم بھول نہیں پائیں گے۔ یہ بچے بھی ہم سے سوال کرتے رہیں گے۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو شاید۔“ بابا نعمت علی اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا

”یہ بچے تو پھر بھی سوال کریں گے۔ جب کیا بتائیں گے بابا؟“ صفیہ نے طعنیہ پوچھا

”کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ ہم نے اگرچہ ہداری کی بات نہ مانی تب بھی تو یہ گھر خالی کرنا پڑے گا۔ تم تیری کرلو بیٹی۔ کل بندے کی قل خوانی کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ بس تم تیار رہنا۔“ جب اس نے بے بسی محسوس کی تو یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ صنفیہ بڑھ حال سی سوچوں میں گم ہو گئی۔ رقم وہیں پڑی رہی۔ اچانک صنفیہ رو دی پھر روتے ایک دم سے خاموش ہو گئی جیسے اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔



رات کا پہلا چہرہ ختم ہونے کا تھا سراج اور چھاکا فہد کے گھر محن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ تبھی سراج نے اچانک پوچھا ”یار کافی دیر ہو گئی ہے، فہد نہیں آیا ابھی تک؟ اور تو بھی میرے سامنے بیٹھ بات تو کر رہا ہے لیکن کہیں کھویا ہوا ہے۔ یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔ اتنا کھویا کھویا سا کیوں ہے۔ کوئی پریشانی ہے؟“

”نہیں یار۔! پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔ لیکن دکھ بہت ہو رہا ہے۔ یہ جو چہ ہداری کبیر نے کیا ہے نا، اچھا نہیں کیا۔“ چھاکا کے لہجے میں دکھ ٹھکلا ہوا تھا۔ تو سراج بولا

”یہ کون سا ان کے لیے یا اس علاقے کے لوگوں کے لیے نئی بات ہے۔ جب تک لوگ ان کے خلاف نہیں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ وہ تو ظلم کرتے رہیں گے۔“

”پہلے میں نے کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا ہوتا نہیں دیکھا تھا۔ سنی سنائی اور آنکھوں دیکھی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ منظر وہ عجیب، وہ دھندلیں۔ میری نگاہوں کے سامنے سے بچتے ہی نہیں ہیں۔ یار۔! زندگی یوں بھی سستی ہو جاتی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور پھر جو میرے ساتھ گزری، میں نہیں بھول سکتا، میں بہت اذیت میں ہوں یار۔“ چھاکا نے دھکی لہجے میں کہا

”اس کا مطلب ہے میرا بھائی بھی اس طرح اذیت میں تھا۔“ سراج اس کی طرف دیکھ کر بولا

”اب میں محسوس کر سکتا ہوں کہ وہ کیوں گواہی دیتا چاہتا تھا۔ میں نے یہ پورا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بہت ظلم کیا اس نے۔“ چھاکا نے آنکھیں بند کر کے کہا تو سراج بولا

”کب تک یہ ظلم کرتے رہیں گے۔ آخر ایک دن ایسا تو آئے گا۔ جب انہیں اپنے گناہوں کا حساب دینا ہے۔ پتہ نہیں لوگ کیوں نہیں سمجھتے اس کبیر کو تو اب کام دینا ہوگی۔“

”ورنہ بہت سارے گمراہ جڑ جائیں گے اس نے اپنے باپ کی طاقت کا بہت فائدہ استعمال شروع کر دیا ہے۔ اس سے بھلائی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔“ چھاکا حتی اعزاز میں بولا

”چھاکا۔! تو مایوس نہ ہو میرے بھائی۔ اچا ہے دیر سے صحیح لیکن ایک دن آئے گا۔ ان کا ظلم ہی انہیں ختم کر کے رکھ دے گا۔ یہ بھی تو قانونِ فطرت ہے۔ تو پریشان نہ ہو۔ ہم نے ہی ان کا راستہ روکنا ہے۔ کوئی باہر سے نہیں آئے گا۔ ہم ہی ان کا ہاتھ روکیں گے۔“

سراج دانت پیٹتے ہوئے بولا تو چھاکا کے نے غصے میں کہا

”ہاں۔ ایسا ہوگا۔ میں فہد کا پتہ کرتا ہوں۔“

”جل میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔“ سراج نے کہا تو دونوں اٹھتے چلتے گئے۔

قسمت گھر میں صبح کے سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ مسجد میں نماز کے بعد چند لوگ ہی رہ گئی تھے۔ جن میں چھاکا، سراج اور فہد بھی تھے۔ بابا نعمت کے پاس ماسٹر دین محمد بیٹا ہوا تھا۔ انہی چند لوگوں کے درمیان قل خوانی کی دعا ہو گئی تو لوگ مسجد سے نکل آئے۔ فہد بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ نکل آیا اور مسجد کے باہر کھڑے ہو کر ہاتھیں کرنے لگا۔ وہیں ایک بندے نے سوال کیا تھا کہ نذیری کی قل خوانی میں اتنے کم بندے کیوں ہیں؟ جس پر فہد نے کہا

”اس گاؤں میں آج ہم نذیرے کی قل خوانی پر اکٹھے ہوئے ہیں۔ یہ چند لوگ ہی اس لیے آئے ہیں کہ نذیر غریب آدمی تھا اور وہ چوہدریوں کی نگاہ میں نہیں آنا چاہتے۔ ڈرتے ہیں چوہدریوں سے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ غریب تو تھا وہ۔ پر لوگ چوہدری کے خوف سے لوگ نہیں آئے۔“ ایک بوڑھے نے گویا اس کی بات کی تصدیق کر دی۔ جب فہد نے انتہائی طنز پر انداز میں لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا

”کل ایسا ہی واقعہ گاؤں کے کسی اور جوان کے ساتھ پیش آ سکتا ہے تو پھر اس کے بے بھی کوئی نہیں آئے گا۔ سب جانتے ہیں۔ قتل کس نے کیا ہے مگر پولیس ایک طعنے نازی بندے کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ جس نے اقرار جرم بھی کر لیا ہے۔ ظالم تو صاف بچ گیا نا۔“

”دارت ہی مدعی نہیں بنے۔ چوہدری توفیقے کی ضمانت کروالے گا۔ کیس کی عدم بروی کی وجہ سے وہ ملوث بھی بچ جائے گا۔ ایوں چند دن ہی پولیس کا مہمان رہے گا نا۔“ ایک بزرگ سے بندے نے کہا تو سراج بولا

”فہد۔ کیا تمہیں نہیں پتہ کہ انصاف کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے کتنا پیسہ لگانا پڑتا ہے۔ دفتروں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ اتنی ہمت تھی ان لوگوں میں۔“

”جب گواہ ہی نہیں ملیں گے تو عدالت بھی کچھ نہیں کر سکے گی۔ فیصلہ ثبوت اور پکی گواہی پر ہوتا ہے نا۔“ بزرگ نے سمجھاتے ہوئے کہا تو فہد بولا

”کیا یہاں کے لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے؟ ذرا حوصلے کی دیر ہے۔ یوں خوف زدہ رہے تو یہ ظلم ہوتا ہی رہے گا۔ آج نذیر قتل ہوا کل کوئی اور قبر میں چلا جائے گا۔“

”ہونی کو کیسے مال سکتے ہیں بیٹا۔ کیا کر سکتے ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بزرگ وہاں سے چل دیا۔ فہد اور سراج دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔

انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ قسمت گھر کی گلیوں میں ایک بھونچال آچکا ہے۔ صفید اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اپنے گھر سے نکل پڑی تھی۔ اس کا اچھا دوپٹہ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر افسوس اور بے بسی کی سنجیدگی تھی۔ صفید گلی میں آ رہی تھی۔ لوگ اسے دیکھ رہے

تھے۔ وہ کسی کی طرف دیکھے، ہوا چلتی چلی جا رہی تھی۔ مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی وہ چوک میں آگئی۔ اس کے ساتھ کئی بچے، عورتیں اور نوجوان بھی تماشہ دیکھنے کی غرض سے ساتھ ہو لئے تھے۔ فہد اور سراج کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے قریب آکر فہد کے سامنے رک گئی۔ تبھی ایک آدمی نے اس سے پوچھا

”صفیہ! کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”میں فہد کے پاس آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے آچل کا پلو کھولا، اس میں سے نوٹ نکال کر فہد کے سامنے ڈھیر کرتے ہوئے بولی: ”یہ ہے وہ رقم ہے جو میرے سائیں نے تم سے لی تھی۔ اور اسی جرم میں چوہدری کبیر نے اسے قتل کر دیا۔ میرے گھر والے تو میرا ساتھ نہیں دیتے۔ مگر میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ تاکہ تم میری مدد کرو۔“

”کھل کر بات کرو تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ فہد نے سکون سے پوچھا تو صفیہ کھٹی بھرے لہجے میں بولی

”میں تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔ مرد ہو تو وعدہ کرو ورنہ سر جھکا کر پرے ہٹ جاؤ۔“

”میں تمہاری مدد کروں گا مگر۔“ فہد نے کہنا چاہا تو صفیہ ٹپ کر ہڈیانی انداز میں بولی

”تم بھی اگر مکر کرنے لگے ہو۔ مجھے تو ماسٹر جی کی دبی سٹپی نے کہا تھا کہ گاؤں میں تم ہی ایک مرد ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔ لیکن اب جا کر اسے بتا دوں گی کہ تم بھی اگر مکر کرنے لگے ہو۔ لگتا ہے تم بھی مرد نہیں ہو۔“

”میں تمہاری مدد کروں گا لیکن کل اگر تجھے کوئی مجبوری آن پڑی تو۔“ فہد نے انتہائی قہل سے پوچھا

”میرے بچوں کو قہم کرنے والا پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں اس کام میں بہت سی رقم لگے گی۔ وہی دینے آئی ہوں۔ یہ رقم اٹھاؤ۔ یہ لو میرے گہنے بھی لے لو، جان مانگو گے تو جان بھی دے دوں گی۔ پر میری ہانہ کو تمام لے۔ مجھے انصاف دلا دے۔“

صفیہ نے دہائی دیتے ہوئے کہا تو فہد چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا

”آؤ میرے ساتھ۔“

”فہد! خود کو اکیلا مت سمجھتا۔ میں صفیہ کو بتا دیتا چاہتا ہوں کہ ابھی یہاں پر مرد ہیں۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

سراج نے جذبہاتی ہوتے ہوئے کہا تو چھا کا بولا

”میں بھی چلتا ہوں فہد، میں نے نذیر کا کل اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، صرف میں نے ہی نہیں، گاؤں کے لوگوں نے بھی دیکھا ہے۔ لیکن تم بھی جانتے ہو اور میں بھی، ان میں سے کوئی بھی گواہی نہیں دے گا۔ یہ سب ان ظالم چوہدریوں سے ڈرتے ہیں میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں گواہی دوں گا۔“

وہاں پر کھڑا ہوا ہر شخص حیرت زدہ تھا۔ شاید قسمت مگر کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا جانے والا تھا۔ تبھی فہد نے با اعتماد انداز میں

صفیہ سے کہا

”آؤ چلیں۔“

چمن کے نے بکھرے ہوئے نوٹ اٹھا کر مغیہ کے پلو میں ڈال دیئے اور پھر وہ سب ایک طرف چل دیئے۔ فہد نے اپنا سیل فون نکالا اور جعفر کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ اس وقت سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔

جعفر کو جیسے ہی قسمت نگر کی صورت حال معلوم ہوئی اس نے سب سے پہلے مائزہ کا نمبر ملایا اور سیل فون کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مائزہ تیار ہو کر گھر سے باہر نکل رہی تھی۔

”ہیلو جعفر کیسے ہو؟“ مائزہ نے کہا تو جعفر نے پوچھا

”تم کیسی ہو۔ میرا خیال ہے ابھی آفس تو نہیں ہو؟“

”ابھی آفس کے لیے گھر سے نکل رہی ہوں۔ تم خیریت سے تو ہونا۔ تمہارا لہجہ کدھ ٹھیک نہیں لگ رہا مجھے۔“ مائزہ نے سنجیدہ

ہوتے ہوئے کہا تو جعفر بولا

”ٹھیک ہوں۔ خیر سنو! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مدد! بولو جعفر، اس میں اتنا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔“ مائزہ نے کہا تو جعفر نے قسمت نگر کے

تازہ واقعہ کے بارے میں سب تفصیل سے بتا دیا۔ مائزہ جوں جوں سنتی گئی، اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔

”کاش جعفر۔ یہ سب مجھے فہد بتاتا۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ میں سب کر لیتی ہوں۔ اوکے ہم بعد میں بات کرتے ہیں۔ میں آفس

پہنچ جاؤں۔“ اس نے حسرت سے کہا اور فون بند کر دیا۔ جعفر چند لمحوں تک فون کو تکتا رہا پھر کچھ سوچتے رہنے کے بعد ملک فیم کو فون کر کے فوراً اپنے آفس میں ملنے کا کہا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جعفر کے آفس میں ملک فیم بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ان کے درمیان چائے کے پیالیاں

دھری ہوئی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے، وہ پرسکون انداز میں بات کر رہے تھے، جعفر کہہ رہا تھا

”یہاں آتے ہی جہاں میں نے ماحول کو سمجھا ہے، وہاں میں نے وہ معلومات بھی لی ہیں کہ یہ چوہدری لوگ اتنا ظلم کیوں کرتے ہیں۔“

”کیا پتہ چلا آپ کو؟“ ملک فیم نے پوچھا

”یہی کہ یہ سب آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“

جعفر نے اطمینان سے کہا تو ملک فیم نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا

”میری وجہ سے مطلب، کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“

ملک فیم نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا تو جعفر پر جوش بھجے میں بولا

”ہاں، آپ لوگ ظلم ہوتا تو دیکھتے ہیں لیکن اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ غریب لوگ کہاں آواز اٹھ سکتے ہیں۔ یہ تو آپ

جیسے لوگوں کی ذمہ داری ہے تاکہ جو چہ چوری جیسے بھلے نہیں لیکن تھوڑی بہت قوت رکھتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن وسائل پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ہاری آواز دبا دی جاتی ہے۔ مثلاً اگر مدعی ہی مقدمہ لڑنا نہ چاہے تو وکیل کیا کر سکتا ہے۔“ ملک نعیم نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو جعفر بولا

”آپ بہت کریں راستے خود بخود نکل آئیں گے۔ مخلوق خدا کو ان ظالموں سے نجات دلائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ وہ اگر اپنے وسائل کو آزما رہے ہیں تو کیا آپ ان کمزوروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”مثلاً، بتائیں۔ کیا ہو سکتا ہے؟“ ملک نعیم نے پوچھا

”شاید آپ کو معلوم نہیں ہے، چوہدری کبیر نے پھر ایک قتل کر دیا ہے اور مقتول کی بیوہ تھانے پہنچی جانے والی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد تھانے میں رپورٹ کرے گی۔ اب اس کی مدد کرنے والا کون ہے؟ کیا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں بنتی عوام کا ناکندہ قتلہ روٹ لینے والا تو نہیں ہوتا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔“

جعفر نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا ملک نعیم نے احتجاجی لہجے میں کہا

”بھئی تو بات ہے کہ لوگ آتے ہی نہیں ہیں۔ اگر وہ خاتون میرے پاس آ جاتی تو میں دیسے ہی اس کی مدد کرتا۔ خیر۔ امیں سمجھ گیا کہ آپ اصل میں کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں اس خاتون کی بھرپور مدد کروں گا۔“

”تو پھر آپ کو اس علاقے سے انکسٹن میں کوئی نہیں ہر اسکتا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

جعفر نے حتیٰ لہجے میں کہا تو ملک نعیم بولا

”یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا ہونا ہے اور کیا نہیں ہونا۔ بہر حال میں چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا۔ جعفر نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا تو ملک نعیم چل دیا۔ جعفر کے مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنے سیل فون پر فہد کے نمبر ملائے۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ نور پور تھانے پہنچ گئے ہیں۔

فہد سمیت وہ سارے تھانے کے اندر چلے گئے جو قسمت نگر سے ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے ساتھ پرئیں بھی تھا۔ تھانیدار وہاں سے اٹھ کر باہر آیا تو انہیں دیکھ کر ٹھک گیا۔ تبھی تھانیدار نے بڑے رعب دار انداز میں کہا

”یہ اتنا ہجوم لے کر کدھر آ گئے ہو؟“

”اس خاتون کا شوہر قتل ہو گیا ہے یہ اس کی ایف آئی آردو بارہ درج کر دانے آئی ہے اور ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کی ایف

آئی آردو بارہ درج کرو۔ یہ مدی ہے۔“ فہد نے سکون سے کہا

”تم وکیل بن کر آئے ہو۔ خیر کب ہو ایہ قتل اور کہاں ہوا؟“ تھانیدار طنزیہ انداز میں بولا

”یہ تو لکھنے بیٹھیں گا۔ جمی سب بتائے گی نا۔ تم لکھو۔“ سراج نے اس سے کہیں زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا، تھانیدار نے اس کی

طرف دیکھا، پھر ایک نگاہ لوگوں پر ڈالی اور قتل سے بولا

”ابھی تو میں سرکاری کام سے جا رہا ہوں۔ ابھی وقت نہیں ہے میرے پاس تم لوگ انتظار کرو۔ اسنے میں جو لکھوانا ہے۔ وہ درخواست میں لکھ لو اس آج ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو فہد نے اسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا

”اس خاتون کا شوہر قتل ہوا ہے اور یہ۔۔۔۔۔“

”اوئے تم لوگ کیا ہو۔ میری بات سمجھ میں نہیں آئی تمہیں۔ جب میں نے کہہ دیا ہے تو انتظار کرو۔ تم زیادہ وکیل بننے کی کوشش

مت کرو۔“ قانیدار غصے میں بولا

”دیکھو قانیدار۔ امیر اپنا ذاتی معاملہ تھا تو میں خاموشی سے چلا گیا۔ تجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ جو تم کر رہے ہو۔ یہ لفظ ہے اور

اب اگر بات کرو تو وہ تمہارے کرناور نہ پھر تمہیں ابھی سمجھانا پڑے گا کہ بات کیسے کرتے ہیں۔“ فہد نے کہا

”تم سمجھاؤ گے مجھے صحیح کیا ہوتا ہے اور غلط کیا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم کیا شے ہو۔ لیکن یہ نہیں جانے کہ قنون کی طاقت کیا

ہوتی ہے۔ چلو ادھر جا کر بیٹھ جاؤ۔“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ قانیدار نے چپقل کی گاڑی آرکی اور اس میں سے لوگ نکل آئے۔ سب سے آخر میں ماڑہ گاڑی

میں سے نکلی۔ انہیں دیکھ کے قانیدار ٹھٹک گیا۔ فہد نے بھی خوشگوار حیرت سے انہیں دیکھا اور فہد سے قانیدار کی طرف دیکھ کر پوچھا

”اب جا کر دکھاؤ قانیدار صاحب۔ اور انہیں اپنی بدتمیز زبان میں جواب دو، یہ میڈیا ہے، اب تم جو کہو گے یا کرو گے۔ اس کے

ذمے دار تم خود ہو گے۔“

اسنے میں ماڑہ، فہد کے قریب آرک گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ٹکا ہیں پھر کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں حجانے کون کون

سے جذبے تیر رہے تھے۔ جیسی ماڑہ نے لہجے میں عیار اور جذبات کی شدت سے بے قابو ہوتے ہوئے فہد سے پوچھا

”کیسے ہو فہد؟“

تب فہد نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا

”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ؟“

”میں سب بتا دوں گی، لیکن پہلے یہ۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے قانیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے

بولی، ”انسپکٹر، کیا معاملہ ہے اس خاتون کا؟“

”اس نے کیا بتانا ہے، یہ تو چوہدری کا زرخرید ہے، میں بتاتی ہوں۔“ منیہ نے غصے میں کہا اور ساری روداد مختصر انداز میں بتا

دی۔ سارا ماجرا سن کر ماڑہ نے قانیدار سے کہا

”آپ اس خاتون کی ایف آئی آر درج نہیں کر رہے ہو۔ کیا آپ پر کوئی سیاسی دباؤ ہے۔ یا آپ نے رشوت لی ہوئی ہے۔ کیا

وجہ ہے؟“

تھانیدار نے کمرے کی طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے کہا

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے ایف آئی آر درج کر لی ہوئی ہے، میں پوری کوشش کر کے تفتیش کر رہا ہوں، یہ لوگ خواہ مخواہ دباؤ

ڈال رہے ہیں۔“

”کیا دباؤ ڈال رہے ہیں؟ یہ خاتون یہاں کے ایم این اے کے بیٹے پر الزام لگا رہی ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ایف آئی

آر نہیں کئی آج تیسرا دن ہے؟“ مائرہ نے پوچھا تو تھانیدار نے گھبراتے ہوئے کہا

”یہ لوگ ہمارے پاس آج ہی آئے ہیں۔ ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ہم نے تو نامعلوم افراد کے خلاف ہی ایف آئی آر کا

ہے۔ فیضان ای آدی گرفتار ہوا ہے اس نے اقبالی جرم بھی کر لیا۔“

”لیکن یہ خاتون خود مدعی بن کر اپنی ایف آئی آر ایم این اے کے بیٹے کے خلاف لکھوانا چاہ رہی ہے، قتل کے اس مقدمے کے

بارے میں اس کا کوئی بیان نہیں لیا گیا۔ اور اب آپ اس کی بات سننے کی بجائے، کسی سرکاری کام سے جا رہے ہیں۔ جو اتنا اہم ہے۔ ان

باتوں کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟“ مائرہ نے پوچھا

”وہ میں۔ وہ میں۔“ تھانیدار نے اٹکتے ہوئے کہا

”آپ یہ مان کیوں نہیں لیتے کہ آپ پر سیاسی دباؤ ہے۔ جس کی وجہ سے آپ نے ایف آئی آر تک غلط درج کی۔ ان

چوہدریوں کے بچے جو مرضی کرتے رہیں۔ اور آپ ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ جھگے کے ملازم نہیں۔ چوہدری

کے درخیز غلام ہیں۔“ مائرہ نے غصے میں کہا تو تھانیدار فوراً ہینترہ بدلتے ہوئے کہا

”جیسا یہ کہتے ہیں میں ویسی ہی ایف آئی آر درج کرتا ہوں۔“

”وہ تو تمہیں کرنی پڑے گی، جلدی کریں۔ یہ خبر معمولی نوعیت کی نہیں ہے۔ یہ پوری دنیا میں جانے گی۔ یہ تاہو کہ چوہدری کی

نوکری کرتے کرتے اپنی نوکری سے بھی جاؤ اور قانون تمہیں سزا لگ دے۔“

مائرہ نے کہا تو تھانیدار بغیر چوں و چراں کئے بولا

”آؤ۔“

فہد کے ساتھ صفیہ اور سراج اندر چلے گئے۔ چشم دید گواہ کے لئے چھا کا دیں تھا کچھ دیر بعد۔ صفیہ کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔ چو

ہدریوں کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی تھی۔ انسپکٹر السردہ سامیٹھا ہوا تھا۔ فہد اور مائرہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے، مسکرا دیے۔ کچھ

دیر بعد وہ سب تھانے سے باہر آ چکے تھے۔

اسی لمحے ملک فہم کی گاڑی تھانے کے دروازے پر رکی۔ وہ گاڑی سے اتر کر جلدی سے آگے بڑھا تو ملک فہم کو پہچان کر لوگ اس کے اور گرد جمع ہو گئے۔ مائرہ سے جب تعارف ہوا تو اس نے ملک فہم سے کہا

”اجھا ہوا آپ ہمیں مل گئے، ورنہ مجھے آپ کے گھر آنا پڑتا۔“

”میں تو اب بھی آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں۔“

ہاتوں کے دوران مائرہ نے کمرے کو اشارہ کر دیا۔ مائرہ نے مائیک اس کے سامنے کیا تو بھی سمجھ گیا۔ عجیبی، مائرہ نے سوال کیا

”آپ کا شمار علاقے کے سرکردہ افراد میں ہوتا ہے، آپ بھی یہ سست کرتے ہیں۔ قسمت مگر میں یہ جو بھیا تک قتل ہوا ہے اور اس کا الزام آپ ہی کے سیاسی مخالف کے بیٹے پر ہے، جو اس وقت ایم این اے ہے اور حکومت میں بھی شامل ہے، آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”قسمت مگر میں جو بہانہ لقل ہوا ہے، میں اس کی زبردست مذمت کرتا ہوں۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ بات یہ نہیں کہ وہ میرے سیاسی حریف ہیں، بلکہ کسی بھی معاشرے میں جرم برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے قتل ہوا، کس نے کیا، اس کا جو بھی مجرم ہے، میں حکومت وقت سے یہ اپیل کروں گا کہ وہ جلد از جلد مجرموں کو گرفتار کر کے انہیں کیفر تک پہنچائیں۔“ ملک فہم نے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تو مائرہ نے دوسرا سوال کرتے ہو پوچھا

”کیا آپ کا فرض نہیں بنتا کہ اس مظلوم کی مدد کریں، اس کا شوہر قتل ہوا ہے جو اس کا اور اسے خاندان کا واحد سہارا تھا؟ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس خاتون کا شوہر قتل ہوا ہے، اسے جلد از جلد انصاف ملے۔ انصاف کے حصول کے لیے آپ اس خاتون کی کیا مدد کریں گے؟“

”جی بات تو یہ ہے یہ خاتون ابھی تک میرے پاس نہیں آئی۔ میں نے بھی آپ ہی کی طرح سنا ہے، اور اس کے لیے میں قسمت مگر تھانے میں آیا ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، اسے انصاف کے حصول میں مدد دینے کے لیے میں پوری کوشش کروں گا۔ اور جیسی یہ مجھ سے مدد چاہے گی میں اسے دوں گا۔“ ملک فہم نے کہا تو مائرہ نے پوچھا

”کیا آپ ایسا صرف اس لیے کریں گے کہ اس میں آپ کے سیاسی مخالف جو ہداری جلال کے بیٹے کا نام ملزم کے طور پر آ رہا ہے؟“

”وہ میرا سیاسی مخالف ہے، میں یہ، نہتا ہوں لیکن جرم تو جرم ہے وہ جس نے بھی کیا ہے، اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ میں آپ میڈیا سے بھی اپیل کروں گا کہ آپ بھی مجرموں تک پہنچنے میں مدد دیں۔ میں اس خاتون کو اس کا حق دلانے کا اعلان کرتا ہوں۔“

ملک فہم نے ایک عزم سے کہا تو مائرہ نے اگلا سوال کیا

”کیا آپ کا بیاد ان محض سیاسی لوگوں کے بیان کی طرح ہو گیا آپ اس بارے میں رشتہ بھی کریں گے؟“

”اگر آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ ملزم کوئی سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے بچ جائیں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ملزم جتنا بھی طاقتور ہوگا، اسے قانون کی گرفت میں لانے کے لیے میں بھرپور مدد کروں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا آپ یقین رکھیں کہ یہ سیاسی وعدہ نہیں ہوگا۔“ ملک

ضمیم کے اتنا کہنے پر، مائرہ نے کمرے کو اشارہ کیا تو اس کے ساتھ ہی کمرہ بند کر دیا گیا۔

”بہت شکریہ ملک صاحب۔ اب ہم چلتے ہیں۔“ مائرہ نے اخلافا کہا تو ملک ضمیم نے کہا

”نہیں آپ چلیں گھر، کھا نا کھا کر جائیں گے۔ آئیں آپ سب۔“

”بہت شکریہ ملک صاحب، پھر کبھی سہی، اس وقت ہمیں رپورٹ مکمل کرنے قسمت مگر جانا ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا اور تھانے کے اندر چلا گیا۔ اس دوران مائرہ اپنے محل کے لوگوں کے ساتھ گاڑی کی طرف

جاتے ہیں اور قریب کمرے فہد سے بولی

”آؤ چلیں۔“

”چلو۔“ فہد نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی جانے کو تیار

تھے۔ مائرہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑیاں آگے پیچھے قسمت مگر کی جانب روانہ ہو گئی۔



حویلی کے کاریڈور میں چوہدری جلال انتظار کرنے کے سے انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اسے میں منشی فضل دین آگیا تو چوہدری اس

کی جانب متوجہ ہو گیا۔ منشی بڑے صوب انداز میں بولا

”چوہدری صاحب۔ اوہ نذرے کی بیوہ صنفیہ۔ وہ فہد کے ساتھ تھانے کی طرف گئی ہے۔ ایف آئی آر لکھوانے۔ اس کے

ساتھ گاؤں کے کچھ لوگ بھی ہیں۔“

”مگر۔ اتم تو کہہ رہے تھے کہ نعمت علی ان سب کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا؟“

چوہدری جلال نے ہاتھ پر تیوریاں ڈال کے پوچھا تو منشی بولا

”اس نے تو مجھے یہی کہا تھا۔ لیکن صنفیہ نے اپنے شوہر کا بدلہ لینے کا گاؤں کے چوک میں اعلان کیا ہے۔ اور وہ خود گئی ہے فہد کے

پاس، وہ اسے لے کر تھانے کی طرف چلا گیا ہے۔“

”جل یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ ان کے دل میں کوئی ہرک نہ رہ جائے۔ میں تو انہیں بہت کچھ دے دینا چاہتا تھا۔ تم ایسے کرو۔

فون کر کے انسپکٹر کو ساری بات سمجھا دو، ایف آئی آر درج نہیں ہونی چاہئے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں اسے میں دیکھ لیتا ہوں۔“

چوہدری جلال نے کہا تو منشی تیزی بولا

”جی، وہ میں کہہ دیتا ہوں۔ کیا یہ بات میں وکیل صاحب کو بھی بتا دوں۔“

”ہاں۔! اسے بھی بتا دو۔ انسپکٹر سے کہو کہ وہ صنفیہ وغیرہ کو الگ لے جا کر بات کر لے۔ فی الحال انہیں ٹال دے، پھر بعد میں

دیکھتے ہیں۔ لگتا ہے یہ عورت ایسے نہیں بگھنے والی۔“ چوہدری جلال نے غصے میں کہا

”اصل میں اسے سمجھانے والا ہی تو اس کے ساتھ ہے۔ اگر وہ اس کا ساتھ نہ دے تو اس عورت کی کیا جرات کہ وہ تھانے کا رخ کرے۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟“ منشی نے تہرہ کیا

”منشی۔! میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ فہر اصل میں کیا چاہتا ہے۔ ابھی اس معاملے میں دیکھوں گا، وہ کرتا کیا ہے۔ پھر اس کا پتہ صاف کرنا ہی پڑے گا۔ خیر۔! تم سے جو کہا ہے وہ دیکھو، فون کرو میں آکر اوپر بات کرتا ہوں۔“

”جی بہتر۔“ یہ کہہ کر منشی اندر کی جانب بڑھ گیا تو چوہدری بھی آہستہ قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

منشی نے تھانے دار کو فون ملا یا تا کہ اسے ہدایت دے سکے کہ چوہدری جلال کیا چاہتا ہے لیکن وہ تھانے میں نہیں تھا۔ تھانے کے منشی نے تمام روداد بتا دی۔ فون رکھ کر اس نے ایف آئی آر درج ہونے کے بارے میں چوہدری جلال کا بتایا تو وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا

”وہ اسے ایس بی جعفر سے بات کراؤ۔“

چوہدری جلال کے چہرے پر پریشانی تھی۔ منشی فون ملا رہا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی ریسور بڑھاتے ہوئے کہا

”یہ ایس بی جعفر صاحب بات کریں۔“

”اے ایس بی جعفر۔! یہ کیا کر دیا ہے آپ کے انسپکٹر نے۔ ایف آئی آر درج کر دی۔ کیا اسے آپ نے سمجھایا نہیں تھا میری آپ سے تفصیلی بات ہو چکی ہے مگر بھی۔“ چوہدری جلال نے دبے دبے غصے میں کہا

”جی۔! سمجھایا تو تھا اسے لیکن میڈیا کے سامنے وہ کیا کر سکتا تھا۔ اسے ایف آئی آر درج کرنا پڑی۔ منشی شہر بھی تو ان کے ساتھ تھا۔ وہ تو کیا، میں خود کو بے بسی محسوس کر رہا ہوں۔“ جعفر نے جواب دیا

”تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ سب سیاسی مخالفت میں ہو رہا ہے۔ یہ اچھا نہیں ہوا اے ایس بی۔“ چوہدری جلال نے دھمکاتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”یہ اچھا ہوا ہے یا برا، میں نہیں جانتا۔ میں تو نبی آیا ہوں چوہدری صاحب۔! میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ سب پر ایس کی وجہ سے ہوا ہے۔ سارا معاملہ آپ کے سامنے ہے۔“

”لیکن آپ اس بات کا تو خیال کریں تاکہ ہمیں خواہ مخواہ پھنسا یا جا رہا ہے۔ کل جب اوپر سے حکم آیا تو آپ ہی پر دباؤ آئے گا۔“ چوہدری جلال نے دھمکا یا تو جعفر بولا

”میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا، میں کہاں تک قتل چھپا سکوں گا۔ اگر آپ کے بیٹے قتل نہیں کیا تو یقین رکھیں، اسے کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر اس نے واقعی قتل کیا ہے تو اسے کوئی قانون کی گرفت سے نہیں بچا سکتا، نہ آپ کی سیاست، نہ آپ کی دولت اور نہ اثر و رسوخ۔ ایک عام آدمی اور آپ میرے لئے برابر ہیں۔“

چوہدری جلال کی اقا پر یہ لفظ بجلی بن کر گرے۔ اسے یہ گمان ہی نہیں تھا کہ ایک آفیسر اسے یوں جواب دے گا۔ اس لئے غصے

بھرے دھب سے بولا

”وہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ ہمارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

”اب تو سارا معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی طرح اس خاتون کو منالیں۔ صلح تو کرنی پڑے گی پھر دیکھتے ہیں، کیا ہو سکتا

ہے۔“ جعفر نے سکون سے کہا

”آپ سے کچھ نہیں ہوگا، اب میں کر کے دکھاتا ہوں۔“

چوہدری جلال نے غصے میں فون فٹنی کو تھما دیا۔ پہلی بار اسے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا تھا۔

چوہدری جلال نے کچھ دیر سوچا اور پھر اچانک بولا

”اوئے فٹنی۔ اوکیل کے آنے سے پہلے، جس طرح بھی ہو سکے، وہ چاچے سوہنے کو لے آؤ۔ اس کا بیٹا ہی ہے نا چشم دید گواہ،

میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

”جی میں سمجھ گیا۔ ابھی گیا۔“ فٹنی نے کہا اور تیزی سے باہر کی جانب چل دیا۔

چوہدرے میں پہنچ کر فٹنی نے دوری دیکھ لیا، چاچا سوہنا زمین پر بھی چادر پر پٹی کٹوری کھیل رہا تھا۔ اس نے گاڑی وہیں رکوا

دی۔ پھر اتر کر سیدھا چاچے سوہنے کے پاس چلا گیا۔ سب کو نظر انداز کر کے اس نے چاچے سوہنے سے سلام کیا تو چاچے سوہنے نے فٹنی کی

طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا

”خیر تو ہے فٹنی۔ ابڑی چیز میں آئے ہو۔“

”خیر تو تیرے ہتھ کی نہیں ہے جو نگے چوہدری کے خلاف گواہیاں دیتا پھرتا ہے۔۔۔ کدھر ہے وہ۔“ فٹنی نے بڑے دھب سے

کہا تو چاچا سوہنا بولا

”ساری خبریں اسی کی طرف سے ہیں فٹنی۔ جس نے پیدا کیا ہے اور ری بات میرے ہتھ کی گواہی کی، میں اس کے معاملے میں

داخل نہیں دیتا جو اس کا دل چاہے کرے۔“

”تو جانتا ہے کہ تو کیسی بات کر رہا ہے۔ تیرے جیسے کی کینوں کی ہمت یہ ہونے لگی کہ اب وہ چوہدریوں کے خلاف گواہیاں دیتے

پھریں، سنو۔ اچا ہے اس کے معاملے میں دخل دیتے ہو یا نہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلو اور چوہدری صاحب کو یہی بات بتا دو۔“ فٹنی نے کہا

”مجھے کیا لینا دینا تیرے چوہدریوں سے، میں کیوں جاؤں۔“ چاچا سوہنا بولا

”دیکھ سوہنے۔ ابھی میں آیا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے کی طرح اب تجھے بندے ہی اٹھا کر لے جائیں۔“

”بات سن اؤئے فٹنی۔! پہلے کی بات اور تھی، اب ہمارا بندہ دست ہے۔ ہم کی کین تو پہلے ہی مرے ہوئے ہیں، یہ نہ ہو کہ تجھے با

تیرے چوہدری کو لے کر مرجائیں۔" چاچا سوہنا تلخی سے بولا تو منشی نے کافی حد تک نرم پڑتے ہوئے کہا

"لیکن چوہدری صاحب کے پاس تو جانا ہی پڑے گا۔"

"کیوں، جانا پڑے گا؟" چاچے سوہنے نے اکتاتے ہوئے کہا تو منشی نے تاک لیا کہ چاچا سوہنا اچھے سے اکٹڑ گیا ہے۔ اب

جتنی اس سے بات کی تو یہ چوراہے میں بیٹھ کر ان کی بے عزتی ہی کرتا رہے گا۔ اس نے سوچا کہ اس سے تو بعد میں بھی بچھا جاسکتا ہے۔ اس لئے فوراً ہی متراہد لے ہوئے بولا

"لیکن اپنے ہنر کو خود ہی سمجھا دو۔ ورنہ ہمارا سمجھنا یا بہت برا ہوگا۔"

"میں کہہ دوں گا اسے۔" چاچا سوہنا نے لا پرواہی سے جواب دیا تو منشی بولا

"تمہیں کہنا ہوگا اور وہ جہنم کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے نا، وہ زیادہ دن گھوم پھر نہیں سکے گا۔ یہ بھی اسے سمجھا دینا۔"

"یار منشی۔! اتنی تلخ زبان کیوں استعمال کرتے ہو۔ تو نے بتا دیا میں اسے کہہ دوں گا۔ اب جاؤ، مجھے یہ چال چلنی ہے۔" چاچا

سوہنا بولا اور پھر کہیتے ہوئے زور سے چال چلی۔ منشی چند لمحے تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چاچے سوہنے نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

منشی واپس حویلی پلٹا تو چوہدری جلال کے پاس وکیل بیٹھا ہوا کاغذات نکال رہا تھا۔ چوہدری جلال اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ منشی ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ منشی وکیل نے کاغذات بڑھاتے ہوئے کہا

"چوہدری صاحب۔ اچھوٹے چوہدری کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو گئی ہے۔ جس طرح ہوئی ہے، یہ میں جانتا ہوں۔ ویسے آپ بھی بے خبر نہیں ہیں۔"

چوہدری جلال نے وہ کاغذات پکڑ کر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا

"سارا معاملہ آپ کے سامنے ہے، اس صورت حال میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ آگے کیا ہوگا؟"

"آگے کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا جاسکتا۔"

وکیل نے سوچتے ہوئے جواب دیا تو چوہدری جلال نے تشویش سے پوچھا

"کیوں؟ کیس بھی آپ ہی لڑیں گے۔ اپنی مدد کے لیے جتنے چاہیں وکیل اپنے ساتھ لے لیں۔"

"ہاں یہ نہیں ہے چوہدری صاحب۔! میرا نہیں خیال کہ ام یہ کیس زیادہ لمبا لے جائیں گے۔ سیاست میں اب وہ طرح بچتے نہیں

رہے کہ آپ دھونس دھاندلی یا جبر سے عوام پر حکمرانی کر سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ملک نصیم نے پریس کانفرنس کر کے اس عورت کی بھرپور مدد

کا اعلان کر دیا ہے۔ کیونکہ جنوں آپ کے کہہ وہ اب متحرک ہو گیا ہے اور یہی معاملت میں دلچسپی لے رہا ہے، وہ اب اس کیس میں دلچسپی

لے گا۔ کیوں لے گا یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ وہ میڈیا میں اس معاملے کو اچھا لے گا۔ اور...."

وکیل نے صورت حال کو تفصیل سے بتانا چاہا تو چوہدری جلال نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

”کچھ بھی ہو وکیل صاحب۔ ابھی ایک زمانے تک سیاست کا بھی طریقہ رائج رہے گا۔ سیاسی پارٹیاں کہاں ان چھوٹے موٹے سیاست دانوں کو آگے لے کر آتی ہیں۔ اور پھر اختیار کن لوگوں کے پاس ہے۔ یہ آپ کو انجی طرح معلوم ہے۔ ایف۔آئی آر کے لئے کتنے لوگوں نے زور لگایا اور ضمانت یونہی ہو گئی۔ یہ بات بھی سمجھیں آپ۔ ابھی کچھ نہیں بدلے، اختیار جہاں پہلے تھے اب بھی وہیں ہے، عوام تو پاگل ہے جو تہہ پٹی کی باتیں کرتے نہیں سمجھتی اور بیڈ رائٹیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ سب چل رہا ہے۔“

”لیکن یہ دیکھیں کہ اس عورت کو حمایت مل گئی۔ پیسے ایسا نہیں ہوتا تھا۔“ وکیل نے اسے جواباً کہا تو چوہدری جلال نے مسکراتے

ہوئے کہا

”او وکیل صاحب! آپ جس ماحول کی بات کر رہے ہیں۔ وہاں لوگ دال روٹی کے پکڑے ٹکڑے کھاتے ہیں تو سوچیں گے۔ ہاضی میں کتنے بڑے بڑے جلوس نکلا کرتے تھے۔ اب کیوں نہیں۔ لوگوں کو روٹی کے جھیلے سے فرصت ہی نہیں۔ وہ کیا سڑکوں پر آئیں گے۔ ہم نے اس بے وقوف عوام کو کرسی ایسا دیا ہے۔“

”مگر ایسے ہی حالات انقلاب کو جنم دیتے ہیں۔ عظیم تبدیلی آتی ہے۔ خیر۔ امیں نے بہت سوچ کچھ کر بتایا ہے کہ ملک نعیم اس پوزیشن میں ہے کہ وہ سیاسی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور پھر آپ فہم کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سو اس معاملے کا حل صبح کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

وکیل نے صاف گوئی سے کہا تو چوہدری جلال نے بھڑک کر کہا

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ میں اور صلح کروں؟“

”جتنی جلدی صلح ہو جائے گی۔ یہ معاملہ اتنی جلدی دب جائے گا۔ مخالفین بھی سیاسی فائدہ نہیں اٹھا پائیں گے۔ معاملہ بہر حال صلح پر ہی ختم ہوگا۔ اس کے لیے کوشش کریں۔“ وکیل نے بختل سے کہا

”وکیل صاحب! آپ تو خواہ مخواہ گھمراہ رہے ہیں حالات ایسے بھی نہیں ہیں۔ آپ کیس کی تیاری کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے

گا۔“ چوہدری جلال نے لہر دہانی سے کہا تو وکیل سر ہلاتے ہوئے بولا

”آپ کی مرضی ہے چوہدری صاحب۔ امیں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اب کیس چلے گا تو ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ اب مجھے

اجازت۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا تو وکیل ہاتھ ملاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ چلا گیا تو، چوہدری بھی کھڑا ہوا ہے اور فحشی نے چوراہے میں ہونے والی بات بتادی۔ جس سے اس کی تیاریوں پر عمل پڑے،

اگلے ہی لمحے وہ ٹارنل ہوتا ہوا بولا

”ٹھیک ہے فحشی، اور کچھ کہنا ہے؟“

”چوہدری صاحب۔ اوہ عورت اب فہد کی بات مان رہی ہے۔ یہ صلح ہے تو مشکل لیکن ناممکن نہیں ہے۔ صغیہ کو مٹا دیا جاسکتا ہے۔“

”جس طرح بھی ہو۔ اب یہ معاملہ ختم ہونا چاہئے۔“

چوہدری جلال نے اکتاتے ہوئے کہا تو نشی نے جلدی سے کہا

”آپ فکر نہ کریں۔“

یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب گیا۔ جبکہ دوسری طرف بشری بیگم کا افسردہ چہرے کے ساتھ ان کی باتیں سن چکی تھی۔ وہ اپنے بچے کے لئے کچھ اور سی سوچ رہی۔ ایک ماں ہونے کے ناطے اس کی سوچ کچھ اور ہی تھی۔

ایسے وقت میں چوہدری کبیر اپنے ڈیرے پر بیٹھ ٹیلی وژن دیکھ رہا ہے۔ تبھی ماکھا لنگڑاتا ہوا اندر آیا تو اس کی طرف متوجہ ہو کر چوہدری کبیر نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے پوچھا

”ہاں بولو۔ اکوئی پتہ چلا؟“

”جی چوہدری صاحب۔ اوہ بات سچی ہے۔ جو صغیہ نے گاؤں کے چوک میں فہد سے کہی تھی۔“ ماکھے نے جواب دیا تو چوہدری

کبیر نے پوچھا

”تمہارا مطلب ہے صغیہ جو اپنی فریاد لے کر فہد کے پاس گئی تھی، اسے سسلی نے بھیجا تھا؟ اس کے کہنے پر وہ فہد کے پاس گئی تھی۔“

”جی چوہدری صاحب۔ بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔“ ماکھے نے بتایا

”صغیہ کی ایک سی دن میں اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے خلاف پرچہ کٹوانے قاتانے چل پڑے۔ سسلی نے ہی اس کا ذہن

میں آگ بھری ہے۔“ چوہدری کبیر نے خود دکھائی کے سے اعزاز میں کہا

”جی وہ اس سے برا بدلتی رہی ہے۔ اور اب بھی اس کے پاس جاتی ہے۔“ ماکھا تیزی سے بولا

”تو پھر اصل میں وہی میری دشمن ہوئی، جسے میں دل سے چاہتا ہوں۔ پر کوئی بات نہیں، میں تو اسے بڑے پیار سے نظر انداز کرتا

چلا آ رہا تھا، مگر مجھے لگتا ہے، اب اس کا بہت سارا خیال رکھنا پڑے گا۔“ چوہدری کبیر نے دانت پیچتے ہوئے غصے میں کہا

”اصل وجہ تو فہد کا یہاں آنا ہے، اس کی وجہ سے سسلی میں اتنا حوصلہ آگیا ہے۔ ورنہ پہلے تو اس نے کبھی اور جی آواز میں بات نہیں

کی تھی کسی کے سامنے۔“ ماکھے نے کہا

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ فہد کے آنے ہی سے تو انہیں سانس لینا نصیب ہوا ہے مگر وہ فہد... وہ کب تک رہے گا۔ وہ بھی تو، اب نہیں

رہنے والا خیر۔ تم جاؤ۔! میں دیکھتا ہوں کیا کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز اونچی کرتے ہوئے ساری توجہ ٹی وی

سکرین کی جانب کر لی۔ ماکھا لکھ بھر کھڑا ہوا مگر ہر چلا گیا۔ چوہدری کبیر کی نگاہیں تو ٹی وی اسکرین پر تھیں لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔



ماسٹر دین محمد عصر کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو دالان میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ سلمیٰ بچن میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ کا چہرہ دیکھا تو اٹھ کر اس کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ پھر بڑے نرم سے انداز میں پوچھا

”اباجی! آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟“

ماسٹر دین محمد چند لمحے خاموش رہا پھر سلمیٰ کی طرف دیکھ کر بولا

”صفیہ مدینہ فہد کے پاس گئی، وہ اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔ کیا تو نے اسے فہد کے پاس بھیجا تھا۔“

”ہاں! میں نے اسے فہد کے پاس بھیجا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا ہے کہ وہ انصاف کے لیے کوشش کرے۔“ سلمیٰ نے عزم

سے کہا

”تم جانتی ہو۔ تمہارا یہ حوصلہ دینا ایک نئی جنگ کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یہ سوچا ہے تم نے؟“ ماسٹر دین محمد نے

مکھری سلجیدگی سے پوچھا تو سلمیٰ بولی

”حد سے بڑھا ہوا خوف انسان کو دلیر بنا دیتا ہے۔ جنگ ہوگی یا امن رہے گا، میں اس کے بارے میں نہیں جانتی مگر یہ مجھے پتہ

ہے کہ کوئی تو ہو جو چوہدریوں کے سامنے کھڑا ہو اور اب وقت آ گیا ہے اباجی۔“

”کیا تمہیں یہ سوچ فہد نے دی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ صفیہ کو اسکے پاس بھیجے؟“ ماسٹر دین محمد نے ایک خیال کے تحت پوچھا

”نہیں اباجی! میں نے خود صفیہ سے کہا تھا۔ اس مظلوم عورت کا کوئی بھی ساتھ نہ دے، لیکن میں ضرور ساتھ دوں گی۔“ سلمیٰ

نے حتمی لہجے میں کہا

”تم کیا کر سکتی ہو، ساری زندگی ہم۔“ ماسٹر دین محمد اسے سمجھاتے ہوئے بولا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولی

”ان کا ظلم سہتے رہیں ہیں۔ ظلم اس وقت تک بڑھتا رہتا ہے جب تک کوئی اس کے سامنے ڈٹ نہیں جاتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا

ہے۔ اب مجھے نہیں ڈرنا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ ہمیں مار دیں گے۔ لیکن اباجی مجھے یہ بتائیں کہ پہلے ہم کون سے زندہ ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے تم نے صفیہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”جی، میں اس کا ہر طرح سے ساتھ دوں گی۔“

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی تو ماسٹر دین محمد نے کہا

”جیسے تمہاری مرضی پتر امیں نے تو زندگی گزار لی۔“

”آپ فکر نہ کریں اباجی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سلمیٰ نے اسے قائل دیتے ہوئے کہا

”خیر! وہ فہد اور صفیہ نور پور سے واپس آ گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک صحافی لڑکی بھی ہے۔ مجھے یہ پیغام ملا ہے کہ وہ فہد کے ساتھ

اوجھڑائیں گے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمیٰ چونک گئی۔

”جی، اچھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ ماسٹر دین محمد اپنی سوچوں میں کھو گیا۔

زیرِ دہ وقت نہیں گذرا کہ باہر بارش کی آواز آئی۔

”لگتا ہے مہمان آگئے ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے اونچی آواز میں کہا تو سلی آفیل درست کرتے ہوئے اٹھ گئی

”جی، میں دیکھتی ہوں۔“

سلی نے دروازہ کھولا۔ پہلے فہد اور پھر مائرہ اندر آگئی۔ مائرہ نے گھر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، پھر سلی کو دیکھ کر ٹھٹھکی۔ سلی

آگے بڑھ کر اسے ملی، پھر اسے ساتھ لے کر ماسٹر کے پاس آگئی۔ ماسٹر دین محمد نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا

”اچھا تو یہ بیٹی سحانی ہے، بیٹھو بیٹا۔“

مائرہ، ان کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی

”سلی آؤ تا تم بھی میرے پاس بیٹھو۔“

”میں آپ کے لیے کچھ لے آؤں، مطلب۔۔۔“ اس نے کہتا چاہا تو مائرہ اس کی بات کاٹ کر بولی

”اوچھوڑو، ادھر فہد کے گھر سے بہت اچھی چائے پی کر آئی ہوں۔ اب دل نہیں کر رہا۔ کچھ دیر بعد تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا

کھاؤں گی۔ اور یہ تم کیا آپ جناب لے کر بیٹھ گئی ہو، ہم دوست ہیں یا۔۔۔“

”تو میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“ سلی نے کہہ کر مائرہ بولی

”تم ادھر بیٹھو میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کھانا بھی ہم بنالیں گے۔“ سلی بیٹھ گئی تو وہ ماسٹر دین محمد کی طرف دیکھ کر بولی

”اور ستائیں افکل۔“

”اللہ کا شکر ہے بیٹا تو تم لوگ باتیں کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“

ماسٹر دین محمد نے کہا اور باہر نکلا چلا گیا۔ جب فہد نے کہا

”سلی، اب تم اپنے پراجیکٹ کے بارے میں بتاؤ یہ تمہاری بہت سیلپ کرے گی۔“

”ہاں ہاں بتاؤ۔“ مائرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر کچھ دیر بعد وہ باتوں میں کھو گئیں۔



فہد اپنے گھر داخل ہوا تو سراج اکیلا ہی مکن میں چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سامنے والی چار پائی آکر بیٹھ گیا تو سراج نے پوچھا

”مہمان چلے گئے۔“

”ہاں چلے گئے۔ اور یار میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وہ موبائل فون ٹاور لگانے والوں سے تمہارا رابطہ ہو گیا تھا؟“ فہد نے پوچھا

”ہاں۔ اودہ میرے ساتھ دیا ہی معاہدہ کر گئے ہیں جیسے تم نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ

دلوں میں کام مکمل کر لیں گے۔“ سراج نے جواباً کہا تو بولا

”چلو ٹھیک ہے۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا، ”یہ چھانکا کدھر ہے؟“

اس سے پہلے کہ سراج جواب دیتا، ان کے چھانک پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی انہیں عمر حیات آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آتے ہی سلام کیا اور آ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”سنو آج چار عمر حیات کیا حال ہے، کیسے آتا ہوا؟“

”میں ٹھیک ہوں بہتر۔! اور میں آیا اس لیے ہوں کہ کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ کل اپنا زمیحوں کا قبضہ لے لوں۔“ عمر حیات نے

سکون سے کہا

”اتنی جلدی جا رہا ہے چا چا ابھی چند دن اور رہ لیتا۔“ سراج نے اخلاقا کہا تو وہ بولا

”کیا کرتا ہے وہ کہ جب جاتا ہے تو بس جاتا ہے۔ میں نے کل پڑاری کو بلایا ہے۔ تم بھی اپنے لوگوں کو لے آنا، ممکن ہے چوہدری کوئی خرابی کرنے کی کوشش کرے۔“

عمر حیات نے تشویش سے کہا۔ اس پر فہد نے چوتھے ہوئے محل سے پوچھا

”چا چا! تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ وہ خرابی بھی کر سکتا ہے، اس کا ذکر کیوں ہے؟“

”دیکھو بہتر، چوہدری نے تو آگے نہیں آنا، وہ تو ہلہ شیری ہی دے گا تا۔ اس نے میرے بھائیوں کو آگے کرنا ہے۔ اور میرے بھائی پہلے ہی سے لمبے میں ہیں۔ ایک تو میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں نہیں دیا، دوسرا زمین ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔“ عمر حیات نے وجہ قادی

”ہاں چا چا، وہ تو اپنا قصہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے وہ اب کچھ نہیں کرے گا۔“

فہد نے پر یقین لہجے میں کہا تو سراج بولا

”فہد کے ذہن میں شاید نہ ہو لیکن میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہوا ہے۔“

”چلو اچھا ہے، اللہ کرے وہ کچھ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ پھر بھی تم لوگ اپنا دھیان رکھنا۔“

عمر حیات نے دعائیہ انداز میں کہا تو فہد بولا

”ہاں چا چا کیوں نہیں ہم اپنا پورا دھیان رکھیں گے۔“

”اچھا بہتر۔ اب میں چلتا ہوں، کل میں نے صرف زمین ہی تمہارے حوالے کرنی ہے، میں نے کل ہی یہاں سے چھپے جانا

ہے۔“ یہ کہتے ہوئے عمر حیات اٹھنے لگا تو فہد جلدی سے بولا

”چا چا، ابھی بیٹھو، چائے تو پیو۔“

”میں نے ابھی پی لیا ہے۔ اور پھر کافی کام ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور باہر کی جانب چلا گیا۔

”بولو۔ کیا کرنا ہے اب؟“ سراج نے فہد کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بولا

”یہی۔ زمینوں کا قبضہ لیں گے اور کیا۔“ اس پر سراج تھوڑا فکر مند ہو گیا جبکہ فہد کے چہرے پر سکون تھا۔

اگلی صبح وہ فہد چھا کا اور سراج ان زمینوں میں جا پہنچے، جو انہوں نے عمر حیات سے خریدی تھیں۔ وہاں پٹاری کے ساتھ اور کافی سارے لوگ تھے۔ کنواں پر درخت تلے بیٹھ کر پٹاری نے کاغذات تیار کئے جو اس نے دھنظل اور انگٹھوں کے بعد فہد کے حوالے کر دیئے۔ یہ مرحلہ امن اور صلح سے حل ہو گیا۔ کسی بندے نے بھی شراغیزی نہیں۔ زمین کا قبضہ بغیر عافیت ہو گیا۔ اسی وقت عمر حیات نے اپنے گھر کی چابی بھی اس کے حوالے کر دی۔ دعائے خیر ہوئی اور وہ سب وہاں سے آ گئے۔ چاچا عمر حیات بھی گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔

”تو پھر چاچا عمر حیات چلا گیا۔ وہ بھی ان چوہدریوں کا ستایا ہوا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ اب وہ کبھی پلٹ کر یہاں آئے گا۔ آئے گا بھی کیوں؟“ سلمیٰ نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں داران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فہد نے وہ کاغذات سلمیٰ کو دے دیئے تھے۔ ”ہاں۔ اگر اس نے یہاں آنا ہوتا تو وہ اپنا سب کچھ بیچ کر جاتا کیوں۔ لگتا ہے اس نے بھی بڑا مہر کیا ہے۔ سلمیٰ، یہ بستیاں بھی محبت کے ساتھ بستی ہیں۔ یہ فطرت، یہ ظلم، یہستیوں کو ہی نہیں اجاڑتے۔ انسانوں کو بھی ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں۔“ فہد نے دکھ سے کہا تو سلمیٰ بھی افسوس ناک لہجے میں بولی

”پتہ نہیں بے چارہ یہاں سے کتنا دُکھی ہو کر گیا ہوگا۔“

”ہاں۔ ازمن کا قبضہ دیتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اور پھر اس سے یہاں رہا نہیں گیا، فوراً چلا گیا۔“ فہد نے

وہ لمحات یاد کرتے ہوئے بتایا

”مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں زمین کا قبضہ لیتے وقت چوہدری کے لوگ نہ مداخلت کر دیں۔ وہاں پھر سوائے لڑائی جھگڑے کے اور کیا

ہوتا تھا۔“ سلمیٰ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا تو فہد بولا

”جب کوئی لڑائی جھگڑے کے لیے مل جائے تو پھر لڑنا بھی پڑتا ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ چوہدری اب مزید مجھ پر دھونس

بھائے گا۔ اس نے اگر کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔“

”اس نے سکون تو برباد کیا ہوا ہے؟“ سلمیٰ نے فطرت سے کہا تو فہد مسکراتے ہوئے بولا

”کسی کا سکون چھین لینے والے پہلے خود بے سکون ہوتے ہیں۔ دراصل وہ اندر سے بہت زیادہ بزدل ہوتے ہیں۔ یہی بزدلی

چھپانے کے لیے وہ کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتے رہتے ہیں۔ تاکہ دوسروں پر اپنا رعب دکھاتے رہیں۔ خیر! چھوڑو ان باتوں کو۔“

”تو پھر اور کیا باتیں کریں؟“ سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا

”چاہے عمر حیات کا گھر اب خالی ہو گیا ہے۔ اور تمہیں پتہ ہے ناکاب تم نے وہاں پر کیا کرنا ہے؟“

”میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے، وہ گھر اب فقط سکول ہی نہیں ہوگا۔ وہاں اور بہت سارے کام ہوں گے۔ آپ مجھے بتاتے

جائیں، میں کرتی چلی جاؤں گی۔ اب اتنا حوصلہ آگیا ہے مجھ میں۔“

سہمی نے غم سے کہا تو فہد سمجھاتے ہوئے بولا

”تم اُسے اپنی ضرورت کے مطابق ٹھیک کروالو۔ اس میں چند دن لگ جائیں گے مگر تم اپنا کام شروع کر دو۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، ویسے پیچھے درک تو میں نے کب کا شروع کر دیا ہوا ہے۔“

”گڈ، مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ اب میں نے کچھ کاغذات دیکھنے ہیں کمرے میں، تم ایک کپ چائے لے آؤ میرے لئے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ سہمی نے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ تبھی فہد کھڑا ہوا اور باہر والے کمرے کی جانب چلا گیا۔ سہمی اسے محبت

پاش لگا ہوں سے دیکھتی رہی۔

فہد کمرے میں موجود، سامنے پڑے کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ سہمی کمرے میں آکر چائے کا مگ اس کے سامنے رکھا اور خود

ایک جانب ہو کر بیٹھ گئی۔ فہد نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی

”دو۔ ان کاغذات کے بارے میں، یہ تو مختلف دستاویزات ہیں۔ تم انہیں سمجھ نہیں پاؤ گی۔ یہ مجھے ہی دیکھنا ہوں گے، اگر کوئی

اور بات ہے تو بتاؤ۔“ فہد اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا

”میں دراصل آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے ہولے سے کہا تو فہد نے سنجیدگی سے پوچھا

”بات، بولو۔ کیا بات ہے؟“

”میں وہ دراصل منیہ کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں اس بے چاری کا کیا ہوگا؟ ایف آئی آر تو درج ہو گئی۔ لیکن کیا اسے

انصاف مل سکے گا؟“ سہمی نے پوچھا

”کیوں نہیں ملے گا اسے انصاف، ملے گا اور ضرور ملے گا۔ اصل میں ہم لوگوں سے اُمید لگا بیٹھتے ہیں کہ شاید وہ ہمیں انصاف

دیں گے مگر اسے بھول جاتے ہیں جو حقیقی منصف ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے، بس ظالم کی رسی دراز کر دیتا ہے۔“ فہد نے اسے سمجھاتے

ہوئے کہا

”لیکن وہ منیہ وہ تو مایوس ہو رہی ہے نا، اسے حوصلہ تو میں اور آپ ہی دیں گے نا۔“ سہمی نے یاد دلایا

”بے شک۔ انسان ہی ایک دوسرے انسان کے لیے وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اسے انصاف ملنے میں کچھ دقت تو لگے

گا نا۔“ فہد نے کہا

”اور دقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے کہ کب تک۔ وہ بہرہ ہو چکی ہے اس کے بچے ہیں۔ وہ ان کی روزی روٹی پوری کرے گی یا

انصاف کے لیے عدالتوں میں دھکے کھاتے پھرے گی؟ ایسا نظام کیوں نہیں بن جاتا، جہاں ہر شخص کو تحفظ کا احساس ہو اور اگر کوئی ظالم ظلم کرے تو اسے فوراً سزا مل جائے۔“ سلمیٰ کے بچے میں گویا آگ بھری ہوئی تھی، جس پر فہد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قہقہے سے کہا ”یہی سسٹم ہی تو ہے۔ جس نے ان ظالموں کو بہت طاقتور بنا دیا ہوا ہے۔ اور عوام ظلم پر ظلم سہتے چلے چارے ہیں۔ اسی سسٹم ہی کو بدلنا ہے۔“

”کیسے بدلے گا یہ سسٹم؟“ سلمیٰ نے بے صبری سے پوچھا تو فہد بولا
 ”عوامی طاقت سے، اگر ہم جمہوریت چاہتے ہیں تو عوام کا شعور ہی اس سسٹم کو بدل سکتا ہے ورنہ....“
 ”ورنہ! ہم ایسے ہی ظلم سہتے رہیں گے۔“ سلمیٰ نے اس کی بات کاٹ کر کہا
 ”نہیں! اب وقت بدل گیا ہے سلمیٰ۔ اسسٹم پہلے ذہن میں بدلنا ہے۔ پھر اس کے مطابق عمل ہوتا ہے۔ عوام کو یہ شعور آ جائے کہ انہوں نے اپنا حق کیسے لینا ہے تو سب بدل جائے گا۔ تم لکڑہ کر دسب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا
 ”مجھ سے تو اس بے چاری کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے سے جو ہوسکا میں اس کی ہر طرح سے مدد کروں گی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ سلمیٰ نے گلو کیر لہجے میں کہا تو فہد بولا
 ”تم کیا سمجھتی ہو۔ اکیا میں تمہارے اس دکھ سے واقف نہیں ہوں۔ میرے بھی وہی جذبات ہیں۔ جو تمہارے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اب ہمارے دکھ مکھ سانچے ہیں؟“

”جانتی ہوں۔ اسی لیے تو پورے حوصلے کے ساتھ صنفی کی مدد کر رہی ہوں۔ میں اسے انصاف دلا کر ہی رہوں گی۔“ سلمیٰ نے حزم سے کہا

”بس تمہارا یہی اعتماد مجھے حوصلہ دیتا ہے۔ جواب میری اصل طاقت ہے۔ ہم دونوں مل کر یہی عوامی شعور دیں گے۔“ فہد نے اسے محبت پاش نکال دیا اور ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر سلمیٰ شرمائی اور وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ فہد مسکراتے ہوئے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ سلمیٰ کے حوصلے پر خوش تھا۔



شام کے سائے رات میں ڈھل چکے تھے۔ جعفر اپنے آفس میں تھا۔ اس کے ساتھ ماثرہ تھی۔ دونوں آفس آئے سائے بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ جعفر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا
 ”ہوگئی رپورٹنگ تمہاری؟“

”ہاں ہوگئی۔“ ماثرہ نے دھیمے سے کہا ارد بھر لکھ بھر بعد میں بولی، ”جعفر! زندگی میں اتنی نگہن کہاں سے آ جاتی ہے؟ سانس لینے ہوئے بھی اتنی مشکل ہو جاتی ہے دل کرتا ہے کہ سانس ہی نہ لیا جائے۔“

جعفر نے چمک کر اسے دیکھا اور پوچھا

”مارہ۔ اتنی مایوسی؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیوں ایسا فضول سوچ رہی ہو؟“

”یہ فضول سوچیں نہیں ہیں۔ میرے حالات کا وہ دیا ہوا تاثر ہے۔ جیسے میں بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے

جواب دیا تو جعفر بولا

”لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے کہ تمہیں آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ دن رات کام کر کے تم تھک چکی ہو اتنی محنت نہیں کرتے۔

جس سے بندہ مایوس ہو جائے۔“

”تم نہیں سمجھ سکو گے جعفر اور سمجھ سکتے بھی نہیں ہو۔“ مارہ نے حسرت بھرے انداز کہا تو جعفر مسکراتے ہوئے بولا

”کیوں، میں کیوں نہیں سمجھ سکتا؟ حالانکہ تم خود مجھے اپنی قرادے چکی ہو۔“

”پھر بھی تم نہیں سمجھ سکتے۔“ وہ ایک دم سے بدلی ہوئے لہجے میں بولی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بات بدل گئی ہے۔ جعفر نے یونہی

ضد کرتے ہوئے کہا

”چلو بتاؤ۔ کیوں، میں کیوں نہیں سمجھ سکتا؟“

”ایک عورت کیا سوچتی ہے اور کیسے سوچتی ہے۔ کیا تم ایسا سوچ سکتے ہو۔ اگر تم ایسا دعویٰ کرو تو میرے خیال میں تمہارے مرد بین

پر۔“ مارہ کہتے ہوئے ایک دم سے رک گئی اور پھر مسکرا دی۔ جعفر نے خیزی سے پوچھا

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”اسی نئے کہہ رہی ہو ہر بات بحث کے لئے نہیں ہوتی۔“ وہ کہتے ہوئے اس وی تو جعفر بولا

”گنا ہے آج کل تمہارے ساتھ کوئی پرائیلم چل رہا ہے اگر میں کوئی مدد کر سکوں تو بتاؤ۔ رٹلی۔! میں بندہ بڑا غلط ہوں اور۔۔۔“

”تمہیں کس نے کہہ دیا ہے کہ میرے ساتھ کوئی پرائیلم چل رہا ہے یونہی بس تم تو۔“ مارہ نے کہا اور بات ہوا میں اڑا دی جیسے کچھ

بھی نہ ہوا ہو۔

”کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے مارہ۔ تمہاری یہ آواز چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ اس پر تمہارا یہ کھویا ہوا لہجہ کسی بھی بات کا ٹھیک

طرح سے جواب نہیں دیتا۔ اور تمہارے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت۔ اسے میں کیا کہوں؟“ جعفر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس پر مارہ

اعتراف کرنے کے سے انداز میں بولی

”تم ٹھیک کہتے ہو اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایسی کیوں ہو گئی ہوں، میں فہم کو نہیں بھلا پا رہی ہوں۔“ اس کے یوں

کہنے پر جعفر کے چہرے پر حسرت بھرا تاثر پھیل گیا۔ تبھی وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا

”اوکے۔ تم کچھ بھی مت سوچو، اب ایسے کرو کچھ دیر آرام کرو، پھر ہم قسمت گھر چلتے ہیں اور فہم سے جا کر ملتے ہیں۔ خوب کپ۔۔۔“

”نہیں، مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔ مجھے رپورٹ تیار کرنی ہے اسے ان انٹیر بھی جانا ہے۔ میں کام سے آئی ہوں یونہی سیر کے لیے نہیں۔ میں ابھی کچھ دیر بعد نکلوں گی، اور سفر بہت لمبا ہے۔ سلی اور ماسٹر جی سے مل آئی ہوں۔ دونوں بہت اچھے ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ دل کچھ اور چاہ رہی ہو لیکن اس کی زبان پر کچھ اور ہو۔ جعفر چند لمبے اس کی طرف دیکھا رہا۔ مائرہ نے نگاہیں چرائیں تو وہ بولا

”اوکے، جیسا تم چاہو لیکن ذرا سا آرام کر لو، پھر کھانا وغیرہ کھا کر نکل جانا۔“

”اوکے، چلو۔“ مائرہ نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اٹھ گئی۔ تو جعفر بھی اٹھ گیا۔ دونوں ہی اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سوچ رہے تھے، مگر اظہار کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔

مائرہ چلی گئی تو جعفر کو اپنے اکیسے پن سے بے چینی ہونے لگی۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ مائرہ اس کے لئے کتنی اہم ہے۔ چاہئے وہ اس کی محبت کا اعتراف نہیں کرتی بلکہ فہم کی محبت کا دم بھرتی ہے لیکن اس کی قربت ہی سے امید بندھی ہوئی تھی۔ جعفر سے بیٹھا نہیں گیا۔ بلکہ اٹھ کر چل دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فہم کے پاس جائے اور اس سے بہت ساری باتیں کرے۔ مگر حالات نے یہ مجبوری ان کے درمیان ماکڑی کی تھی۔ وہ ملک فہم کی طرف نکل گیا۔ اس وقت جعفر بغیر یونیفارم کے تھا۔

ملک فہم گھر پر ہی تھا۔ یوں اچانک اسے دیکھ کر وہ پہلے تو کچھ بھی نہ سمجھا۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں کاریڈور میں کرسیاں بچھائے بیٹھے ہوئے تھے۔ دھیمی روشنی تھی۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ جعفر نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا

”ملک صاحب میں یوں خاموش سے اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ پولیس والا اگر اپنے کسی فحش کام کے لیے بھی کسی کے پاس چلا جائے تو لوگ سو طرح کی باتیں بتاتے ہیں۔“

اس پر ملک فہم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”آپ کا اپنا گھر ہے جیسے مرضی ملنے کے لیے آئیں۔“ یہ کہہ کر اس نے خوشگوار حیرت سے کہا ”وہ آپ کی دوست رپورٹر کافی تیز ہے۔ اس نے خبر کے ساتھ میری پریس کانفرنس بھی چلا دی۔ حالانکہ وہ ابھی بیٹھیں تھی۔“

”انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ اس نے ابتدائی خبر بھیج دی تھی۔ ابھی تفصیلی رپورٹ بعد میں آئے گی۔ ویسے میں ٹی وی پر آپ کی پریس کانفرنس دیکھی ہے اور اس کا بڑا اثر بھی ہوا ہے۔ مجھے اوپر سے کافی کہا جا رہا ہے کہ میں پوری دیانتداری سے اس معاملے کو دیکھوں۔ اور کچھ دھمکیاں بھی مل رہی ہیں۔ بتانا میں چاہ رہا ہوں کہ چوہدری کی دسترس جہاں تک بھی ہے، اب میری راہ میں وہ رکاوٹ نہیں۔ مجھے خوف نہیں۔“ جعفر نے کہا تو ملک فہم بولا

”خوف تو مجھے بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ کب اور کیا سازش کریں اس کا تو اندازہ نہیں ہے نا؟“

”میں مانتا ہوں کہ آج وہ طاقتور ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ ہی ایسا رہے گا۔ اسے اسی کے میدان میں شکست دینا ہوگی۔ جس میں وہ دوسروں کو شکست دینا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس بات کو۔ خبر میری ایک تجویز ہے آپ کے لیے۔“ جعفر نے کہا

”جی فرمائیں۔“ ملک فہم بولا

”آپ نے فہم کے بارے میں تو سن ہوگا؟ جو قسمت مگر میں رہتا ہے اور اس کی۔۔۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا تو ملک فہم جلدی سے بولا

”بالکل، کیوں نہیں یہ وہی نوجوان ہے۔ جو اس وقت چودھریوں کا اکیلے ہی مقابلہ کر رہا ہے۔ باوجود کوشش کے چودھری اس کا

کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ منیہ کی دلی مدد کر رہا ہے۔ میں اس سے براہ راست ملا تو نہیں مگر اس کے بارے میں سنا بہت ہے۔ شاید آج تھانے

میں دیکھا بھی ہو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیا آپ چاہیں گے کہ آپ اس کی مدد کریں؟“ اس نے پوچھا تو ملک فہم تیزی سے بولا

”بالکل، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اگر قسمت مگر کی قسمت بدلنے میں وہ میرا ساتھ دے تو یقیناً یہ کایا جلدی پلٹ سکتی ہے۔“

”تو پھر آپ جب چاہیں اس سے مل لیں۔ ان حالات میں آپ دونوں کی ملاقات بہت ضروری ہے۔“ جعفر نے اسے سمجھا

ہوئے کہا تو ملک فہم نے پوچھا

”تو اس طرح کیا آپ بس مہل میں رہیں گے؟“

”ملک صاحب اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ میرے جتنے بھی اختیارات ہوں۔ وہ بہر حال محدود ہیں۔ اور میں انہی اختیارات

ی سے کام لینا چاہتا ہوں۔“ جعفر نے کہا ملک فہم حتیٰ لچھے میں بولا

”آپ ٹھیک کہتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اس بات کو میں بہت جلد فہم سے خود ملوں گا۔“

”فہم صاحب۔! اپنے حلقے میں عوامی رابطہ بڑھائیں۔ میں اور میرے دوست آپ کے ساتھ ہیں۔ پھر اہوا دریا سوائے تباہی

کے کچھ نہیں کرتا۔ جبکہ پرسکون دریا سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ اپنے لوگوں کو مضبوط کریں۔ تاکہ آنے والے اینکشن میں وہ

آپ کا ساتھ دے سکیں۔“ جعفر نے صلاح دی

”ٹھیک ہے۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں۔ اب تو عوام بھی خاصی سیانی ہو گئی ہے۔ جہاں مفاد ہوتا ہے۔ وہیں کام دیتے

ہیں۔ ورنہ پوچھتے ہی نہیں۔“ ملک فہم نے جتنے ہوئے کہا تو جعفر نے تصحیح کرتے ہوئے کہا

”عوام نہیں۔ عوام میں سے چند لوگ۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ملک فہم نے کہا اور پھر ان کے درمیان لمبی باتیں چل نکلیں۔ رات گئے جعفر وہاں سے نکلا اور

واپس آکر اس وقت تک نہیں سویا جب تک مازہ اپنے گھر نہیں پہنچی گئی۔

صفیہ اسروہی چولے کا پس بیٹھی اپنے بچوں کو روٹی کھلا رہی تھی۔ بچے بھی خاموش سے تھے۔ اس کی سوچوں کے لئے یہی خیال کافی تھا کہ وہ آئندہ آنے والا وقت کیسے گزارے گی۔ اس کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ اپنے شوہر کا بدلہ لینے کے لئے قانون کا سہارا تو لے چلی ہے، کیا قانون اسے انصاف دے گا؟ وہ انہی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا اور اس کے سرِ نعمت علی کے ساتھ منشی فضل دین گھر میں آکر صحن میں بھی چار پائیلوں پر بیٹھ گئے۔ منشی نعمت علی نے اونچی آواز میں اسے پکارتے ہوئے کہا

”صفیہ! اونچی صفیہ! ذرا ادھر تو آنا۔ دیکھ منشی جی آئیں ہیں۔ تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ جلدی آؤرا۔“

اس پر صفیہ نے خشکیوں لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھا، لہو بھر کو سوچا اور پھر اٹھ کر ان کے قریب چار پائی پر آکر بیٹھ گئی۔ جب منشی فضل دین دھیمے سے لہجے میں بولا

”بیٹی صفیہ! تو اس گاؤں کی بیٹی ہے۔ ہمیں حیرا خیال ہی نہیں، حیرا احساس بھی ہے۔ چوہدری تو ڈھلے لوگ ہیں۔ ہم جیسے غریبوں کا ان سے کیا مقابلہ۔ میں حیرے ہی فائدہ کے لیے بات کر لے آیا ہوں۔ اگر تو ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات سن لو۔“

”کہو منشی۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے بھی دھیمے لہجے میں کہا تو نعمت علی بولا

”ہاں ہاں یوں منشی۔ تو اطمینان سے اپنی بات کہہ۔ صفیہ سمجھ دار ہے۔“

”دیکھ بیٹی۔ تو ساری زندگی یوں اکیلی تو نہیں رہ سکتی۔ آخر تجھے اپنا گھر چاہئے۔ حیرے بچوں کے سر پر سایہ چاہئے۔ تو نے ان کی پرورش کرنی ہے۔ ان بچوں کا کیا ہوگا۔ یہ سب سوچا ہے تو نے؟“ منشی نے پوچھا

”میں نے کیا سوچنا ہے منشی۔ اب سوچنے کے لیے رہ گیا ہے۔“ صفیہ بولی

”آج نہیں تو کل۔ اسوچنا تو پڑے گا۔ ہم نذیر کو واپس تو نہیں لاسکتے۔ پر ایسا تو کچھ کر سکتے ہیں کہ تجھے تحفظ ملے اور تیرے بچے بھی سکون کی زندگی گزاریں۔“ منشی نے کہا تو صفیہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولی

”منشی! اکل کر بات کہہ، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”تو آرام سے اس گھر میں عدت پوری کر، اگر تو چوہدری کے ساتھ صلح کر لے گی تو یہ گھر تجھے ہمیشہ کے لیے مل جائے گا۔ حیرے بچوں کی پرورش کے لیے چوہدری خود مدداری لے لیں گے۔ جیسے تو چاہے گی۔“ منشی نے بڑے نرم لہجے میں کہا نعمت علی

”اور بیٹی! امیرا کیا ہے۔ آج ہوں کل نہیں ہوں گا تو نے بھی زندگی گزارنی ہے۔ اگر تو چاہے تو میری شادی بھی ہم۔“

”ہاں۔ اتویہ کیا بات کر رہا ہے؟“ صفیہ نے حیرت سے کہا تو منشی نے جلدی سے کہا

”شرع میں کوئی شرم نہیں ہے پتر، خیر۔ اتو عدت پوری کر اور چوہدریوں سے صلح کر لے۔ اسی دن یہ گھر حیرے نام لگا دیا جائے گا۔ تو بالک ہوگی اس گھر کی چل میں کوشش کر کے زمین کا ٹکڑا بھی حیرے نام کرادوں گا۔ بس تو ہاں کر۔“

”منشی! یہ جو تجھے لالچ دے رہا ہے۔ کیا یہ نذیر کے خون کی قیمت ہے۔ جو تو چوہدریوں کی طرف سے مجھے دینے آیا ہے۔ تو

کیا سمجھتا ہے کہ میں مان جاؤں گی؟“ صفیہ نے ایک دم سے غصے میں کہا تو نعمت علی بھی غصے بولا

”چپ کرنا فہار۔ اچھے پڑھ نہیں کہ تو کس سے بات کر رہی ہے۔“

”مجھے پڑ ہے بابا، میں کس سے بات کر رہی ہوں، پر میں نذیر کے خون کا سودا نہیں کر سکتی۔“ وہ حتیٰ لہجے میں بولی تو نعمت علی نے کہا

”یہ بھی تو سوچ تو جائے گی کہاں؟“

اس پر صفیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ نعمت علی نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ ایک لمحے میں سارے ٹاٹے تو زور دینے لگے۔ ایک

دم سے ہر تعلق پرایا کر دیا۔

”نعمت علی۔ ایہ جو آج اس کے ساتھ ہیں نا۔ چند دن گزرنے دے۔ یہ کہیں بھی دکھائی بھی نہیں دیں گے۔ ابھی اس کا دماغ ان

لوگوں نے خراب کر رکھا ہے۔ جب وہ نذر ہے تو اس کی عقل ٹھکانے آئے گی۔ کون اپنے گھر سے مفت روٹیاں کھاتا ہے۔“ منشی نے حقارت

سے کہا صفیہ بولی

”منشی! جس اللہ نے پیدا کیا ہے نا، وہی پالنے والا بھی ہے۔ چاہے ساری دنیا میرا ساتھ چھوڑ جائے، میں نذیر کا بدلہ لے کر

رہوں گی۔ یہاں تک کہ تم سب لوگ مل کر مجھے وردہ۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور واپس اپنے بچوں کے پاس جا بیٹھی۔ جس منشی نے اٹھتے ہوئے کہا

”تم پھر بھی سوچ لو صفیہ۔ بہت غور کرنا ہماری باتوں پر۔ زندگی جذباتی باتوں سے نہیں کٹتی۔ حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

صفیہ نے ان کی جانب دیکھا ہی نہیں وہ یوں اپنے بچوں کو روٹی کھلانے میں مصروف ہوگی۔ جیسے اس نے سنا ہی کچھ نہ ہو۔

”میں اسے سمجھاؤں گا۔ فی الحال اس کے دماغ پر غصہ سوار ہے۔ اتر جائے گا۔“ نعمت علی نے منشی سے کہا

”ہاں! سمجھانا اسے، اس میں ہی بھلا ہے۔“

منشی نے کہا اور وہ باہر کی جانب چل دیا اور نعمت علی سوچوں میں گم چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کیسے

سمجھائے۔

سارا دن وہ صفیہ کو سمجھاتا رہا لیکن صفیہ نے اس کی بات نہیں مانی۔ وہ تھک ہار گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کی بہو، اس کی بات

نہیں مانے گی۔ شام ہوتے ہی نعمت علی جھپکتے ہوئے حویلی چلا۔ جہاں پورج کے پاس منشی اس کے انتظار میں تھا۔ وہ قریب آ کر رک گیا

تو منشی نے پوچھا

”ہاں بھئی نعمت علی۔ کیا کہتی ہے تمہاری بہو۔ وہ مٹی ہے نا نہیں؟“

”تم جانتے ہو منشی! ابھی اس کا دکھ تازہ ہے اس کے دماغ پر غصہ سوار ہے۔ میں اس سے کروں گا بات، وہ مان جائے گی۔“

نعمت علی دھیمے سے لہجے میں کہا تو منشی طرہ لہجے میں بولا

”کب مانے گی وہ۔ چوہدری صاحب نے اتنی بڑی رقم اس لئے نہیں دی کہ وہ انکار کر دے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہوا ہے۔ چوہدری صاحب صرف اقرار میں گئے ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”میں نے کہا ہے نا، میں اسے منالوں گا۔ سمجھ جائے گی۔“ نعمت علی نے بے بسی سے کہا

”دیکھ! چوہدری جی کو بھانے کرنے والے لوگ بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔ اسے مناد۔ ورنہ تمہارے سمیت یہاں سے کوئی بھی نہیں جاسکے گا۔ تم لوگ نری کی زبان نہیں سمجھتے شاید۔“ منشی نے سخت لہجے میں کہا

”قل تو میرا بیٹا ہوا ہے۔ اور وہ میری بہو ہے، میں مانتا ہوں کہ وہ چند لوگوں کی باتوں میں آگئی ہے۔ اس لیے کچھ دن تو لگیں گے نا۔ میں چوہدری کو شش کر کے منالوں گا۔“ نعمت علی نے اسے منانے والے انداز میں کہا

”پھر وہی کوشش۔ ایسی بات پھر چوہدری صاحب کے سامنے مت کرنا اسے مناد۔ یا سمجھاؤ، کچھ بھی کرو۔ وہ خود جائے تھانے اور اپنا کیس خود ختم کروائے۔ ورنہ تم جانے ہو۔ ہم نے بھی تو چوہدریوں کا نمک کھایا ہے۔“ منشی نے حقارت سے کہا اور نعمت علی کو جانے کا اشارہ کیا۔ نعمت علی نے ضرورت سے اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کر کے واپس پلٹ گیا۔



روشن صبح میں سورج ابھی نکل ہی رہا تھا۔ سراج اور فہم دونوں کیمتوں میں جھل قدمی کرتے ہوئے آرہے تھے۔ یہ وہ صبح تھی، جس کے بعد انہوں نے ایک بہت بڑا کام کرنے کی ضمان لی تھی۔ رات کی ہوئی پلاننگ کو حتمی صورت دے رہے تھے۔ ایسے میں چھانچا انہیں دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر سراج نے حرا کہا

”چھانچا آ رہا ہے۔ اللہ کرے کوئی خیر کی خبر ہی لا رہا ہو۔“

فہم نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا

”وہ خبر ہی لایا ہے یا پھر کام سے بھاگ کر آ گیا ہے۔“

وہ دونوں مسکرا دیے۔ اتنے میں چھانچا قریب آ گیا اور آتے ہی بڑے جوش سے بولا

”یارم دونوں ادھر ہو۔ میں پتہ نہیں، کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر آیا ہوں۔“

”بولو۔ بات کیا ہے کیوں ڈھونڈ رہے تھے۔“ سراج نے پوچھا تو چھانچا بولا

”دو ہاتھ ہیں۔ ایک تو وہ ناوردائے آئیں ہیں۔ ان سے مل میں جا کر اور دوسری بات یہ ہے کہ کل منشی کیا تھامنیہ کے پاس۔“

اس پر سراج نے تشویش سے پوچھا

”کب؟ کیا کر لے گیا تھا؟“

”مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ وہ صبح کے وقت چائے نعمت علی کے ساتھ اس کے پاس گیا اور صلح کر لینے کے عوض بہت زیادہ مالچ دیا ہے

۔ یہاں تک کہ گھر اور زمین بھی دینے کو کہا ہے۔" چھما کے نے بتایا

"کیا جواب دیا پھر منیہ نے؟" فہد نے پوچھا

"وہ تو نہیں مانی، لیکن چاہے نعمت کی زبانی سنا ہے کہ وہ بہت جلد مان جائے گی۔" اس نے جواب دیا

"اگر منیہ مان گئی تو پھر بہت برا ہو گا یا ر۔" سراج نے تشویش سے کہا تو فہد بولا

"دیکھ سراج۔! ہمارا جو فرض تھا۔ وہ ہم نے پورا کیا۔ اب اگر وہ ہماری مدد چاہے گی تو ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ اگر وہ

چوہدریوں سے کسی بھی وجہ سے صلح کر لیتی ہے تو وہ واپس کر سکتی ہے۔ ہم اسے روک تو نہیں سکتے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ اس کی سوچ ہے۔"

"لیکن! اگر وہ صلح کر لیتی ہے تو پھر ہم جو اتنا آگے چلے گئے ہیں چوہدری کی مخالفت میں پھر کسی پر کیا اعتبار رہ جائے گا۔ یہ بھی تو

سوچ۔ اسے روکنا ہو گا۔" سراج نے کہا تو فہد سمجھاتے ہوئے بولا

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے ہو سراج۔ میرا نہیں خیال کہ وہ چوہدریوں سے صلح کرے گی۔ اگر اس نے صلح کرنی ہوئی تو ہم اسے

نہیں روک سکتے۔ بلکہ اچھا ہے۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ اپنے ارادے میں کتنی مضبوط ہے۔ واقعی چوہدریوں کی مخالفت، تو پہلے ہماری ان

کے ساتھ کون سی محبت چل رہی ہے۔"

"آخر یہ عورت ذات ہے۔ وہ دھمکیوں میں آ سکتی ہے۔ لالچ بھی ہو۔" سراج نے کہنا چاہا تو فہد بولا

"کچھ نہیں ہوتا۔ تو ذرا تحمل سے کام لے، دیکھ کیا کرتی ہے وہ۔ سب سب بھول جا، اس پر سوچ جو ہم نے آج کرنا ہے، چل وہ

تیرے نادروالے آئے ہیں۔ پہلے ان سے ملے ہیں، تاکہ وہ تو جائیں۔"

"چلو، مگر یہ منیہ والی بات کو یونہی مت لیتا۔"

سراج نے اسے سمجھایا تو فہد نے ہمدی سے کہا

"ہاں ہاں دیکھتے ہیں۔"

وہ تینوں وہاں سے گھر کے لئے چل دیئے۔

نادروالوں سے ملنے کے بعد فہد اپنی کار میں سلمیٰ کے گھر پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سکول کے سامنے جا پہنچا۔ جہاں بھی وہ

پڑھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں نہیں اٹھی۔ ماضی اسے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔ اس

نے دیکھا سکول کی عمارت پر زنگ آلود تالا پڑا ہوا تھا۔ فہد کی گاڑی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے فہد اور سلمیٰ باہر آ گئے۔ انہی لمحات

میں اطراف میں سے سراج اور چھما کا ٹھلے۔ سراج کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کے ساتھ کافی سارے اسلحہ بردار لوگ تھے۔ سلمیٰ بہت جذباتی

ہو رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو رواں تھے۔ فہد نے کار میں سے ہٹوڑا نکالا۔ وہ ہاتھ میں ہٹوڑا لئے آگے بڑھا ہے اور تالے پر ضرب

لگانے لگا۔ تالوٹ گیا تو فہد نے سلمیٰ کو ساتھ لیا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ چھما کا اور سراج ان کے ساتھ تھے۔ اندر جا کر انہوں نے گھنٹی لی

اور سہمی کے ہاتھ میں دے دی۔ سہمی اس گھنٹی کو اپنے ہاتھ میں لئے چند لمبے دیکھتی رہی۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں گھنٹی بجانے لگی۔ ایک ضرب، دوسری ضرب تیسری ضرب۔

ٹن.....ٹن.....ٹن.....

گھنٹی کی آواز پر رے قسمت گھر میں پھیل گئی۔ لوگ چونک اٹھے۔ سکول بیل بج رہی تھی۔ گھر، بازار، گلی، کمیٹ، راستے سب جگہ آواز سننی جا رہی تھی۔ لوگ حیران ہو کر سن رہے تھے۔ ماسٹر دین محمد وہ آواز دہمی مسکراہٹ سے یوں سن رہا ہے جیسے کوئی نغمہ ہو۔ چوراہے میں بھی سکوں کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ حنیف دوکاندار اور چاچا سوہنا بھی سن رہے تھے۔

حنیف دوکاندار نے حیران کن انداز میں پوچھا

”یہ ہمارے گاؤں کے سکول کی گھنٹی بج رہی ہے نا؟“

”حقیقت تو یہی ہے حنیف، لگتا ہے قسمت گھر کی بدلتی ہوئی قسمت کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔“ چاچے سوہنے نے خوشگوار انداز

میں اپنے مائے دی

”اوجا چا کوئی خدا کا خوف کرو۔ اتنے برس ہو گئے چوہدریوں نے یہ سکول نہیں کھلنے دیا۔ اب گاؤں میں ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ گھنٹی تو کسی نئے شرکی آواز ہے۔“

حنیف دوکاندار نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا تو چاچا سوہنا بولا

”نہیں، بالکل نہیں، یہ شرکی نہیں، خیر کی آواز ہے۔ تعلیم ہر بچے کا بلیا دی حق ہے۔ چوہدری کون ہوتے ہیں، ان مصوم بچوں کو ان کے حق سے محروم کرنے والے۔“

”یہ بھی فہد کی نئی شرارت ہے۔ دیکھنا اب خون خرابہ ہوگا۔ یہ بندہ کسی کو چین نہیں بیٹھنے نہیں دے رہا۔ جب سے یہ گاؤں میں آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد ہی پڑا رہتا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا

”وہ تم جیسے بے ضمیروں کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ نیند سے اٹھو اور اپنا حق پکچانو۔ وہ ظالموں کو لٹکا رہا ہے مگر ظالم بجائے اس کا سامنا کرنے کے کمزوروں پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں اور کمزور خواہ مخواہ خوف سے دبے جا رہے ہیں۔ یہ تہدیلی ہے۔ اب نہ بدلتا تو کبھی نہیں بدلتے گا۔“ چاچے سوہنے نے اسے دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا

”یہ تیرے جیسے چند اُسے شہہ دے رہے ہیں۔ اس وقت تمہارا پتہ بھی نہیں چلتا جب چوہدری اپنی آئی پر آگئے۔“ حنیف دوکاندار نے ڈرایا تو چاچا سوہنا بولا

”تو آجائیں اپنی آئی پر، کس نے روکا ہے، فہد کا سامنا کرتے ہوئے کیوں ڈرتے ہیں۔ سکول کھل گیا ہے۔ اب اس میں بچے پڑھیں گے۔ اب چوہدری جو مرضی کر لیں یہ بند نہیں ہوگا۔“

”دیکھو کیا ہوتا ہے، سکول بند ہوتا ہے یا اس کے کھولنے والے....“ حنیف دوکاندار کہتے ہوئے خاموش ہو گیا اور پلٹ کر اپنی دوکان کی طرف چلا گیا۔

سکول کی تختی بج رہی تھی اور اس وقت تک بھتیجی رہی جب تک سارے قسمت مگر نے نہ بن لیا۔

فہد اور ماسٹر کھانا کھا چکے تو سہلی چائے لے کر آگئی اور مہران کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے کہا

”سکول کا تالا تو توڑ دیا ہے تم لوگوں نے، ایک خواب تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن یہ چوہدری اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ ضرور۔“

”سکول کا تالا توڑنے سے پہلے میں نے سب سوچ لیا تھا اور اس کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں میں نے محکمہ تعلیم

کے آفیسرز سے بھی بات کر لی ہے۔ بلکہ آج کل میں آپ کے پنشن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ آپ بس دیکھیں، ان چوہدریوں کی بے

بسی۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ فہد نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو، ماسٹر دین محمد بولا

”فہد پتر۔ ایسا بے تشویش والی بات یہ ہے اگر صغیہ مان گئی تو اب تک جو تمہاری کوششیں ہیں۔ وہ سب رائیگاں جائیں گی۔ دشمنی

بھی بڑھ جائے گی۔ یہ تم لوگوں کو پہلے سوچنا چاہئے تھا تا کہ اس کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔“

”بات اثر و رسوخ کی نہیں اور نہ ہی دشمنی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر صغیہ دباؤ میں آکر ان کی بات مان لیتی ہے تو پھر چوہدری

کے جبر کا جال توڑنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن یہ ناممکن تو پھر بھی نہیں ہے۔“ فہد نے سنجیدگی سے کہا

”میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں فہد۔ اس قدر مشکل حالات میں بھی تم حوصلہ نہیں ہارے ہو۔ جبکہ میرے کہنے کا مقصد یہ

ہے یہ بٹنا کہ بندہ اپنی لڑائی توڑ سکتا ہے۔ کسی کی لڑائی کیا لڑے۔ اب صغیہ جیسی کمزور عورت ان کا دباؤ کب تک برداشت کرے گی۔“

ماسٹر دین محمد نے کہا تو سہلی بولی

”ہم اس کا سہارا ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جتنا مرضی وہ اس پر دباؤ ڈالیں۔ صغیہ نہیں مانے گی۔ وہ ان کے لالچ میں بھی نہیں

آئے گی۔“

”کسی کا کیا اعتبار۔ افرض کیا وہ لالچ یا دباؤ میں آجاتی ہے تو ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ جبکہ چوہدری تو ہر ممکن کوشش کریں گے

تا معاملہ اس کے جینے کا ہے۔ اب معاملہ صغیہ پر ہے۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ حالات کا رخ موزاں کر سکتا ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو فہد بولا

”آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد جی، میں مان لیتا ہوں کہ وہ لالچ یا دباؤ میں آکر اپنا فیصلہ تبدیل کرے گی۔ تو پھر کیا ہوا۔ چوہدری

کے ساتھ ہمارے حالات تو ویسے ہی رہیں گے۔ اور اگر دشمنی بڑھتی ہے تو پھر بڑھ جائے۔“

”اباجی، آپ سمجھائیں مت۔ میں ابھی اس سے ملتی ہوں۔ اسے حوصلہ دوں گی۔ جس طرح کا سہارا چاہے گی میں اسے دوں

گی۔“ سہلی نے کہا تو ماسٹر دین محمد پوچھا

”کیا سہارا دو گی۔ کیا دے سکتی ہوں۔ چوہدری تو اسے روپے پیسے اور زمین کا لالچ دے رہے ہیں۔ تم کیا دے سکتی ہو۔ کیا ہے

تمہارے پاس؟“

”کیا نہیں ہے سسٹی کے پاس استاد جی۔ گھر، روپیہ پیسہ، زمین سب کچھ ہے سسٹی کے پاس۔“

اس کے یوں کہنے پر ماسٹر دین محمد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا

”میں تو اپنی رائے دے رہا تھا۔ باقی تم لوگ جانو کہ کیا فیصلہ کرتے ہو۔“

”آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ساری کوششوں کا محور فقط منصفیہ نہیں ہے اور بہت کچھ ہے۔“ فہد نے کہا تو

ماسٹر دین محمد بولا

”تم جو بہتر سمجھتے کرو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”آپ ناراض ہیں؟“ فہد نے اچانک پوچھا تو ماسٹر دین محمد نے جلدی سے کہا

’نہیں پتر۔! میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ میں آئندہ آنے والے حالات کی سختی سے آگاہ کر رہا تھا۔“

اس پر فہد نے اپنے استاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ مند لہجے میں کہا

”آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“

ماسٹر دین محمد نے اپنا سر ہلایا تو فہد اٹھ کر چل دیا۔

فہد گھر پہنچا تو ملک فہیم اس کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ فہد کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ برے تپاک سے ملا۔ اسے عزت کے

ساتھ بٹھایا۔ پھر فہد اور ملک فہیم دونوں کمرے میں خوشگوار سوڈ میں بہت دیر تک علاتے اور اس کی صوت حال پر باتیں کرتے رہے۔ صبحی

ملک فہیم نے کہا

”آپ سے اتنی ڈمیرے ساری باتیں کر کے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ خیر۔! باتیں اور ملاقاتیں تو اب ہوتی رہیں گی۔“

”کیوں نہیں ملک صاحب۔! آپ جیسے سیاسی بندہ، سیاست کے بغیر بھلا کہاں رہ سکتا ہے اور پھر جہد و جدوجہد تو اس جاگیر دار کے

خلاف ہے جس نے جبر سے ملاتے پر حکمرانی کر رکھی ہے۔ میرا مقصد تو اس جبر کے خلاف لڑنا ہے۔“

فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ملک فہیم صاف انداز میں بولا

”سیاست یا الیکشن جیتنا ہی میرا مقصد نہیں ہے۔ مجھ سے یہ علم نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے پہلے ہی اپنی بساط مطابق کوشش کی تھی،

اب بھی کر رہا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

فہد نے زوردار لہجے میں کہا تو ملک فہیم حتیٰ لہجے میں بولا

”تو پھر یہ طے ہوا کہ نذیر کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہم اس مظلوم عورت کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ اور اس کے لیے چاہے جو بھی کرنا پڑے۔ مگر ہرے اسے سیاسی ایشو بنائیں گے تو ہی اس مظلوم عورت کی فریاد سن جائے گی۔“

”اے قانونی مدد بھی تو فراہم کرنی ہے۔“ فہد نے یاد دلایا تو ملک فہم نے کہا

”میں ہوں نا۔ اس میں جو خرچ وغیرہ ہو گا وہ میں کروں گا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہترین وکیلوں کی مدد لیں گے۔“

”چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو آپ کہیں میں حاضر ہوں۔“ فہد نے خوش ہوتے ہوئے کہا

”میں تو یہاں تک سوچ رہا ہوں کہ یہاں لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع دوں تا کہ وہ ساری زندگی کی کمینہ نہ رہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں۔“ ملک فہم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا

”میں بھی اس نچ پر سوچ رہا ہوں دیکھیں، جاگیر دار ہونا سرمایہ داروں کو اپنے منافع سے غرض ہے۔ لیکن مزدور کو وہ فائدہ کہاں ہے، روزگار کے مواقع کون پیدا کرتا ہے“ فہد نے بھی اپنا خیال بتایا تو ملک فہم بولا

”میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات، فہد آپ نے ہونا تو مجھے نئی توانائی مل گئی ہے۔ اس علاقے کا سیاسی سیٹ اب بھی نئے سرے سے دیکھیں گے۔ ظاہر ہے، کچھ وقت بعد ہم نے الیکشن میں تو جانا ہی ہے۔ اس وقت تک ہمیں سیاسی طور پر مضبوط ہونا ہے۔“

”عوام اب باشعور ہے ملک صاحب۔! عوامی قائد کے لیے کچھ کرنا ہو گا ورنہ آپ اور ہم انقلاب کی چاب تو سن رہے ہیں۔“ فہد نے اسے آگے لے لے والے وقت کا ک احساس دلایا

”بالکل۔! احب پڑ نہیں۔ اس انقلاب کے بعد جو سیٹ اب بنے گا۔ اس میں ہم کہاں ہوں گے۔ یہ شاید ہم ابھی سوچ نہیں رہے ہیں۔ خیر۔! انی المال مجھے اجازت دیں، گاؤں تک پہنچنے کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اب ملاقات تو ہوتی رہے گی۔“ ملک فہم نے اجازت چاہی تو فہد خوش دلی سے بولا

”کیوں نہیں، ضرور ہوگی ملاقات۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا، پھر ملک فہم دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے اس کے چہرے پر خاصی خوشی تھی۔



حویلی کے ڈرائیونگ روم میں بشری بیگم مہری سوچوں میں گن چلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے رانی اسے چائے دے گئی تھی جو اب تک ویسے پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ رات کی باتیں اسے بھول نہیں رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے چوہدری جلال کو بدلا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس وقت

بھی وہ لان میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

رات چوہدری جلال خواب گاہ میں تھا۔ بشری بیگم نے اس کی محبت دیکھ کر پوچھا

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

”سوچنا کیا بیگم! دنیا داری کے مسائل تھوڑے ہیں۔ ایک کوئل کرودھہر سا منے آکھڑا ہوتا ہے۔ ارد گرد پھیسے ہوئے تھوڑے

جھنجھٹ ہیں۔ ان کے سنے سوچنا تو پڑتا ہے۔“ چوہدری جلال نے عجیب سے لہجے میں کہا تو بشری بیگم نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے بولی

”آپ پہلے کبھی اسے فکر مند دکھائی نہیں دیئے، آپ مجھے نال رہے ہیں؟“

”بیگم! تمہیں معلوم ہی ہے کہ معاملہ کیا چل رہا ہے۔ میں نے کبیر کو بہت سمجھایا کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ مگر وہ مانا

نہی نہیں۔ یہ وقت بھی آتا تھا کہ ایک معمولی عورت ہمارے سامنے آکھڑی ہوگی۔ اور وہ ہماری بھوری بن جائے گی۔“ چوہدری جلال نے کہا

”میں نے وکیل کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ چوہدری صاحب۔ اس سے پہلے کی حالات مزید ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں

۔ ہمیں انہیں سنبھالنا ہوگا۔ صفیہ اگر مان جاتی ہے تو پھر معاملہ ختم ہو سکتا ہے نا؟“ بشری بیگم بولی

”مشکل تو یہی ہے۔ وہ ہمارے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے۔ معاملہ اگر اپنے ہی علاقے میں رہتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن۔!

مخالفین اسے بہت دور تک لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے اثرات ٹھیک نہیں ہوں گے۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا

”کیا فہد اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ آپ اسے نہیں روک پارہے ہیں؟ اس نے تشویش سے پوچھا تو چوہدری جلال نے نخوت سے کہا

”فہد۔ اُسے تو میں ابھی ایک چوٹی کی طرح مسل دوں لیکن اس وقت وہ ایسی عورت کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ جیسے وہ مظلوم

بنانے پر تیار ہوا ہے۔ اگر اس وقت اسے کچھ کہتے ہیں تو وہ بھی مظلوم بن جائے گا۔“

”لے دے کہ بات صفیہ پر ہی آن گیتی ہے نا چوہدری صاحب۔! اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ میں

چلی جاتی ہوں اس کے پاس۔“ بشری بیگم نے مان سے کہا تو چوہدری جلال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا

”نہیں، ابھی ہم پر ایسا وقت نہیں آیا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اپنے معاملات کے لئے تمہیں کسی کے

پاس بھیجوں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”چوہدری صاحب۔! یہ معاملہ میرے بیٹے کا بھی ہے۔ میں اگر آپ کی بیوی ہوں تو ایک بیٹے کی ماں بھی ہوں کیا میں اپنے بیٹے

کے لیے اتنا بھی حق نہیں رکھتی ہوں۔ کہ اس کے لئے کچھ کر سکوں۔“ وہ جذباتی انداز میں بولی تو چوہدری جلال نے کہا

”میں ہوں نا اور اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں، تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔“

”نہیں چوہدری صاحب۔! مجھے اپنے بیٹے کے لیے ایک کوشش کر لینے دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی کوشش کی

ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانی میں ایک بار۔“ بشری بیگم نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے سختی سے کہا

”بیگم۔ اتم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ مجھے احساس دلارہی ہو کہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں نا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی۔“

بشری بیگم نے بحث کرتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے چڑتے ہوئے کہا

”نہیں۔ چاہے یقین بھی ہے۔ لیکن میں نے جب کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا اب تم سو جاؤ۔“ چوہدری یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے

لگا۔ بشری بیگم غم زدہ سی کروٹ ملی کر لیٹ گئی۔ وہ تب سے سوچ رہی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ چوہدری جلال باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رانی کو بلایا اور اسے باہر لان میں چائے لانے کا کہہ کر چوہدری جلال کے پاس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

چوہدری جلال اور بشری بیگم لان میں تھے اور رانی انہیں چائے سرو کر رہی تھی۔ بشری بیگم نے ادھر ادھر کی باتوں میں چوہدری جلال کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں آرکی۔ وہ گاڑی میں سے نکلا اور تیزی سے ان کی جانب آگیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ بشری بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا

”آؤ کبیر، چائے پیو گے؟“

چوہدری کبیر نے ماں کی بات سن کر غصے میں کہا

”بابا۔! پہلے تو فہدی یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا پھردہا تھا۔ لیکن اب، شردین محمد کی بیٹی سلمیٰ اور صفیہ دونوں مل کر

واضح طور پر ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہی ہیں۔“

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال اور بشری بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چوہدری جلال چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا

”ہوا کیا کبیر بیٹا۔ کچھ بتاؤ گے بھی؟“

”اتنے برس سے جو سکول ہم نے بند کروا دیا ہوا تھا۔ وہ آج سلمیٰ اور فہدی نے جا کر کھول دیا ہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ اب یہ

سکول روزانہ کھلے گا۔ پولیس اب کیا کرنا چاہئے؟“

یہ خبر چوہدری جلال کے لئے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی، یہ اس کی اٹا کے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ خاموش ہی تھا کہ بشری بیگم

نے کہا

”مگر اس میں اتنا طغی میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیرے ہباؤ کچھ لیتے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو۔“

”نہیں بیگم۔ ایہ صبر کرنے والا کام نہیں ہے، سکول کی گھنٹی، ہماری شکست کی صدا ہے۔ یہ برداشت نہیں ہوگی۔“ چوہدری جلال

نے وہ بے غصے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا

”اتنے برس سے جو ہمارا رعب و دبدبہ یہاں کے لوگوں پر طاری ہے، وہ انہوں نے چیلنج کر دیا ہے۔ کب تک انہیں نظر انداز

کرتے رہے گے۔“

”سکول چلائے گا کون، ہماری مرضی کے بغیر یہاں علم نہیں آ سکتا۔ پہلے کیا یہاں عہد آیا، سب اپنے گھروں میں بیٹھے تھوڑے ہیں لے رہے ہیں۔ میرے ہر جہاں تک پہنچ کرنے کی بات ہے، اس کی انہیں مزا بھگتتا پڑے گی۔“

”لیکن بابا، انہیں روکن تو ہو گا؟“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا۔ پھر لہو بھر خاموشی کے بعد بولا، ”بابا آپ وقت حالات اور سیاست کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کو فقط بتانے آیا ہوں، میں انہیں روکوں گا۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”تم کچھ بھی نہیں کر دو گے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس بارے میں سوچو بھی۔“ بشری بیگم نے تیزی سے کہا تو چوہدری کبیر نے سستی ان سنی کرتے ہوئے کہا

”دن بدن ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور کی مصلحت حالات خراب کر رہی ہے، ایک دن سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں یہ تماشا نہیں دیکھ سکتا۔“

”تم صرف تم تماشا دیکھو، کہا نا تمہیں کچھ نہیں کرنا۔“ بشری بیگم نے درشتی سے کہا تو چوہدری کبیر نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ رانی نے کچھ برتن اٹھائے اور وہاں سے چل دی۔



شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی۔ منیہ اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا دھین بجانے کہاں تھا۔ اس کے قریب اس کے بچے چار پائی پر پڑے سو رہے تھے۔ وہ شام ہی سے رو رہی تھی۔ ایسا دکھ اس کے اندر سرایت کر گیا تھا کہ آنسو خشک ہی نہیں ہو رہے تھے۔ جیسے وہ سوچتی، اس کا دکھ مزید بڑھ جاتا۔ جیسے اس کے اندر سادہ برستے برستے رک ہی نہ رہا تھا، انتقام کی آگ ہی اتنی زیادہ تھی۔

ڈھلتی ہوئی شام کے وقت منیہ چار پائی پر بیٹھی تھی۔ وہ سوئی سے کوئی کپڑا ہی رہی تھی۔ باہر سے بابا نعت علی آیا تو وہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ بابا خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ بھی منیہ نے دھیرے سے پوچھا

”خیر تو ہے بابا۔! سارا دن کہاں تھے۔ پلٹ کر گھر ہی نہیں آئے؟ کچھ کھا یا پیا بھی نہیں ہے صبح سے۔“

”کھانا پینا کیا ہے بیٹی۔! جب ہر طرف خوف کا اندھا چرا چھا جائے تو پھر کھانے پینے کا خیال کہاں رہتا ہے۔ بھوک پیاس تو جیسے اڑ گئی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں آتی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟“

بابا نعت علی بے بسی سے سوچا تو منیہ نے پوچھا

”کیا کرنا چاہتا ہے تو بابا؟“

”سو فائدہ تمہیں سمجھا یا ہے بیٹی۔ ہم غریب لوگ چوہدریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب تو ہم یہاں سے کہیں اور بھی نہیں جاسکتے کہ چلو اپنی جان بچا کر کسی طرف نکل جائیں۔“

بابا نعت علی رد ہوتا ہوتا ہوئے بولا تو صفیہ نے حیرت سے پوچھا

”انکی کیا بات ہو گئی ہے بابا۔ تو ایسے کیوں سوچ رہا ہے۔“

”میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔ میری اب سوچ کہاں رہی ہے۔ مجھے تو حکم کا پابند کر دیا گیا ہے۔“ بابا نعت علی نے صاف انداز

میں کہہ دیا

”کیسا حکم۔ افسر و انہوں نے جہیں ڈار یا دم کا یا ہوگا۔ پر تو انہیں بتادے میں مر تو سکتی ہوں، لیکن میں بدلہ ضرور لوں گی۔“ اس

نے طحی صاف کہہ دیا تو بابا نعت علی نے غصے سے کہا

”کیسے لے کر بدلہ اتنی رقم ہے تیرے پاس جو تو خرچ کر سکے۔ جن لوگوں کے سر پر تو بڑی بڑی ہاتھ کر رہی ہے نا۔ وہ کل تیرے ساتھ

نہ رہے تو کیا کرے گی۔ کون دے گا اتنی دیر تک تیرا ساتھ، تیرے ساتھ کون تنہا پکھڑوں کے دھکے کھائے گا۔ کل کو جو تو تھک ہار کر چہرہ دیوں

کے سامنے ہاتھ جوڑے گی، اچھا نہیں ہے کہ تو آج ان کی بات مان لے۔“ بابا نعت علی نے اسے سمجھایا تو صفیہ نے مضبوط لہجے میں کہا

”ان کی بات ماننے سے پہلے میں مر جانا قبول کر لوں گی۔“

”تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو نہیں مانی تو پھر۔۔۔“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا

تو صفیہ نے کہا

”وہ یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔ جیتے جی تو انہوں نے مجھے اور میرے بچوں کو مار ہی دیا ہے اب جان سے بھی مار دیں۔ میں نہیں ڈرتی

ان سے۔“

”دیکھ تو سمجھ جا، وہ جو دے رہے ہیں۔ لے کر مبر شکر کر لے۔ ورنہ بہت کچھ تانا پڑے گا۔ کیوں عذاب کو دعوت دے رہی ہے۔

کون ہے تیرا جوتھے سنبھال لے گا۔ اپنے مستقبل کا سوچ، اپنے بچوں کا سوچ۔“ بابا نعت علی نے غصے میں کہا اور چار پائی سے اٹھ کر باہر کی

طرف نکل جاتا ہے۔ صفیہ ایک دم سے افسردہ ہو گئی۔ اسے کوئی بھی حوصلہ دینے والا نہیں تھا۔ کیا وہ اپنا حق بھی نہیں لے سکتی؟ جس نے جرم

کیا وہی اس کی طرف داری ہو رہی ہے۔ کیا نظام ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر آنسو تھے کہ تھمنے کا

نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ صفیہ اپنے کمرے میں افسردہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے بچے سو گئے ہوئے تھی اتنے میں دروازہ پر

دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا، پھر دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ اس نے لائین اٹھائی اور مچن پارکر کے دروازہ کھول کر سامنے

بھری بیگم کو کھڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کے ساتھ حویلی کی ایک عازہ مرانی تھی۔ صفیہ کے منہ سے سرسرا تے ہوئے نکلا

”چوہدرانی جی۔ آپ؟“

چوہدرانی نے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولی

”اندر آنے کے لیے نہیں کہوں گی صفیہ؟“

”آں، آؤ آؤ جو ہد رانی آؤ۔“ صفیہ نے کہا دروازے میں سے ہٹ گئی۔ جو ہد رانی بشری بیگم اندر آ گئی۔ بچے سوئے پڑے تھے۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اور رانی ایک جانب کھڑی تھی۔ بشری بیگم خاموش تھی

”کہو جو ہد رانی جی، کیسے آتا ہوا اور وہ بھی اس وقت؟“ پاؤں کو کشش کے صفیہ کے بچے میں طغور آیا تھا، اس پر بشری بیگم نے نرم لہجے میں کہا

”رات کے اندھیرے میں کسی کے دروازے پر یا تو کوئی چور جاتا ہے یا پھر بہت مجبور، تمہارے سامنے ایک مجبور ماں کھڑی ہے۔ تم چاہو تو اس کی جھولی بھر سکتی ہو۔“

”جو ہد رانی۔ میرا اللہ تو کسی کے ساتھ ہے انصاف نہیں کرتا پھر یہ جھولیاں بھرواتے رہتا، تم لوگوں کا ہی مقدّر کیوں۔ ہے کوئی اس کا جواب؟“ صفیہ نے غصے میں پوچھا تو بشری بیگم بولی

”میں مانتی ہوں کہ میرے بیٹے سے ظلم ہو گیا۔ اس کے بچے میں تمہارے دروازے پر اس لیے چل کر آئی ہوں کہ تم بھی ماں ہو۔ میرے دکھ کو سمجھو گی اور۔۔۔“

”میں بھی تو ماں ہوں۔ کیا میرے یہ بچے مٹی کے کھونے ہیں یا ان میں جان ہی نہیں ہے۔ ان کے سر سے تمہارے بیٹے نے باپ کا سایہ چھین لیا تو میں ماں ہو کر ان کا دکھ محسوس نہیں کرتی، کیا ہم غریبوں کے جذبات نہیں ہوتے۔ ہم سانس نہیں لیتے، ہمیں دکھ نہیں ہوتا؟“ صفیہ غصے کی شدت میں کہتی چلی گئی تو بشری بیگم نے اسی نرم لہجے میں کہا

”میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن جو ہوتا تھا وہ ہو گیا صفیہ، اب نذیر واپس تو نہیں آئے گا، تم ان بچوں کے مستقبل کے لیے جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں بس میرے بیٹے کو معاف کر دو۔“

”نہیں۔۔۔ تم نہیں دے پاؤ گی، اور نہ ہی تمہیں ہمارے دکھ کا احساس ہے۔ اگر احساس ہوتا تو یوں میرے زخموں پر ہلکے چھڑنے نہ آ جاتی۔“ وہ انتہائی دکھ سے بولی تو بشری بیگم نے مان سے پوچھا

”تم مانگ کر تو دیکھو صفیہ۔ میں دوں گی۔ بولو؟“

”کیا تم اپنا بیٹا مجھے دے سکتی ہو یا میرے بچوں کی طرح اس کے باپ کا سایہ دے سکتی ہو اسے بھی جہنم کر سکتی ہو۔“ صفیہ نے غصے میں کہا تو بشری بیگم بھی غصے میں بولی

”یہ کیا بک رہی ہو؟“

”ابھی تو میں نے بات کی ہے اور جو ہد رانی تم اپنے آپ میں نہیں رہتی۔ دکھ سمجھتی ہو میرا؟ تم لوگ کیوں نہیں سمجھو کہ غریب بھی حق پر ہو سکتا ہے۔ تم میرے سر کے سائیں کا خون خریدنے آئی ہو۔“

صفیہ نے نفرت سے کہا تو بشری بیگم غصے میں بولی

”ہوش کی دوا کر صفیہ۔ اتم جس کی زبان بول رہی ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں سے سکتی؟“

”کون کسی کو کچھ دے سکتا ہے، ابھی تم نے بھی دعویٰ کیا تھا۔ سنو چوہدرانی۔ اچھے اس دنیا میں انصاف ملے یا نہ ملے لیکن قیامت کے دن تم لوگوں کا گریبان میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوا کر رہوں گی۔ اس دنیا میں کوشش کرو گی۔ اگلے جہان میرا رب مجھے انصاف دے گا۔“

وہ غصے بھرے لہجے میں تیز انداز میں بولی تو بشری بیگم نے حقارت سے کہا

”ابھی تم ہوش میں نہیں ہو۔ جب ہوش میں آؤ تو میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں۔ تمہارے قصور سے بھی زیادہ دے دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے رانی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر کی جانب چلی گئی تو صفیہ بے بس ہو کر رونے لگ گئی۔ پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کے وقت صفیہ چوبے کے پاس بیٹھی آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی بابا نعمت علی گھر میں آیا ہے اور آتے ہی پوچھا ”صفیہ۔ ایہ میں کیساں رہا ہوں رات چوہدرائی آنی اور تو نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ جانتی ہو وہ ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟“

”کیا کر سکتے ہیں۔ یہی تا کہ وہ ہمیں مار دیں گے۔ تو مار دیں۔ ایسی زندگی جی کر ہم کیا کریں گے۔ جس میں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔“ اس نے نفرت سے جواب دیا تو بابا نعمت بولا

”اصل میں تیرا دماغ خراب کیا ہے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے، دیکھ لینا وہ تیرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ خود ساری زندگی چوہدری کے سامنے اونچی سانس نہیں لے سکے۔ وہ تیرا کیا ساتھ دیں گے؟“

”جب خون کے رشتے ہی سفید ہو جائیں تو پھر کوئی ساتھ دے یا نہ دے نذیر تیرا بھی تو بیٹا تھا بابا۔ تو ان سے بدلہ لینے کی بجائے مجھے خوف زدہ کر رہا ہے؟“ صفیہ نے جتا یا تو بابا نعمت نے سمجھا دیا

”بدلہ تو دہاں لیا جاتا ہے جہاں طاقت ہو۔ ہم بے طاقت بے بس لوگ بھلا ان سے کیا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ہم لوگ تو سکون سے سانس لے لیں، یہی فہیمت ہے۔“

”تو پھر ہمیں چپے کا بھی کوئی حق نہیں ہے بابا۔“ صفیہ غصے میں بولی

”کو پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ بات مان جایا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے تیرا دماغ خراب کیا ہے۔ تو آگ اگل رہی ہے۔ میری بات مان جا کیوں اس بڑے چاہے میں میری زندگی خراب کر رہی ہے۔ مان جا۔ ورنہ۔۔۔“ وہ غصے میں کہتا ہوا رک گیا۔

”ورنہ کیا بابا تو کہنا کیا چاہتا ہے۔“ وہ ایک دم ہلنک اٹھی تو وہ بھی غصے میں بولا

”میں یہی کہنا چاہتا ہوں تو اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو پھر تیرا ہمارا تعلق کیا رہ جائے گا۔ تو پھر جہاں جانا چاہئے چلی جا۔“
 ”ہاں۔! تو کبھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔ میں ان بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔ نہیں رہوں گی، چلی جاؤں گی۔“ اس نے بھی کہا
 ”ہاں ہاں چلی جا ہماری جان تو عذاب میں نہیں رہے گی نا“ بابا نعمت نے تنگ آتے ہوئے کہا تو فیصلہ کن انداز میں بولی
 ”چلی جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رودی۔ بابا چند لمحے کھڑا رہا پھر ہر نکل گیا۔ صغیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔
 صغیہ اپنے گھر کے صحن میں دھری چار پائی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ ایسے میں سلسی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے دور سے دیکھا
 اور پریشان ہو گئی۔ وہ اس کے قریب گئی تو صغیہ نے اس کی طرف دیکھا اور مزید شدت سے رونے لگی۔ جب سلسی نے تشویش سے کہا
 ”کیا ہوا صغیہ! کیوں رو رہی ہو۔ کیوں نکلا یا مجھے۔ خیریت تو ہے نا۔“

”بابا نے مجھے اس گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا ہے۔“ صغیہ نے سسکتے ہوئے کہا اور شدت سے رو پڑی تو سلسی نے چوکتے ہوئے کہا
 ”اوہ! وہی ہوا نا۔ جس کا ڈر تھا۔ پر تم بھرتی کیوں ہو کیوں حوصلہ ہار رہی ہو۔ میں ہوں نا۔“
 ”تم کب تک میرا اور میرے بچوں کا بوجھ اٹھا پاؤ گی۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیسہ پاں لوں گی۔ لیکن یوں
 میرے سر سے جھت جھین لی جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہں جاؤں گی؟“ صغیہ نے روتے ہوئے کہا
 ”تو حوصلہ کر اور چل میرے ساتھ کہتے ہیں، ایک در بند سو در کھلے۔ اپنا سامان اگر لینا چاہتی ہے تو لے لو اور سیدھی میرے پاس
 آ جا، اپنے بچوں کو لے کر۔ میں تمہارا سہارا بنوں گی۔“ سلسی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا
 ”تم کیسے؟“ صغیہ نے حسرت سے پوچھا

”میں نے کہا نا، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کر دو اور چلو میرے ساتھ۔“ سلسی نے کہا
 ”سلسی! کیا مجھے انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بابا غصے میں کہہ کر تو گیا ہے۔ شاید اسے اپنے پوتوں کا خیال آ جائے۔ مجھے جلد بازی
 نہیں کرنی چاہیے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا تو سلسی بولی
 ”تم چاہو تو انتظار کرو مگر ایک دن تجھے اس گھر سے جانا ہوگا۔ یہ چودہریوں کی ملکیت ہے۔ بہر حال تم جب چاہو اور جس وقت
 چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔ میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھوں گی۔“
 ”تو پھر میں دیکھ لوں بابا کو؟“ صغیہ نے پوچھا

”ہاں دیکھ لو جیسے تمہارا دل چاہئے۔“ سلسی نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔ صغیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس گھر کی
 در دیوار پر نگاہ ڈالی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلسی اسے دلاسا دیتے ہوئے
 مامردین محمد اور فہد دالان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ فہد نے کہا

”استادجی۔ آپ ایک دون میں تیار رہیں۔ آپ کو میرے ساتھ نور پور جانا ہوگا۔ وہ آپ کا پیشکش کیس منظور ہو گیا ہے۔ وہاں سے چیک لینا ہوگا۔“

”اُدھر۔ میں جانتا ہوں ان جگہ والوں کو۔ اتنی جلدی کہاں وہ چیک دینے والے ہیں۔ ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔ یہ جگہ فرض شامی سے کام کریں تا تو اس ملک کے آدمے مسائل خود، خود حل ہو جائیں۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا۔ اسی وقت سلسلی باہر گٹ سے اندر آگئی۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آ کر رک گئی تو ماسٹر دین محمد نے اس سے پوچھا

”خیر تو تھی صفیہ نے بڑی جلدی میں تمہیں بلایا تھا؟“

”وہ بابا نعمت علی نے اسے اپنے گھر سے گل جانے کو کہا ہے۔ چودہویں کی بات نہ ماننے پر۔“ سلسلی نے السردگی سے کہا

”تو پھر تم نے کیا کیا؟“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”میں نے کہا۔ آ جاؤ۔ میرے گھر میں اس کی ذمہ داری سنبھالیں۔ آپ کہیں

یہ کہتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو فہد نے تیزی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا

”ٹھیک کہا تم نے۔ وہ جب بھی آئے تم اسے چاہے عمر حیات کے گھر ٹھہرا دو۔ اگر وہ وہاں خطرہ محسوس کرے تو یہاں۔ جیسا تم چاہو۔“

”اب اگر اس کی ذمہ داری لی ہے تو پوری طرح سے نبھانا۔ یاد رکھنا، اس کے آنے کے ساتھ۔ تمہیں دکھ اور پریشانیاں بھی مل سکتی ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے سمجھایا

”مجھے احساس ہے اباجی، میں نے یہ ذمہ داری صرف ایک مظلوم کا ساتھ دینے کے لیے لی ہے۔“

سلسلی نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے سکون سے حوصلہ دیا

”تو پھر گھبراتا نہیں، وہ ادھر والا تیرا ساتھ ضرور دے گا۔“

”آپ چائے وغیرہ پی، میں لاؤں؟“ سلسلی نے پوچھا تو فہد نے کہا

”نہیں۔! ضرورت نہیں۔ میں بھی ذرا سراج کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے استادجی نے مجھے بلوالیا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چل دیا۔ سلسلی نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔



چودہری کی حویلی میں در آنے والی وہ صبح اتنی خوشگوار نہیں تھی۔ چودہری جمال مہری بنجیدگی کے ساتھ والا ان میں بیٹھا مہری سوچ میں گم تھا۔ چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں بشری بیگم چائے لے کر دیرے دیرے قریب آئی اور میز پر چائے رکھ کر اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چودہری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سرودبچہ میں پوچھا

”تمہیں جب میں نے روکا تھا کہ اس بچہ ذات کی عورت کے پاس نہیں جانا تو پھر تم کیوں گئیں؟“

”چوہدری صاحب۔! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ میں ماں ہوں۔ اور میں اپنے بیٹے کے لیے۔۔۔“ بشری بیگم نے کہنا چاہا مگر وہ کی بات ٹوک کر بولا

”مگر شوہر کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ اب تمہیں شوہر سے زیادہ اپنا بیٹا عزیز ہو گیا ہے۔ جو کہ واقعی گنہگار ہے۔“
 ”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی سرتاج کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی: ”مجھے معاف کر دیں۔ پہلی اور آخری بار معاف کر دیں۔“

”تم جانتی ہو بیگم، ان پنج ذات کے لوگوں کے ہارے میں۔ ان لوگوں سے نرم لہجے میں بھی بات کر لو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تمہاری بات نہیں مانی۔“ چوہدری جلال نرم پڑتے ہوئے بولا تو بشری بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا

”اس کے دماغ میں تو بہت آگ بھری ہوئی ہے۔ وہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی۔“
 ”وہ اس وقت پوری طرح دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں جانتے ان کا سامنا کس سے ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔“ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا اور پہلی پکڑ لی
 ”کہیں میرے بیٹے کبیر کو کچھ۔“ بشری بیگم نے جان بوجھ کر فخر و ادھر اور اچھوڑ دیا

”میرا بھی وہ بیٹا ہے اگر اسے کچھ ہوتا ہے تو پھر ہماری سیاست کا کیا فائدہ میں تو ان کی اچھل کود دیکھ رہا ہوں۔ کبیر محفوظ ہے۔“
 یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی اٹھالی اور ہلکا سا پیا۔ بشری بیگم حسرت و یاس سے اپنے شوہر کی جانب دیکھتی رہی، جو سوچ میں کھویا ہوا ساپ لے رہا تھا۔ تبھی بشری نے چوہدری سے پوچھا
 ”کہاں ہے میرا کبیر وہ جو پلی میں تو نہیں ہے۔“

”ڈیرے پر ہے بلوا لوا سے، اگر بلا سکتی ہو تو، کیونکہ آج سکول کی گھنٹی پھر بجے گی اور وہ لوگ یہ گھنٹی پوٹھی نہیں بجا رہے ہیں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، وہ نہیں مان رہا۔“ چوہدری نے بے بسی سے کہا
 ”مطلب، دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تصادم ہو اور۔۔۔“

بشری بیگم نے کہا اور پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی، چوہدری جلال نے پیالی واپس میز پر رکھ دی۔
 چوہدری کبیر اظہارِ اپنی انداز میں ڈیرے کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تنہیدگی اور غصے کے تاثرات نمایاں تھے۔ اتنے میں ماکھا آ گیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا

”ہاں بول ماکھے، کیا خبر ہے۔ آج بھی انہوں نے سکول کھولنا ہے یا پھر بس تارا توڑنے ہی کا شوق تھا اور ایک دن ہی گھنٹیاں بجا کر قاب ہو گئے؟“

”نہیں چوہدری صاحب، سبکی کچھ بچوں کے ساتھ سکول کی طرف ہی جارہی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے فہد اور اس کے ساتھ بندے بھی موجود ہیں۔“ ماکھے نے بتایا تو چوہدری کبیر نے چونکتے ہوئے پوچھا

”کتنے بندے لیے بھرتے ہیں؟“

”تھوڑے سے ہیں۔“ ماکھے نے بتایا

”اواخر ہے، جتنے بھی ہوں۔ تیاری کرو سکول تو بند ہوتا ہی ہے۔ آج اس فہد کی زندگی کی کتاب بھی بند کر دیتے ہیں۔ دیکھتا ہوں

کون سکول چلاتا ہے؟“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا تو ماکھا بولا

”جو حکم چوہدری صاحب۔“

چوہدری کبیر کا یہ دور سے لکھا، میز پر پڑے ہوئے شرمیلے راج اور نکارا اور پھر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ چوہدری کبیر گاڑی نے سٹارٹ کر

لی۔ اس دوران اس کے ملازمین بھی ایک دوسری جیب میں بیٹھنے لگے۔ ایسے میں

ڈیرے کے پھاٹک میں گاڑی آ کر رک گئی۔ اس میں سے مٹی نے نکل کر موبدب انداز میں دوا دہ کھولا۔ تو بشری بیگم باہر نکل

آئی۔ چوہدری کبیر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے جلدی میں اپنی گاڑی میں سے ہار آ کر غصے میں اپنی ماں سے بولا

”آج تک حویلی کی کوئی عورت ڈیرے پر نہیں آئی۔ یہ بات آپ جانتی ہو ماں، ایسا کیا ہو گیا ماں کہ۔“

”کہاں جا رہا ہے تو؟“ بشری بیگم نے پوچھا

”جن لوگوں نے سکول کھولا ہے نا انہیں سبق دینے جا رہا ہوں۔“ چوہدری کبیر نے طعنے لگے یہ بچے میں کہا تو بشری بیگم سکون سے بولی

”جہل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔“

”اوکیا ہو گیا ہے ماں، میں کوئی کچ کی گولیاں کھیلنے نہیں جا رہا۔ میرا راستہ مت روک۔“ چوہدری کبیر نے احتجاجاً کہا تو بشری بیگم

اسی سکون سے بولی

”میں تیری گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں۔ تو چاہے تو مجھے سکول لے جایا واپس حویلی۔ میں نے تیرے باپ سے وعدہ کیا ہے کہ اب

تجھے کوئی خون نہیں کرنے دوں گی۔“

وہ اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے چوہدری کبیر گاڑی میں جا بیٹھتی۔ وہ بے بسی میں چند لمحے سوچتا رہا پھر ملازمین کو واپس جانے کا

اشارہ کر کے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

حویلی کے ڈرائیونگ روم میں چوہدری جلال، وکیل اور چوہدری کبیر تینوں صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مٹی کھڑا

تھا۔ چوہدری کبیر غصے میں کہہ رہا تھا۔

”بابا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ جو اچانک یہاں تماشے ہوتا شروع ہو گئے ہیں، یہ کوئی فہد کا کمال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ملک

ضمیمہ ہے۔ وہی سب کچھ کرواد رہا ہے۔“

”کے چوہدری جی آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ یہ فقط آپ کا اندازہ ہے؟“ وکیل نے پوچھا
”دوسری بار الیکشن ہارنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ہم نے اس کی خاموشی کو نظر انداز کر دیا مگر وہ اندر ہی اندر ہمارے
خلاف سازشیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صفیہ کے لیے اس نے پریس کانفرنس کر دی تو وہ کھل کر سامنے آیا۔ اب وہ باقاعدہ فہد سے مل کر گیا
ہے، یہاں اس گاؤں میں آکر اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”یہ ثبوت نہیں ہیں کچھ چوہدری صاحب۔“ وکیل نے کہا تو چوہدری جلال بولا

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“

”ذرا غور کریں چوہدری صاحب، ریونیو آفیسر نے فہد کے حق میں فیصلہ دیا تو آپ نے اس کا جادلہ کروادیا۔ ڈی ایس پی جادلہ
کروا گیا، اس نے سیاسی دباؤ برداشت نہیں کیا۔ مطلب آپ کی بات نہیں مانی اور جو اس کی جگہ اے ایس پی آیا ہے اس کا موڈ کوئی آپ کے
حق میں نہیں لگتا۔ وہ سیدھے سیدھے فہد کی بات کرتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے چوہدری صاحب، کیا ملک فہم، انتظامی طور پر اتنی اپروچ
رکھتا ہے؟“ وکیل نے سمجھایا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”لگتا نہیں ہے کہ وہ اتنی اپروچ رکھتا ہوگا۔“

”نہیں آپ یقین سے بات کریں۔“ وکیل نے پوچھا

”نہیں، نہ اس کی ہمت ہے اور نہ اس کے اس قدر تعلقات ہیں۔“ اس نے حتیٰ لچھے میں کہا تو وکیل بولا

”تو پھر سوچتے چوہدری صاحب، کہیں آپ سیاسی طور پر ناکام تو نہیں ہو رہے؟ آپ کا اثر و رسوخ کدھر گیا؟ یا پھر مان لیں کہ
ملک فہم اپروچ رکھتا ہے اور وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو گیا ہے۔“

”میرا ذہن نہیں، مگر کہ وہ اتنا بڑا کھیل، کھیل سکتا ہے۔ جہاں دشمن کی کمزوریوں اور خامیوں پر نظر رکھی جاتی ہے، وہاں اس کی
خوبیوں پر بھی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔“ چوہدری جلال حتیٰ لچھے میں بولا

”کیا وہ ہمت کر بھی نہیں سکتا؟“ وکیل نے پوچھا

”اگر اس نے حوصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کا راستہ روکنا بہت ضروری ہوگا۔“ اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا

”کب راستہ روکیں گے آپ جب اس کے مہرے مضبوط ہو کر آپ کو فہد مات دینے کے لئے آپ کے سر پر آنکھیں گے؟“

وکیل نے کہا تو چوہدری کبیر تڑپ کر بولا

”ہا ہا، اجازت دیں ملک فہم کا ہی پتہ صاف کر دیتے ہیں سارے مہرے خود ہی پٹ جائیں گے۔“

”پتہ صاف کر دینا بہت آسان ہوتا ہے کچھ چوہدری جی۔ مگر پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ احساس ہوگا آپ کو۔ میں

کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دوں گا۔“ وکیل نے کہا تو چوہدری کبیر انتہائی خطرہ لہجے میں بولا

”تو پھر کیا کریں وکیل صاحب، اب ان کی منت تو کرنے سے رہے۔“

”یہ وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ کچھ لو کچھ دو کا اصول اپنا کر سیاست کریں۔ علاقے کے لوگوں کو اعتماد میں لیں۔ ان پر نودائیں کریں۔ ڈرانے دھمکانے کی بجائے ان کو یہ باور کرائیں کہ آپ ان کے ہمدرد ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کروادیں۔ اپنی سیاسی جماعت میں اثر و رسوخ بڑھائیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر چوہدری جلال کی طرف دیکھ کر بولا: ”آپ نے ساری زندگی سیاست کی ہے کیا آپ نہیں جانتے؟“

”میں تو جانتا ہوں وکیل صاحب، لیکن کبیر کو کون سمجھائے۔ یہ جو چند لوگ یہاں کھیل تماشے کر رہے ہیں ان کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ بس اصل جہ تک پہنچنا ہے۔ اس کی سمجھا آگئی تو یہ سب خود بخود ختم ہو جائے گا۔“ چوہدری جلال نے سمجھانے والے انداز میں کہا

”یہی بات اس وقت سمجھ آئے گی جب یہ سگے چوہدری سیاست سیکھیں گے، تو پتہ چلے گا۔“

وکیل نے سمجھ یا تو چوہدری جلال بولا

”وہ تو میں نے آپ سے کہا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ باقی میں سب دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے نشی کی طرف دیکھ کے پوچھا

”دیکھو کھانا لگ گیا ہے؟“

”جی لگ گیا ہے، آپ آئیں۔“

اس نے کہا تو ابھی اٹھ گئے تو نشی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے قحانے کے نمبر ڈائل کئے اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد

تھانیدار نے فون اٹھا لیا۔ اس نے نشی کو پہچانتے ہوئے پوچھا

”اوئے نشی جی کیا حال ہے تیرا؟ کیسے کیا فون؟“

”میں ٹھیک ہوں، سن، تیرے ذمے لگنا ہے۔“

”کام، کیسا کام؟“ اس نے پوچھا

”تو ہے کہ مذہبی آیا ہے اور نہ ڈیرے پر، اور نہ ہی تو فون پر ملتا ہے۔ لگتا ہے نئے اے ایس پی نے تمھ سے کوئی زیادہ ہی کام لینا

شروع کر دیا ہے۔“ نشی نے خطرہ لہجے میں کہا تو تھانیدار چڑتے ہوئے بولا

”اوئے کام کیا نشی، اس اے ایس پی نے تو پڑھنے پادیا ہے۔ یہ پہلا افسر ہے جس کی ابھی تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اور جس دن

اس کی مجھے سمجھا آگئی اس کی ساری افسری تمھارا کر رکھ دوں گا۔ خیر، تو کام بول۔“

”کام یہ ہے کہ وہ جو چھکا کا ہے نا، اسے کچھ دن اس طرح اندر رکھن ہے کہ وہ ہار نہ آ پائے۔ بس اتنا سا کام ہے، جو تو نے کرنا

ہے۔“ نشی نے بتایا

”کچھ دن، مطلب؟“ اس نے پوچھا

”ہاں، اگر بات نہیں مانتا تو پھر اسے لٹا بھیج دے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ منشی نے کہا

”اؤ بے دعا کیا ڈالتا ہے اس پر؟ دیکھ تجھے پتہ ہے نئے افسر کا، جو کام بھی ہوتا ہے وہ بھر پکا ہی ہوتا ہے۔“ تھانیدار نے اسے

سمجھاتے ہوئے کہا

”میں کون سا کھڑا ہوں کہ تو کچا کام کر۔ کام تو پکا ہی ہوتا چاہیے۔ وہ خود کو چشم دید گواہ بنائے پھر تاہے ناندیر کا۔“ منشی نے

اسے سمجھایا تو تھانیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

”اؤئے ایک تو یہ چشم دید گواہوں نے میری مت مار دی ہے۔ ویسے جو چہرہ کی کبیر کو بھی چاہیے کہ تھہ ہولار کھے وہ بھی نا۔“

”اور یہ وڈھے لوگ جانے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چھما کے پر جو مدعا ڈالتا ہے اور جیسے ڈالتا ہے وہ بتا دینا میں سارا بندوبست کر

دوں گا۔“ منشی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے بتا دوں گا۔ پر ہم جو چہرہ دیوں کی اتنی غلامی کر رہے ہیں اور اصرار جو دینا ہے وہ بھی ہم پلے ہی دیں۔“ تھانیدار نے کہا

”کتنا چاہئے ہوگا اس کام لے لیے؟“ منشی نے پوچھا

”کام دیکھ لو، رقم بھی خود ملے کرلو تم نے کون سا قیام دینی ہے۔“ تجھے پتہ تو گاڑی بنا بیٹروں کے نہیں چلتی۔“ اس نے واضح

انداز میں کہا تو منشی بولا

”تو مدعا ڈال، رقم تجھے پہنچ جائے گی۔“

”بس تو کوئی کام کا بندہ تلاش کر کے رکھ باقی فکر نہ کر۔“ تھانیدار نے بھی یقین دہانی کروادی تو منشی بولا

”بندے بڑے، اب میں فون رکھتا ہوں۔“

منشی نے رسیور کر پیل پر رکھ دیا۔

بشری بیگم افسردہ سی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ رانی آگئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر ہولے سے پوچھا

”بیگم صاحبہ، آپ تو بہت زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہیں۔“

”معاملہ میرے پتر کا ہے۔ کیا مجھے پریشان نہیں ہوتا چاہیے۔ یہ کوئی میرے بس کی بات ہے پتہ نہیں کیا ہوگا۔“ بشری بیگم نے

حسرت سے کہا تو رانی قالین پر صوفے کے ساتھ بیگم کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی

”بیگم صاحبہ! بھلا مجھے بتائیں۔ آپ اگر یونہی پریشان رہیں تو کیا یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ نہیں نا“

”تم کہتی تو ٹھیک ہو لیکن یہ میرا دل جو ہے نا، بہت ڈرد رہا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ بشری بیگم نے سوچتے ہوئے کہا تو رانی بولی

”آپ ماں بن کر سوچ رہی ہیں تا لیکن پریشانی سے کچھ نہیں ہوگا۔“

”تو پھر اور کیا کروں میں۔ اس صفیہ کو منانے کئی تھی لیکن اس نے تو کوئی اُمید بھی نہیں چھوڑی۔“ بشری بیگم نے حسرت سے کہا۔ اس دوران چوہدری کبیر نے کمرے میں آتے ہوئے اپنی ماں کی بات سن لی۔ تبھی اس نے وہ بے وفائی سے غصے میں کہا

”آپ نے وہاں جا کر اچھا نہیں ماں۔ نہیں جانا چاہئے تو وہاں۔“

”تم! میں تو اس کے پاس...“ بشری بیگم نے چونک کر کہا تو چوہدری کبیر عمارت سے بولا

”یہ ہماری شان اور مرتبے کے خلاف ہے کہ آپ اس کی کمین عورت کے دروازے پر چل کر گئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا پولیس پکڑ کر لے جاتی مجھے، سزا ہو جاتی۔ میں مر جاتا۔“

”اللہ نہ کرے پتر! یہ تو کیسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ برا ہو دشمنوں کا تمہارے سر پر تو میں نے ابھی سہرے دیکھنے ہیں۔“

بشری بیگم نے تیر لہجہ میں کہا

”ہاں۔ یہ بات کی ہے نا آپ نے کام کی، میں یہی بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا تو بشری بیگم نے چونک کر کہا

”یہی بات! کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔“

”آپ نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ میری پسند کون ہے؟“ چوہدری کبیر نے کہا

”ہاں پوچھا تھا کون ہے وہ بتاؤ مجھے، میں اسے ہی تمہاری دلہن بناؤں گی۔ بتا پتر؟“ بشری بیگم نے خوش ہو کر کہا تو چوہدری کبیر بولا

”تو سنو ماں، میری پسند، ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلسلی ہے، وہی میری دلہن بنے گی۔“

”یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو تم، سلسلی، وہ کیوں؟“ بشری بیگم نے شدید حیرت سے کہا تو چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے بولا

”اس کیوں کا جواب، میں اس وقت دوں گا، جب وہ میری دلہن بن گئی۔“

”بیٹا، کہاں وہ کہاں تم؟ یہ جوڑ بنتا ہی نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ ضد کر رہے ہو۔ ایسا مت سوچو، تمہارا معاملہ جلدی ختم ہو جائے گا تو ہم تمہیں بہت اونچے گھرانے سے دلہن لا کر دیں گے۔ پھر ایسا نہیں سوچنا۔“ وہ انکار کرتے ہوئے بولی

”ماں! میں نے کہہ دیا۔ اور بہت سوچ سمجھ کر یہ کہا ہے۔ وہ ہر حال میں میری دلہن بنے گی۔ اور بس۔“ چوہدری کبیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بشری بیگم حیرت زدہ ہی بیٹھی رہ گئی۔ رانی نے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر پلٹ گئی۔

رات کا دوسرا پہاڑ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چوہدری جلال حویلی کے دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا۔ بشری بیگم نے اسے یوں دیکھا تو دے قدموں سے اس کے پاس آئی تو چوہدری نے اس کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

”آپ نے سنا نہیں۔ رات اتنی گہری ہو گئی ہے۔“ بشری بیگم نے پوچھا تو چوہدری جلال اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا

”نیکم۔ ایہ جو تو نے کبیر کی ضد بارے مجھے بتایا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹر دین محمد کو ساری زندگی ہم نے دبا کر رکھا ہے اس کی بیٹی سسلی بارے کبیر کی خواہش۔۔۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟“

”میں نے اپنے طور پر معلوم کیا جو ہدیری صاحب۔ اپنا کبیر۔ اس سسلی کے لیے اپنے دل میں محبت پال چکا ہے۔ جس کا اظہار وہ کرتا رہا ہے۔ ہم ہی غافل رہے ہیں۔“

بشری نیکم نے اس پر واضح کر دیا تو چوہدری جلال نے چوتھے ہوئے کہا
 ”کیا مطلب۔! یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ فضول ضد ہے کبیر کی یہ۔ اسے یہیں ختم کرنا ہوگی یہ ضد۔ بتا دینا اسے میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں بھی نہیں چاہتی کہ کبیر ایسی خواہش کرے۔ لیکن اگر سختی سے روکیں گے تو ممکن ہے وہ ہماری بات نہ مانے اور۔۔۔“ بشری نیکم نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا

”کچھ بھی کر لے۔ ایسا ممکن نہیں ہوگا۔“ پھر ایک دم سے خاموش ہو کر لمحہ بھر کے لئے سوچا اور بولا، ”نیکم۔ اتم نے یہ معلوم نہیں کیا کہ اس لڑکی سسلی نے ہی کبیر پر ڈورے ڈالے ہوں؟“

”وہ کبیر سے نفرت کرتی ہے۔“ بشری نیکم نے ہولے سے کہا تو چوہدری جلال سمجھتے ہوئے بولا
 ”تو پھر وہ ایسا صرف اپنی ضد اور انا کے لیے کرنا چاہتا ہے۔ اسے سمجھ دو وہ ایسی فضولیات میں نہ پڑے۔ بلکہ اس جاگیر کو سنبھالنے کے لیے خود کو تیار کرے۔ اگر میں نہ رہا تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔“

”اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اسے آہستہ آہستہ مٹا لوں گی۔ اس کے ذہن سے سسلی نکال دوں گی۔ آپ اس کے لیے جلدی دہن دیکھ لیں۔ پھر وہ سب بھول جائے گا۔“ بشری نیکم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”ایسا ہی کرنا ہوگا۔ بس یہ تھیر والے من طے کی دھول کم ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کر دیتے ہیں۔“ چوہدری جلال نے حتیٰ انداز میں کہا تو بشری نیکم بولی

”یہی بہتر رہے گا۔ آپ آئیں۔ آرام کریں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“
 ”ہلو۔“

چوہدری جلال اٹھا گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔



صبح کی نماز کے بعد فہد اور سراج چہل قدمی کیا اور گھر کے صحن میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ باتیں کر رہے تھے کہ چھا کا آگیا، اس نے آہستہ سے سلام کیا اور کچن کی طرف جانے لگا۔ جیسی سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشگوار موڈ میں پوچھا

”اوتے چھا کے۔ ابڑا چپ چاپ ہے۔ خیر تو ہے لبتے نے تو نہیں مارا؟“

”کیا ہوا ہے تجھے، کیوں پریشان ہے؟“ فہد نے بھی اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا تو چھا کا بولا

”پریشانی تو ہے، چوہدری کاٹھی آیا تھا لبتے کے پاس۔۔۔ دھمکی لگائے۔“

”کہیں وہ بندہ بڑے والے کیس میں تو نہیں؟“ سراج نے حیرت سے پوچھا

”ہاں۔! کہہ رہا تھا کہ میں اپنا بیان واپس لے لوں۔“ چھا کے نے جواب دیا تو اس نے کہا

”ہوں، یار انہوں نے تو ایسا کرنا ہی ہے اب، الگ ہے چوہدری کا قانونی جنگ ہار کر بد معاشی پر اتر آئے ہیں۔“

”وہ پہلے کون سا قانونی جنگ لڑتے ہیں۔ غلّہ گردی ہی تو کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے خوف زدہ ہیں اور اس غلّہ گردی کے لیے انہوں نے بد معاشی پالے ہوئے ہیں۔ خیر چھا کے، وہ جو کچھ بھی کہیں ان کی چھوڑ انہوں نے تو کہنا ہی ہے یہ بتا، تو اور تیرا ابا کیا کہتے ہیں؟“ فہد نے پوچھا

”کچھ نہیں، لبتے نے تو صرف مجھے بتایا ہے اور کوئی بات نہیں کی اور میں میں تو وہی کہوں گا نا جو آپ لوگ کہیں گے۔“ چھا کے نے کہا تو فہد بولا

”کیوں، تم ہماری زبان کیوں بولو گے نہیں، چھا کے، ہم لوگوں کے کہنے پر نہ جا، اپنے اندر سچ بولنے کی ہمت پیدا کر۔ وہی سچ کہنے کا حوصلہ کر جو اصل حقیقت ہے۔ چوہدری زیادہ سے زیادہ جان سے مراد بے گاماس سے آگے وہ کیا کر سکتا ہے، یہ سوچ لے۔“ یہ کہہ کر فہد چھا کے کے دس پر ہاتھ رکھ کر بولا، ”یہ جو کہتا ہے وہ کر۔“

”نہیں فہد۔! میں نے فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ میں نے تو وہی کہنا ہے جو حقیقت ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔“ چھا کے صاف لہجے میں کہا تو سراج بولا

”تو پھر کیا غم ہے۔ یہ دونی صورت کو ختم کر۔“

”میں پریشان اس لیے نہیں ہوں کہ انہوں نے مجھے دھمکی دی یا وہ میرے کسی فیصلے پر اثر انداز ہوں گے۔ میں پریشان اس لیے ہوں کہ اگر میری وجہ سے مجھے چوہدری کو سزا ہوتی ہوئی نظر آئی تو وہ مجھے مارنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس طرح منفیہ کو انصاف تو نہیں مل سکے گا۔“ چھا کے نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو فہد نے ہنستے ہوئے کہا

”اب وہ وقت ختم ہو چکا ہے چھا کے۔ کبیر جس طرح پہلے اس علاقے میں بد معاشی کر رہا تھا، اب وہ یہاں نہیں کر سکے گا۔ اسے اب ہم سے چھپ کر ہی رہنا ہوگا۔“

”تو حوصلہ کر چما کے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا ہم نہیں ہیں۔ اور پھر تجھے کیا، تیری تو پورے علاقے میں دس بچھ ہو گئی ہے۔“ سراج نے خوشگوار انداز میں ہنستے ہوئے کہا تو وہ تینوں ہنس دئے۔ تبھی فہد نے کہا

”ہاں اب جلدی چائے ہی پلا دے۔ تیرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرے ہاتھ کی چائے کا تو چمکا ہی لگ گیا ہے۔“

”سیدھے ناشتہ ہی بنا میری جان، وہ تیرا شیخ آفتاب بھی تو آتا ہوگا۔“ سراج نے یاد دلایا تو فہد نے کہا

”اوہاں پارہ کچھ کھانے کو دے دے۔ اس کے ساتھ پتہ نہیں کتنا وقت لگتا ہے۔“

”ابھی لو۔“ چما کے نے کہا اور کچن میں گھس گیا۔

فہد، سراج اور شیخ آفتاب کھیتوں کے درمیان پھرتے ہوئے زمین دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ زمین کا سروے کر رہے ہوں۔ وہ چلتے ہوئے سڑک کنارے آگئے، جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے پاس شیخ آفتاب کا ڈرائیور اور کچن میں کھڑے تھے۔ شیخ آفتاب نے خوشگوار لہجہ میں کہا

”زمین تو میں نے دیکھ لی فہد صاحب۔ ایسے فیکٹریوں کے لیے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ میں ایسی ہی جگہ چاہتا تھا اور چوہدری جلال میری راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔“

”یہ چاہے عمر حیات کی زمین تھی جو میں نے خریدی ہے۔ چوہدری جلال میری بھی راہ میں آیا تھا۔ مگر اب نہیں، اب آپ یقین رکھیں۔ وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گا۔“

فہد نے اسے یقین دلایا تو شیخ آفتاب بولا

”فہد صاحب، ان سیاستدانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آپ نہیں جانتے، ہمارے ہاں سیاست کسے کہتے ہیں؟“

”جانتا ہوں شیخ صاحب، دھوکا دینا، جھوٹ بولنا اور دوسروں کو کھل کر اپنے مفادات حاصل کرنے ہی کو سیاست سمجھا جاتا ہے۔“ فہد

نے کہا

”ہمارا سیاسی کلچر ہی یہی بن چکا ہے کہ دولت لگاؤ اور دولت کو دھلاں حرام، قومی مفاد، اور عوام کی خدمت ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سیاست بھی ایک کاروبار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرمایہ لگا کر ایم پی اے، ایم این اے بن جاؤ، خوب کرپشن کرو، لوٹ مار کرو اور دولت بناؤ۔ غریب آدمی تو الیکشن کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔“ شیخ آفتاب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو فہد سکون سے بولا

”لیکن، بات تو ووٹ پر آخر ختم ہوتی ہے نا شیخ صاحب، غریب اگر اپنے جیسے کسی بندے کو ووٹ دے دیں تو وہ ایم این اے بن جائے گا۔“

”مگر غریب کو ووٹ کی طاقت کا شعور نہیں۔ وہ بے چارہ ان سیاست دانوں کی غلامی میں پھنسا ہوا ہے۔“ شیخ آفتاب نے

حقیقت بتائی تو فہد حوصلہ افزا لہجہ بولا

”اب غریب نکلے گا، کم از کم اس علاقے سے تو نکلے گا۔ خیر، ہم اپنی بات کریں۔“

”میرے پاس یہاں زمین نہیں تھی۔ ورنہ میں چوہدری کی پیدا کردہ رکاوٹیں ختم کر دیتا۔ خیر، اُسے چھوڑیں، آپ بتائیں یہ سارے معاملات طے کرنے کے لیے آپ کب آرہے ہیں ہمارے پاس؟“

شیخ آفتاب نے پوچھا تو فہد نے کہا

”آپ جب چاہیں۔ ویسے تو ملک نعیم صاحب نے آپ سے بات کر لی ہوگی۔“

فہد نے اپنا عندیہ دیا تو اس نے لمحہ بھر سوچا اور بولا

”میں تو کہتا ہوں آج ہی ملاقات ہو جائے، کچھ منظر کھرے تو باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

”چلیں آج ہی سہی، آپ ملک صاحب کے ہاں پہنچیں، میں بھی وہیں آ جا تا ہوں۔“

”میں دو گھنٹے بعد آپ کا وہیں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر شیخ آفتاب نے اپنا ہاتھ بڑھا یا تو دونوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور

گاڑی میں بیٹھا۔ وہ بھی، کن مین بھی اور ہاتھ ملاتے چلے گئے۔ فہد اور سراج نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ملک نعیم کے گھر میں فہد، شیخ آفتاب، ملک نعیم اور سراج بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ آفتاب کہہ رہا تھا ”یہ تو طے ہے ملک

صاحب کس علاقے میں ٹیکسٹریاں لگانی ہیں۔ چوہدری جلال نے ہمیشہ مخالفت کی ورنہ میں تو سرمایہ لگانے کو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔“

”شیخ آفتاب۔ ایہ ٹھیک ہے کہ آپ سرمایہ اپنے منافع کے لیے لگا رہے ہیں۔ لیکن یہ اس علاقے کے لیے ضروری بھی

ہے۔ کیونکہ یہاں غربت ہے، بے روزگاری ہے، ہسپتال نہیں، کوئی بڑا سکول نہیں۔ ٹیکسٹریاں لگانے کے ساتھ آپ کو یہ سہولیات دینا ہوں

گی۔“ فہد نے کہا تو ملک نعیم بولا

”بے شک۔ ایسی تو پہلی ترجیح ہے۔ سرمایہ دار کا منافع عوام میں سے ہو کر آتا ہے۔“

”میں نے سوچا ہے کہ میں نے وہاں سے کئی برس تک منافع نہیں کمانا، سیدھی بات ہے میں نے اپنی ضد پوری کرنی ہے۔ میری

زندگی میں صرف چوہدری جلال ہی ایسا شخص آیا ہے جس نے میری راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ خیر۔ آپ جو بھی اور جیسی بھی شرائط

رکھیں جو طے کرنا چاہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ شیخ آفتاب نے واضحانہ انداز میں کہہ دیا تو فہد بولا

”میری صرف ایک شرط ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی خوشحالی، اور بس۔“

”ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں۔ آپ نے سکول کھول کر علاقے پر بہت احسان کیا ہے۔ اب یہ بند نہیں ہونے دیں گے۔ میں نے

خود مجھے والوں سے بات کی ہے۔“ ملک نعیم نے کہا

”تو پھر طے ہو گیا آپ جیسے چاہیں بچہ بنوالیں۔ مجھے منظور ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے شیخ آفتاب نے فہد کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

فہد نے ہاتھ ملایا تو ملک نعیم اور سراج کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔



صفیہ اپنے گھر میں چار پائی پر بیٹھی واں پنجن رقص تھی کہ نعمت علی گھر میں آ گیا۔ وہ اسے گھر میں دیکھ کر مسکرایا۔ صفیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ قریب پڑی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا

”مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ تیرا ہارے سوا ہے کون۔ اچھا کیا تو نے میری بات مان لی۔ اب تو چاہئے تو یہ گھر اپنے نام لکھوا لیا۔ چوہدری ہمیں یہ گھر دے دیں گے۔“

”بابا۔ ایہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے سوا ہمارا ہے کون مگر میں یہاں اس لیے نہیں ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے۔“

صفیہ نے واضح کاف انداز میں کہا تو بابا نعمت علی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ غصے میں بولا

”تو پھر تو یہاں کیوں ہے۔ میں نے تمہیں یہاں سے چمے جانے کو کہا تھا۔“

”چلی جاؤں گی اور اگر چلی گئی تو پلٹ کر بھی واپس نہیں آؤں گی۔“ صفیہ نے کہا

”دیکھو صفیہ۔ اتنا ہارے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو چوہدریوں کی بات مان لے اور یہاں پر سکون زندگی گزار یا پھر درہدری ٹھوکریں کھانے کے لیے چلی جا۔ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ میں چوہدریوں کے سامنے بہانے بنا کر تھک چکا ہوں۔“ بابا نعمت علی نے ہار مانتے ہوئے کہا تو صفیہ بولی

”تو مجبور نہ ہو بابا۔ میں چلی جاتی ہوں۔“

”تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی ہو۔ یہاں بیٹھی کیہ کر رہی ہو۔ تم اب میری ذمے داری نہیں ہو۔ بابا نعمت علی نے چیخ کر کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے بابا کا گلہ رندہ گیا۔ صفیہ نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ صفیہ نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا پھر دکھا اور حسرت سے بولی

”چلو بیٹا۔ اب ہم یہاں سے چلیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“

اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سیدھی سسلی کے گھر پہنچی۔ اس وقت ماسٹر دین محمد محسن میں بیٹھا ہوا تھا جب دروازے میں صفیہ آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ بچے تھے۔ ماسٹر دین محمد کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تو بولا

”آ جاؤ بیٹی، آؤ۔ آ جاؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ یہ کہہ پھر سسلی کو آواز دی، ”سسلی آؤ چہر سسلی۔“

دروازے کی طرف سے صفیہ آگئی تو اندر کی جانب سے سسلی وہاں آگئی۔

”میں آگئی ہوں سسلی۔ ہمیشہ کے لیے وہ گھر چھوڑ کر آگئی ہوں۔“ صفیہ نے کہا

”میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم نے اچھا کیا یا برا لیکن یہاں جہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آؤ بیٹھو۔“ سسلی نے کہا

”میں محنت مزدوری کروں گی۔ اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں میں کوشش کروں گی کہ جلدی۔۔۔“ اس نے کہا چاہا تو ماسٹر دین محمد نے جھل سے کہا

”اوجھنی۔ تو بیٹھ۔! کچھ کھانی لے، پھر یہ باتیں سوچتی رہنا اللہ نے تیرے لیے رحمت کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ وہ رزق دینے والا ہے۔ وہی دے گا۔ تو بیٹھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میرے لیے رحمت کا بندوبست؟“ صفیہ نے حیرت سے پوچھا تو سہلی نے بتایا
 ”ہاں۔ وہ چاچے عمر حیات والا گھر خالی ہے، تاہنا سامان ادھر ہی رکھ لینا۔ ادھر رہنا چاہو تو بھی ہمیں پریشانی نہیں۔ بس اب تم نے ان باتوں کو نہیں سوچنا۔ تو بیٹھ میں ان بچوں کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“

صفیہ نے تھک کر بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا اور وہیں ایک چار پائی پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔
 صفیہ نے جہاں چاچے عمر حیات والے گھر میں ڈیرہ ڈال لیا، وہیں سہلی نے اسی گھر کو اپنا آفس بنالیا۔ لیکن یہ ابھی باقاعدہ نہیں ہوا تھا۔ سہلی ابھی اپنے گھر ہی کام کرتی تھی۔ اس وقت سہلی والے ان میں مہر پر کافی سارے کاغذ پھیلائے بیٹھی تھی۔ صفیہ اس کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب فہد گھر میں آیا۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور خوشگوار موڈ میں پوچھا
 ”کیا ہو رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا دفتر کیوں لگایا ہوا ہے۔“

”آپ بیٹھیں تو میں آپ کو بتاؤں۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ فہد قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کے بولا
 ”بیٹھ گیا اب بولو۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ صفیہ اپنا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس آ گئی ہے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا۔ جدھر چاہے رہے۔“
 ”ٹھیک ہے اور دوسری بات؟“ فہد نے پوچھا۔

”میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ پہلے میں گاؤں کے ان غریب لوگوں کی لسٹ بنا رہی ہوں جو کسی نہ کسی حوالے سے مدد کے مستحق ہیں۔ بعد میں یہ فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے پاؤں پر کیسے کھڑا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اپنی کمائیں اور خود کھائیں۔“ سہلی نے بتایا
 تو فہد بولا

”یہ تو بہت اچھا ہے، جب تک ہم خود انھیں نہیں ہوں گے۔ ان جاگیرداروں کے چنگل سے تو نہیں نکل سکتے۔“
 ”مسئلہ بھی تو یہی ہے نا۔ ان کے چنگل سے نکل کر خود انھیں ہمارے درمیان سہارے کی ضرورت ہے، اس پر ہمیں سوچنا ہے۔ اور ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔“ سہلی نے گہری سنجیدگی سے کہا تو صفیہ نے پوچھا
 ”میں جائے گاؤں آپ کے لیے؟“

”ہاں۔! بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ میں نے ابھی نور پور کے لیے نکلنا ہے۔ یہ استاذی کدھر ہیں؟“
 ”ساتھ والے گاؤں، اپنے کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے۔“ سہلی نے پوچھا تو صفیہ ان کے پاس سے اٹھ کر کنج کی طرف چلی گئی۔

”جیسا کام کر رہی ہو، ویسا ہی میں کر رہا ہوں۔ دیکھو میں نے چارے عمر حیات کی زمین اس لیے خریدی ہے کہ اس پر فیکٹری لگاؤں۔ تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور وہ خود انحصار ہو کر چودہریوں کے چنگل سے نکل آئیں۔“ فہد نے کہا تو سلسلی بولی

”فیکٹری لگانا کوئی معمولی بات ہے، اس کے لیے بڑا سرمایہ چاہئے؟“

”میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک کی بجائے دس فیکٹریاں یہاں لگا لوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے لوگ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔“ فہد نے جواب دیا تو سلسلی نے جلدی سے پوچھا

”وہ کیوں؟“

”شیخ آفتاب نے بہت کوشش کی فیکٹری لگانے کی مگر چودہری نے اس کی چٹنے نہیں دی۔ وہ سرمایہ اٹھا کر پھر تار ہا لیکن کسی نے زمین نہ دی۔ اب میں نے زمین خریدی ہے تو میرے ساتھ پارٹنر بننا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ مقامی لوگ ہوں گے تو میری ہی قوت میں اضافہ ہو گا۔ صبح سے اسی کے ساتھ تھا۔ اب بات آئی سمجھ میں۔“

”جی سمجھ گئی۔“ سلسلی نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہد لست اٹھا کر پڑھنے لگا۔



حویلی کے ڈرائیونگ روم میں بشری بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ رانی اس کے لیے چائے کھلک لائی تو رانی نے دھک اسے جھٹاتے ہوئے کہا

”یہ لیں بیگم صاحبہ۔“

”کبیر کہاں ہے؟ ابھی تیار نہیں ہوا؟“ بشری بیگم لگ بھڑکتے ہوئے پوچھا تو رانی بولی

”دھجی، تیار ہو کر ادھر ہی آرہے ہیں۔“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ چودہری کبیر اندر سے دوڑیں آگیا۔ بشری بیگم نے چائے کا سپ لے لگ رکھ دیا اور کبیر کی طرف دیکھ کر بولی، ”کدھر جا رہے ہو؟“

”ڈیمے پر۔“ اس نے کہا اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولا، ”کیوں خیر ہے ماں، جو آپ ایسے پوچھ رہی ہیں آج؟“

”میں نے تم سے بات کرتی ہے۔ بیٹھو۔“

”کہیں۔!“ یہ کہہ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تو بشری بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”تیرے باپ سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری اس سسلی کا نام بھی نہیں سنتا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم صرف خمد میں آ کر اسے اپنی دلہن مانتا چلتے ہو۔ اس لیے۔۔۔“

بشری بیگم نے کہنا چاہا تو چودہری کبیر مسکراتے ہوئے بولا

”ماں، میں نے خمد کی ہے یا خواہش، میری دلہن سسلی ہی بنے گی، کوئی دوسری نہیں۔“

”تم کون ہوتے ہو اکیلے فیصلہ کرنے والے جو فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے وہی ہوگا۔“ بشری بیگم نے غصے میں پوچھا تو چوہدری کبیر سکون سے بولا

”ماں تو بہت بھولی ہے، شادی اس سے میں نے کرنی ہے فیصلہ بھی میرا ہی ہوگا۔“

”تو پاگل ہو گیا ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں۔ تم اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ کیوں فضول بحث کرتے ہو۔“ وہ اکتاتے ہوئے یونی تو چوہدری کبیر نے جذباتی اعزاز میں کہا

”ماں آپ نہیں جانتی ہو۔ وہ میرے لیے کیا ہے۔“

”کیا ہے وہ تمہارے لیے، ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو میں اس۔۔۔۔۔“ بشری بیگم نے حیرت سے پوچھا تو وہ مزید کہنا چاہتی تھی تو اس نے انگلی کھڑی کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ حیرت اور غصے میں اسے دیکھتی رہی۔ چوہدری کبیر مسکراتا ہوا اٹھ کر بیرونی دروازہ عبور کر گیا۔ رانی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

دو پہرے سے ذرا پیچھے چوہدری جلال صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ چند لمحے بعد مٹھی فضل دین وہاں آ گیا۔ وہ چوہدری کی جانب متوجہ ہو کر بولا

”چوہدری صاحب! آپ تک جو خبر پہنچی ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ سیٹھ آفتاب نے وہ جگہ اپنی فیکٹریوں کے لیے پسند کر لی ہے۔ جو فہد نے عمر حیات سے خریدی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے سیٹھ آفتاب اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے۔ وہ یہاں فیکٹریاں لگا نا اب تک نہیں بھولا۔“ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا تو فٹی بولا

”گلتا تو یہی ہے۔ کیونکہ اس نے زمین پسند کر کے فہد سے بات کر لی ہے۔“

”فٹی! جب تک یہ فہد یہاں نہیں آیا ان لوگوں کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ میری مرضی کے بغیر یہاں فیکٹریاں لگانے کا سوچ سکیں۔ اس فہد نے انھیں رستہ دے دیا ہے۔ یہ ہمارے لیے اچھا نہیں ہے۔“ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”گئی بات تو یہ ہے چوہدری صاحب! آپ نے شروع ہی سے فہد کے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ لگا چوہدری ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہاں پھر جانے ہی دینا چاہیں تھے۔ وہ کھلے عام لوگوں کو آپ کے بارے میں بھڑکا رہا ہے۔ اس کا وجود ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے چوہدری صاحب۔“ فٹی نے اسے یاد دہرایا

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہمیں ہر طرح سے رنج کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ وہ ہم سے کس طرح انتقام لینا چاہتا ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔“ چوہدری جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”تو پھر جتنی جلدی ہو سکے، اس کا کام ہو جانا چاہئے، ورنہ مشکل پیدا کرتا چلا جائے گا وہ ہمارے لئے۔“ فٹی نے بڑی خطرناک

صلاح دی تو چوہدری جلال اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا بولا

”ہاں۔ اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا اس پر ایسے ہاتھ ڈالنا ہے کہ وہ پھڑک نہ سکے۔“
”لیکن آپ پہلے کئے چوہدری والا معاملہ دیکھ لیں۔“ فشی نے دودلا یا تو چوہدری جلال کو یاد آگیا
”وہ نعمت علی سے پوچھو، اگر اس کی بھینچیں مانتی تو۔۔۔“

”میں سمجھ گیا، ان کا بھی حل ہے لیکن اگر میں کہوں کہ فہدی جواس مسئلے کا جز ہے تو۔۔۔“ فشی نے سوالیہ نشان چھوڑ دیا تو چوہدری
جلال لمحہ بھر توقف کے بعد بولا ”اس کے بارے میں نے سوچ لیا ہے۔ بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ نور پور
پر جانا ہے۔“

فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر کی جانب چلا گیا۔

سہ پہر کے وقت چوہدری جلال اور بشری بیگم دونوں لان میں تھے۔ چوہدری کبیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے پاس آکر
بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے چہرے پر تاثر یہی تھا کہ وہ اس سے کوئی اہم ترین بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لئے چوہدری کبیر نے پوچھا
”جی بابا۔ آپ نے مجھے بلایا۔ خیریت تو ہے نا۔“

”ہاں۔ ا خیریت ہے اگر تم چاہو تو ورنہ شاید نہ ہو سکے۔“ چوہدری جلال نے کسی تاثر کے بغیر کہا

”کیا مطلب۔ ایسی کیا بات ہوگئی ہے۔“ چوہدری کبیر سکون سے بول تو بشری بیگم نے کہا

”بات یہ کبیر۔ وقت ایسا آگیا ہے، جب ہمیں کچھ فیصلے کر لینے چاہیں۔ ورنہ حالات ہمارے ہاتھ سے ریت کی طرح نکل
جاتے گئے۔“

”ایسا کیا ہو گیا ہے بابا، آپ لوگ کیوں اتنے پریشان ہیں۔“ چوہدری کبیر نے حیرت سے پوچھا ”کیسی بات کرنے

تھیں بلایا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابھی نذر کا معاملہ ختم نہیں ہوا اور تم نے ایک نئی ضد شروع کر دی ہے، اور ایسی
ضد جسے نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہماری خاندانی روایات۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”تو میں کون سا اس ماسٹر کی بیٹی کو اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔ جس سے ہماری خاندانی روایت ٹوٹ جائے گی۔“

اس نے کہا تو دونوں میاں بیوی چونک گئے۔ تبھی چوہدری جلال نے اٹھتے ہوئے پوچھا

”کیا مطلب۔ ا تم کہا کیا چاہتے ہو؟“

”میں تو فہد کو ذاتی اذیت چاہتا ہوں میں سسٹی کو اس حویلی میں نہیں لائوں گا بلکہ نوکرانی بنا کر نوپور میں رکھوں گا۔ اس کی جرات

کیسے ہوئی کہ میرے خلاف نذر کی بیوی کو پھڑکانے کی۔“ چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا

”ہوں۔ اتویہ سوچ رہے ہو تمہاری؟“

”کیونکہ آپ فہد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف فہد کی وجہ سے اتنا حوصلہ ملا ہے کہ وہ ہمارے خلاف سر اٹھا سکیں۔ اور یہ جو حالات ہمارے خلاف ہو رہے ہیں۔ صرف اور صرف اسی وجہ سے ہیں۔“ چوہدری کبیر نے اپنے باپ کو دلیل دی

”کبیر۔! تم نہیں سمجھتے ہو۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اسے راستے سے ہٹاتے ہیں تو پھر ہمارے پاس حالات سدھارنے کا بھی موقعہ نہیں رہ جاتا۔ شاید تم نہیں جانتے اس نے بھین سے لیکر اب تک ہمارے خلاف ہی قوت جمع کی ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا

”تو پھر فیصلہ کر لیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یوں حالات کے ہاتھ سے نکلنے دیکھتے رہیں یا پھر ان حالات پر قابو پا لیں۔“ چوہدری کبیر نے پوچھا چوہدری جلال دھیمے سے لہجے میں بولا

”ان حالات پر قابو پانا ہی ہوگا کبیر“

”تو بس پھر، میں جو کرتا ہوں، مجھے کرنے دیں۔“ چوہدری کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشری تنگ تنگ سے خوف زدہ لہجے میں بولی

”خدا را کچھ ایسا نہ کرنا جو ہمارے لیے نئی مصیبت بن جائے میرے بیٹے، پہلے ہی ہم بہت اذیت سے گزر رہے ہیں بہت ہو چکا یہ خون خرابہ۔“

”ماں۔! فیصلہ ہو چکا ہے۔“ چوہدری کبیر نے قسمی لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشری تنگ تنگ سے پراذیت بھرے جذبات ابھرائے تھے، اسے یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔

اسی شام وکیل جمیل اختر حویلی کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ چوہدری جلال نے اسے بلوایا تھا کہ یہ اچانک ملک فہیم کیسے سراٹھانے لگا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ فہد اور شیخ آفتاب جیسے لوگ بھی آں مئے تھے۔ وہ اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ آیا آخر کیا ہو گیا ہے کہ وہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ وہ قدرے غصے میں بات کر رہا تھا

”یہ سب کیا ہو رہا ہے وکیل صاحب۔! ہم پر کھوں سے یہاں پر سیاست کر رہے ہیں۔ آج تک علاقے میں ہماری اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی اب ہو رہی ہے۔ لوگ جگہ جگہ بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف باتیں کر رہے ہیں۔“

”چوہدری صاحب۔! ایسا تمہی ہوتا ہے جب کسی بھی سیاست دان کی اپنے حلقے میں سیاسی گرفت کمزور ہو جائے، مفاد پرست تو کبھی بھی نہ ہونے سے بہت کچھ بنا لیتے ہیں۔ دیکھنا بھی ہوگا کہ سیاسی گرفت کمزور کیوں ہو گئی؟“ وکیل نے بڑے قہر سے کہا

”کیوں ہو گئی آپ سب کا خیال کیا؟“ اس نے بھی کافی حد تک قہر سے پوچھا

”یہ لوگ آپ کو کیا بتائیں، انہوں نے تو وہی کیا ہے جو آپ نے کہا۔ ان کے پاس ووٹ تو ہیں۔ لیکن وہ صلاحیت نہیں جس سے بدلے ہوئے حالات کا رخ دیکھ سکیں۔ کیا آپ نے علاقے کے ان بااثر لوگوں سے رابطہ رکھا۔ جو اپنے طور پر چھوٹی چھوٹی قومیں ہیں۔“

وکیل نے پوچھا

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب۔ نور پور کے چھوٹے موٹے کاموں سے لیکر سبلی تک چھوٹے بڑے اداروں میں ان کے کام نکلوائے ہیں۔ سفارشیں کی ہیں۔ نوکریاں دلوائیں ہیں جائز اور ناجائز سارے کام ہوتے ہیں۔ اور رابطہ کیسے ہوتا ہے۔“

چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے کہا تو وکیل بولا

”چوہدری صاحب۔! میں بار بار عرض کرتا رہا ہوں کہ اب سیاست اور حالات کا رخ بدل گیا ہے۔ اب عوام کو شعور ہے۔ کامیاب وہی ہوگا جو عوامی خدمت کرے گا، اسی کے ہاتھ میں سیاسی گرفت ہوگی۔“

”وکیل صاحب میں آپ کی اسی بات سے اختلاف کرتا آیا ہوں۔ میں چاہوں تو ایک ہی دن میں پانسہ پلٹ کر رکھ دوں میں چند بندوں کو قابو کرنے کی بات ہے یہ نہ عوامی شعور سے ہوگا اور نہ عوامی خدمت سے۔ میرے خیال میں اصل معاملہ یہ ہے کہ مفاد پرست لوگ سیاسی بلیک میلنگ پر اترا آئے ہیں۔ کیا خیال ہے۔“

یہ سن کر وکیل کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے قہقہے سے کہا

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن غلط میں بھی نہیں کہہ رہا۔ علاقے کی چھوٹی چھوٹی قوتوں کو ساتھ لے کر ہی چلنا ہوگا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔ ملک خیم یہ جو اپنے ہونے کا نام ثبوت دے رہا ہے۔ میں اس سے گھبرا جاؤں۔ آپ اپنا گروپ مضبوط کریں۔ میں علاقے کی سیاست کو خود دیکھتا ہوں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو وکیل بولا

”جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو نور پور کی صورت حال بارے بتا دیتا ہوں، پھر جیسا آپ کہیں، ویسا ہی ہوگا۔“

وہ دونوں باتیں کر کے لگے۔

وکیل چلا گیا تو چوہدری جلال نے بہت دیر تک سوچنا رہا۔ اسے اپنی تمام تر مشکلات کی وجہ صرف اور صرف فہدی لگا۔ اس کے یہاں آنے ہی سے حالات اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جائے، اس نے فہدی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی رات چوہدری جلال اپنے ڈیرے پر جا پہنچا۔ جیسے ہی اس کی گاڑی رکی اس کے پیچھے ہی ایک اور کار آن رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا، جس نے جین اور لیڈر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف غیر جذباتی انداز میں دیکھا تو کاشی نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ چوہدری جلال نے غیر جذباتی انداز میں کہا

”بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے کاشی۔“

”آپ نے بادی اتنے عرصے بعد کیا ہے۔ اس دوران آپ کو کام نہیں پڑا، آج کام پڑا تو آپ نے بلوایا۔“ کاشی نے اس کی طرف بہت سنجیدگی سے جواب دیا

”ہاں تمہاری یاد، غیر معاملہ ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے، میں تو سیدھے سیدھے اس کا حل کر لیتا لیکن یہ سیاست درمیان میں آگئی۔“

دونوں کی فکر میں معاملہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“

چوہدری جلال نے اپنی الجھن بتائی تو کاشی سکون سے بولا

”ہم کس لئے ہیں چوہدری صاحب، ہم حاضر ہیں۔ پولیس، آپ کے مقابلے میں کوئی اور سیاست دان آگیا ہے کیا؟“

”ایک چھوٹا سا سیاست دان تو پہلے ہی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک فیراہم سا بندہ ہے جسے شروع میں نے اہمیت ہی نہیں دی تھی

۔ اب وہ دوسرا بن گیا ہے۔“ چوہدری نے کہا تو کاشی لا پرواہی سے بولا

”اب میں آگیا ہوں نا، سکون ہو جائے گا۔ کہیں تو آج رات ہی اس کا کام کر دیتا ہوں۔“

”نہیں۔ اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ تم آؤ نا، سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ معاملہ یہاں کاشی نہیں نور پور کا بھی ہے۔ میں

تجربہ سے سبھاؤ دیتا ہوں۔ آؤ۔“ چوہدری جلال نے کہا اور کاشی کو لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا



جعفر اپنے آفس میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب سے مائرہ یہاں سے ہو کر گئی ہے، اس کی اپنی ذات میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اسے

یہ تو کفرم ہو گیا تھا کہ مائرہ اس کے بلاوے سے زیادہ فہد کی کشش میں وہاں تک کھینچی چلی آئی ہے۔ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی مایوس

نہیں تھا، اسے ہلکا سا دکھ ہو رہا تھا کہ جا کر اس نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ تب اس نے سوچا اگر اس نے فون نہیں کیا تو وہ خود کر لے۔ یہ سوچ کر

وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور مائرہ کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے پوچھا

”کیسا لگتے ہیں فہد کا گاؤں؟“ ناچا سچے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکل گیا تو مائرہ نے کچھ بھی محسوس نہ کرتے ہوئے پر جوش

انداز میں کہا

”میں سوچ رہی ہوں جعفر کہ وہاں کچھ دن وہ کرزیر دست سی رپورٹ بناؤں۔ ہم ترقی کی بات کرتے ہیں، لیکن کہاں ہے ترقی؟

میں اس علاقے کو مثال کے طور پر پیش کروں گی۔ وہاں انسان بیٹھے ہیں، کیا جدید دنیا کی سہولتوں پر ان کا کوئی حق نہیں اب دیکھو پیسے کے

زور پر وہ ایم این اے نے اپنا ہاں تو فون ناؤر لگو الیا اور دوسرے عوام اس سہولت سے محروم ہیں۔ اسی طرح باقی معاملات میں ہے۔“

”تجربہ یاد ہے مائرہ۔ مجھے تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی لیکن اس وقت تمہارے لہجے میں یہ شدت نہیں تھی۔ ہمارا میڈیا بھی

ابھی تک عوام کے ان مسائل تک نہیں پہنچ سکا جس پر شعور دینا چاہئے؟ خیر تم نے تبہ نہیں کیا؟“ جعفر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا

تو مائرہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا

”جعفر، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ انسان سامنے بڑی ہوئی شے کو نہیں سمجھ پاتا۔ یونہی خواہ مخواہ الجھن کا شکار رہتا ہے۔ اس کے

بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔ کیا الجھن ہے۔ کے سمجھ نہیں پاتی ہو؟“ جعفر نے پوچھا

”بعض اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے اپنے ہی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ۔ ہمیں انہوں کی بد

مگنی دور کر دینی چاہیے نا؟“ جواب دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا۔ جس پر جعفر بولا

”بالکل۔! کیوں نہیں اپنوں کے درمیان الجھن نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہئے۔ اسے

صاف ہونا چاہئے۔“

”میرا اور تمہارا تعلق کیا ہے۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں اور.....“ مائرہ نے

کہنا چاہا تو جعفر تیزی سے بات کاٹ کر شکوہ بھرے لہجے میں بولا

”نہیں، مائرہ ہم فقط دوست ہی نہیں کچھ اور بھی ہیں۔ یہ بات تمہیں اب تک سمجھ آ جاتی چاہئے تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ اظہار

ہی کیا جائے۔“

”کیوں۔! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان کچھ اور تعلق اظہار مطلب؟“ مائرہ نے حیرت سے پوچھا

”ہاں مائرہ۔! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ جعفر نے

ہمت کر کے اظہار کر دیا تو مائرہ نے چونک کر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا

”تم جعفر یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں۔“

”مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنالی

ہے۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔“ جعفر نے اسے بتایا تو وہ غصے میں بولی

”نہیں جعفر، تم فہد کی بات نہیں اپنی بات کہو، میں تو تمہیں ایک دوست سمجھتی تھی اور تم کیا سوچتے رہے، تم نے میرے اعتماد کو دھوکا

دیا۔ تم وہ جعفر نہیں ہو، اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرتا۔ میں نہیں چاہتی کہ میں “

وہ کہہ نہیں پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جعفر بے بسی سے اس کی طرف سے رونے کی آواز سنتا رہا۔ اچانک فون بند ہو گیا

۔ اس نے فون کو بے بسی سے دیکھا پھر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا تھا۔

رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دھیمی روشنی میں، مائرہ اپنے بیڈروم سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اسے جعفر کا جذباتی پن یاد آ رہا تھا۔

”ہاں مائرہ۔! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔... مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں

اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنالی ہے۔... میں جھوٹ نہیں بولتا اور پھر تم سے تو غلط بیانی

کر ہی نہیں سکتا یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔“

مائرہ نے اذیت سے اپنے بالوں میں انگلیاں بھیریں اور بڑبڑاتے ہوئے بولی

”یہ تم کیا سوچ رہے ہو جعفر۔! مجھے تو فہد کا انتظار کرنا ہے۔ اور تم مجھے یقین ہے۔ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا اور اگر نہ آیا تو؟ جعفر کی

بات ٹھیک ہوئی تو کیا میں جعفر حبیب دوست بھی گنواؤں گی۔ یا خدایا! میں کس دور رہے پر آن کھڑی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا مجھے

اپنا آپ حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہئے۔ مجھے کوئی نہ کوئی توفیق ملے گا، میں فہم کو میں چاہتی ہوں اور جعفر مجھے، میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟“

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کتھنیوں کو دبایا اور پھر بے بسی ہو کر اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

جعفر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اپنے بیڈ پر پڑا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ ماہرہ ناراض ہو گئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا اب رد عمل کیا ہوگا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کرب سے گذر رہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس نے کئی بار نمبر بھی ملائے لیکن ہر بار رک گیا۔ جیسی اسے کچھ نہ سمجھا تو اس نے ملک فہیم کے نمبر ملائے۔ رابطہ ہو جانے پر جعفر نے پوچھا ”سنائیے کیا حال ہے؟ کیسے بل رہی ہے آپ کی سیاست اور کیا کہتا ہے آپ کا علاقہ؟“

”سب ٹھیک ہے اور بہت اچھا ہے۔ چوہدری کے خلاف جو نفرت ہے۔ لوگ اسی وجہ سے میرے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور میں انہیں اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

ملک فہیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو جعفر بولا

”ہاں یہ جو جاگیر داری سسٹم میں لوگ ہیں، یہ نقطہ چند لوگوں کو نواز کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ دراصل وہ حاکمیت چاہتے ہیں۔ ایسی حاکمیت جس میں کم از کم عوام کی بھلائی نہیں ہوتی۔ آپ کا علاقہ تو زیادہ ترقی پاتی ہے۔“

”ہاں۔ از یادہ دیہاتی ہے، میں کام کر رہا ہوں وہاں پر، فہم کی وجہ سے میں جلدی کامیابی حاصل کر لوں گا۔“

ملک فہیم نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو جعفر بولا

”اس کی وجہ سے کیسے، وہ کیسے؟“

”اس نے بڑی تیزی سے اپنے گاؤں قسمت پور اور پھر ارد گرد کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بنایا ہے۔ گوچوہدری نے جو اپنا خوف برسوں سے لوگوں پر مسلط کیا ہے۔ اسے ختم کرنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔ وہ جو یہاں میرے حامی اور سپورٹر تھے۔ اس کے لیے بھی وہ بہت اہم ثابت ہو رہا ہے۔“ ملک فہیم نے بتایا

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میں نے کہا تھا نا کہ وہ آپ کے لیے بہت اہم ہوگا۔“ جعفر نے کہا تو ملک فہیم بولا ”اصل میں یہ ایک نئی لہر کی وجہ سے بھی ہے لوگ سابقہ چوروں کو ان کے کاموں کو دیکھ کر اکتا چکے ہیں، وہ نئی سوچ چاہتے ہیں، نئی قیادت چاہتے ہیں۔“

”وہ اس لئے ملک صاحب کہ نسل نئی آگئی ہے، انہیں وقت کی تہذیبی کا شعور ہے، وہ اپنے ارد گرد بھی تہذیبی چاہتے ہیں۔“ جعفر نے تبصرہ کیا تو ملک فہیم بولا

”اصل میں یہ وقت ہی تو ہے جو سب کچھ بدل دیتا ہے لوگ کب تک ان کرپٹ سیاست دانوں کو مقدس گائے بنا کر رکھیں جب وہ عوام کے لیے کچھ نہیں کریں گے تو عوام بھی انہیں روٹ نہیں دیں گی۔“

”یہ جہدِ ملی تو ایک فطری عمل ہے۔“ وہ بولا

”بس اب تو انکیشن کا انتظار ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے سب ٹھیک کر لوں گا۔“ ملک فہم نے کہا

”میرے لائق جو بھی ہو۔ تو مجھے بتائیے گا۔ اچھا اب اجازت۔ اللہ حافظ۔“ جعفر نے اچانک کہا

”ضرور بتاؤ گا۔ اللہ حافظ“ ملک نے کہا تو جعفر نے فون بند کر دیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ کچھ دل بہل جائے گا مگر وہاں باتیں ہی

دوسری شروع ہو گئیں تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اسے بہت سارے خیال آ رہے تھے۔ اسے فہد کی بات یاد آ رہی تھی کہ مائرہ کا بہت خیال رکھنا، میرے جانے کے بعد سب کچھ اطمینان سے بتا دینا کہ میرا گاؤں جانا کتنا ضروری ہے۔ بس وعدہ کرو، جو تمہیں کہا ہے وہی کرو گے۔ پھر اسے مائرہ کی بات یاد آئی جو اسے بہت دکھ دے ہی تھی کہ تم جعفر یہ سوچ بھی کیسے کہتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا ”مائرہ سے اپنے من کی بات کہہ کر، اپنے جذبات کا اظہار کر کے، میں نے کہیں غلطی تو نہیں کی؟ وہ کیا سوچے گی۔ یہی کہ میں نے اس کی دوستی کا غلط مطلب لیا۔ میں جو اس کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی چاہت کو اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں، کیا میں غلط ہوں یا فہد کی چاہت میں بیگنی مائرہ کا انتظار کرتے ہوئے وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے کوئی فیصلہ کر لیتا چاہئے یا پھر۔ خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔“

اس نے تجنی سے آنکھیں موند کر صوفے سے ٹپک لگالی۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا۔

جعفر صوفے پر غم راز نہ جانے کب سو گیا تھا۔ اس کے منہ پر کتاب تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے بے زاری سے فون اٹھا کر اسکرین دیکھا تو یوں چونکا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کال رسیو کر کے جلدی سے بولا

”ہیں مائرہ، تم، اس وقت؟“

”ہاں۔ میں اور کیا اس وقت میں تمہیں فون نہیں کر سکتی۔“ مائرہ نے عام سے لہجے میں کہا

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس وہ تم بھی جانتی ہو۔“ اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا تو وہ سنجیدگی سے بولی

”دیکھو۔ اہم بہت اچھے دوست ہیں اور دوستوں میں غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھے دوست تو وہی ہوتے ہیں نا، اپنی غلط

فہمیاں دور کر لیں۔ اس میں کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہے۔“

”کیا چاہتی ہو تم؟“ جعفر نے اسی الجھن میں پوچھا تو مائرہ نے مضبوط لہجے میں کہا

”کچھ نہیں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ہم دونوں نے جو اپنے دل میں چھپا چھپا کر باتیں رکھی ہوئی ہیں، وہ ہمیں ایک دوسرے سے

کہہ دینی چاہئیں۔ ہمارے درمیان کوئی نیا تعلق بنتا ہے یا نہیں۔ اہمیت اس کی نہیں بلکہ ہمارے لیے اہم یہ ہوتا چاہئے کہ ہماری دوستی پہ کوئی

حرف نہ آئے۔“

”اگر تم ایسا سوچتی ہو تو پھر میرے ضمیر پر جواتنا بوجھ ہے وہ اتر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ آخر ہمارے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔“ جعفر نے سنجیدگی سے کہا

”جعفر! میں تم سے آج طے نہیں کروں گی۔ بلکہ کبھی بھی نہیں طے نہیں کروں گی۔ ہم اسے وقت پر چھوڑ دیتے ہیں پلیر۔۔۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو جعفر سکون سے بولا

”اوکے، اب یہ طے ہے کہ ہم نے کبھی آپس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اور نہ تو کیسی ہو۔“

”اب میں پرسکون ہوں۔ اور سکون سے سو پاؤں گی۔ باقی باتیں صبح کریں گے۔“ مائرہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جعفر نے فون ایک طرف رکھ اور بیڈ پر جالیٹا۔ بات کر کے وہ اچھا محسوس کر رہا تھا۔



صبح کی نماز کے بعد ماسٹر دین محمد گلی میں چلنا آ رہا تھا۔ ایسے میں سامنے سے ایک عورت آگئی۔ وہ قریب آ کر رکی جیسے وہ اس سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔ ماسٹر دین محمد رک گیا تو وہ عورت بولی

”ماسٹر جی۔ کیا حال ہے آپ کا؟“

”میں ٹھیک ہوں بہن۔ توں۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔“ ماسٹر دین محمد نے سکون سے پوچھا تو وہ عورت بولی ”سب ٹھیک ہیں۔ دیپے، مشرقی۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کی طرف آؤں۔ میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“

”خیر تو ہے نا بہن۔ ایسی کیا بات کرنا تھی۔“ اس نے پوچھا تو وہ عورت شکوہ بھرے لہجے میں بولی

”دیکھیں نا۔ میں تو وہی کہوں گی۔ جو آپ کے فائدے کی بات ہو۔ گاؤں میں لوگ بڑی باتیں بتا رہے ہیں۔ ایسا کچھ کہتے ہیں کہ بس تو یہی بجلی۔“

”ایسا کیا کہتے ہیں؟“ ماسٹر دین محمد نے حیرت سے پوچھا تو اس عورت نے انتہائی طعنے لہجے میں کہا

”بھئی کہ ایک جوان جہان لڑکا آپ کے گھر میں رہتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر اسے رکھنا آپ کی مجبوری ہے کہ وہ آپ باپ بیٹی کو کھلاتا پلاتا ہے، روپیہ پیسہ دیتا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں فہد کی شادی سسلی سے کر دیتے؟“

یہ سن کر ماسٹر دین محمد چونک گیا۔ اس نے خود پر قابو رکھا اور بڑے تحمل سے پوچھا

”ایسا کون کہتا ہے؟“

”سارے گاؤں والے۔ کسی کی زبان تو نہیں روکی جاسکتی۔ ویسے آپ پریشان نہ ہونا بھی نہیں چاہیے، یہ صلاح ہے بھی ٹھیک، نہ ہنگ لگے نہ پھٹکری۔ رنگ بھی چو کھا آئے۔ کوئی خرچہ نہیں، اور بیٹی بیاہ دو۔ فہد گھر جوائی بھی رہے گا۔“ اس عورت کے لہجے میں طعنے کے ساتھ

تھارت بھی تھی۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے تحمل سے جواب دیا

”یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“

”ریکس! ماسٹر جی آپ سیانے بندے ہیں، بھلا تائیں جوان جہن لڑکی گھر میں ہے تو پھر جب ایک جوان جہان لڑکا گھر میں جب چاہے آئے، جب چاہے جائے کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اس پر اگر لوگ باتیں بنائیں، وہ کیسے غلط ہو گئیں بھلا؟“

”فہم میرے بیٹوں کی طرح ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ عورت تنگ کر بولی ”ہوگا، پرسگا تو نہیں ہے، اب دیکھیں نا، اس کا کون سا اپنا گھر نہیں ہے پھر کیوں دن رات آپ کے گھر میں پڑا رہتا ہے۔ اب یہ مت کہنے کا کردہ سلسلی پر اپنی دولت نہیں وار رہا۔“

”بہت برا کہہ رہے ہیں لوگ۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا

”بالکل جی جب وہ اکٹھے گاؤں میں اکیسے ادھر ادھر گھومیں پھریں گے ساتھ ساتھ دکھائی دیں گے تو یہی سوچیں گے ناکامان میں کوئی خاص ہی تعلق ہے۔“ اس عورت نے ماسٹر کے بدلتے چہرے کو دیکھا اور پھر جلدی سے بولی: ”خیر! اس وقت تو مجھے جلدی ہے میں پھر آؤں گی گھر جب تفصیل سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ماسٹر چند لمحے وہیں سن کھڑا رہا پھر قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ اس کی چال میں قطعاً احتیاط نہیں رہا تھا۔ ماسٹر دین محمد صحن میں آکر چار پانی پڑھے جانے والے انداز میں بیٹھا۔ سسی مکن میں تھی، وہ پانی کا گلاس لے کر آئی اور وہ اسے چھاتے ہوئے پوچھا

”اباجی۔ ناشتہ لاؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں بھئی۔ اتوبس میرے لیے ایک چائے کی چالی لے آ۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سسلی نے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر دھیرے سے اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر پوچھا

”اباجی، کیا بات ہے، آپ نے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی، آپ کا لہجہ آپ کا ساتھ نہیں دے رہا، کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں بھئی۔ بعض اوقات انسان ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوتا ہے جہاں پر لفظ تنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کہنے والی بات بھی کبھی نہیں جاسکتی۔“ ماسٹر دین محمد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو سسلی بولی

”اباجی! ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے بھی کہہ نہیں پارے ہیں۔ مجھے نہیں یاد۔ پہلے کبھی ایسا وقت ہم پر آیا ہو کہ ہم بات ہی نہ کر سکیں؟“

”یہ بات ہی ایسی ہے بھئی۔ اتنا بھی چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں پارہا ہوں۔“ وہ بے چارگی سے بولا

”آپ کہہ دیں اور آپ کو یہ بات کہنا ہوگی۔ کیا میں آپ کے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتی؟“ سسلی نے دھکی لہجے میں کہا تو ماسٹر دین محمد بہت مشکل سے بولا، ”تو پھر سنو۔“ یہ کہہ کر اس نے عورت والی بات سسلی سے کہہ دی۔ سسلی نے بڑے تحمل سے بات سن کر کہا

”ابہائی۔! جب سے فہد آیا ہے۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ آپ فہد سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں خود اس سے بات کر لوں گی۔“

”کیا کہو گی اس سے، مجھے اس کی ناراضگی کا ڈر نہیں لیکن ان حالات میں اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ ہمارے سوا اس کا ہے کون یہاں پر۔ وہ دشمنوں سے ہنر دازما ہے اس وقت۔“ ماسٹر دین محمد نے کہنا تو سہی نے اس حوصلہ دینے والے انداز میں کہا

”میں سمجھتی ہوں ابہائی۔ مجھے کیا کرنا میں آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔“ سسلی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی اور، سٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ ان کے لئے ایک نیا امتحان تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ملک نعیم کے ہاں سے واپسی پر فہد ماسٹر دین محمد کو خوشخبری دینا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو سنسان گھر دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھنکا۔ وہ انگلی میں کار کی چابی گھوما رہا تھا، اسے روک کر اس نے سنسان والا ان کو دیکھا۔ تبھی اجنبی چہرہ نے سسلی اندر سے والا ان میں آئی۔ فہد طویل سانس لے کر والا ان میں چلا گیا پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

”یہ آج معصوموں سے ہٹ کر اتنی خاموشی کیوں ہے۔ استاد جی کدھر ہیں؟“

”آگے آپ؟“ سسلی نے اجنبی لہجے میں پوچھا

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اور یہ تم کس اجنبی لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو؟“ فہد نے چونک کر پوچھا تو سسلی نے اسی گھر درے لہجے میں جواب دیا

”فہد۔! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ لیکن جب بات میری عزت تک آئے گی۔ وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ صاف لفظوں میں کہو؟“ فہد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو سسلی بولی

”مکئی کہ آپ اب اس گھر میں مت آیا کریں۔“

اس نے بڑی مشکل سے کہا، جس پر فہد نے اسے فور سے دیکھا اور بڑے قہقہے سے کہا

”سسلی۔! میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں؟ مگر تمہارا ہے، تم کہہ رہی ہو لیکن اس مجھے اتنا متادو، کیا استاد جی بھی ایسا ہی چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔! وہ بھی چاہتے ہیں۔“ اس نے بہ مشکل کہا تو فہد چند لمحے خاموشی کے بعد پوچھا

”سسلی کیا میں سمجھ لوں کہ وہ جنگ جو ہم لڑ رہے تھے، کیا اب مجھے وہ جنگ تہا لڑنا ہوگی۔“

”نہیں۔! میں آپ کے ساتھ برابر کھڑی ہوں اس وقت تک، جب تک ہمیں کامیابی نہیں مل جاتی یا پھر میرا وجود ختم ہو جائے گا۔“

”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں تعلق کے لیے ملنا ضروری تو نہیں ہوتا۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔

اس نے لمحہ بھر کو اس کی طرف بھر پور نگاہوں سے دیکھا اور مزکر چلا گیا۔ سسلی نے ایک بار ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا لیکن پھر خود پر قابو پا کر رک گئی۔ فہد بڑھتا ہوا دروازہ پار کر گیا تو سسلی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جبکہ فہد سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔

فہد اپنے گھر میں بستر پر لیٹا بہت افسردگی سے سوچتا چلا جا رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس کا لہجہ اس قدر رنجی کیوں ہو گیا تھا۔ کسی نے سازش کی ہے یا کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے؟ کیا ہوا اس کو کم از کم مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا۔ کوئی بات ہوئی؟ معلوم تو ہونا چاہئے۔ اس کے خیالات کا تانا بھنا کے آجانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا

”اؤ فہد، یار دیکھو اپنا فون چلا کر، وہ موبائل فون چالو ہو گیا ہے ہمارے علاقے میں۔“

”اچھا کب؟“ فہد نے کہا اور قریب پڑا فون اٹھا کر اسے آن کر دیا۔ سگنل آرہے تھے۔ اس دوران چھا کا تانا چھا گیا۔

”ابھی میں آ رہا تھا تو لوگ باتیں کر رہے تھے۔ نارودا لے اسے چلا گئے ہیں، پورے مجھے بھی چلانا سکھا دے۔“

”ہاں یار آگئے ہیں سگنل۔ چل تو چائے بنا۔ پھر میں تجھے بتاتا ہوں۔ یہ کیسے چلتا ہے۔“ فہد نے کہا تو چھا کا کمرے سے چلا گیا۔

فہد نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے فبریشن کرنے لگا۔

اس وقت مارہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کا فون بج رہا ہے تو اس نے دیکھا، پھر چونک کر فون ریسیو کر لیا۔

”ہیلو۔ اؤ فہد تم کہاں سے بات کر رہے ہو۔“

”اپنے گاؤں قسمت گھر سے مارہ۔ امیرے گاؤں سے نکل کر ہوا میں سرسرا نے والی پہلی آواز تمہارے نام ہے۔“ فہد نے

خوشگوار موڈ میں کہا تو مارہ ہنسنے ہوئے بولی

”اؤہ۔ اؤ فون سردی شروع ہو گئی وہاں، اچھا لگا مجھے بہت اچھا لگا۔ تم نے مجھے کال کی۔“

”کچھ ایسی ہی احساس میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے یہاں آکر چلے جانے کو بہت مس

کیا۔“ فہد نے کہا تو مارہ ایک دم سے کھٹے ہوئے بولی

”واؤ فہد۔ اویسے مجھے بھی بڑی فکری محسوس ہوئی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ تمہارے پاس آئی بھی اور تم سے اتنی ڈھیر

ساری باتیں بھی نہ کر سکی۔ اچھا ہاؤ کیسے ہو تم؟“

”مارہ۔ اکیلا تم کسی ایسے انسان کے احساسات کا تعین کر سکتی ہو جیسے صرف اپنی ذات کو منوانا ہو بلکہ اسے انہوں کے وقار کو بھی

تسلیم کرنا ہو۔ شاید تم اسے دفاعی غلط قرار دو۔ مگر سچ یہی ہے۔ من کی دنیا کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں ہے نا، میں بس ایسا ہی ہوں۔“ فہد

نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو مارہ بولی

”پہلے تو نہیں لیکن اب سمجھ رہی ہوں۔ تم نے خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ تو اس کی ایک معقول وجہ ہے تمہارے

پاس۔ میں سمجھتی ہوں۔“

”تم سمجھتی تھی ہو مارہ۔ امیرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ میں ایسے حالات میں گھرا ہوا ہوں، یہ تو طے ہے کہ میں جنگ ہار کر

یہاں سے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ بلکہ خود کو ناکارہ کر دینے تک سینہ سپر رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ فہد کے لہجے میں دبی عزم تھا، جسے وہ پہلے بھی

محسوس کر چکی تھی۔ اس لئے سکون سے پوچھا

”کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”ہاں۔ اہمیت کچھ اتنا کہ جتنا کوئی بھی نہ کر سکے۔ بس تم اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہی میرے لیے بہت ہے۔“ فہد نے غلوں سے کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی

”فہد میں نے ایک پلان بنایا ہے۔ وہ میں نے جعفر سے بھی ڈسکس کیا ہے۔ اس بارے میں چند دن بعد میں تمہیں بتاؤں گی۔“ اس نے جذباتی انداز میں یوں کہا جیسے رو دے گی۔ پھر خود پر قابو پا کر بولی، ”اچھا میں اب فون بند کرتی ہوں میں بعد میں کروں گی۔“ اس نے ایک دم سے فون بند کر دیا تھا۔ فہد نے حیرت سے سائل فون کو دیکھا پھر دیر سے مسکرا کر فون ایک جا ب رکھ دیا۔



بشری بیگم حویلی میں ایک کھڑکی کے پاس کھڑی، دیکھ تو باہر رہی تھی لیکن گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رانی کے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ جبکہ رانی اسے ساکت دیکھ کر چمک گئی۔ وہ کچھ اور ہی سمجھی، اس لئے تیزی سے بولی

”چوہدرانی جی، چوہدرانی جی چوہدرانی جی۔“

اس کے یوں خوف زدہ لہجے پر بشری بیگم نے چہرے پر مسکرتے ہوئے رانی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی

”آں ہاں..... کیا بات ہے؟“

”چوہدرانی جی۔ خیر تو ہے ناں۔ میں نے پہلے کبھی آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ کہیں کچھ چوہدری کی وجہ سے تو۔۔۔ پر یہ کون سا نئی بات ہے۔ وڈھے چوہدری سب سنبھال لیں گے۔“ رانی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”نہیں، بات وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ میں تو کی اس ضد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو اس نے ماسٹر دین محمد کی بیٹی کے لیے کی ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ یہ ضد اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“ بشری بیگم نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو رانی بولی

”میں نے تو سنا ہے چوہدرانی جی۔ لگا چوہدری اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، بڑی پرانی بات ہے۔“

”محبت ہی تو نہیں کرتا وہ اس سے۔ اگر محبت کرتا ہوتا تو حالات ایسے نہ بنتے۔ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔“ بشری بیگم نے دکھ سے کہا

”پھر تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ماسٹر دین محمد یا سسٹی وہ کہاں مانیں گے۔“ رانی نے گہمراہتے ہوئے کہا

”وہ نہ بھی مانیں۔ لیکن بات جب ضد کی آجائے تو یہ چوہدری نفع نقصان نہیں دیکھتے۔“ بشری بیگم نے اسی لہجے میں کہا جیسے

اسے بہت افسوس ہو رہا ہو

”ہاں! یہ تو ہے، پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ لگا چوہدری تو اپنی ضد کا پکا ہے۔“ رانی نے کہا

”بہت کچھ ہو سکتا ہے رانی، بہت کچھ، جب تک فہد ہے۔ سسٹی پر کوئی آغ نہیں آئے گی، یہ میں جانتی ہوں۔ ہاں اگر فہد نہ رہا تو

شاید حالات بدل جائیں۔ اس لیے فہد کی سلامتی بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری۔“ بشری بیگم نے جتنی لہجے میں کہا تو رانی بولی

”آپ کو پتہ ہے چوہدرانی جی، وہ فہد حویلی والوں کے کتنا خلاف ہو رہا ہے اور پھر بھی آپ؟“

”ہاں پھر بھی، اب ہمیں اسی کچھ نہ کھ کرنا ہوگا۔ تو میرا ایک کام کر۔“ بشری بیگم نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو رانی بولی

جی چوہدرانی جی، بولیں۔“

”کسی ذریعے سے کسی طرح میری ملاقات فہد سے کروادے، میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ بشری بیگم نے کہا تو رانی

نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ویرے سے بولی

”چوہدرانی جی، آپ کہتی ہیں تو میں کچھ کرتی ہوں۔“

بشری بیگم نے گہری سانس لیا اور پھر ہار دیکھنے لگی، حیرت زدہ سی رانی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ بچانے کیا سوچ رہی تھی۔

رانی اسی دوپہر سراج کے ڈیرے پر جا پہنچی۔ سراج اور رانی دونوں کھیت کی منڈ میر پر بیٹھے، تیس کر رہے تھے۔

”آج تم دن کے وقت آ گئی۔ پھر تم اتنی دیر سے آئی ہوئی ہو اور بڑی خاموش خاموش سی ہو، کیا پریشانی ہے؟“ سراج نے پوچھا تو

رانی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی

”پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہ رہی ہوں، سوچ رہی ہوں کہ تم سے کیسے بات کروں؟“

”اگر کوئی بات کہنی ہے تو کہو، اس میں سوچنا کیا؟“ سراج نے کہا تو رانی بولی

”پتہ نہیں، مجھے وہ بات تم سے کہنی بھی چاہئے یا نہیں۔ اصل میں سراج، وہ چوہدرانی کا ایک کام ہے، اس نے وہ مجھے کرنے کے

لیے کہا ہے۔“

”چوہدرانی کا کام، دیکھ رانی، اگر اس نے کوئی دھمکی دی ہے تو چپ چاپ واپس چلی جا، بہت سن لیں میں نے اس خاندان کی

دھمکیاں اور۔۔۔“ سراج نے فہمے میں کہا تو رانی اس کی بات کاٹ کر تجزی سے بولی ”اب نہیں ہے سراج، وہ صرف فہد سے ملنا چاہتی ہے

اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ ڈرے اور کئے چوہدری کی طرح خون خراب نہیں چاہتی۔ چوہدرانی نے اتنا کہہ کر کہ میں ملنا چاہتی ہوں

فہد سے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتی ہوگی، جس سے یہ لڑائی ختم ہو جائے۔“

”رانی، ان چوہدریوں نے ظلم ہی اتنے کیے ہیں کہ اب زخموں پر ہتھ بھی مرہم رکھ دیا جائے وہ زخم بھریں گے نہیں۔“ سراج نے

اسے حقیقت بتائی

”تم اگر اسے فہد سے ملا دو تو ممکن ہے کوئی راہ نکل ہی آئے؟“ رانی نے صلاح دی تو سراج نے غلوں سے کہا

”تو یقین رکھ رانی، میں پورے غلوں کے ساتھ فہد سے طوا دوں گا، وہ اگر نہ بھی مانا تو میں منالوں گا۔ آگے اللہ کی مرضی۔“

”مجھے تم پر یقین ہے سراج، اللہ کرے یہ ظلم، خون خراب اور لڑائی بند ہو جائے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے۔“ رانی

نے اٹھتے ہوئے کہا تو سراج بھی اٹھ کے بولا

”ٹھیک ہے، میں تجھے بتا دوں گا۔ آؤ تجھے چھوڑ دوں۔“

وہ دونوں منڈھیر سے اٹھ کر آگے بڑھے۔ چھی ان کے عقب میں ماکھا نمودار ہوا۔ وہ انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ سراج اور رانی کو خبر ہی نہیں تھی کہ دشمنوں کی نگاہ ان پر پڑ چکی ہے۔

ماکھا بڑے مضطرب انداز میں ڈیرے کے صحن میں کھڑا تھا۔ اتنے میں کبیر کی گاڑی آ کر دی اور اس میں سے کبیر باہر نکلا۔ ماکھا تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب آیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا

”اوئے ماکھے، خیر تو ہے نا، ایسے کیوں کھڑا ہے؟“

”کئے چوہدری جی میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ ماکھے نے تیزی سے کہا تو چوہدری کبیر سنجیدگی سے پوچھا

”وہ کیوں؟ میرا انتظار کیوں کر رہا تھا؟“

”بات ہی کچھ ایسی ہے، کئے چوہدری جی۔“ وہ جھپکتے ہوئے بولی تو اس نے غصے میں کہا

”تو جمل پھر نہ کھول، بتا کیا بات ہے۔ منہ میں گھسکنیاں ڈالی ہوئی ہیں کیا؟“

”وہ حویلی میں آپ کی نوکرانی ہے نا جی، وہ کیا نام ہے اس کا رانی۔“ ماکھے نے کہا

”ہاں کیا ہوا اسے؟“ چوہدری کبیر بولا

”آج میں نے اس کو سراج کے ساتھ بیٹھے ہوئے اور بڑی گہری باتیں کرتے ہوئے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کتنی دیر

نک وہ اس کے کھیتوں میں اس کے ساتھ رہی ہے۔ پھر سراج اسے کافی دور تک چھوڑنے آیا۔ اور۔۔“

”تو کج کہہ رہا ہے۔“ چوہدری کبیر نے تصدیق چاہی تو ماکھا جلدی سے بولا

”میں جھوٹ کیوں بولوں گا جی، پھر میں نے گاؤں کے کچھ بندوں سے بھی معلوم کیا، وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں جی، محبت

کرتے ہیں جی وہ ایک دوسری کے ساتھ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ماکھے پر حویلی کی ملازمہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ملے، یہ کیسے ممکن ہے؟“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا اور

واپس اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ڈیرے سے باہر نکلا چلا گیا۔

اس وقت بشری بیگم اپنے پیڑ پر اور رانی اس کے پاس ٹالین پر بیٹھ ہوئی تھی۔ بشری بیگم نے اس سے پوچھا

”ہاں اب بتا، وہ فہد سے ملنے کی کوئی راہ نکلے؟“

”چوہدرانی جی وہ سراج ہے نا، امین اراکس کا بھائی، ان کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔ اس کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہی ہے لیکن

میں اسے اکیلے میں اس کے ڈیرے پر ملتی تھی، اور اس کے ساتھ اطمینان سے بات کی۔“ رانی نے جمل سے کہا

”تو اس نے تمہاری بات سن لی؟“ بشری بیگم نے حیرت سے پوچھا تو رانی بولی

”پہلے تو اس نے بہت طعنے کیا کہ میں ایسی بات کہنے کیوں آگئی ہوں۔ پھر جب میں نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ خون

خرا نہیں چاہتی ہو تو پھر اس نے میری بات پر سوچا۔“

”اچھا تو پھر کیا کہا اس نے؟“ بشری بیگم نے تجسس سے پوچھا تو رانی نے سکون سے بتایا

”میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ آپ فقط فہد سے ملنا چاہتی ہیں تم کوئی ایسا بندہ ہست کرو کہ آپ دلوں کی ملاقات ہو جائے پھر جو فیصلہ ہو گا وہ بعد کی بات ہے۔“

”وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اس نے کیا کہا؟“ بشری بیگم نے بت مبری سے پوچھا

”وہ مان گیا، اس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ آج ہی فہد سے بات کرے گا۔ بلکہ اسے مجبور کرے گا کہ چوہدرانی جی کی بات سن لے،

پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ رانی نے بتایا تو بشری بیگم نے سوچتے ہوئے پوچھا

”کیا خیال ہے سراج کی بات فہد مان جائے گا۔ ویسے اگر تم سیدھے فہد سے بات کر سکتی تو زیادہ اچھا تھا۔“

”نہ چوہدرانی جی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، اسی لیے تو میں نے سراج سے بات کی ہے، وہ تو ہمارے گاؤں کا ہے نا۔“ رانی نے خود

میں سینٹے ہوئے کہا تو بشری بیگم نے سکون سے کہا

”اچھا چل ٹھیک ہے۔ اب کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، میں فہد سے مل کر کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دوں گی۔“

”اللہ کرے امن ہو جائے۔“ رانی نے دعا کی تو بشری بیگم نے کہا

”اب تو جا، اپنا کام کر، میں ذرا آرام کر لوں، بہت تھک گئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ نیم دراز سی ہو گئی اور رانی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

رانی مٹکی ستھرائی میں مشغول تھی کہ چوہدری کبیر کمرے میں آیا اور اس نے آتے ہی اس کی چوٹی سے پکڑ کر زوردار تھپڑ اس

کے منہ پر مار دیا۔ پھر غصے میں پھٹکارتے ہوئے بولا

”تم جو بلی کی ملازمہ ہو کر ہمارے ہی دشمنوں سے پیار کی ٹینگیں بڑھاؤ۔ انہیں یہاں کے راز بتاؤ۔“

”نن۔۔۔ نن، نن، چوہدری جی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ رانی نے خوف زدہ

ہوتے ہوئے کہا تو چوہدری کبیر پاگل ہوتے ہوئے بولا

”غلط فہمی۔۔۔ وہ بھی مجھے ہوئی ہے، مگر تو سراج سے ملی تھی، کیا یہ جھوٹ ہے؟“

”میں گئی تھی اس کے پاس لیکن۔۔۔“ اس نے کہا تو چوہدری کبیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”ہمارا ہی شک کھاتی ہو

اور ہمارے ہی خلاف دشمنوں سے ملتی ہو۔ میں تو کسی کو اپنے خلاف سوچنے نہیں دیتا اور تم ہو کہ جو بلی کی باتیں باہر جا کر دشمنوں کو بتاتی ہو؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے گے چوہدری جی ایسا کچھ نہیں ہے۔“ رانی روتے ہوئے ڈر کے بولی

”تو بولو، وہاں کیا کرنے گئی تھی کیوں ملتی ہو سراج سے وہ بھی اس کے کھیتوں میں جا کر۔“ چوہدری کبیر نے جس طرح اصرار

دینے والے انداز میں کہا تو رانی نے عزت پر حرف آتا محسوس کر کے دلیری سے بولی

”یہ سچ ہے کہ میں اس سے ملی ہوں مگر میرا یقین کریں جو ملی کے خلاف میں نے.....“

”خاموش!!!“ چوہدری کبیر نے دھاڑتے ہوئے کہا تو رانی سہم گئی اور سہے ہوئے انداز میں کبیر کی طرف دیکھا تو وہ نفرت سے بولا

”پتہ نہیں کب سے تم یہاں کی باتیں انہیں بتا رہی ہو۔ میں بھی کبوں حالات ہماری گرفت میں کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ ہمارے

بی گھر کا بھیدی..... تمہیں سزا ملے گی اور ضرور ملے گی۔“

”میں نہیں چوہدری جی آپ چوہدرانی جی سے پوچھ لیں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ رانی ہڈیاں اٹھا کر بولی تو کبیر اسے پیٹھ پر دے

مارا۔ اور پھر اچانک ڈک کر اس کے بدن کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے چوہدری کبیر ہلے ہوئے لہجے بولا

”میں مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم جوان ہو گئی ہو شادی کرنا چاہتی ہو، سراج کے ساتھ۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اس کی جامب پر دھ تو رانی اس کی نیت سمجھتے ہوئے بولی

”نہ چوہدری جی نہ میرے قریب مت آنا۔“

کبیر کا نہیں بلکہ اس کی باتیں تمام لیں۔ وہ کسی بے بس پرندے کی مانند اس کی گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ وہ کمرے سے

نکل جانا چاہتی تھی، لیکن ایسا نہ کر سکی۔ کبیر نے اسے دبوچ لیا تھا۔

ایک چچ حویلی میں گونج کر رہ گئی۔ لٹی پٹی رانی دیوار کے ساتھ ٹک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبیر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے

حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے کپڑے درست کرتا ہوا اٹھا۔ وہ باہر جانے کے لئے مڑا تو سامنے دروازے میں بشری بیگم کھڑی

تھی۔ وہ شدید حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ کبیر قریب سے خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا، بشری جیسے ہی اس کے قریب آئی، رانی

سبک پڑی تو بشری بیگم نے دھیرے سے پوچھا

”رانی، بولو کیا ہوا، بولو رانی؟“

رانی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ بشری بیگم نے حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا

”یہ تو نے اچھا نہیں کیا کبیر، مان تو زودیا ہے تو نے میرا، مجھ کو دسٹوٹ گیا ہے میرا.....“ وہ بڑبڑاتے ہوئے رانی کی طرف متوجہ ہو

کر پڑی۔ ”اٹھ جا، اس سے پہلے کہ حویلی کے دوسرے ملازموں کو معلوم ہو، اپنا آپ سمیٹ لے۔“

”نہیں بیگم صاحبہ، رانی اب نہیں رہی، ختم ہو گئی ہے۔“

رانی نے انتہائی دکھ سے کہا تو بشری بیگم دانت پیستے ہوئے بولی

”کبیر۔!“

وہ انتہائی غصے میں اٹھ کر باہر چلی گئی۔ رانی وہیں دیوار کے ساتھ لگی ہوئے بدمی پڑی رہی۔

بشری بیگم کو کبیر گھر نہیں ملا۔ وہ پہلے تو اسے خود حویلی میں تلاش کرتی رہی پھر اسے نوکروں سے معلوم ہوا کہ کبیر اپنی گاڑی میں باہر چلا گیا ہے۔ بشری دالان میں غصے میں بے حال اور پریشان سی کھڑی رہی پھر چونک کر اس طرف چل پڑی جہاں وہ رانی کو چھوڑ آئی تھی۔ اس نے کوریڈور میں چلتے ہوئے اسے آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ سمجھی وہ اس کمرے کے دروازے تک آ کر رک گئی۔ وہ اندر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ رانی پچھلے سے جھول رہی تھی۔ یہ دہشت زدہ منظر دیکھ کر بے ساختہ بشری بیگم کے منہ سے جھج کل گئی۔



فہد اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی چار پائی پر اور سراج بیٹھا تھا۔
 ”یار آج صبح رانی آئی تھی بشری بیگم کا پیغام لے کر۔“

”رانی اور وہ بھی بشری بیگم کا پیغام لے کر، خیر تو ہے نا، کیا کہتی ہے؟“ فہد نے چونکتے ہوئے پوچھا تو سراج بولا
 ”چوہدرانی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ“ لفظ اس کے منہ ہی میں ہوتے ہیں کہ چھاکا تنزی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس یوں آتے دیکھ کو وہ دلوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور فہد نے پوچھا
 ”خیر تو ہے چھاکے، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”غضب ہو گیا سراج، حویلی میں رانی نے خودکشی کر لی ہے۔ مگر لوگ کہہ رہے ہیں کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔“ چھاکے نے کہا تو وہ دونوں ہری طرح چونک گئے۔ سراج نے بڑبڑانے والے انداز میں پوچھا
 ”خودکشی۔۔ مگر کیوں؟ کس لیے؟ تمہیں کس نے کہا؟“

”حویلی کے مالی نے مجھے ساری تفصیل بتائی ہے۔ کبیر نے رانی کو کسی جگہ بھی نہیں چھوڑا تھا، اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور ابھی کچھ لوگ اسے دفنا کر آئے ہیں۔“ چھاکے نے بتایا تو سراج کے غصہ پھیلتا چلا گیا۔ فہد کا حیرت اور دکھ ملا چہرہ ہاتھ ہاتھ کدہ کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔

”رانی کو پامال کر کے، اسے قتل کر کے دفن بھی کر دیا گیا۔“ سراج نے اچھٹی حیرت سے پوچھا
 ”حویلی والوں نے اسے خاموشی سے دفن دیا ہے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، مگر تاہذا ظلم چھپ تو نہیں سکتا۔“ چھاکے نے بتایا یہ سنتے ہی سراج غصے میں اٹھ۔ چار پائی پر پڑی گن اٹھائی اور میز سے باہر کی طرف لپکتا چلا گیا۔ فہد نے بھاگ کر اسے پکڑا تو سراج نے حیرت اور شکوہ بھرے انداز میں کہا
 ”نہیں فہد، کیا اب بھی مجھے تم روکو گے؟“

”تم کیوں اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ گندے کرنا چاہتے ہو۔ تم تو اصرار کرو۔ یقین کرو مجھ پر، ہم بدلہ لیں گے اور ضرور لیں گے، اس وقت میرے کہنے پر رک جاؤ۔“ فہد نے اس کے ہاتھ سے گن چھینتے ہوئے کہا
 ”کب تک مبر کروں فہد، رانی میری محبت تھی یار، اس بے غیرت نے میرے بھائی کو قتل کیا۔ اب رانی کو اب بھی اسے چھوڑ دوں۔ نہیں فہد نہیں، تم میں حوصلہ ہو گا مجھ میں اب نہیں رہا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

”میری بات تو سنو، میں چلوں گا تیرے ساتھ لیکن“ فہد کہتا ہوا رک گیا کہ سراج اس کی بات کانٹے ہوئے باہر کی جانب جاتے ہوئے بولا

”وہ قتل پر قتل کئے جا رہا ہے اور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں۔ اب وقت آگیا ہے فہد، تم میرا ساتھ دو یا شدو میں آج اسے قتل کروں گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، وہ ہمارے انتظار میں نہیں ہوگا؟ اس نے اپنے ذہرے پر ٹنڈوں کی فوج بیٹھائی ہوگی۔ اندھا دھند چڑھائی ہو رہے نقصان میں جائے گی، یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے ہو؟ ذرا سا صبر کرو۔ میرے کہنے پر۔“ فہد نے اسے سمجھایا تو سراج نے انتہائی غصے میں کہا

”یار بھئی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا۔ اب مجھے مری جانا چاہیے۔“

”مریں گے تمہارے دشمن، تم ایک بار ادھر بیٹھو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ ہم نے کرنا کیا ہے۔ میری بات اگر تمہاری سمجھ میں آ جائے تو پھر جو چاہے کرنا، آؤ بیٹھو۔“ فہد نے اسے پکڑا اور وہ اس کے کاندھے سے لگ کر رونے لگ گیا۔

رانی کے خوشی کرنے والی بات کوئی معمولی نہیں تھی۔ جنگل کی آگ کی مانند پورے قسمت مگر میں پھیل گئی۔ صبح ہو جانے تک یہ بات ہر بندے کو معلوم ہوگئی۔

اس وقت سلمیٰ سکول میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک کاپی دیکھ رہی تھی۔ ایک بچہ اس کے پاس کھڑا تھا۔ سبھی اس کے پاس صفیہ اور ایک عورت آگئیں۔ صفیہ نے آتے ہی بتایا

”سلمیٰ، حویلی میں رانی نے خودکشی کر لی ہے۔ راتوں رات بے چاری کو خاموشی سے دفن بھی دیا۔“

”کیا کیوں؟“ سلمیٰ انتہائی حیرت سے پوچھا

”خودکشی کی تو بات اڑائی گئی ہے، اصل میں چوہدری کبیر نے اس کی عزت سے کھیل کر قتل کیا ہے۔“

تب صفیہ نے اسے وہ دردناکائی جو قسمت مگر میں پھیل چکی تھی۔ سلمیٰ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے آنسو نکل پڑے۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا۔

”وہ بے چاری غریب لڑکی ان حویلی والوں کے ظلم کا سہہ کر رہی ہوگئی، کون پوچھتا ہے سلمیٰ۔ اس نے سوال کرنا ہے ان حویلی والوں سے؟“ عورت نے کہا تو سلمیٰ چوہکتے ہوئے بولی

”میں ... میں کروں گی سوال نہیں بخشوں گی ان حویلی والوں کو۔ میں لوں گی رانی کے خون کا حساب۔ صفیہ تم ان بچوں کو مگر بھیج کر آ جانا میں دیکھتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

سلمیٰ اس عورت کو اپنے ساتھ لے کر سکوں سے باہر کی طرف چل پڑی۔



حبیب الرحمن اپنے گھر کے لان میں بیدی کرسی پر بیٹھا انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں اندر سے، مائرو آکر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”پاپا۔ پیاخار چھوڑیں اور میری بات سنیں۔ میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہ رہی ہوں۔“ مائرو نے کہا تو اس نے اخبار سے لٹاؤں بٹا کر مسکراتے ہوئے کہا

”اہم بات اور وہ تم کرنا چاہتی ہو۔ تو کچھ میں بن رہا ہوں۔“

”پاپا۔! میں کہیں پر تھوڑی سی انویسٹمنٹ کرنا چاہتی ہوں۔ ظاہر ہے اس کے لیے مجھے کچھ سرمایہ چاہئے۔ آپ دیں گے؟“ مائرو نے لاڈ سے کہا تو حبیب الرحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”تم بزنس کرو گی، کر سکو گی؟“

”پاپا۔! بزنس نہ کر سکی تو میرے پاس تجربہ تو ہو گا۔ آپ سرمایہ دیں گے؟“ مائرو نے کمزوری دلیل دے کر پوچھا

”بیٹا۔! تم نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور پھر یہ سارا کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ بھتا چاہے سرمایہ لینا اور مجھے پونجی کی ضرورت بھی نہیں کہ تم یہ سرمایہ کہاں لگا رہی ہو۔“

حبیب الرحمن نے اعتماد سے کہا تو مائرو خوش ہوتے ہوئے بولی

”جھٹک پو پاپا۔! آپ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں۔ میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گی۔ لیکن اس سے پہلے میں خود پوری معلومات لینا چاہتی ہوں۔“

”اگر بات معلومات کی حد تک ہے تو ایک بات پوچھوں بیٹا، تم یہ سرمایہ لگا کہاں رہی ہو؟ شاید میں تمہیں کوئی اچھا مشورہ دے دوں۔“ حبیب الرحمن نے سنجیدگی سے پوچھا تو مائرو بولی

”پاپا میں یہ سرمایہ ایک فیکٹری میں لگا رہا چاہ رہی ہوں اور یہ محض منافع کمانے کے لیے نہیں۔“

”تو پھر کس مقصد کے لیے؟“ اس نے پوچھا

”پاپا، جب ہم کسی بھی علاقے کے بے روزگار لوگوں کے لیے روزگار کا بندوبست کرتے ہیں تو وہاں پر خوشحالی آتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہاں پر موجود جاگیرداروں کے تسلط کے تلے پے ہوئے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ لوگ جب اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں اور اپنی دولت کا درست استعمال کرتے ہیں۔ جس سے بہترین نمائندے آگے آتے ہیں اور بہترین حکومت بنتی

ہے۔“ مائرو نے تفصیل سے بتایا تو حبیب الرحمن نے پوچھا

”ہوں، یہ تو اس وقت ہمارے ملک کی اہم ضرورت ہے کیا تم کسی مخصوص علاقے میں یہ کام کرنا چاہ رہی ہو۔“

”جی پاپا۔“ مائرو نے کہا حبیب الرحمن نے مسکراتے ہوئے کہا

”گڈ لک بیٹا، میری ٹیک خوشامدات تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اب میں اخبار پڑھ لوں؟“

”جی ہاں پڑھیں۔ میں آپ کے لیے خود چائے بنالاتی ہوں۔“ ماثرہ نے چستے ہوئے کہا تو حبیب الرحمن نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چلی گئی تو حبیب الرحمن اخبار پڑھنے لگا۔

ماثرہ آفس میں داخل ہوئی تھی کہ اس کا سیل فون بجھا۔ اس نے اسکرین دیکھ کر فون رسو کر لیا اور بولی ”کیسے ہو جعفر؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ۔“ وہ تیزی سے بول تو ماثرہ نے تشویش سے پوچھا

”میں تو ٹھیک ہوں مگر تمہاری آواز سے نہیں لگتا کہ تم ٹھیک ہو، بات کیا ہے؟“

”میں تمہیں قسمت مگر میں ہونے والی ایک واردات کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ یقیناً جانو اس کا مجھے ذاتی طور پر دکھ ہوا ہے۔“

یہ کہہ کر جعفر نے نہایت احتفار سے بتایا تو ماثرہ نے انتہائی دکھ سے کہا

”اوہ یہ تو بہت برا ہوا کیا تم نے فہد سے بات کی؟“

”اب تو میرا اور اس کا ہر لمحہ رابطہ رہتا ہے۔ اسی نے ہی بتایا بلکہ فہد کا ایک دوست سراج اسی رات ہی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں

قسمت مگر جا رہا ہوں۔ حویلی بھی جاؤں گا لیکن اس کے لئے کوئی ابتدائی رپورٹ ہونا۔ یہ لوگ قتل پر قتل کئے جا رہے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر پا

رہے ہیں۔“ جعفر نے دکھ سے کہا تو ماثرہ نے تیزی سے کہا

”جعفر، میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔“

”اوکے، میں فور پور جا کر پھر تم سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ قسمت مگر سے معلومات لے کر بتاتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر اور فون بند کر

دیا۔ ماثرہ ایک دم سے دنگی اور پریشان ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے آفس میں بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم سے اس نے فیصلہ کر لیا۔

اس وقت فہد اپنی زمین پر چھپا کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا

”چھپا کے ابھی تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کیسے ہو گا میری آنکھ سے دیکھو۔ یہاں جو فصلیں اُگتی ہیں۔ یہاں

ٹیکسٹریاں لگیں گی تو بے شمار لوگوں کو روزگار ملے گا۔“

”لیکن فہد یہ فصلیں کہاں اُگیں گی۔ اس طرح ٹیکسٹریاں لگتی رہیں تو یہ کسان لوگ کہاں جائیں گے۔“ چھپا کے نے کچھ نہ سمجھتے

ہوئے کہا تو فہد نے سمجھا یا

”ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ یہاں محدود زیادہ ہیں اور محدود کم۔ محدود کم ہوں گے تو محدود زیادہ ہو جائے گی۔ ماضی میں یہی

زمین بے آباد تھی۔ ایسی بے شمار زمینیں بے آباد پڑی ہیں۔ انہیں آباد کرنا ہے۔ ہیٹ میں روٹی جائے گی تو مستقبل کے ہمارے سوچنا بھی آ

جائے گی۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ اور جو زرعی ملک نہیں بھی ہیں وہ امیر ہیں۔ بس یہی وسائل کی تقسیم ہی ترقی کی طرف لے گئی

۔ غریب کا حق اسے ملنا چاہیے۔“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ فون کی بیل بجی۔ اسکرین دیکھ کر فون رسبو کرتے ہوئے بولا

”ہیلو۔ اماثرہ۔“

”کیا ہو رہا ہے؟“

”میں اس وقت اس زمین پر ہوں جہاں ٹیکسٹری لگانی ہے۔ میرے ساتھ میرا دوست ہے۔“ اس نے بتایا تو اماثرہ بولی

”اچھا سنو، تمہیں بتانا فائلس چاہیے، میں دوں گی۔ پاپا سے میری بات ہوگئی ہے۔ اب یہ کیسے کرنا ہے۔ کیا ہونا ہے مجھے نہیں پتہ۔“

”تم میری فائلس پائڈر بنانا چاہتی ہو۔ ویل کم، یہ ٹھیک رہے گا۔“ فہد نے کہا تو اماثرہ خالچے میں بولی

”میں تو بہت کچھ چاہتی ہوں۔ مگر تم ہی نہیں مان رہے ہو۔ خیر۔! ابھی میری جھڑپ سے بات ہوئی ہے، وہ رانی والے معاملے پر۔

میں خود آ رہی ہوں۔ سلی سے کہنا پریشان نہیں ہوتا۔ اب میں کچھ دن قسمت مگر ہی میں رہوں گی۔“

”واقعی، کب آ رہی ہو؟“ فہد نے حیرت سے پوچھا تو اماثرہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا

”بہت جلدی، ہمارا رابطہ تو رہے گا۔ اوکے میں بعد میں فون کرتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

فون بند ہو گیا۔ فہد کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ چند لمحوں سوچتا ہے پھر سر جھٹک کر چھانکے سے بولا

”آؤ چلیں۔“

وہ دونوں سڑک کنارے کھڑی کار کی جانب بڑھ گئے۔ اس کا رخ سسٹی کے آفس کی طرف تھا۔

سسٹی میز کے اس پار کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے صلیہ کے ساتھ چند عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سسٹی ان سے بات کر رہی تھی۔

”میں نے آپ سب کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اس آفس کا ہم باقاعدہ افتتاح کریں گے تاکہ پورے علاقے میں پتہ چلے کہ

یہ آفس ہم نے کس مقصد کے لیے بنایا ہے۔ لیکن اس وقت رانی والا معاملہ انتہائی دکھ بھرا اور سنگین ہے۔ میں آپ سب کو یہ بتانا چاہ رہی

ہوں کہ میں لڑوں گی رانی کا مقدمہ۔ اس سے پہلے بھی میں صلیہ کی جنگ لڑ رہی ہوں۔“

”ہاجی آپ ہمیں بتائیں۔ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ ایک عورت نے پوچھا تو سسٹی نے کہا

”اپنے گھروں میں اپنے مردوں سے بات کریں ہم سب مل کر اس مقدمہ کو حاصل کرنا ہے۔“

”ہاجی، آپ برانڈ مائڈ تو ایک بات کہوں۔“ دوسری عورت نے کہا تو سسٹی بولی

”کہو۔ برامانے والی کیا بات ہے۔“

”آپ یہاں جو بھی کر رہی ہے، ہمیں اس کی سمجھ ہے یا نہیں لیکن یہاں کے لوگ کیسے ہیں آپ کو پتہ ہے۔“

”ہماری بات لوگ سمجھیں گے۔ آج تھوڑے لوگ ہوں گے تو کل زیادہ ہوں گے۔ دھیرے دھیرے ہماری بات کی سمجھ سب کو آ

جائے گی۔ ایک بار حوصلہ کر لیا جائے تو پھر ڈرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دیکھنا ایک دن یہ سارے لوگ اپنے ساتھ ہوں گے۔

دیکھو۔ اہار کسی کے ساتھ جھگڑا تو نہیں ہے۔ ہم تو اپنے حق کی بات کرتے ہیں۔ اور ہمارے جو حامیات ہیں، ان میں حق چھین لینا پڑتا ہے۔ ہمارا خدا ہماری مدد کرے گا۔ یہاں بیٹھ کر عورتوں کے جو چھوٹے موٹے مسئلے ہیں ہم خود حل کر سکیں وہ لڑکیاں جو پڑھ نہیں سکیں۔ انہیں تعلیم دے سکیں۔ ارد گرد گاؤں کی عورتوں کو پتہ ہو کہ اس علاقے میں ان کی آواز سننے والا کوئی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے رانی ہارے آواز بلند کرتی ہے۔“

”ہم غریب لوگ کسی کا مسئلہ کیا حل کریں گے؟“ ایک عورت نے پوچھا تو سلمیٰ نے کہا

”نانا کہ ہم غریب ہیں بے بس ہیں۔ لیکن کب تک؟ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہاری اولاد ان جاگیرداروں کی فلاحی سے نکلے۔ ہم نے کسی سے لڑائی نہیں کرنی بلکہ اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”یہ مفید نے چوہدریوں کی بات نہیں مانی، اسے اپنے گھر سے نکلتا پڑا یہ تو اچھا ہونے اسے سنبھال لیا ایسی تو کتنی ہیں۔ کس کس کو سنبھالیں گی۔“ دوسری عورت نے پوچھا تو سلمیٰ بولی

”جب تک مجھ میں حوصلہ اور قوت رہی۔ اب آپ لوگ بتائیں۔ میرا ساتھ دیں گی یا نہیں؟“

”میں شاید پہلی عورت ہوں۔ جس نے چوہدریوں کی بات نہیں مانی۔ وہ اپنی طاقت آزمائیں۔ میں اپنا صبر آزماؤں گی۔ اور سچ یہ ہے ہمیشہ صبر کی فتح ہوتی ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ رانی پر ظلم ہوا۔ ہم عورتیں اپنی عزت نہیں کریں گی تو کان کرے گا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہر طرح،“ دوسری عورت نے کہا تو سب اس کی ہمنوا ہو گئیں۔ ان کا جوش و جذبہ دیکھ کر سلمیٰ ایک دم جذباتی ہو گئی اور بولی

”آج سے میں رانی کا بدلہ لینے کا اعلان کرتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اسے اب فہم سے ملنا تھا۔



حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری جلال نے بڑے کردار سے فون بند کر کے رکھا۔ پھر قریب کھڑے منشی سے پوچھا

”ہاں یوں منشی کیا بات ہے؟“

”وہ منشی باہر اے ایس پی صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ منشی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال نے

بڑبڑاتے ہوئے کہا

”اے ایس پی! وہ کیا کرنے آیا ہے یہاں، بلاؤ“

منشی پلٹ گیا تو چوہدری جلال کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ چند لمحوں بعد جعفر اندر گیا۔ تو چوہدری جلال نے بجائے

بٹھانے کے، دوری سے پوچھا

”کیسے آنا ہوا اسے ایس پی؟“

”آپ اور آپ کے بیٹے کبیر کے خلاف میرے پاس درخواست آئی ہے۔ اس کے بارے میں ”فتیش“ کرنے آیا ہوں، چوہدری صاحب۔“ جعفر نے طنز یہ انداز میں کہا تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا ”فتیش؟ آج تک کسی کی اتنی جرات نہیں ہوئی کہ یہاں آکر ایسی بات کرے۔ بول کس نے ہمارے خلاف درخواست دی ہے۔ وہ خود یہاں آکر انکار کرے گا کہ اس نے درخواست نہیں دی۔“

”نہ چوہدری صاحب نہ، یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ آپ ایسا نہیں کر سکیں گے اور اگر ایسا دعوے تو بدلائیں اسے ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلمیٰ نے درخواست دی ہے۔ میں دیکھوں یہ انکار کیسے ہوتا ہے۔ کیا طریقہ ہے آپ کے پاس منت کرتے ہیں یا تشدد۔“ یہ سنتے ہی چوہدری جلال کا رنگ اڑ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے حیرت سے بولا ”سلمیٰ نے..... ایسا نہیں ہو سکتا؟“

”ایسا ہو گیا ہے چوہدری صاحب اور اب سیدھے سہاؤ مجھے بتائیں کہ رانی نے خودکشی کیوں کی؟ اور کیسے کی؟“ جعفر نے غصے اور فحاشیت سے کہا تو چوہدری جلال نے چند لمحوں سوچ کر کہا ”اس نے چوری کی تھی۔ سزا کے خوف سے اس نے خودکشی کر لی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تھانے میں ہم نے رپورٹ کر دی تھی، قانونی کارروائی بھی پوری کی، اب تم کیا فتیش کر رہے ہو؟“

”یہ کہ خودکشی تو اس نے کی لیکن کیوں کی؟ کس نے اسے خودکشی پر مجبور کیا۔ درخواست میں کچھ اور لکھا ہے۔ میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں۔ اور چوہدری صاحب۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ اتنی بھی سمجھ نہیں رکھتے کہ رانی کا پوسٹ مارٹم کئے بغیر دفن دیا گیا؟ کچھ کیا ہے یہ آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گا۔“ جعفر نے کہا تو چوہدری جلال ہلکے آواز میں بولا

”جو تمہاری ڈیوٹی ہے، تم وہ کرو، ایویں ادھر ادھر کیوں وقت ضائع کرتے پھر رہے ہو۔ اب کچھ مزید پوچھنا ہے یا“ ”میں ڈیوٹی ہی کر رہا ہوں، یہ سبق مجھے نہ دیں۔ جہاں تک میرے علم میں بات آئی ہے، وہ یہ ہے کہ رانی نے خودکشی نہیں کی، اسے قتل کیا گیا ہے اور اس کی عزت تم لوگوں کے ہاتھوں پامال ہوئی ہے۔ ابھی مجھے آپ سے کچھ نہیں پوچھنا لیکن بہت جلد آپ مجھے خود بتائیں گے کیونکہ مجھے ڈیوٹی کرنا ہے غلامی نہیں۔“

جعفر نے غصے میں کہا تو چوہدری جلال نے سوچے ہوئے قتل سے کہا ”تمہارا خون کچھ زیادہ ہی گرم لگتا ہے اے ایس پی۔ خیر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری ان فضول قسم کی فتیشوں میں اتنا وقت ضائع کروں۔ میرے نقش سے بات کر یا کرو اور جاؤ۔“

”اوکے میں چلا ہوں لیکن ایک بات کہتا چلوں، وقت کسی کا نہیں ہوتا جب یہ ہاتھ سے لکھا ہے، اب سمجھ آتی ہے۔“ جعفر نے

دوسلی آمیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر باہر کی سمت چل دیا۔ چوہدری جلال اس کی طرف غصے سے دیکھتا رہا۔

چوہدری جلال ڈرائنگ روم ہی میں ٹھہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش اور غصے کے بے چارے تاثرات تھے۔ اتنے میں چوہدری کبیر اور فٹی وہیں آگئے تو چوہدری جلال ان کی طرف دیکھ کر دھاڑتے ہوئے کہا

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری حویلی میں کوئی معمولی انسر آ کر اونچی آواز میں بات کرے۔ مگر وہ اے ایس پی اتنی باتیں کر کے گیا ہے۔ بہت ایمان دار بنتا ہے۔ اس کی کیا جرات تھی کہ یہ سب کہے لیکن اسے تو سلی نے درخواست دی وہ کچھ زیادہ ہی پرہیزگار نہیں نکالنے لگی۔“

”اس کی جرات صرف اور صرف فہدی دہر سے ہوئی ہے بابا، ورنہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ میں نے تو آپ کو کہا تھا کہ اس چڑیا ہی کو قید کر لیں مگر آپ نے۔“ چوہدری کبیر کہتے ہوئے زک گیا تو چوہدری جلال بولا

”مگر اس کی اوقات نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کا حصہ بنے“

”میں کون سا سے اپنے خاندان کا حصہ بنارہوں بابا۔ فہدی جس کا عہدے پر بندوق رکھ کر چلا رہا ہے میں نے تو وہ کا عہدہ کا بھوکنا ہے بس۔“ چوہدری کبیر نے کہا

”تمہاری بات میری سمجھ میں آتی ہے لیکن“ چوہدری جلال نے کہتا چاہا مگر چوہدری کبیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”آپ سوچتے ہی رہیں گے اور پانی سر سے گزر جائے گا۔ آپ اپنے دونوں کی سیاست کی سوچتے ہیں لیکن میں اس علاقے پر اپنی حکمرانی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ووٹ تو پھر بھی ہمیں ہی ملے ہے یہ لوگ پیار سے، ملنے والے نہیں ہیں۔“

”تیرا کیا خیال ہے فٹی؟“ چوہدری جلال نے پوچھا تو فٹی نے ہلاتر دیکھا

”نکے چوہدری جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ان پر اگر بھرپور وار نہ کیا گیا تو یہ ہماری جان کو آجائیں گے۔ سلی کی شادی، اگر

نکے چوہدری جی سے ہوگئی تو فہدی چابی ہمارے ہاتھ آجائے گی اور وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ پھر یہ حالات ہی نہیں رہیں گے۔“

”کیا وہ ماسٹرمان جائے گا، وہ تو آرام سے نہیں مانے گا؟“ چوہدری جلال نے پوچھا تو چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا

”اسے ماننا ہوگا، وہ جس طرح بھی مانے۔ آپ ایک بار بات کریں پھر میں اسے مثالوں گا، مجھے اپنے طریقے سے منانا آتا ہے۔“

”ٹھیک ہے فٹی، ابھی تک اس، سٹرک، میں کرتا ہوں بات۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چلا گیا تو فٹی پٹ گیا۔ کبیر کے چہرے پر

مسکراہٹ آگئی۔

چوہدری جلال انصہرانی انداز میں ٹھہل رہا تھا کہ فٹی کے ساتھ ماسٹر دین محمد احمد کے ساتھ اندر آ گیا۔ دونوں آنے سے سنے ہوئے تو چوہدری جلال نے کہا

”خوش آمدید ماسٹر دین محمد جی آیاں لوں، آؤ بیٹھو۔ میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نہیں کھڑی ٹھیک ہوں۔ آپ کہیں میں سن رہا ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے کسی تاثر کے بغیر کہا تو چوہدری جلال محل سے بولا

”ماسٹر دین محمد! فیروں جیسی باتیں مت کرو، ماضی میں جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔“ ڈی۔ بیٹھو۔ اور میری بات غور سے سن لو۔“

”ایسی بات کیا چوہدری۔ جس سے ماضی کی ساری باتیں بھلائی جاسکتی ہیں اور پھر... کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم ماضی کی باتیں بھول

جائیں؟“ ماسٹر دین محمد نے سوال کیا تو چوہدری جلال نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

”اوتے ماسٹر۔ اتنے ابھی سے تاریکی والی باتیں شروع کر دی ہیں۔ آؤ۔ ادھر آؤ۔ بیٹھو۔“

ماسٹر دین محمد کھڑا ہوا تو وہ اسے باور کرائے کے لیے بولا ”میں اپنے ساتھ بیٹھا رہا ہوں۔ عزت اور مان دے رہا ہوں تمہیں،

اپنے ساتھ بیٹھ کر۔“

”چوہدری، سیدھا کہو تم کہا کیا چاہتے ہو۔“

ماسٹر دین محمد بھی اکتائے ہوئے لہجے میں بول تو چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”تو پھر سنو۔ امانا کہ ماضی میں تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں عزت دوں۔ تمہاری بیٹی

سلی اس حویلی کی بیوی بن کر رہے۔“

”چوہدری۔! میں جانتا ہوں کہ صبر کیا ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صبر کی حد کیا ہوتی ہے۔ تو کون ہوتا ہے

کسی کو عزت دینے والا۔ عزت اور ذلت فقط میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے مجبور نہ کر کہ میں اپنا صبر توڑ دوں۔“ ماسٹر دین محمد سخت لہجے

میں بول تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا

”میرے سامنے انکار کا مطلب تم سے زیادہ اچھی طرح اور کون جانتا ہے۔ تمہاری یہ تلخ بات میں اس لیے برداشت کر رہا ہوں

کہ میں تم سے ناٹھ جوڑنا چاہتا ہوں جا سوچ لے اور بہت اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لے۔ نکاح ہوتے ہی کروڑوں کی جائیداد سلی کے

نام کر دوں گا۔“

”چوہدری۔! اپنی حویلی میں جا کر تم نے یہ بات کی۔ اچھا نہیں کیا۔ میرا جواب بھی سن لو۔ ہم مروتہ سکتے ہیں لیکن تمہاری یہ بات

نہیں مان سکتے۔“ ماسٹر دین محمد سخت لہجے میں کہا تو چوہدری جلال بولا ”خندے دماغ سے سوچو ماسٹر خندے دماغ سے، چند روپوں کی

نوکری تلاش کرنے والی لڑکی کے دن پھر جائیں گے، کروڑوں کی جائیداد ملے گی۔ زندگی سنور جائے گی، اس کی بھی اور تیری بھی۔ جاؤ جا کر

سوچو۔ ورنہ میں خود ہی تمہاری ہاں سن لوں گا۔“

”میرا آج بھی اور کل بھی یہی جواب ہے چوہدری۔ تم...“ ماسٹر دین محمد نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال ہاتھ کے اشارے سے

روکتے ہوئے کہا

”بس۔! جاؤ لے جاؤ منشی اسے اور سمجھاؤ۔ آنے والے دنوں میں کیا ہوگا اسے یہ بھی سمجھا دو۔“

یہ کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا۔ ششی اسے باہر کی جانب لے گیا۔ امشردین محمد نہایت افسردہ رہ چلا گیا۔

چوہدری جلال لان میں بیٹھانوں پر بات کر رہا تھا۔ چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں رکی اور وہ کار سے اتر کر سیدھا اپنے باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ چوہدری جلال فون بند کر کے کہا

”کبیر! کہاں تھے تم مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”بابا۔ انور پور کے بھی اور یہاں کے بھی سارے معاملات کو دیکھنے کے لیے آپ ہی نے کہا تھا۔ وہی دیکھ رہا ہوں، مصروف تو ہونا ہی ہے۔ خیر آپ بتائیں کیا بات کرنا تھی۔“ چوہدری کبیر نے کہا

”دیکھو، میں نے تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا تم جو مرضی کرتے رہے ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے مشکل میں ڈال دو، تمہاری وجہ سے میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر بولا

”ایسی بھی کیا بات ہوگی بابا؟“

”میڈیا کی رپورٹ نے اپنا اثر تو کیا ہے تا پارٹی کی طرف سے پوچھ گچھ کی گئی ہے کہ معاملہ کیا ہے، یہ ذرا سی چنگاری بھڑک بھی سکتی ہے۔ اس لیے میں اب تمہیں سمجھا رہا ہوں جو قدم بھی اٹھاؤ وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔“

”بابا آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ جو سٹگی لے ہماری ناک کے نیچے آفس کھول لیا ہے۔ یہ صرف آپ کی ڈھیل کی وجہ سے ہوا۔ آپ اب سیاست دان بن کر ہی سوچ رہے ہیں۔ اس علاقے کا بڑا زمیندار نہیں، یہ کبھی نہ کھلتا۔“ چوہدری کبیر نے غصے میں کہا

”تم رانی کے معاملے میں بے وقوفی نہ کرتے۔ یہی بات تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اور ایسے دفتر جو ہوتے ہیں ناڈیرے داری کی طرح ہوتے ہیں۔ عوام چار دن کھالی لے گی، پھر کون جائے گا ان کے پاس۔ کب تک چلا سکتے ہیں وہ ڈیرے داری۔“ چوہدری جلال نے کہا

”اگر ایب ہی ہوتا تو پریشانی والی بات نہیں تھی۔ اس آفس کا باقاعدہ افتتاح ہے۔ پتہ ہے کون کرے گا؟“ چوہدری کبیر تشویش سے کہا

”کون ہے؟“ چوہدری جلال نے پوچھا

”ملک فیم، وہی ملک فیم جس کو آپ مات دیتے رہے ہیں۔ وہی آج ہمارے علاقے میں اپنی سیاست چکانے کی کوشش میں ہمارے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔“ چوہدری کبیر کے لہجے میں حقارت تھی تو چوہدری جلال بولا

”اس کی یہ جرات ہوگئی۔“

”وہ چند دنوں میں یہاں آئے گا۔ عوامی حقوق کی نعرہ بازی میں لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکائے گا۔ بھوکے شکم لوگوں کی باتیں کرے گا اور چلا جائے گا۔“ چوہدری کبیر نے یوں کہا جیسے ملک فیم کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو

”کبیر! یہ صرف آفس ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے خلاف ایک مرکز بنایا جا رہا ہے۔ قہد بہت سوچ سمجھ کر چال چل رہا ہے۔ نڈیرے

کی بیوی کے باعث وہ پہلے ہی لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہا ہے۔ یہ آفس نہیں ہونا چاہئے۔“ چوہدری جلال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا

”میں آج شام تک ہی...“ اس نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے تیزی سے کہا

”نہیں کبیر۔ خود کچھ نہیں کرتے، یہ وقت ہوش کا ہے۔ جوش کا نہیں بلکہ چند دن صبر۔ فہد نے جو ماحول بنایا ہے نا وہ اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ نہ آفس رہے گا اور نہ ان کی سیاست اب مکمل میں مزہ آئے گا۔ انہیں لوگوں کی ہمدردیاں نہ لینے دو۔“

”وہ جو لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے لگے؟“ چوہدری کبیر نے حیرت سے کہا تو چوہدری جلال بولا

”اچھا ہے نا، ہماری دہشت کی بات ہی کریں گے۔ یہی وقت ہے جب لوگوں میں ان کے خلاف نفرت پھیلانی جاسکتی ہے، کرنے والا نہیں چلے جلوس کرنے دو خیر۔ اتم فریش ہو جاؤ پھر بتانا ہوں کہ اب کیا کرنا ہے۔ فشی کو بھی بلوا لو۔“

چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر اٹھ کر اندر چلا گیا۔



ماسٹر دین محمد اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی فشی کی آواز آئی۔

”ماسٹر دین محمد، گھر پر ہی ہوتا۔“

اس آواز کے ساتھ ہی فشی اندر آ گیا۔ اس نے والا ان میں لیٹے ہوئے ماسٹر کو دیکھا اور اس کی جانب بڑھ گیا، پھر اس کے قریب بیٹھ گیا تو ماسٹر دین محمد نے یوں پوچھا جیسے خود پر قاپو پار ہوا۔

”کیسے آئے ہو تم؟“

”یہی پوچھنے کہ تم نے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ چوہدری صاحب زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتے۔“ فشی نے کہا

تو ماسٹر دین محمد بولا

”اس نے اپنے گھر بلا کر ایسی گھنیا اور بیچ بات کی تھی اور اب تم میرے گھر میں بیٹھ کر کمینی حرکت کر رہے ہو۔“

”سنو ماسٹر! کیا تو نہیں جانتا کہ تو نے ذرا سی غلطی کی تھی اور تجھے بڑی سزا دی گئی۔ اب اگر کوئی ایسی بات کی تو یہ سزا میری آئندہ

نسل بھگتے گی۔ فہد کو پتا دے کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ فشی نے کہا تو ماسٹر دین محمد بے خوف لہجے بولا

”وہ دن گزر گئے۔ اب مجھے اور میری بیٹی کو موت سے ڈر نہیں لگتا۔ چوہدری نے سکول بند کر دیا، وہ اب کھل گیا ہے۔ تیرے

چوہدری کی اب یہ اوقات نہیں کہ اسے بند کر دے۔ کہہ دیتا اپنے چوہدری کو اور سمجھا دیتا اسے آئندہ ایسی فضول سوچ بھی نہ سوچے۔ ورنہ

شریف آدمی جب اپنی آئی پر آ جائے تو تیرے چوہدری جیسے کئی بے فیرت بہا کر لے جائے۔“

”تو نہیں جانتا۔ تیری بیٹی اگر نکلے چوہدری کی دلہن نہ بنی تو اس کا حشر کیا ہوگا تیرے پاس بھی ایک موقع ہے۔ عزت سے اپنی بیٹی کو رخصت کر دے ورنہ شاید اسے رانی کی طرح؟“ فشی نے دھمکی لگائی تو ماسٹر دین محمد نے غصے میں کہا

”تم یہاں سے چلے جاؤ تو اچھا ہے، ورنہ ابھی تیرے جوتے مار دوں گا۔ دفعہ ہو جاؤ۔“

یہ سن کے فشی خباثت سے مسکرا دیا پھر اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔

ماسٹر دین محمد بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور دل سوس کر رہ گیا۔ وہ دوبارہ لیٹ تو گیا لیکن کتاب نہ پڑھ سکا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ چوہدری نے مجھے ذلیل کرنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈا ہے۔ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ میں اپنی بیٹی انہیں کیسے دے دوں گا۔ نہیں وہ کوئی بہت گہری سازش کر رہے ہیں یا پھر وہ مصفیہ کی مدد کرنے پر سٹی کو انتقام کا نشانہ بنانا چاہ رہے ہیں۔ اب تو اس نے رانی کے بارے بھی اپنی آواز بلند کر دی ہے۔ ضرور یہ کوئی سازش ہے۔ میری پھول سی بیٹی۔ آہاں درندوں کے ظلم کا شکار ہو جائے، میں کبھی ایسے نہیں ہونے دوں گا۔

اسے کے تصور میں ایک بھیا تک منہرا بھرا۔ اس کی بیٹی سلمیٰ ایک صحرائی ویرانے میں درختوں کے درمیان اکیلی بھاگتی جا رہی تھی اور زور زور سے چیختے ہوئے پکار رہی تھی۔

”ابا! مجھے بھالو! مجھے بھالو! مجھے بھالو!“

ماسٹر دین محمد ایک دم سے چوٹکتے ہوئے بڑبڑایا

”نہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ صبر کی وہ حد آگئی ہے۔ جہاں زہاں بندی جرم بن جاتی ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے فہد سے بات کرنی چاہئے۔“

یہ بڑبڑاتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے بھر گیا۔ کچھ دیر ایسی کیفیت میں رہا اور پھر اچانک اپنا دل پکڑ کر رہ گیا۔

ماسٹر دین محمد بسز پر ڈھال پڑا ہوا تھا۔ سلمیٰ اور مصفیہ اس کے پاس تھیں۔ چھٹی، مسٹر دین محمد نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کراہتے ہوئے پوچھا

”فہد نہیں آیا ابھی تک؟“

”ابا! آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں آجائے گا وہ۔ آپ کتنی بار پوچھ چکے ہیں۔“ سلمیٰ نے دھیرے سے کہا

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ آئے گا۔ مجھے خود ہی چاہنا پڑے گا اس کے پاس۔“ ماسٹر دین محمد نے بے چارگی سے کہا۔ اتنے میں فہد دروازے میں نمودار ہوا تو مصفیہ بولی

”وہ آگیا ہے فہد۔“

یہ سن کر ماسٹر دین محمد کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ فہد اس کے قریب آ کر بولا

”حکم استاد جی۔ میں آگیا ہوں۔ لیکن آپ کو ہوا کیا ہے ایک دم سے؟“

”اچھا ہوا تو آگیا ہے پتر۔ میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔ اکیلے میں۔“ ماسٹر دین محمد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ سسٹی اور صفیہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم سے بدل گئے اور وہ اندر چلی گئیں۔ تنہائی پا کر ماسٹر دین محمد نے کہا

”بیٹا۔ اٹھاپہ چوہدری کوئی نئی سازش کر رہے ہیں۔“

”کیسی سازش، اور کیا۔ آپ مجھے کھل کر بتائیں۔“

فہد نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے حویلی میں بلوانے اور فٹی کے آنے تک ساری بات اسے بتادی۔ اس دوران فہد کا رنگ غصے میں سرخ ہوتا چلا گیا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”اپنی طاقت کے ذمہ میں یہ اس نے اچھا نہیں کیا استاد جی۔ میں اب تک بڑے صبر سے اس کا مقابلہ کرتا آیا ہوں۔ بہت عزت تک آگئی ہے۔ اب وہ حد پار کر گیا ہے۔ اب صبر کرنا بزدلی ہوگی۔“

”صبر ہر حال میں کرنا ہے پتر اور خصوصاً اس وقت جب سامنے کوئی گھٹیا قسم کے دشمن سے ہوں۔“ ماسٹر دین محمد نے اس سے کہا تو وہ غصے میں بولا

”جیسے آپ کا حکم استاد جی، لیکن اتنی اجازت ضرور دیں کہ گھٹیا دشمن کو احساس ضرور دلاؤں کہ وہ کس قدر گھٹیا ہے۔ کیونکہ دشمن کے ساتھ اچھا سلوک، نیکی نہیں ہوتی۔“

”یہ تیری مرضی ہے پتر جیسے تو چاہیے۔ لیکن سسٹی کو بچانوں۔ وہ بڑا اچھا دار کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں استاد جی۔ یہ منافقت اسی دن سے شروع ہوئی تھی، جب سلمیٰ نے مجھے یہاں آنے سے روکا تھا۔ میں نے بھی خفی پرو بیگنڈا سنا ہے اور سن رہا ہوں۔ منافقوں سے پنہنا مجھے آتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اپنا خیال رکھیں۔ میں یہ سب دیکھوں گا۔ اب یہ میرا معاملہ ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے استاد جی کا ہاتھ تھپتھپایا اور اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ سلمیٰ اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے بہت جلدی کی تھی۔



چوہدری جلال اور بشری بیگم حویلی کے اندرونی دالان میں بیٹھنے چائے پی رہے تھے۔ چوہدری جلال نے اپنی بیوی کے چہرے پر دیکھا اور پوچھا

”کیا بات ہے بیگم۔ اخیریت تو ہے نا، تم بہت اداس لگ رہی ہو؟“

”جی چوہدری صاحب۔! اخیریت ہے۔ بس آپ کو ایسے لگ رہی ہوں۔“ بشری بیگم نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا

”کچھ تو ہے۔ ویسے اگر تم نہ مانتا چاہو تو۔۔“

”میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بس وہ سوچ رہی تھی کہ وہ ماسٹر دین محمد کی بیٹی ہے ناسمجھی۔ اس نے عمر حیات والے گھر میں آفس بنالیا ہے۔ اب باقاعدہ اس کا افتتاح بھی کرتے والی ہے۔ مجھے جہاں تک پتہ چلا ہے، وہاں بیٹھ کر یہ اعلان کر رہی ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرے گی۔ میں یہ سوچ رہی ہوں یہ سب وہ رانی کے لیے کر رہی ہے، یا اس کے رد عمل کے طور پر؟“ بشری بیگم نے الجھتے ہوئے پوچھا تو چوہدری جلال مسکراتے ہوئے بولا

”وہ سلی بے چاری، اپنا حق نہیں بے پائی، کسی کو کیا حق دلائے گی۔ یہ سب وہ فہد کے کہنے پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے چوہدری صاحب، وہ گاؤں کی اتنی عورتوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔“ بشری بیگم نے بتایا تو چوہدری جلال بولا

”ہاں مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اب اس کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی لمبی سازش ہو رہی ہے۔ خیر انہیں نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

”کیسی سازش کیا ہونے والا ہے؟“ بشری بیگم نے چوہدری جلال بولا

”بیگم۔! میں کبیر کو صرف ایک جذباتی نوجوان سمجھتا تھا۔ لیکن اب پتہ چل رہا ہے وہ دور کی سوچتا ہے۔ اس نے جو سلی کو اپنی دلہن بنانے کے لیے کہا ہے، تا تو بالکل درست کہہ رہے۔ مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی شادی سلی سے ہو جانی چاہئے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ کیا مان جائیں گے، ماسٹر دین محمد ان جانے گا جو ساری زندگی آپ کا عتاب سہتا رہا ہے؟“ بشری بیگم نے حیرت سے پوچھا

”یہی تو بات ہے، وہ عتاب کیوں سہتا رہا۔ اگر اس میں ذرا سی بھی جان ہوتی تو یہاں سے چلا جاتا۔ اب بھی وہ میری بات چال نہیں سکے گا۔ تم دیکھ لیتا۔ درنہ میں جو چاہوں وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔“ چوہدری نے غرور سے کہا تو بشری بیگم بولی

”لیکن چوہدری صاحب، پیسے وہ اکیلے تھے۔ اب فہد ہے، نا، انکے پاس۔“

”جو میں سمجھتا ہوں۔ وہ تم نہیں سمجھ پاؤ گی بیگم، اب فہد کو اکٹھا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب وہ سلی، عوام کی نہیں، ہماری خدمت کرے گی۔ تم دیکھنا، ان کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا تو۔ بشری بیگم پریشان ہو گئی۔

وہ اس وقت باتیں کر رہے تھے جبکہ انہیں خبر نہیں تھی کہ حویلی کے باہر جینٹل کی وین پورچ میں آرکی تھی۔ اس میں سے مارہ کے ساتھ دوسرے لوگ اتر آئے تھے۔ انہیں ایک ملازم نے آکر بتایا تو چوہدری جلال نے حیرت سے اسے دیکھا پھر بولا

”انہیں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔“

ملازم یہ نہ کروا لیں چلا گیا۔

چیمبل والے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان والے صوفے پر چوہدری جلال بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ نے اس

سے سوال کیا

”میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ رانی نامی جس ملازمہ نے آپ کی اس حویلی میں خودکشی کی، اسے آپ نے دفنانے کی اتنی جلدی

کیوں کی؟“

”ہم نے تو اسے نہیں دفنایا۔ اس کے والدین آکر اسے لے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے شرمندگی کی وجہ سے جلدی کی ہو کیونکہ

اس نے چوری کی تھی۔“ چوہدری جلال نے بڑے قہر سے جواب دیا تو مائرہ نے پوچھا

”کیا چوری کی تھی؟“

”یہی کچھ رقم تھی اور زیور، شادی قریب تھی اس کی۔ حارث لکھنا سے معلوم تھا کہ ہم اسے بیٹیوں کی طرح رخصت کرتے۔ یہ حویلی

کی روایات ہے۔“ وہ اعتماد سے بولا

”اسی گاؤں قسمت نگر کی لڑکی سلسی نے آپ کے بیٹے پر جو الزام لگایا ہے، اس میں کس حد سچائی ہے؟“ مائرہ نے سوال کیا تو

چوہدری جلال بولا

”میرا چونکہ ایک سیاسی پس منظر ہے اور میرے مخالفین مجھ پر، میرے خاندان کے افراد پر ایسے سنگین الزامات لگاتے رہتے

ہیں۔ خودکشی کے فوراً بعد ہم نے پولیس کو بتایا، انہوں نے کارروائی کی۔“

”لیکن تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس دن قحطانی میں رپورٹ درج نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی ہسپتال سے میڈیکل

رپورٹ لی گئی ہے۔ کارروائی پھر کیا ہوئی، کیا آپ غلط بیانی نہیں کر رہے ہیں؟“ مائرہ نے اسے گھیرا تو چوہدری جلال اسی قہر سے بولا

”میں اس بارے کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے پاس اس کے ثبوت ہیں وہ میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔“

”یہ کاغذات آپ اپنے اثر و رسوخ سے ہوا سکتے ہیں۔“ مائرہ نے حمزہ سے کہا تو چوہدری جلال بولا

”اس پر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اب میں سیاست بھی تو میں اپنے اثر و رسوخ سے کر رہا ہوں۔ یہ صرف مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔

آپ خود جانیں اور تحقیق کریں۔“

”میں نے تحقیق کی ہے اور اس بنیاد پر آپ سے بات کر رہی ہوں۔ رانی آپ کے بیٹے کبیر کی ہوس کا نشانہ بنی ہے اور اسے قتل

کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے منیہ نامی خاتون کے شوہر قتل کا الزام آپ کے بیٹے پر ہے۔ جس کی باقاعدہ ایف آئی درج ہوئی ہے۔ اس پر

آپ کیا کہیں گے؟“ مائرہ نے تلخی سے کہا تو چوہدری جلال غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا

”آپ اگر تحقیق کر چکی ہیں تو پھر آپ میرے پاس کیا لینے آئی ہیں۔ میں ان الزامات کا سامنا کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ

میرے مخالفین کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملے گا جس سے وہ میری سیاسی سادھ کو خراب کر سکیں۔“

اس پر مائرہ سوال کرنے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ مائرہ نے حیران ہو کر دیکھا تو چوہدری جلال بولا
”بس بہت ہو چکے سوال، مجھے کچھ ضروری کام سے جانا ہے۔ باقی پھر سہی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ مائرہ اس کی طرف دیکھتی رہی
پھر مایوسانہ انداز میں اٹھ گئی۔ اسے سمجھا آگئی تھی۔

قسمت مگر گاؤں کی ایک گلی میں کچھ بوگوں نے ایک لکھا ہوا سینرا اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اسے لگانا چاہ رہے تھے۔ ایک لڑکا دوسرے لڑکے
کو صلاح دے رہا تھا

”ادھر ٹھیک ہے، ادھر لگا دیجئے ہیں۔“

تبھی ان کے پاس سے ایک آدمی نے گزرے ہوئے پوچھا

”اُوئے لڑکوا یہ کیا کر رہے ہو؟“

”نور پور سے آنے والے مہانوں کے لئے بیئر لگا رہے ہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا تو آدمی نے پوچھا

”کیا لکھا ہے اس پر؟“

”ہم ملکِ ضمیم کی آمد پر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔“

یہ سن کر وہ سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ لڑکے چاچا عمر حیات والے اس گھر کے سامنے جھنڈیاں لگا رہے تھے جواب سسلی کا آفس بن چکا تھا۔

سسلی اور صفیہ آفس میں تھیں۔ سسلی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھی ہوئی سامنے دھرے کاغذوں پر لکھ رہی تھی اور صفیہ ساتھ میں کھڑی

تھی۔ باہر ہارن بجا تو سسلی چونک گئی۔ اس پر صفیہ نے کہا

”گلتا ہے فہد آیا ہے۔“

سسلی خاموشی سے لکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد فہد دروازے کے فریم میں آن کھڑا ہوا اور بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا

”اجازت ہے میں اندر آ سکتا ہوں؟“

سسلی نے اسے بڑی شاکی نگاہ سے دیکھا۔ پھر سر کا اشارہ کر دیا۔ وہ آ کر کرسی پر بیٹھا تو سسلی نے صلیب سے کہا۔

”تم جاؤ صفیہ۔“ پھر فہد کی طرف دیکھ کر کے یوں ”یوں اجنبیوں کی طرح اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔“

”تم نے اپنے گھر میں آنے سے جو منع کر دیا تھا۔ سوچا کہیں یہاں بھی تو مجھ پر پابندی نہیں ہے۔“ فہد نے دھیمے لہجے میں کہا

تو سسلی نے سکون سے کہا

”میں نے دل میں رہنے سے تو منع نہیں کیا تا اور آپ جانتے ہو۔“

”میں جانتا ہی نہیں، سمجھتا بھی ہوں۔ میں ایک بات تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم نے دنیا کے مطابق نہیں اپنے مطابق جینا ہے۔ دنیا کو سوطرح کی باتیں کرے گی اور جینے نہیں دے گی۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”کیا یہ اچھا نہیں ہے، کسی کو بات کہنے کا موقع ہی نہ دیا جائے؟“ سلسلی نے پوچھا

”ذرا سوچو سسلی! امیرے آنے سے لے کر اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب اچانک کیوں؟ اسے سمجھ؟ کسی بدگمانی میں مت پڑنا ورنہ لمحوں کا حاصل صدیوں پر محیط ہو جائے گا۔ مت ڈرو۔ دنیا کیا کہتی ہے۔ بس ذرا وقت کا انتظار کرو۔“ فہد نے قہقہے سے کہا تو سلسلی بولی

”میں آپ سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتی۔ دور رہ کر بھی میں آپ کے ساتھ ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ آپ بھی مجھ سے غافل نہیں ہیں۔ اور مجھے یقین ہے یہ جدا جدا راستے ایک ہو جائیں۔“

”میں اس لیے آیا ہوں کہ ماہرہ، اپنی پوری ٹیم کے ساتھ یہاں قسمت بگڑ میں آگئی ہے۔ اب وہ یہاں کچھ دن رہے گی، تمہارے گھر میں، تمہارے ساتھ۔“ فہد نے بتایا تو سلسلی نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا

”وہ گھر کیا اس کے شایان شان ہوگا وہ تو۔۔۔“

”وہ ادھر اسی گھر میں رہے گی۔ بس تم اس کا خیال رکھنا۔“ فہد نے حتیٰ لچے میں کہا تو سسلی بولی

”جیسا آپ چاہو۔ میں اس بہت خیال رکھوں گی۔“

”دوسری بات کہ تمہیں افتتاح پر رقم کی ضرورت ہوگی، یہ سو۔۔۔ اور راجلے کے لیے یہ سیل فون۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے نوٹوں کی گڈیاں اور فون میز پر رکھ دیا۔ اور پھر کھڑا ہوا۔ سسلی نے نوٹوں کو دیکھ کر پھر اس کی طرف حسرت سے دیکھ کر پوچھا

”یہ اتنی بڑی رقم اور فون؟“

”ہاں۔ ایہ رکھو۔ میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ سسلی اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہی وہ لمحات تھے جب اسے فہد پر ٹوٹ کر بیاں آیا۔ یہی تو شخص تھا جس نے اسے اعتماد جیسی دولت سے نوازا۔ ایک دم ہی اس میں جوش بھر گیا۔ وہ اپنی حالت پر مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے صفیہ کو آواز دے کر بلایا۔ پھر خود ہی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

سسلی کے آفس کے دوسرے کمرے میں زمین پر دردی بچھائے دوڑکیاں بیٹھی کاغذ پر لکھ رہی تھیں۔ سسلی نے ان سے جا کر پوچھا

”فہرست تیار ہوگئی یا ابھی۔۔۔۔۔“

”جی ہاں، بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ ابھی مکمل ہو جاتی ہے۔“ ایک لڑکی نے سرائفہ کر کہا تو سسلی خوش ہوتے ہوئے بولی

”شاہباش، جلدی کرلو۔ پتہ ہے دو پہر تک کام مکمل کرنا ہے، شام کو افتتاح بھی ہے۔“

لفظ اس کے منہ میں ہی میں تھے کہ صفیہ نے آکر بتایا۔

”وہ باہر جھنگ والے آئے ہیں۔ تمہارے کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں۔“

”اوجھڑ نہیں، میں ان کے پاس جاتی ہوں۔“

سہمی نے کہا اور فوراً اس طرف بڑھ گئی۔ مائرہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سہمی اسے دالہا نہ انداز میں ملتے ہوئے بولی

”بہت خوش ہوئی تمہیں دوبارہ دیکھ کر۔“

”یقین جانو مجھے بھی بہت خوش ہو رہی ہے۔ اب تو میں کچھ دن ادھر ہی رہوں گی۔“ مائرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو سہمی بولی

”ابھی فہد یہاں سے گئے ہیں۔ تمہارے بارے میں بتا کر، آؤ بیٹھو، نہیں بلکہ گھر ہی چلتے ہیں۔“

”وہ بھی چلے جائیں گے، پہلے تھوڑا سا کام کر لیں۔“ مائرہ نے کہا تو سہمی بولی

”جیسے آپ کی مرضی۔“

کچھ دیر بعد سہمی اور مائرہ آٹنے سائے بیٹھی ہوئیں۔ صفیہ ان کے پاس کھڑی تھی۔ کسرہ مین اپنا کام کرتا تھا۔ تبھی مائرہ نے پوچھا

”رائی کے بارے میں آپ کا موقف کیا ہے۔ حویلی والے تو اس کی تردید کرتے ہیں۔“

”یہ حویلی والے اب تک ان بے زبانوں پر ظلم ہی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے رائی پر ظلم کیا، اس کے ثبوت اور شواہد موجود

ہیں۔ یہ ان کا کوئی پہلا ظلم نہیں ہے۔ نبھانے کتنے ظلم کیے ہیں انہوں نے۔“ سہمی سخت لہجے میں جواب دیا تو مائرہ نے اگلا سوال کیا

”آپ نے یہ جو تنظیم بنائی ہے، اس کا بنیادی مقصد کیا ہے؟“

”یہاں کے لوگوں کو بتاؤں کہ ان کا حق کیا ہے۔ رائی جیسی عورتوں کے حق کے لیے میں نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے

بھی پہلے میں اس خاتون صفیہ کو انصاف دلانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہوں۔ جس کے شوہر کو دن دیناڑے چوہدری کبیر نے قتل کر دیا

تھا۔“ سہمی نے کہا تو مائرہ نے پوچھا

”کیا آپ ظلم کے خلاف لڑیں گی؟ آپ کے پاس کیا طاقت ہے؟“

”مجھے اب کوئی خوف نہیں ہے۔ کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں میں چاہے زندگی ہار جاؤں لیکن انہیں ہمارے نہیں دوں گی، جن عورتوں کا

اب میں حوصلہ ہوں میں بھی اب ان ظالموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔“ سہمی نے جواب دیا

”کیا آپ تفصیل سے بتائیں گی کہ انہوں نے کیا ظلم کئے ہیں۔“ مائرہ نے پوچھا تو سہمی نے جرات سے کہا ”کیوں نہیں۔“ یہ

کہہ کر وہ بتانے لگی۔ سہمی کے چہرے پر عزم جھلکنے لگتا تھا۔ اس دوران صفیہ بھی روتے ہوئے اپنا موقف ریکارڈ کروا دیا۔

سہ پہر ہو گئی تھی۔ سڑک پر گاڑا سے باہر فہد، چھا کا اور چند لوگ کھڑے تھے۔ ایک بزرگ بندے کے ہاتھ میں ہار تھا۔ وہ سبھی

راہ تک رہے تھے۔ فہد اس جانب دیکھ رہا تھا۔ سارے لوگ اسی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک سڑک پر کاروں کا قافلہ آتا ہوا دکھائی دیا، جو

ذرا سی دیر بعد ان کے قریب آ کر رک گئے۔ ایک کار میں سے ملک نعیم ہی نکلا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا۔ بزرگ آدمی نے اس کے گلے میں ہار ڈالا تو سب جلوس کی صورت میں چل پڑے۔

جیسے ہی وہ سسلی کے آفس کے سامنے پہنچے۔ وہاں کافی سارے لوگ ملک نعیم اور فہد ہارے استقبالی لوگ نعرے لگ رہے تھے۔ ملک نعیم زندہ باد۔ دفتر کے باہر رہن لگا ہوا تھا۔ سسلی اور کچھ لوگ وہاں کھڑے تھے۔ ایک لڑکی نے اس کی جانب پلیٹ میں رکھی قیمتی بڑھائی۔ ملک نعیم نے رہن کاٹ دیا تو ہر طرف تالیاں بچ اٹھیں۔ گھر کے صحن میں سٹیج بنا ہوا تھا۔ میز کے پار سسلی، درسیان میں ملک نعیم اور گاؤں کا ایک بزرگ بندہ بیٹھ گیا۔

انہوں نے بڑا مختصر پروگرام رکھا تھا۔ پہلے سسلی نے ڈانس پر آ کر اپنا مقصد بتایا اور پھر ملک نعیم اٹھ کر سٹیج تک آ کر بات کرنے لگا۔ ”قسمت مگر کے معزز لوگو! میں یہاں کوئی سیاسی تقریر نہیں کرنے آیا۔ صرف اور صرف ان عظیم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے آیا ہوں۔ جنہوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ وہ بھی اس آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ کوئی انہیں غلام بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ ہمارے جمہوری ملک کی اصل طاقت عوام ہیں۔ جب تک عوام اپنے حقوق کا شعور حاصل کرے گی۔ اس وقت تک کسی بھی طرح کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ یہی شعور ایک محبت وطن قیادت سے کرائے گا۔ میں بھی آپ میں سے ہوں۔ ہم سب نے مل کر اس مشن کے لیے جدوجہد کرنی ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میں آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چوں گا۔“

وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بجاتیں تو وہ سٹیج سے واپس آیا۔ ملک نعیم زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔ وہ لوگوں میں آ گیا اور ان سے ہاتھ ملاتا رہا۔ وہ کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر اپنے ساتھ آئے قافلے کے ساتھ چلا گیا۔

شام وصل کرات میں بدل گئی تھی۔ ماسٹر دین محمد کے ساتھ سسلی اور مائرہ، تینوں صحن میں بھیجی ہوئی چادر پائوں پر بیٹھے ہوئے چائے پیا رہے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے سارے کاموں سے فارغ ہو کر صرف گپ شپ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماسٹر دین محمد کبہ ہاتھ۔ ”کبلی بات تو یہ ہے بیٹی، مجھے بہت اچھا لگا کہ تم نے ہمارے گھر کو رہنے کے لیے پسند کیا۔ جیسا بھی ہے، اس میں تمہارے رہنے کے لیے وہ سہولیات تو نہیں ہوگی۔“

”انگل، مگر کمینوں سے ہوتا ہے۔ بندہ وہیں رہنا پسند کرتا ہے جہاں وہ سکون محسوس کرے۔ آپ سے مل کر، سسلی سے مل کر، مجھے بہت سکون کا احساس ہوا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے خوشگوار انداز میں پوچھا، ”اور دوسری بات انگل؟“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، مگر کمینوں ہی سے بنتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے بیٹی کہ تم نے جو بتایا کہ اس علاقے کی رپورٹ بتاؤ گی تاکہ یہاں کا حال بیان کر سکو، یقیناً جو تم وہ کام کر رہی ہو جو ان لوگوں کا کرنا چاہتے تھے جو یہاں کے نمائندے بن کر ایوانوں میں جا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

ماسٹر دین محمد نے دُکھی لہجے میں کہا تو سہلی بولی

”وہ کیوں علاقے کی ترقی چاہیں گے اس طرح تو ان کی علاقے پر حاکمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ یہاں کے لوگ ان کے کھجے سے نکل جائیں گے۔“

”سہلی تمہارے خیال میں اس کا حل کیا ہے؟“ مائرہ نے پوچھا

”سہل عوام کے نمائندے وہ لوگ ہوں، جو ان کے مسائل حل کریں۔ کوئی مسائل حل کرنے کی سوچے گا تو حل ہوں گے نا۔“

اس دوران ماسٹر دین محمد نے چائے کا خالی کپ قریب پڑی میز پر رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا

”لو پتر تم کرو باتیں، میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر باہر کی جانب گیا تو مائرہ بولی

”بھئی ہار جب میں آئی تو بہت افراتفری میں تھی۔ اس بار بھی کچھ ایسے ہی تھا۔ لیکن پھر بھی میں تمہارے لیے کچھ گفت لانا نہیں

بھولی۔ مجھے امید ہے تمہیں پسند آئیں گے۔“

”مائرہ، تمہاری مہربانی کہ تم نے مجھے یاد رکھا۔ تمہارے آنے سے ہمیں بہت سہارا ملا ہے، ورنہ یہ چھوہری اپنی گھناؤنی سازش

میں کامیاب ہو جاتے۔“ سہلی نے محسوسیت سے کہا تو مائرہ بولی

”اب ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ میں پوری دنیا کو ان کا اصل چہرہ دکھاؤں گی۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ خیر

چھوڑ دو یہ تو ہو گا اور حل کر دیں گی۔ کوئی اور بات نہ کریں۔“

”مثلاً کیس باتیں؟“ سہلی مسکراتے ہوئے پوچھا تو مائرہ نے بے تکلفی سے کہا

”کچھ اپنے بارے میں کہو، کچھ میرے بارے میں پوچھو۔ دیکھو۔ اہم دوست تو بن گئی ہیں لیکن ایک دوسرے کے بارے میں ہم اتنا

نہیں جانتیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ چلو جان لیتی ہیں ایک دوسرے کے بارے میں۔“

سہلی نے کہا تو اس پر دونوں قہقہے لگا کر دیں۔



تھکا ہوا، چھکا گھٹن میں بھی چار پائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اندر سے چاچا سوہنا نکلا۔ وہ خوب تیاری کئے ہوئے تھا۔ صاف سحرے

کپڑے، جگڑی وغیرہ باندھی ہوئی تھی۔ وہ آکر چھاکے کے پاس بیٹھ گیا تو چھاکے نے حیرت سے پوچھا

”اہا۔ اخیر تو ہے یہ ٹیڈر شہور نکال کر، سرمد ڈال کر کسی میلے میں جا رہا ہے؟“

”نہ تو مجھے یہ بتا، دعوے تو یہ کرتا ہے کہ پورے علاقے میں تیری دس بچہ ہے، تجھے پتہ ہے اس علاقے میں کوئی میلہ ہے؟“

چاچا سوہنا معنوی غصے میں بولا تو چھ کے نے ہنستے ہوئے کہا

”میلہ تو نہیں ہے، پر یہ تیری تیری ایویں ہی مخالفت میں ڈال رہی ہے نا۔“

”میں ہر کسی میلے پر نہیں اپنی نبو (ہجو) تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا ہے اب تیراویاہ کر دوں۔ عورت کے بغیر گھر کتنا

سونا سونا لگتا ہے۔“ چاچا سوہنا مسکراتے ہوئے بولا چھ کے نے حیرت نے پوچھا

”ابا تجھے خبر تو ہے یہ کیسی باتیں کرنے لگ گیا ہے؟“

”میں کلا رہ گیا ہوں چتر، جو باتیں میں ادھر ادھر سے سن رہا ہوں مادہ بڑی خطرناک ہیں۔ ٹھیک ہے سکول کھل گیا ہے تو چوہدری

ایویں ہی چپ نہیں کر گئے، اس خاموشی کے بعد جو طوفان آنے والا ہے۔“ چاچے سوہنے نے تشویش سے کہا تو چھ کا بولا

”اوا، اب تو ایویں ہی ڈر رہا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اس دن چوہدری مجھے مار دیتے تو کیا ہوتا؟ تو اب بیٹش کر، جہاں تاش کی پانچ

ہاتریاں لگتا ہے نا، وہاں دس لگایا کر۔ میں نہیں پڑھ سکا اب تو آنے والی نسل تو پڑھے گی نا۔“

”پتر مجھے کھانا نہ کر جائیں۔“ چاچا سوہنا جذباتی ہو کر بولا

”تجھے کلا ہو نے کا اتنا ہی ڈر ہے نا تو سکول کے سامنے بیٹھ کر آلو چھو لے بچا کر، تیرا کچھ تو فائدہ ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر

دیکھ کے پوچھا، ”کدھر ہے میرا شہزادہ؟“

تجھی قریب ہی کہیں مرغابول دیا تو چاچا سوہنا ہنستے ہوئے بولا

”لے سن لے۔“

چھ کا اپنے مرغے کی طرف بڑھ گیا تو چاچا سوہنا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ چوراہے کی طرف تھا۔

چوراہے میں چاچا سوہنے کے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تاش کھیل رہا تھا۔ ارد گرد لوگ بیٹھے ہوئے کھیل

بھی دیکھ رہے تھے اور تبصرے بھی کر رہے تھے۔ حنیف دوکاندار بھی باہر نکل کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کے ساتھ اس کی درمیان باتیں چل

رہی تھیں۔

”اویار۔! جب سے یہ فہد آیا ہے نا گاؤں میں کوئی نا کوئی نئی بات ہی ہو رہی ہے۔ اللہ خیر ہی کرے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا تو

سامنے والا بندے نے پوچھا

”اب کیا کر دیا اس نے؟“

”دیکھو یار۔ ماشر دین محمد کی بیٹی نے کوئی دفتر کھول لیا ہے۔ وہ بھی عوام کے لیے۔ اب وہ بھلا عوام کے لیے کیا کر سکے گی جو خود

اکلی نور پر تک سفر نہیں کر سکتی۔“ حنیف دوکاندار نے طنز پر لہجے میں کہا تو وہ آدمی بولا

”اس میں فہد کہاں سے آ گیا۔“

”او پاگل۔ اور بھی تو اس مردین محمد کے گھر رہتا ہے۔ اس کی پڑھائی بخیر ہو چلی رہی ہے۔ سنا ہے سلمیٰ کے ساتھ اس کا بہت زبردست عشق چل رہا ہے، ورنہ اس کی جرات کہاں تھی۔ پہلے یوں دیکھا تھا اس کو۔“ حنیف دوکاندار نے سمجھا یا تو آدمی بولا

”بس بار، مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے، گاؤں میں کوئی طوفان ہی نہ آ جائے وہ بار بار چوہدری کو ہی لٹکا رہے ہیں۔“

تبھی چاچا سوہنا تاش ایک طرف رکھ کر بولا

”تو کیوں ڈر رہا ہے۔ تیرا کسی طوفان سے کیا لینا دینا، تیرے جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں کھاتے پیچے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ کسی کا درد کسی کا احساس کوئی کوئی جانتا ہے۔ اگر تم لوگوں کا احساس کرنے والا کوئی آئی گیا ہے تو اسے پیچو۔“

”چاچا پیچو کیا بات کر رہا ہے؟“ حنیف دوکاندار نے کہا تو چاچا سوہنا بولا

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ شعور وہیں آتا ہے جہاں انقلاب آتا ہو۔ اس بات کو سمجھو۔ اور چھوڑ دو فہد کی مخالفت۔ تیرے یہ چوہدری تجھے پہچانے نہیں آئیں گے۔ قلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔“

”یار۔ اکل گاؤں میں ملک فہم آ کر چلا گیا۔ اوئے مجھے ایک بندے نے بتایا ہے کہ اس کی اور چوہدریوں آپس میں بڑی مخالفت ہو گئی۔ اپنے اس نذیرے کے معاملے میں وہ صفیہ کی حمایت کر رہا ہے۔ اسی لیے تو وہ فہد کے پاس آیا تھا۔“ پاس بیٹھے آدمی نے بتایا

تو ایک دوسرے آدمی نے کہا

”یار اگر چوہدریوں کی مخالفت ہے تو پھر یہاں کے حالات بھی اچھے بھلے خراب ہو جائیں گے۔“

”اوضاعات کیا خراب ہونے ہیں۔ انہوں نے ملک فہم کے یہاں آنے کو اجمیت ہی نہیں دی۔ ورنہ اگر وہ چاہتے تو وہ یہاں آ کر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری ایسے بھی نہیں ہیں کہ اپنے مخالف کو نظر انداز کر دیں۔ یہ جو خاموشی ہے نا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی طوفان ہو گا۔ دیکھ لینا تم چند دنوں ہی میں دیکھ لینا۔“

حنیف دوکاندار نے کہا تو چاچا سوہنا تڑپ کر بولا

”اوئے سنو اوئے۔! جو طوفان آئے گا، اسے سبھی دیکھ لیں گے۔ تم یہ بتاؤ، وہ جو باتیں کر کے گیا ہے۔ وہ کیسی نہیں۔ یار، عجیب ہے وقف آدمی ہو، کیا چوہدریوں کا ظلم کرنا ہی لکھا ہے۔ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہم غریبوں پر ظلم ہی کرتے رہیں اور ہم ظلم سہتے رہیں۔ اور تیرے جیسے منافق لوگ ان کی خوشامد ہی نہیں، انکے خوف سے ڈراتے رہیں۔ چوہدری کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہیں کہ ان کی مخالفت نہ کی جا سکتی ہو۔“

”نہیں باتیں تو اس کی ٹھیک ہیں۔ مگر ان سیاست دانوں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ ان پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے

دھیمے لہجے میں کہا چاچا سوہنا بولا

”اگر طوفان کی جگہ ملک فہم لوگوں کے کام آنا شروع ہو جائے تو کیسا ہے؟“

”بھرتو چا چا ہمارے سارے مسئلے ہی نہ حل ہو جائیں۔“ پاس بیٹھے آدمی نے کہا تو چا چا سو ہنا بولا

”تو بس پھر اس بات کو سوچو۔ غور کرو اس بات پر۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پتے اٹھائے اور کھیل میں مصروف ہو گیا۔ لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے جس نے آج چوراہے میں بیٹھ کر چوہدریوں کی بھرپور مخالفت کر دی تھی۔



رات کے اندھیرے میں کاشی سڑک پر اپنی گاڑی بھگائے لے جا رہا تھا۔ ایسے میں ڈلیش بوڑد پر پڑا اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون اٹھا دیا اور اسکرین پر دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

”جی چوہدری صاحب، اتنی رات کو یاد کر لیا؟“

دوسری طرف چوہدری جلال حویلی کے کایڈور میں کھڑا فون کر رہا تھا۔

”بول کاشی۔ کیا بات ہے۔ جو فون نہیں کیا۔ کیا میرا کام یاد نہیں ہے تمہیں؟“

”میں نے سب طرح کا جائزہ لے لیا ہے۔ صرف دو دنوں میں کسی بھی وقت گاؤں سے باہر فہد کا کام ہو جائے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال بولا

”ہاں اس کا کام اب ہو جانا چاہئے بہت دن دے دیئے اسے۔“

”میرا کام کب ہوگا، چوہدری صاحب؟“

کاشی اپنے مطلب پر اتر آیا تو چوہدری جلال نے دبیڈے ہنسنے میں کہا

”تیرا کام بھی سمجھ ہو گیا، بس علاقے میں یہ افواہ بھی نہیں اڑنی چاہیے کہ اس معاملے میں ہمارا کوئی بھی تعلق ہے۔“

”کیا یہ آپ کی شرط ہے، میرے کام کے معاملے میں میں کام کروں گا تبھی آپ میرا کام کریں گے؟“ کاشی نے چونکتے ہوئے پوچھا

”نہیں شرط نہیں میں ابھی اوپر بات کرتا ہوں بس بہت محتاط ہوں تمہارا کام ہو گیا ہے سمجھو۔“

چوہدری جلال نے سمجھانے والی انداز میں کہا تو کاشی بولا

”آپ جانیں اور آپ کی احتیاط۔ میں کام کروں گا۔ آپ بھی میرا کام کر دیں۔ باتیں نہیں صرف کام۔“

”کہا ہے نا، ہو جائے گا۔ تم اپنا کام کرو، اوپر سے انکیشن بھی آنے والے ہیں۔“ چوہدری جلال نے کہا

”تو ٹھیک ہے آپ کا کام بھی سمجھ ہو گیا۔“

کاشی نے حتیٰ انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ آگئی تھی۔

چوہدری جلال کا ریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں چوہدری کبیر باہر جانے کے لیے نکلا تو اپنے باپ کو دیکھ کر اس بڑھ گیا۔ اس کی

طرف دیکھ کر چوہدری جلال نے کہا

”ابھی کاشی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ دونوں میں فہد کا کام ہو جائے گا۔“

”یہ اس کی سزا تو نہ ہوئی نا، ایک دم ختم ہو جائے گا۔ میں سسلی سے شادی کر کے اسے بتانا چاہتا ہوں کہ جب ہم دشمنی کرتے ہیں تو وہ قسملوں تک اتر گئی۔ میں اسے تڑپا دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چوہدری کبیر نے نفرت سے کہا

”وقت اور حالات کی نزاکت یہی ہے بیٹے۔ ملک فہم کا اس علاقے میں اتنا خطرے کا بہت بڑا الارم ہے۔ مسائل بڑھ جائیں گے۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھایا تو چوہدری کبیر یوں

”محض سسلی کو حاصل کرنا میری ضد نہیں ہے۔ میں فہد کے ساتھ علاقے کے لوگوں کو بھی بتانا چاہتا ہوں۔ کہ ہماری خاموشی، ہماری کمزوری نہیں ہوتی۔“

”دیکھو۔ فہد کے بعد تم جو چاہو کرو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اب یہ فیصلہ تمہارا ہے۔ پہلے کیا کرتا ہے۔ سسلی سے شادی یا پھر فہد۔“ چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر یوں

”چلیں بابا۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ آپ نے جو کہہ دیا ٹھیک کہہ دیا۔“

”یہ ہوئی نا بات۔ کاشی کو اپنا کام کرنے دو پھر دیکھتے ہیں۔“ اپنے باپ کے کہنے پر چوہدری کبیر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر مرکز پر راج کی جانب چلا گیا۔

باپ بیٹے کو خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے عقب میں بشری بیگم کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف زدہ حیرت ہوئی تھی۔



دن کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جعفر ابھی آفس نہیں پہنچا تھا۔ ملک فہم اور شیخ آفتاب اس کے آفس میں دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”ملک صاحب۔ آپ نے وہاں کی ساری رورود سنا دی۔ ٹھیک ہے، لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ فہد نے وہاں بہت کام کیا ہے۔ اب آگے کا بھی تو سوچنا ہے، کیا پلاننگ ہونی چاہیے۔ وہاں پر ہم نے بزنس ہی نہیں کرنا دوٹ بھی بیٹے ہیں۔ اور اس کا سارا دار و مدار فہد پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ چوہدری جلال کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا۔ اب فہد کی حفاظت بہت ضروری ہو گئی ہے۔“ شیخ آفتاب نے دورانہ کشی سے کہا

”یہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک چوہدری جلال نے اسے ڈرا یا دھمکایا ہی ہے۔ لیکن فہد بہت حوصلہ مند جوان نکلا۔ وہ مضبوطی سے ڈٹ رہا ہے۔ لیکن کب تک شیخ صاحب اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔“ ملک فہم نے بتایا

”جنگ وسائل سے نہیں جیتی جاتی ملک صاحب۔ اس کے بے حوصلہ اور وقار چاہیے۔ اگر وہ فہد کو راسخ سے ہٹا دیتے ہیں تو

پھر.....؟“ شیخ آفتاب نے سوال اٹھایا تو

ملک فہم بولا

”ہمارا ہاں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”تو پھر سوچئے۔ یہاں سے بندے بھیجیں یا وہاں سے تیار کریں۔ فہد کے گرد ایک حفاظتی حصار بنانا ہوگا۔ اور میں نے یہی بات کرنے کے لئے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی کہ ہم اے ایس پی صاحب سے اس سلسلے میں بات کریں۔“ شیخ آفتاب نے احساس دلایا تو ملک فہم نے سوچتے ہوئے کہا

”کیوں نہ یہ بات فہد سے کر لی جائے۔ وہ جو مناسب ہوگا، ہمیں بتائے گا۔ ہم اس کے لیے کریں گے۔“

”جیسے آپ چاہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اے ایس پی سے بات کریں۔ اس کے نوٹس میں یہ بات ہونی چاہئے۔ یہ تعداد کر رہا ہے، کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہئے۔“

شیخ آفتاب کے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد جعفر اپنے آفس آگیا تو دونوں سے بڑے تپاک سے ملا۔ بہت دیر باتوں کے دوران انہوں نے یہ خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔ جعفر نے سنا اور ان کی پوری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد وہ چلے گئے تو جعفر نے فون اٹھالیا۔

اس وقت فہد اپنے گھر کے مچن میں بیٹھا ہوا تھا کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔

”ہاں یوں، جعفر کیا بات ہے؟“ فہد نے خوشگوار انداز میں کہا تو جعفر سنجیدگی سے بولا

”کیسے ہو، کیسا چل رہا ہے تم آئے عی نہیں صلیب کی ٹوٹی پر؟“

”بس یہ رادھر ایک کام آگیا تھا۔“ اس نے بتایا تو نے گہری سنجیدگی سے کہا

”اچھا بات سن، آج ملک فہم سے بات ہوئی تو اس نے ایک خدشہ ظاہر کیا، جو بہر حال درست بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری تجھے

اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”اویار ان کا بس چلے تو مجھے ابھی ختم کر دیں۔ کوئی نئی بات بتا۔“ فہد نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا

”نہیں، میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں بالکل سیریس ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تو بہت محتاط رہا کر۔ اگر کہو تو میں کچھ

بندے.....“

”اویار چھوڑ جو تھوڑی بہت آزادی ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ تم کب آرہا ہے میرے پاس؟“ فہد نے اس کی بات کا نکتہ

ہوئے پوچھا

”دل تو بہت کرتا ہے کہ تیرے ساتھ رہوں۔ یہ ذرا معاملہ ختم ہو جائے تو پھر کھل کر تجھے ملا کروں گا۔ سنا مارہ کدھر ہے وہ؟“

جعفر اس کی بات سمجھتے ہوئے بولا تو فہد نے بتایا

”سلی کے پاس اس کے گھر، باقی لوگ میرے پاس۔“

”اچھا آنا فور پور تو سلی کے ہاتھ کے دو چار پر اٹھے تو آئے۔“ جعفر نے شوخی سے کہا تو فہد ہنسنے لگا

”تو بھی بس۔“

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔



بشری بیگم کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈائریکٹر کار چلا رہا تھا۔ جب حویلی سے کار نکالی تو اس نے ڈرائیو کو نہیں بتایا کہ

کہاں جانا ہے۔ راستے میں وہ اسے بتاتی گئی یہاں تک کہ سراج گاڑی روک کر اس نے ڈرائیو سے کہا

”گاڑی روکو۔“

اس نے فوراً گاڑی روک دی۔ بشری بیگم نے غور دیکھا۔ اسے کچھ دور فہد اور سراج بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ وہ گاڑی سے اترتی اور

ان کی جانب بڑھ گئی۔

فہد اور سراج دوستوں کی چھاؤں میں چار پائیوں پر آئے سانسے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ بشری بیگم کو اپنی

طرف آتا ہوا دیکھ کر چونک اٹھے۔ بشری بیگم ان کے قریب آ کر رک گئی تو سراج نے حیرت سے کہا

”چوہدرانی جی آپ؟“

”ہاں میں چوہدرانی بشری بیگم، میں فہد سے ملنے آئی ہوں۔“ بشری بیگم نے فہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جی فہد نے کسی تاثر

کے بغیر کہا

”جی بولیں، میں سن رہا ہوں۔“

”ہات صرف اتنی ہے بیٹا۔! پتہ نہیں تم میری بات پر یقین کر دو بھی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ میرے سینے میں بھی اک ماں

کا دل دھڑک رہا ہے۔ بیٹے! کیا یہ عقل مندی نہیں کہ طوفان آنے سے پہلے خود کو محفوظ کر لیا جائے۔“ بشری بیگم نے سمجھتے ہوئے نرم

لہجے میں کہا تو فہد بڑے تحمل سے بولا

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن جو طوفان میں گھر چکے ہوں۔ ان کا کیا کیا جائے اور جن لوگوں نے طوفان اٹھا ہوا ہے،

انہیں بھی روکنا ہے، طوفان بھی تھمے گا۔“

”میں طوفان سے ہونے والی تباہی سے ڈرتی ہوں۔ وہ چاہیے کسی کی بھی ہو۔ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ طوفان ہی نہ آنے دیا

جائے۔“ بشری بیگم نے پوچھا جسے سمجھتے ہوئے فہد نے کہا

”کیا چاہتی ہیں آپ، میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم تمہوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، یہاں سے چلے جاؤ۔ سسٹی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ ایک ماں ہونے کے ناطے میں وعدہ کرتی ہوں تم جو چاہو گے وہی ہوگا۔“ اس نے کہا تو فہد نے سکون سے کہا

”اس کے لیے تو بڑا وقت درکار ہے۔ میں پہلے ہی بہت انتظار کر چکا ہوں۔ یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”بیٹے بات سمجھنے اور سمجھانے میں تمہوڑا وقت لگتا ہے نا اور طاقت تو ویسے بھی اندھی ہوتی ہے۔ میں۔۔۔“

بشری بیگم نے کہا چاہا لیکن فہد اس کی بات کاٹ کر جہاڑتی لہجے میں بولا

”اندھی طاقت کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہے، جب کوئی اسے روکنے والا سامنے آجائے۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کہاں

کھڑا ہے۔ چوہدرانی جی آپ غلم ہوتا تو دیکھ سکتی ہیں۔ مظلوم اگر کھڑا ہو جائے تو اسے یہاں سے چمے جانے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ آپ

اپنے بیٹے اور شوہر کو سمجھائیں۔ میں بات مان بھی لوں تو کیا وہ آپ کی مان جائیں گے؟“

”بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ تم لمبی عمر گزارو۔ تم سمجھدار ہو۔ سسٹی ابھی۔۔۔“

بشری بیگم نے کہا تو فہد نے غصے میں کہا

”آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔ وہ بھی موت سے۔ میں بہت پہلے بچپن میں مر گیا تھا۔ خالوں کا ساتھ دینے والا بھی ظالم

ہوتا ہے۔ آپ مجھے نہ نصیحت کریں، نہ مشورہ دیں۔ بلکہ دیکھیں خالوں کے ساتھ ہوتا کیا ہے، کیا میرے والدین نہیں تھے، کیا قصور تھا؟

میرا، امین، نذیر، رانی ان کا کیا قصور تھا، ہے جواب آپ کے پاس؟ انہیں نا تو اپنوں کو روکیں، مجھے نہیں۔“

”لیکن بیٹا اگر ہم۔۔۔“

”نہیں چوہدرانی جی نہیں، جب رانی کو بے عزت کر کے مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب آپ کہاں تھیں؟ حویلی ہی میں تھیں۔ آپ کا

بچہ آپ کی بات مان گیا تھا؟ اگر وہ نہیں مانا تھا تو مجھ سے بھی کوئی امید نہ رکھیں۔ جائیں۔“

فہد نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو بشری بیگم نے انتہائی افسوس بھرے انداز میں اسے دیکھا اور پھر اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے

ہوئے واپس کار میں بیٹھ کر چلے گئی تو سراج نے دمیرے سے کہا

”لگتا ہے، چوہدری کوئی گہری چال چلنے والے ہیں۔ ورنہ یوں چوہدرانی کو نہ بھیجتے۔“

”سراج، جب ان کی جان پر ہتھی ہے نا تو یہ غریب کے پاؤں بھی دھو کر پی جاتے ہیں۔ اس بات کو سوچو، جب رانی کی عزت اس

بے غیرت کبیر نے پامال کی تھی یہ اس وقت کہاں تھی، آج یہ طوفان سے ڈرانے آگئی ہے۔“ فہد نے غصے میں کہا تو سراج مل کر رہ گیا۔ پہلی

بار اسے فہد کی نفرت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تبھی اس نے کہا

”جل چھوڑ۔ گھر چلیں، نور پور بھی تو جاتا ہے۔“

”ہاں چل۔“ فہد نے اٹھتے ہوئے کہا تو دونوں ڈیرے سے چل پڑے۔

کچھ دیر بعد فہد گھر سے نکل کر اپنی گاڑی کے قریب آ کر بیٹھنے لگا تو چچا کا اندر سے آ کر بولا

”یہ اپنی ڈاک تو لے لو۔ جو پوسٹ کرنی ہے۔ ورنہ آج پھر رہ جاتی تھی۔“

”اویار۔! اچھا ہوا تو نے یاد دلادیا ورنہ فور پور چا کر یاد آتا۔“ فہد نے کہا اور لفافے پکڑ کے ڈیلیں بورڈ پر رکھے پھر گاڑی

ڈریونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کر کے بڑھا دی۔

اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ کاشی موٹر سائیکل پر سوار گلی کی بکڑ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ فہد کی کار قریب سے گزر گئی تو کاشی بھی

اس کے پیچھے نکل پڑا۔

فہد پہلے سلسی کا آفس گیا جہاں لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ صفیہ تیار ہوئی کھڑی تھی۔ سلسی میز پر بیٹھی کاغذ پر لکھ رہی تھی۔ وہ لکھ چکی تو

کاغذ صفیہ کی جانب بڑھا کر بولی

”صفیہ اگر ممکن ہو یا پھر تمہیں پکھری سے وقت مل جائے تو آتے ہوئے نور پور سے یہ چیزیں لیتی آتا۔“

صفیہ نے کاغذ پکڑ لیا تو سلسی نے کچھ رقم بھی دروازے نکال کر دی۔ وہ بھی صفیہ نے پکڑ لی۔ پھر مایوسی بھرے لہجے میں بولی

”پڑنی تو بیٹھی ہے۔ نجمانے مقدمہ کب شروع ہوگا؟“

”اللہ کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس بار دیکھ لو، پھر ہم خود ملک خیم سے بات کریں گے۔ وکیل بدل دیں گے۔“ سلسی نے

اسے سمجھایا تو صفیہ بولی

”دیکھیں۔ کیا ہوتا ہے۔ وکیل بے چارہ تو بیوی کو شش کر رہا ہے۔“

وہ کہہ رہی تھی کہ دروازہ ہلکا سا جتا ہے اور فہد اندر آ کر بولا، ”صفیہ تم تیار ہو، چلیں۔“

”میں جی تیار ہوں بس آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

وہ آٹھل سنبھالتے ہوئے بولی تو سلسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا

”فہد۔! اگر میں کہوں کہ آج آپ نہ جاؤ تو...؟“

”کیوں میں کیوں نہ جاؤں۔“ فہد نے پوچھا

”آج نور پور سے محکمہ تعلیم کے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون آیا تھا ان کا۔ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتے

ہیں۔ اگر آپ سراج کو بھیج دیں صفیہ کے ساتھ؟“

”میں دیکھتا ہوں۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو سلسی نے تیزی سے کہا

”آپ سراج بھائی سے کہہ دیں وہ چلے جائیں گے۔ آپ ٹالیں نہیں نا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔“

”اچھا، میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلا گیا تو صفیہ بھی پیچھے چلی گئی۔ سسلی متذبذب سی بیٹھ گئی۔

قسمت مگر سے باہر جانے والی سڑک کے کنارے کاشی گھات لگائے موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شرک پر فہد کی گاڑی آ رہی ہے۔ جیسے جیسے کار نزدیک آ رہی تھی، کاشی مضطرب ہو رہا تھا۔ کاشی الرٹ ہو گیا۔ فہد کی گاڑی گزری تو اس نے موٹر سائیکل پیچھے لگا دیا اور اس کے ساتھ ہی ریو الورنکس لیا۔ وہ گاڑی کے قریب ڈرائیونگ سائیڈ سے پہنچا اور ریو الورنسیدھا کیا۔ تبھی وہ چونک گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سراج تھا جس کی نگاہ ریو الورن پر پڑی۔ کاشی نے کار میں جھانکا، فہد نہیں تھا۔ اس نے موٹر سائیکل آہستہ کرنی اور ایک دم سے پیچھے رہ گیا۔ سراج گاڑی بڑھا حات لے گیا۔

سراج کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک اچھٹی کس مقصد کے تحت ان کے قریب آیا اور پھر پٹ گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی صفیہ بھی سمجھ گئی تھی۔ سراج نے فون نکالا اور فہد کو کال کی۔ فہد اس وقت سسلی کے آفس میں تھا۔ سراج نے رابطہ ہوتے ہی کہا ”تم پر جو کا تھانہ حملے کی بات جعفر نے کہی تھی، اور چوہدرانی کی باتوں سے جو ہم نے اندازہ لگایا تھا، وہ بات حرف بحرف درست نکلا۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟“ فہد نے پوچھا تو سراج نے کچھ منٹ پہلے ہونے والے واقعہ کی روداد بتانے لگا۔ جسے سن کر اس نے کہا

”تم کچھری پہنچو، میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے جعفر کے نمبر پر کال کر دی۔

کاشی ایک جگہ رک گیا تھا۔ اس نے ریو الورن اپنی جیب میں ڈالا اور فون نکالا کہ چوہدری جلال کے نمبر پر کال کر دیے۔ وہ اپنے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہوا تھا، شاید وہ کسی خبر کا منتظر تھا اس لئے تیزی سے پوچھا

”ہیلو۔ ایو لو، کیا ہوا؟“

”میں تو اس تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور بندہ تھا۔ لگتا ہے اسے خبر ہو گئی ہے۔“ کاشی نے کہا تو چوہدری جلال نے غصے میں کہا

”یہ کیسے ممکن ہے۔ کہیں وہ بندہ...“

”نہیں، میں نے اسے جانے دیا۔ مگر میں یہ بات نہیں مان سکتا۔ کہ اسے اطلاع نہیں، ورنہ میں صبح سے اس کے پیچھے ہوں۔ اسے ہی فور پور جانا تھا۔ پتہ کریں اسے خبر دینے والا کون ہے؟“ کاشی نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا تو چوہدری جلال بولا

”اگر ایسا ہے تو پھر یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔ تم میرا کام کرو، میں تمہارا کام کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، بس ایک دو دن میں ہو جائے گا۔“ کاشی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جبکہ چوہدری جلال گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

سہمی اپنے آفس میں بیٹھی لڑکیوں سے بات کر رہی تھی۔ ایک لڑکی نے چستے ہوئے کہا

”ہاجی۔ گاؤں میں بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔ انہیں تو یہ یقین ہی نہیں تھا کہ دفتر کا افتتاح ہو جائے گا۔ اب تو یہ محکمہ تعلیم والے بھی آگئے اور این جی او، والے بھی“

”ہاں۔! میں جانتی ہوں۔ لیکن اب بہت سارے لوگ ہم سے رابطہ کر رہے ہیں۔ یہ سارے وہ لوگ ہیں جو صنفیہ کی طرح ان چوہدریوں کے ستائے ہوئے ہیں۔“ سلمیٰ نے اسے بتایا تو وہ بولی

”ان کا ظلم کب تک چلے گا۔ آخر ایک دن تو ختم ہوگا۔“

”ایک اور بات بھی ہے، کوئی بھی ہم پر اس لیے ظلم کر جاتا ہے کہ ہم کمزور ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ ہم اپنی روٹی کے چکر میں اپنی اولاد کو پڑھا لکھا کر انہیں مضبوط نہیں بناتے ہمیں خود مضبوط ہونا ہے۔“ سلمیٰ نے سمجھایا تو وہ لڑکی بولی

”لیکن ہاجی۔ ہم غریب لوگ اتنے وسائل کہاں سے لائیں۔ ہمارے بچوں کو ہمارے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ پیٹ پالنا ہی اتنا مشکل ہے۔“

”میں مانتی ہوں۔ ایسا ہی ہے۔ میں کہتی ہوں حکومتیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں اگر ہم اپنے آپ کو بدل لیں۔ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ ہم خود اپنے بچوں کو پڑھائیں۔ انہیں ہنرمند بنائیں۔ خود قربانی دے لیں۔ پھر کل ہماری اگلی نسل کا ہے۔ بچے تو ہمارے ہیں نا۔ اب دیکھو! ہم سب نے ایک ہو کر یہ دفتر کھولا ہے نا جو چوہدری بھی جرات نہیں کر سکے۔ میں اکیلی تھی لیکن خدا نے ایسے حالات پیدا کر دیئے۔ لوگ میرے ساتھ ہوتے گئے۔ اب میں چوہدریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں۔ ہمیں خود کو بدلنا ہے۔ بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آنے والے ہر دن میں لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ دیکھ لیتا۔“ یہ کہہ کر وہ خوش کن خیال میں گم ہو گئی۔

مارہ محن میں فون کان کو لگائے جھڑ سے بات کر رہی تھی۔ جھڑ نے اسے بتادیا تھا کہ فہد کیسے بچ گیا ہے۔ اس پر قاتلانہ حملہ کیسے ہونے والا تھا۔

”تم نے ابھی سلمیٰ کو نہیں بتانا، فہد خود ہی بتا دے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مارہ نے کہا پھر لہجہ بھر کوڑک کر بولی، ”میں نے رپورٹ بھیج دی ہے۔ ایک دو دن میں اسے اچھی طرح بتالیا جائے گا تو پھر آن ایئر کر دی جائے گا۔“

”بس رپورٹ ایسی ہونی چاہئے کہ بالکل سچ جائے۔ اس کا کچھ اثر ہو خیر، کیسی لگی تمہیں سلمیٰ۔“ جھڑ نے ایک دم موضوع بدل کر پوچھا تو مارہ نے کہا،

”اسے میں نے دیکھا ہے، وہ تو ٹھیک بول لیتی ہے۔ اس نے تو بہت باتیں کی ہیں۔ بہت اچھی ہے وہ۔“

”اس نے بھی تو چوہدریوں کا ظلم سہا ہے۔ مطلب کچھ چوہدری نے تو بہت کوشش کی لیکن یہی اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ کبھی موقع

ملا تو میں ان کی کہانی سناؤں گا۔ اس کے اندر کا دکھ بول رہا تھا۔ بلکہ میں ہی کیوں تم خود سن بیٹا۔ میرے خیال میں اب تک دوستی ہوگی ہوگی۔“ جعفر نے کہا تو مائرہ نے بتایا

”اسی کے آفس میں ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگا ہے اس سے دوستی کر کے۔ میں اسے لے کر آؤں گی فوراً۔“

”یہ جب تمہیں فہد آنے کی اجازت دے گا تاں تم حب ہی آ پاؤ گی۔“

جعفر نے چھیڑتے ہوئے کہا تو مائرہ اسے نظر انداز کر کے بولی

”اچھا پہلے مجھے بھی اس علاقے کی عمر دیوں کے بارے میں اتنی سمجھ نہیں آتی تھی لیکن اب یہ رپورٹ بنا کر لوگوں سے مل کر،

سلی سے باتیں کر کے پتہ چلا۔“

”جب تم نے یہاں کے پورے علاقے کا ایک وزٹ کر لیا تو بہت کچھ مزید بھی سمجھ جاؤ گی۔ میں یہاں آیا ہوں تو مجھے معلوم ہوا

تھا۔“ جعفر نے بتایا تو مائرہ نے پوچھا

”یہاں آ کر تم نے فہد کی کیا مدد کی؟“

”پورے علاقے میں جو بھی چور دیروں کے مخالف ہیں اپنی اپنی جگہ سب کو میں نے اپنی ہاتھ میں لے کر انہیں فہد سے متعارف

کرا دیا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس کا رابطہ ہے۔ ابھی تک لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔“

”ہوں میں سمجھ گئی۔ اوکے جعفر میں بھی کوشش کروں گی کہ اس کے کام آسکوں۔“ مائرہ نے کہا تو جعفر بولا

”اس کے کام آسکتی ہو۔ اسے روٹی بنا کر دینے والا کوئی نہیں ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے پاس تو سلی ہے، میرے پاس کوئی نہیں۔“

”مجھے آنے تو دو پھر دیکھتی ہوں تجھے۔“ وہ معنوی غصے میں بولی تو جعفر ہنس دیا۔ وہ بھی ہنس دی۔ پھر فون بند کر کے سلی کی

طرف چلی گئی۔

اس وقت جعفر نے فون رکھا ہی تھا کہ ملک ضمیمہ کا فون آ گیا۔ اس نے فوراً ہی کہا

”ہیلو۔ اجی۔ جعفر صاحب۔ یہ انکیشن کی خبر آ رہی ہے ٹیلی وژن پر، کیا آپ نے خبر دیکھی؟“

”جی۔ انکیشن کی تاریخ کا اعلان ہو گیا ہے۔ مجھے اطلاع ہو گئی ہوئی ہے۔ اب آپ کے لئے وقت بہت قیمتی ہے۔“ جعفر نے کہا

تو ملک ضمیمہ بولا

”یہ جو کئی حالات اچانک بدل رہے ہیں۔ ان میں کچھ بھی متوقع تھا۔ بے شک اب وقت بہت قیمتی ہے انکیشن جیتنے کے لیے

اب جتن کچھ بھی کر لیا جائے وہ کم ہے۔“

”تو پھر انکیشن لڑنے کی بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔ لوگوں سے رابطہ کریں فوراً باقی آپ کو معلوم ہے کہ کیا کچھ کرنا ہے۔ اب تو

ایک ایک کر جیتی ہے۔“ جعفر نے کہا تو وہ بڑے جوش اور جذبے سے بولا

”ایکشن کی تجریاں تو کب کی شروع ہیں۔ بس یہ ایکشن شیڈوں کا انتظار تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں دوستوں سے رابطے میں ہوں۔ ہم بھر پور طریقے سے ایکشن لڑیں گے۔

”بس یہی اعتماد اور حوصلہ چاہئے۔ میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم رابطے میں رہیں گے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا تو ملک فیم نے کہا

”کیوں نہیں جی۔ یہ سب معاملات صلاح مشورے سے ہی چلتے ہیں۔ میں فہد سے ملتا ہوں اور ایکشن ہارے پلان ترتیب دیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، آپ کل مجھے آفس میں ملیں۔ باقی باتیں یہاں ہوں گی اللہ حافظ۔“ جعفر نے کہا

”اللہ حافظ۔“ وہ بولنا اور فون رکھ دیا۔ جعفر نے بھی فون رکھا اور سوچنے لگا۔ اب فہد سے ایک ملاقات بہت ضروری تھی۔



ایکشن کا اعلان ہوتے ہی حویلی کی رونقیں بڑھ گئیں تھیں۔ علاقے کے لوگ اس کے پاس آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی کچھ ایسے ہی سہاں تھا۔ چوہدری جلال بڑے کردار سے ڈرائیگ روم میں تھا۔ جمیل اختر ایک طرف اور اس کے حمایتی وہ لوگ موجود تھے جو کسی نہ کسی طرح اس کی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وہ مفاد پرست ٹولہ تھا جو اسے ایکشن جتواتے اور اپنا مفاد پورا کرتے تھے۔ ایکشن کرنا تھا ہی یہ لوگ کھمبیوں کی طرح اُگتے تھے۔ چوہدری جلال ان سب کی طرف دیکھ کر کہہ

”یہاں پر آپ سب کو زحمت دینے کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہے۔ ایکشن ہو جائیں گے۔ اس کا پتہ تو تھا لیکن اس قدر جلدی ہونے والے ہیں یہ اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے ہم نے ایکشن میں حصہ تو لینا ہے۔ اب صلاح مشورہ کر لیں کہ کیا کرنا ہے۔“

”چوہدری صاحب۔ پہلے تو آپ بلا متبادل منتخب ہوتے آئے ہیں۔ چھوٹی سیٹوں پر ہی متبادل ہوتا ہے۔ اس میں بھی ہمارے ہی بندے جیت گئے۔ لیکن اس دفعہ ایکشن خائف ہو گا۔ آپ کے مقابلے میں ملک فیم آچکا ہے۔“ جمیل اختر وکیل نے اسے حالات سے آگاہی دی۔ تو چوہدری جلال بولا

”میں جانتا ہوں۔ مقابلے میں ہر کوئی اتر سکتا ہے۔ یہ اس کا جمہوری حق ہے۔ لیکن ووٹ لے کر جیتنا ایک دوسرا مقابلہ ہے۔ اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

”چوہدری صاحب۔! مقابلہ تو بین کیا ہے نا، باہر تو لکنا پڑے گا نا آپ کو۔“ اس نے اہلاد عاتقا یا تو چوہدری جلال نے سمجھتے ہوئے کہا

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پہلے بھی تو نکلتے تھے۔ خیر۔! یہ فیصلہ آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے کہ چھوٹی سیٹوں پر ایکشن کسے لڑانا ہے؟“

”نہیں نہیں جی۔ یہ فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہے آپ نے تو ہمیں حکم دیتا ہے۔ ہم دن رات ایک کر دیں گے۔ ایکشن ہم نے ہی جیتنا ہے۔“ وہاں پر موجود ایک شخص نے کہا تو چوہدری جلال اسے دیکھ کر بولا

”انکیشن تو ہم ہی نے جیتنا ہے۔ ہم نور پور اور ملتان کے لوگوں سے صلاح مشورہ کر کے پھر بندے کھڑے کریں گے۔ کیوں دیکھ صاحب۔“

”ایسا ہی ہونا چاہئے۔ ہم ایک دو دن میں یہ میٹنگ رکھ لیتے ہیں۔ اور اس میٹنگ میں ہم یہ طے کر لیں گے کہ ایم پی اے کی سیٹ پر کس نے انکیشن لڑنا ہے۔“ جمیل اختر نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال پورا

”ظاہر ہے ایم این اے کی سیٹ پر تو میں ہی انکیشن لڑوں گا۔ باقی چھوٹی سیٹوں کے لیے آپ جو مناسب سمجھیں۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے پارٹی ورکر کو یہ باور کرا دیا تھا کہ مرضی اسی کی چلتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ گیا اور پارٹی ورکروں کو کھانے پر بلا لیا گیا۔

اسی دوپہر حویلی کے پورچ میں چوہدری جلال خٹک کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی، جس پر فلپک لگا ہوا تھا۔ اس میں سے پارٹی عہدیدار نکلا، جو اسی حکومت میں سینئر وزیر بھی تھا۔ وہ انکیشن کے لئے طوفانی دورے پر تھا۔ چوہدری نے پوچھا کہ اس کا استقبال کیا۔ وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوشی سے بولا

”خوش آمدید بہت خوشی ہوئی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ آئیں تشریف لائیں۔“

وہ دونوں اندر کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں آسنے سامنے صوفے پر تھے۔ ان کے سامنے لوازمات تھے۔ پارٹی عہدیدار وہاں موجود سیاسی ورکروں کو مل چکا تھا، ان سے وہی پرانی سیاسی گھسی پٹی باتیں اور وعدے کر چکا تھا۔ پھر چوہدری جلال کے پاس بیٹھ کر کہا

”دیکھیں چوہدری صاحب میرے پاس اتحادت نہیں۔ مجھے آگے بھی جانا ہے، بس آپ سے دو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس پر دھیان دیں گے۔“

”جی کہیں میں سن رہا ہوں۔“

”کل ٹی وی پر جو آپ کے متعلق رپورٹ چلی ہے۔ اس نے نہ صرف پچھلے چاروں سالوں کے بلکہ پارٹی کو بھی اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ جو مرضی کریں، جو مرضی کہہ دیں اس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا؟ آپ اپنی باتوں ہی میں جموٹے لگ رہے تھے ٹی وی رپورٹ میں۔ کیا آپ کو بات کرنا نہیں آتی؟“

تبھی چوہدری جلال گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا

”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”آپ کو کیا سمجھ آتی ہے۔ آپ کے بیٹے پر قتل اور عزت پامال کرنے کا مقدمہ ہے۔ ہوا آپ کی خراب ہو رہی ہے اور پر سے اوارے ہماری جان کو آئے ہوئے ہیں کہ آپ ہماری پارٹی کے جس کیا آپ نے انکیشن نہیں لڑنا؟“ پارٹی عہدیدار نے طنزیہ انداز میں کہا تو چوہدری جلال نے حیرت سے کہا

”انکشن تو لڑنا ہے۔ آپ گھبرا گئیں نہیں۔ یہ ہماری آباؤی سیٹ ہے۔ یہ کہا ہے۔ باقی رہے الزامات وہ محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے۔ میں ثابت کر دوں گا۔۔۔۔۔“

”صاف سمجھئے گا چوہدری صاحب۔ وہ جب ثابت ہوگا سو ہوگا، اس وقت تو ہوا آپ کے مخالف ہے۔ آپ کو پارٹی نے ٹکٹ دینا ہے اور آپ کو میڈیا کے ساتھ بات کرنا نہیں آتی۔“

”اب اس کا کیا حل ہے کیا چاہتے ہیں آپ؟“

چوہدری جلال نے پوچھا تو پارٹی عہدیدار اسے سمجھاتے ہوئے بولا

”دیکھیں جی مجھے نہیں لگتا کہ اس بار آپ بلا متبادل جیت جائیں گے۔ انکشن تو ہوگا۔ اگر آپ نے سیاست کرنی ہے تو اپنے آپ کو بدلانا ہوگا۔ یہ پرانی باتوں کو چھوڑنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جی، میں دیکھتا ہوں۔“ وہ دھمکے سے لہجے میں بولا تو پارٹی عہدیدار نے کہا

”صرف دیکھنا ہی نہیں اس کا حل بھی نکالنا ہے۔ اداروں کا بہت دباؤ ہے ہم پر اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیسے“ یہ کہتے ہوئے وہ اسے سمجھانے لگا۔



ملک نعیم کے گھر شیخ آفتاب، فہد اور ملک نعیم تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان موضوع انکشن ہی تھا۔ شیخ آفتاب نے صلاح دیتے ہوئے کہا

”فہد! آپ کیوں پریشان ہیں۔ دوستوں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ اور اتنے لوگوں کی رائے کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آپ تیاری کریں انکشن کی۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ اب یہاں کے لوگوں میں حوصلہ ہے۔ لوگ بدل رہے ہیں، ان کی سوچ میں تبدیلی آرہی ہے۔“

”اور فہد، لوگ پرانے چہروں کو آزما کر اکتا چکے ہیں۔ اب نئے لوگوں کو آگے آنا چاہئے۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ جو نئی قیادت ہے۔ وہی دراصل ان کی مجلس قیادت ہے۔ وہ نہ صرف ان کے مسائل کو سمجھتے ہیں بلکہ وہی حل کریں گے۔“ ملک نعیم نے اپنی رائے دی تو فہد بولا

”ملک صاحب قیادت کی سوچ مثبت ہونے چاہئے مثبت سوچ کا بندہ ہی دوسروں کے دکھ درد کا احساس کرتا ہے۔ ورنہ پھر لڑنا اور لوٹ مار ہی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مثبت سوچ کے مالک ہیں۔“

”آپ کی بات ٹھیک ہے فہد۔ لیکن نوجوان قیادت کو بھی موقع ملنا چاہئے۔ وہ زیادہ بہتر انداز میں قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔“

شیخ آفتاب نے کہا فہد بولا

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شیخ صاحب! لیکن میں نے انکشن نہیں لڑنا۔ میرا جو کام ہے، وہی کرنے دیں۔ مجھے ایک عام آدمی ہی رہنے دیں۔“

”کیا ایک عام آدمی اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا؟ میرے خیال میں وہ زیادہ عوامی حقوق کی بات کر سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ نے یہاں کتنی محنت کی ہے۔ اب الیکشن تو آپ ہی کوڑتا ہے۔ ہار جیت کو چھوڑیں۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ ہی ان کے حقیقی نمائندے ہیں۔“ ملک نعیم نے کہا تو فہد قحط سے بولا

”دیکھیں میں تو عوام کی صلاح و بہبود کے لیے کام کروں گا۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں عوام کی قیادت کا حق بھی رکھتا ہوں۔ نمائندگی کا حق میرٹ پر ہونا چاہئے۔ جو بہتر نمائندے ہیں انہیں آگے لے آئیں۔“

”بہتر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ ملک نعیم نے پوچھا تو فہد نے جواب دیا

”وہی جو پورے دل سے، پوری توجہ کے ساتھ خلوص نیت سے عوامی مسائل حل کرنے کی سبک دود کر سکیں۔“

”یہ جو تبدیلی کا خوشگوار جھوٹا آگیا ہے، اس سے لوگوں کو مایوس نہ کریں۔ آپ کے الیکشن پر جو خرچ آئے گا۔ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ میں کروں گا۔“ شیخ آفتاب نے کہا تو فہد بولا

”بات خرچ کی نہیں ذمہ داری کی ہے۔ اگر آپ ایک چھوٹی سیٹ کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتے ہیں تو پھر آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ میں چاہے جسے مرضی الیکشن لڑاؤں۔ میں اس کی پوری ذمہ داری لوں گا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ فیصلہ تو آپ کے حق میں ہے۔ اس طرح پارٹی ٹکٹ کا مسئلہ بن جائے گا۔“ ملک نعیم نے کہا تو فہد نے حتی انداز میں بولا

”سوچ لیں آپ دوبارہ صلاح مشورہ کر لیں۔ پارٹی ٹکٹ کا مسئلہ میں خود حل کروں گا۔“

”یہ سیٹ ہم نے آپ کو دی۔ جسے چاہیں الیکشن لڑائیں۔ اتنی بڑی بات ہے کہ چند ہدیوں کے علاقے سے ان کے مقابلے کے لیے پورا بٹل کھڑا ہو جائے۔ فہد صاحب۔! آپ جو چاہیں سو کریں۔ ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں۔“ شیخ آفتاب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو ملک نعیم نے تائید کرتے ہوئے کہا

”میری تو حمایت آپ کے ساتھ ہے ہی۔ بس جو کرنا ہے، جلدی کریں۔“

”ہو گیا۔ صرف ایک دن چاہئے۔ کل میں وہ آپ کو بتا دوں گا۔“ فہد نے سوچتے ہوئے کہا تو شیخ آفتاب بولا

”یہ تو ہو گیا۔ اب ہم کچھ دوسرے معاملات دیکھیں۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ تینوں دوسرے معاملات پر باتیں کرنے لگے۔

ذہلیق ہوئی شام میں فہد نے سلمیٰ کے آفس کے سامنے کار روکی اور آفس میں داخل ہوا۔ سلمیٰ باہر صحن میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس وقت فہد کو سلمیٰ خوبصورت دکھائی دی۔ فہد آکر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

”میں اچھی ہوں، اس لیے اچھی لگ رہی ہوں۔ آپ بتائیں کیسے آنا ہوا۔ اور یہ تمہید کیوں باندھی جا رہی ہے۔“ سسلی نے شوخی

سے پوچھا تو فہد بولا

”ہاں۔! میں نے تم سے کچھ کہنا ہے سسلی۔“

”ٹھیک ہے کہیں۔! میں سن رہی ہوں۔“ سسلی اٹھلا کر یوں تو فہد نے سنجیدگی سے کہا

”یہ جوائنکشن آرہا ہے نا، میں چاہتا ہوں تم چھوٹی سیٹ کے لیے ایکشن لڑو۔“

اس کے یوں کہنے پر سسلی ایک دم سے گھبرا گئی، یوں جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ پھر دھیسے سے ہجھ میں بولی

”فہد میں کس طرح ایکشن لڑ سکتی ہوں۔“

”جس طرح دوسرے لوگ ایکشن لڑتے ہیں۔“ فہد نے شوخی سے کہا تو سسلی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اس کی نگاہوں

میں محبت اتر آئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی

”جیسے آپ کا حکم۔ ٹھیک ہے سر تسلیم خم ہے۔“

”لیکن؟“ فہد نے اس کے ایک دم مان جانے پر پوچھا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی

”یہ لفظ تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔“ آپ نے کہہ دیا، آپ کا حکم میں نے مان لیا۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوگا۔ میرے سامنے تو بس

آپ کی ذات ہے نا شاید محبت کیا، کیوں اور کیسے نہیں جانتی۔“

”بس مجھے کبھی اعتماد چاہیے۔“ اس نے اطمینان سے کہا پھر سوچ کر بولا، ”آؤ۔! اگر گھر جانا چاہتی ہو تو آؤ۔ میں ادھر ہی جا رہا

ہوں۔! استاد جی کو بھی تو بتانا ہے نا۔“

”چلیں۔“ وہ ایک دم مان گئی اور اٹھ کر چل دی۔

ماسٹر دین محمد نے ان دونوں کو اکٹھے آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر واضح مثبت تبدیلی آئی۔ پھر پرسکون سا ہو گیا۔ وہ اس کے

پاس آ کر بیٹھ گئے تو ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”خیر تو ہے۔ آج تم دونوں اکٹھے آئے ہو؟“

”خیر ہی ہے استاد جی۔ دراصل میں نے سسلی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔ اس بار چودھریوں کے مقابلے میں سسلی ایکشن

لڑے گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ ماسٹر دین محمد نے حیرت سے پوچھا تو فہد بولا

”کیا آپ کو اچھا نہیں لگا۔“

”یہ فیصلہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ میں تو بس دعا ہی دے سکتا ہوں۔ وہ دیتا رہوں گا۔“ ماسٹر دین محمد نے سوچتے ہوئے ایک دم سے

کہا تو فہد نے پھر تصدیق چاہی

”استاد جی۔ آپ ہماری اس کوشش پر دل سے کیا چاہتے ہیں؟“

”دیکھو بیٹا! سچائی کا جواب اگر سچائی ہوتا۔ تو یہ حالات اور وقت سنہرا ہوتا۔ مہوٹ کے مقابلے میں سچائی کی جیت تو ہے لیکن اس میں بڑی مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ اس کے لیے کبھی کبھی ایسی راہوں پر بھی جانا پڑتا ہے۔ جیسے دن اور مہراج دونوں قبول نہیں کرتے۔“

ماسٹر دین محمد نے ڈھکے چھپے انداز میں اپنا موقف کہہ دیا تو فہد نے سکون سے کہا

”آپ ہائل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اندھیرے میں قدیل اٹھانے والا تکلیف تو برداشت کرتا ہی ہے۔ مگر ہر سکون بھی تو دے

ہوتا ہے۔“

”ہاں! بعض اوقات ذرا سی فحشیت کے باعث غم کو بھی لگ گئی۔ انسان ایک غلط فیصلے کی وجہ سے گمراہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ جو تم

نے سسلی کو انکیشن لڑوانے کا فیصلہ کیا ہے کیا درست ہے؟“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”کیوں کیا ہوا استاد جی، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں لوگوں کے حقوق کے لیے جگ رہا ہوں۔ میں ہی اگر اپنے طبقے کی

عزت نہیں دوں گا تو اور کون دے گا؟“ فہد نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا

”میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ تم اگر امیدوار ہوتے تو زیادہ اچھا تھا۔ سسلی لڑکی ذات ہے۔ کامیاب ہو بھی گئی تو وہ کام نہیں کر

سکے گی جو تم کر سکتے ہو۔ اس نے ابھی تک نوپور نہیں دیکھا۔ وہاں دارالحکومت میں ایوانوں میں پریس کانفرنسوں میں وہ کیسے جائے گی۔ اس

کی ہمت نہیں پڑے گی بیٹا۔ وہ اس قدر بہت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

سسلی اس دوران اپنے باپ کے قریب آگئی اور بڑے جذباتی لہجے میں بولی

”ابا جی! یہ جو دن گزر رہے ہیں۔ میں نے ان دنوں میں ایسی ایسی کہانیاں سنی۔ لوگوں کے ایسے حالات معلوم ہوئے ہیں کہ

میں آپ کو بتاؤں تو دل مل جائے۔ لوگ کس طرح جی رہے ہیں۔ میں اب بھی ہوں، میرا دکھ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ہر فورم پر جاؤں گی

۔ میں بتاؤں گی کہ ہم لوگ کس کرب سے گزر رہے ہیں۔ اور ہاں اگر کوئی مشکل ہوئی تو فہد ہیں تا میرے ساتھ۔“ سسلی عزم کے ساتھ بولی

تو ماسٹر دین محمد نے اس کے چہرے پر دیکھا۔ یہی بار بار اسے اپنی بیٹی با اعتمادگی تھی۔ سو وہ بڑے قہقہے سے بولا

”اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ خیر۔ اتم لوگ بیٹھو، میں آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ماسٹر دین محمد باہر کی جانب چل دیا۔ وہ جا چکا تو سسلی نے پوچھا

”مجھے سمجھ نہیں آئی، ابا کیا کہتا چاہ رہے تھے۔“

”ان کی باتوں میں ایک باپ کے خدشات تھے۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا موقعہ نہیں دینا چاہئے۔ جس سے کسی کے دل میں بھی بدگمانی

پیدا ہو۔“ فہد نے بتایا

”میرے ابا کو مجھ پر اعتماد ہے۔“ وہ اعتماد سے بولی

”اچھی بات ہے۔ لیکن دشمن کا اعتماد نہیں۔ وہ ایسا زہر بھی اگل سکتا ہے جس سے دامن پر چھٹنے پڑ جائیں۔“ فہد نے اسے اصل بات بتائی تو سسلی نے عزم سے کہا

”کچھ نہیں ہوتا۔ میرا کردار ہی لوگوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔“

”انشا اللہ، ایسے ہی ہوگا۔“ فہد نے کہا تو سسلی کے چہرے پر حیا بھل گیا۔ فہد مسکرا دیا۔

اگلے دن کی صبح صبح سراج کے ڈیرے پر فہد واک کرنے کے انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ سراج تھا۔ ایسے میں ماثرہ کی کار آ کر رکی اور وہ باہر آگئی۔ سراج نے تیزی سے جا کر چارپائی کی طرف بٹھاتا کر اسے بچھا دے۔ ماثرہ اس پر جانتی تھی تو فہد بھی اس کے قریب آ گیا۔ تبھی وہ پرسکون سے انداز میں بولی

”تو یہ ہے فہد تمہارا اٹھکانہ۔“

”ہاں اور سمجھو میرا کپ آفس بھی۔“

فہد نے کہا تو اس پر دونوں ہنس دیے۔ پھر سراج کی طرف دیکھ کر ماثرہ نے پوچھا

”کیسے ہو سراج؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹیس میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ تب فہد نے کہا ”اب سنو، میں تم سے کیا بات کرنا چاہ

رہا تھا۔ جو گھر میں بے سسلی کے آفس میں نہیں ہو سکتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیسی مدد خیر بتاؤ؟“ ماثرہ نے کہا تو فہد بولا

”مجھے اس سیاسی پارٹی کا ٹکٹ چاہئے، جس میں تمہارے پاپا ہیں۔“

”الیکشن لڑ رہے ہو واؤ۔ بہت اچھی بات ہے مزہ آجائے گا۔“ ماثرہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو فہد بولا

”میں الیکشن نہیں لڑ رہا۔ بلکہ میں نے اپنے استاد جی کی بیٹی کو کامیاب کرایا ہے۔“

”کیوں، اسے کیوں۔ تم کیوں نہیں۔ وہ تو بہت معصوم ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں مولے کو شاہین سے لڑانے والی بات ہے۔“ ماثرہ

نے تہرہ کرتے ہوئے کہا

”مجھے بہتر اندازہ ہے کہ اپنے مقصد کے لیے مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ وقت بہت نازک ہے، ہمیں بہت محتاط ہو کر چلنا ہے تم اپنے پاپا

سے بات کر دو۔“ فہد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو، مزہ کا نہ ملے اچکا کر بولی

”خیر۔ اتم یہاں کی سیاست بہتر جانتے ہو۔ ٹکٹ تو مل جائے گا میں پاپا سے بات کروں گی بلکہ ان کو اس علاقے کی صورتحال بتا

کر پوری طرح کوشش کروں گی۔ ویسے بھی ان کی پارٹی نے لوگوں کو سامنے لا رہی ہے۔ میں خود بھی اپنی تعلقات آزمانے کی کوشش کروں

گی۔ یہ تو سمجھو کام ہو گیا ہے اور کوئی بات؟“

”نہیں فی الحال تو نہیں۔“ فہد نے سکون سے کہا تو مازہ بولی

”میں ابھی فون کر دیتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فہد بہت دباؤ میں محسوس کرتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔



چھ کا اپنے مرنے کے ساتھ مگن میں بیٹھا ہوا اسے ادا م کھلا رہا تھا۔ قریب ہی چار پائی پر چاچا سوہنا بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

چھ کے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر مرنے کی طرف متوجہ ہو کر بولا

”کھا شہزادے میرے اپنے کا مال، پر یہ دیکھ لے اگر تو ہار گیا، تیری بخنی میں نے ابے ہی کو پلا دی ہے۔“

”اوئے کب ہے اس کا مقابلہ؟“ چاچا سوہنا بولا

”مقابلہ، جس دن وی دارے جیسر نے مجھے چلیج کر دیا اس دن مقابلہ ہو جائے گا۔ پر تو کیوں پوچھ رہا ہے ابا۔“

”یار، وہ بخنی پہنچے برا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔“

اس پر مرقا بول پڑا تو چھ کا بولا

”دیکھا، یہ شہزادہ بھی ماسٹ کر گیا ہے۔ دیکھنا ابا جیت ہماری ہی ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی ہے چھ کا ہے اس سارے علاقے میں جس

کی دس پوچھ ہے۔“

”او تیری دس پوچھ سے یاد آیا، یہ فہد اصل میں کرتا کیا چاہتا ہے اور یہ سلمیٰ بھی ایک دفتر کھول کر بیٹھ گئی ہے۔“ چاچا سوہنا یوں بولا

جیسے تفتیش کر رہا ہو۔

”نا ابا مجھے یہ بتا، اگر تیری سمجھ میں بات نہیں آتی تو پھر تو بات ہی کیوں کرتا ہے۔ یہ انہوں نے کچھ نہیں کیا، اللہ سائیں نے ان

ظالم جو بدریوں کی رسی کھینچنے کے لیے انہیں بھیجا ہے۔ تو دیکھنا ان کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔“ چھ کا گہری سنجیدگی سے بولا

”اوئے میرے بھولے پتر، لوگوں کے سامنے اور خود کو سمجھانے کے لیے ہم بڑی بڑی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن یہ دل، اسے

کون سمجھائے، یہ جو فہد کرتا پھر رہا ہے اس سے کچھ ہوتا نظر تو آتا نہیں۔“ چاچا سوہنا مایوسی سے بولا

”ابا تو پھر تو اپنی نظر کا علاج کرا، پورے علاقے میں الجھل ہو گئی ہے۔“

چھ کے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو چاچے سوہنے نے ایک طویل سانس لی اور بولا

”اللہ کرے وہی ہو جو ہم سوچ رہے ہیں۔“ پھر لہجہ سوچ کر اٹھتے ہوئے بولا، ”لے فیر پتر میں تو چل۔“

یہ کہہ کر چاچا سوہنا گنگنا ہوا ہر کی طرف چل دیا

”جے ناں آترے یار دے نال پورے۔۔۔ ایڈے پٹے نہ سہڑے نی۔۔۔ وارث شاہ جے پیاس نہ ہووے اندر۔۔۔ شیشے

شرمناں دے نہ چھڑے لی۔“

چوراہے میں چاچا سوہنا اور وہاں موجود لوگ، سب باتیں کر رہے تھے اور ساتھ میں تاش بھی کھیل رہے تھے۔ ایک آدمی نے حنیف دوکاندار سے کہا

”لے بھی حنیف! الیکشن کا اعلان ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا ہوگا چار دن ہلا گلا۔ کاریں، جیپیں، موٹر سائیکل، شور شرابا ہوگا۔ نعرے لگیں گے۔“

”اوتے اصل بات تو یہ ہے کہ یہاں ہمارے علاقے میں سے الیکشن کون لڑے گا؟“ حنیف دوکاندار نے پوچھا تو اسی آدمی نے جواب دیا

”اوتے چوہدریوں نے ہی الیکشن لڑنا ہے۔ کسی غریب بندے کی کیا جرات ہے کہ وہ الیکشن لڑے۔“

”غریب کیوں نہیں لڑ سکتا۔ کیا اسے حق نہیں، فہم ہے نا۔“ چاچا سوہنا بولا تو وہ آدمی بولا

”اوبھولے بادشاہ۔ الیکشن میں نوٹ لگانے پڑتے ہیں۔ وہ بھی لمبے نوٹ۔“

اس پر حنیف دوکاندار قہقہہ لگا کر بولا

”اوتے اس فہم کی کیا اوقات کہ وہ چوہدریوں کے مقابلے میں الیکشن لڑے۔ اوتے اس کی اوقات ہی کیا ہے۔ اس کے پاس تو ڈیڑھ ٹنک نہیں ہے۔ وہ کیا لڑے گا الیکشن؟“

”تو حق کہتا ہے یار۔ وہ جیسے کہتے ہیں تاکوئی جانور گاڑی تو روک سکتا ہے لیکن گاڑی چلا نہیں سکتا۔ فہم واقعی الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ جیسے تو اس نے سارا زمینوں پر لگا دیا ہے۔ اب سارا کچھ بیچے گا تو ہی الیکشن لڑے گا۔“

اس آدمی نے کہا تو چاچا سوہنا بولا

”اوتے تم لوگ تو جملے ہو گئے ہو۔ اگر فہم نے الیکشن لڑا تو وہ جیتے گا ضرور یہ میرا دل کہتا ہے۔“

”اوجا چا! تو سیاست کی باتیں نہ کریں۔ اپنا کام کر فیصلہ میدان میں ہوتا ہے۔ صرف خواہش کر لینے سے سب کچھ ہاتھ نہیں

آ جاتا۔“ حنیف دوکاندار نے کہا تو چاچا سوہنا بولا

”میدان میں بندے ہی لڑتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ الیکشن صرف نوٹوں سے لڑا جاتا ہے اس کے لیے حوصلہ اور اتحاد بھی چاہئے

جواب چوہدریوں کے پاس نہیں رہا۔“

”جب علاقے میں جس قدر نوٹ پھنکیں گے نا اسی قدر ووٹ اٹھالیں گے۔“ حنیف دوکاندار نے طنز سے کہا تو چاچا سوہنا ہنستے

ہوئے بولا

”نوٹوں سے ترے جیسے بکا ڈال اپنا ووٹ بیچتے ہیں۔ اب نہیں کہنے والے ووٹ اب لوگوں کو شعور آ گیا ہے وقت ہی تبدیل

نہیں ہوا سوچ بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ اس بار انکسٹن کا تہجہ کچھ انگ ہی نکلے گا۔ اب ہوا چل پڑی ہے۔“
چاچے نے بڑے اعتماد سے ان کی طرف دیکھا پھر کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔



حویلی کے ڈرائیونگ روم میں چوہدری جلال اور وکیل جمیل اختر دونوں باتیں کر رہے تھے۔ غشی ان سے ذرا فاصلی پر بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وکیل نے کہا

”مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ چھوٹی سیٹ کے لیے چوہدری کبیر کے مقابلے میں فہد کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔“

”کیا؟ کیا یہ خبر درست ہے؟“ چوہدری جلال کو یہ سن کر بہت شاک لگا تھا۔

”ہاں۔ مگر وہ نہیں مان رہا ہے۔ کیوں نہیں مان رہا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن جلدی پتہ چل جائے گا۔“ وکیل نے کہا

تو چوہدری جلال تشویش سے بولا

”میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ خیر۔ اودہ آتا ہے مقابلے میں تو آ جائے۔ لیکن وہ کیوں نہیں مان رہا۔ یہ بات سوچنے والی ہے کیا

یہ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”ویسے چند دن بعد سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ لیکن ایک مشورہ ہے۔ کیوں نا۔ اس سے مل کر اسے ٹھنڈا جائے۔ اس سے بہت

کچھ واضح ہو جائے گا۔“ وکیل نے صالح دیتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال بولا

”فورا مل لیں اس سے۔ بلکہ وہ کسی سمجھوتے پر بھی راضی ہو جاتا ہے تو کریں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ انکسٹن نہیں جیت

سکتا۔ ممکن ہے وہ ان حالات سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہو۔ فوراً طو جو شرط بھی ہو، ہم اسے مانیں گے اگر۔ نئے والی ہوئی تو۔“

”میں آج ہی اس سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے وہ ہماری کسی آخر کے انتظار میں ہو۔“

وکیل نے کہا تو چوہدری جلال حیرتی سے بولا

”بھی میں کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے ملک فہم کا جو سامنے آتا ہے وہ محض ذرا وای ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں مٹا ہوں۔ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ چوہدری صاحب۔ املک فہم نے اپنی سیاست چمکانے کے لیے اس علاقے میں

آنا ہی آنا تھا۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ آپ اس کا سد باب وقت سے پہلے کیوں نہیں کیا۔ ورنہ تو

انکسٹن میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ وکیل نے کہا تو چوہدری جلال حیرت سے بولا

”جانتا ہوں اس کی رسی میں نے ہی ذمیلی چھوڑی تھی۔ مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ ہمارے لوگ کیا کر رہے ہیں۔“

”حالات کی کشش بہت ہوتی ہے چوہدری صاحب۔ لوگ اسی طرف جرتے ہیں۔ جہاں طاقت ہو آپ حکومت میں ہوتے

ہوئے ان کے لیے کچھ نہیں کر رہے۔ تو وہ آپ سے کیا توقع رکھیں۔ روایتی سیاست ختم ہو چکی ہے۔ یہ آپ مان لیں۔“

”وکیل صاحب۔ ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ طاقت کی کشش بہت ہوتی ہے۔“ چوہدری جلال نے مسکراتے ہوئے کہا تو وکیل

جیل اختر بولا

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ طاقت کا اصل مرکز کہاں ہے۔ یہی کبھی طاقت کی اہم ضرورت ہے خیر۔ میں نے آپ کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ فوراً پور پر آپ کی گرفت کمزور ہو گئی ہے۔ کیونکہ کبیر دہاں کا بوجھ نہیں اٹھا پارہا ہے۔“

اس کی بات سن کر چوہدری نے چوتھے ہوئے پوچھا

”تو پھر کیا مشورہ دیتے ہیں آپ؟“

”یہی کہ ملک نعیم اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ بجائے اسے دبانے کے، خود کو حوام میں مضبوط کریں۔ میں تو یہی کہوں گا۔ آج آپ کو میڈیا کا سامنا ہے اور آپ جواب نہیں دے پارہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے یہ سوچا آپ نے؟“

وکیل نے دلیل دیتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال اکتائے ہوئے لہجے میں بولا

”ایک تو یہ میڈیا یا جاچک کیوں سوار ہو گیا ہے ہم پر، میں سوچتا ہوں اس پر۔“

”تو پھر اجازت میں چلتا ہوں۔“

وکیل اٹھتے ہوئے بولا وکیل چلا گیا تو فٹنی بولا

”چوہدری صاحب۔! یہ جو وکیل ہے نا، اسے سمجھ رہے ہیں آپ۔ کہیں یہ ننگے چوہدری کی جگہ خود تو سیاست میں نہیں آنا چاہتا؟“

”مجھے بھی یہی شک ہے۔ لگتا ہے یہ بھی ایم پی اے بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ دیکھتا ہوں اسے بھی۔ تم چیمبر صاحب کو فون

کرو اور کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان میڈیا والوں کا تو کوئی سدباب کریں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو فٹنی اٹھتے ہوئے بولا

”جی ہمت۔“

وہ فون کی جانب بڑھا تو چوہدری سوچ میں پڑھ گیا۔ حالات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔

وکیل جیل اختر نے حویلی سے نکل کر فہد سے رابطہ کیا۔ اس نے بات مان لی اور اس کی بات سننے پر راضی ہو گیا۔ ایک سڑک کے

کنارے درختوں کے درمیان وکیل جیل اختر کھڑا تھا۔ قریب ہی اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جس طرف لگی ہوتی ہیں۔ دوسرے

اسے فہد کی گاڑی آتی دکھائی دی جو اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے فہد نکلا تو وکیل کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ فہد نے مسکراتے

ہوئے چہرے کے ساتھ، اس کے قریب جا کر ہاتھ ملایا اور بولا

”جی وکیل صاحب۔ کہیے، آج آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ دو ٹوک بات، بحث نہیں پلیز۔“

”بھول چل رہی ہیں میں نے صرف مقدمے پر بات کی تھی۔ لیکن اب میں الیکشن کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے۔ آپ الیکشن لڑ رہے

ہیں؟“ اس نے بھی سیدھے سجاؤ پوچھ لیا تو فہد نے دو ٹوک لہجے میں کہا

”نہیں۔ میں انکیشن نہیں لڑ رہا۔ آپ تک شاید یہ اطلاع درست نہیں پہنچی۔“

”آپ ایک سمجھ دار انسان ہیں اور جانتے ہیں کہ سیاست میں کہیں بھی کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ میں اسی نہیں، بہت سارے لوگ آپ کی سمجھ بوجھ اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا آئندہ آنے وقت میں آپ یہاں تہہ ملی چاہتے ہیں۔“ وکیل نے مختصر لہجے میں پوچھا تو فہد صاف لہجے میں بولا

”میں اپنے علاقے کو خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اپنی کوشش کرتا رہتا ہوں۔“

”میں مانتا ہوں کہ آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چوہدری صاحب اپنی ماضی کی غلطیوں کو مانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں، ماضی کو ہٹا کر اچھے اور خوشگوار تعلقات کا آغاز کیا جائے۔“ اس نے اپنے مطلب کی بات کی تو فہد نے کہا

”آج تو نہیں کل، اس نے ایسا کرنا ہی تھا۔ آج ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ انکیشن ہے، جس میں ان کی سیاسی پوزیشن پر بہت برا اثر پڑ چکا ہے، وہ بھی چوہدری کبیر کی وجہ سے۔ یہ انکیشن ان کے لیے بہت مشکل ثابت ہوگا۔“

”میں نے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اب آپ کی حمایت ہوگی تو یہ مشکل نہیں رہے گی۔“ وکیل نے اصل مدعا کو فہد مسکراتے ہوئے بولا

”میری حمایت یا مخالفت ان کا کیا بگاڑ سکتی ہے وکیل صاحب۔ یہ تو ان کی خاندانی سیٹ ہے۔ نکال ہی لیں گے۔ وہ آرام سے نکال لیں گے۔“

”دیکھیں آپ ہی نے کہا ہے کہ بحث نہیں۔ سیدھی بات کرتا ہوں۔ آپ نے علاقے میں خاصا اثر و رسوخ بنالیا ہے۔ اس لیے ملک فہم آپ کو بھی انکیشن لڑانا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ مضبوط امیدوار کے ساتھ جڑیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں۔ چوہدری آئندہ آپ کی راہ میں نہیں آئیں گے۔ آپ جیسی جاہل سیاست کریں۔“

وکیل نے اسے آفریدی تو فہد بولا

”میں سوچتا ہوں اور اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے آپ کو بتا دیتا ہوں۔“

”میں شدت سے منتظر رہوں گا۔“

وکیل نے کہا تو دونوں نے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں کی جانب بڑھ گئے۔



چوہدری کے ذریعے پر چوہدری کبیر کے سامنے ما کھا کھڑا تھا۔ چوہدری کبیر صوفے پر بیٹھا میز پر دھری ایش ٹرے کو اضراری انداز میں نگار رہا تھا۔ جیجی ماکھے نے کہا

”جی چوہدری صاحب۔ آپ نے مجھے یاد کیا؟“

”یاد رہے نذیر والا مقدمہ لمبا ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اوپر سے انکشن آگئے ہیں۔ یہ کب تک چلا رہے گا یاد؟“ چوہدری کبیر نے کہا

تو ما کھا بولا

”آپ جیسے حکم دیں۔ ختم کر دیتے ہیں وہ مدعی عورت؟“

”نہیں نہیں ابھی اسے نہیں پھیلنا، اسے تو صلح کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ وہ جو چشم دید گواہ بنا پھرتا ہے۔ وہی نہیں رہے گا تو کیس میں جان کہاں سے رہے گی۔ اسے کچھ اس طرح پار کر دے کہ۔۔۔“ چوہدری کبیر نے اسے سمجھایا

”میں سمجھ گیا۔ میں آج ہی اسے ادھر لے آتا ہوں۔“ ما کھے نے کہا

”نہیں یاد۔ اسے ادھر نہیں مانا۔ میں اس کا کام کر دیتا ہے۔ ویسے بھی علاقے میں پیغام جانا چاہئے۔ ہماری مخالفت کرنے والے بندے کا کیا حال ہوتا ہے۔“ چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا تو ما کھا بولا

”ہو گیا جی، آپ فکر نہ کریں۔ بڑے دنوں بعد کوئی بڑ بڑھانے کا موقع ملا ہے۔ فکر نہ کریں جی۔ لیکن ایک بات عرض کروں۔“

”بولو۔“ چوہدری کبیر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”آپ نے دوسرے چوہدری جی سے بات کر لی ہے انہوں نے ہتھ ہولا رکھنے کو کہا ہے۔ کہیں وہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔“

ما کھے نے اسے یاد دلایا

”ادیار انہیں تو اپنی سیاست کی پڑی ہوئی ہے۔ ادھر سارا کچھ ہاتھ سے نکل جا رہا ہے۔ اونے علاقے پر رعب اور دہرہ ہو گا لوگ خوف کھائیں گے ہمیں دوث دیں گے تو جا میں انہیں سمجھا لوں گا۔ اب جا۔“ اس نے قدرے طعنے میں کہا تو ما کھا چلا گیا۔

چھا کا پیدل ہی گاؤں کی گلی میں جا رہا تھا۔ عقب سے جیپ پر سوار، کھ اور اس کے ساتھی آرہے تھے۔ وہ اسطرح بھرا رہے تھے۔ انہوں نے چھ کے پاس جیپ روکی اور تیزی سے اتر کر ارد گرد گھبرا ڈال لیا۔ چھا کا ایک دم سے گھبرا گیا، پھر رعب سے بولا

”کیا بات ہے؟ اس طرح میرا راستہ کیوں روکا تم لوگوں نے؟“

”تو چشم دید گواہ ہے تا مگر تیرا چشم دید گواہ کوئی نہیں ہوگا۔ چل تجھے تیری سانپوں سے آزاد کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ما کھے نے من سیدھی کی ہی تھی کہ ایک من اس کی کنپٹی پر آ کر لگ گئی۔

”تیرا چشم دید کون ہوگا؟“ سراج نے نے پوچھا تو، کھا گھبرا گیا۔ چھا کے کے لیوں پر مسکراہٹ آگئی تو ما کھا بولا

”سراج تم؟“

”ہاں میں، میں ساری کہانی سمجھ گیا ہوں۔ جب تک ایک فریب ہی دوسرے فریب کا دشمن رہے گا۔ اس وقت تک ہم سب کی حالت نہیں بدلتی۔ تیرے اور میرے ہاتھ میں ہندو کس نے دی۔ ہم حفاظت کس کی کر رہے ہیں۔ سوچو۔ پڑو کیا سوچے گا۔ تیرے

جیسے وہی ظلام تو اپنی عقل بھی ان مفاد پرست سیاست دانوں کے پاس گردی رکھ دیتے ہیں۔“ سراج نے نفرت سے کہا تو ما کھا بولا

”طاقت کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے، جس نشے میں اب تو بات کر رہا ہے۔ گن ہٹا کے دیکھ بھر میں تجھے بتاتا ہوں طاقت کیا شے ہوتی ہے۔“
 ”تو سوچ ٹو، یہ طاقت کس کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اپنے جیسے غریب کو مارنے کے لیے؟ تھ ہے تم پر، میں ابھی تجھے مار سکتا ہوں لیکن ماروں گا نہیں، چل ہٹ اور چلا جا یہاں سے۔ پھینک دے یہ گن۔“
 سراج نے کہا تو ماکھے نے گن ہٹا کر پھینک دی۔

”چوہدری سے کہہ دینا، اب ہمارے کسی بندے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ ورنہ آنکھیں نکال لیں گے۔ ہم اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ چل بھاگ۔“ سراج نے گن کا بولٹ مارتے ہوئے کہا تو ماکھا سب کو اشارہ کرتے ہوئے جیب میں بیٹھ گیا۔ وہ سب چلے گئے
 ”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم یہاں آ جاؤ گے؟“ چما کے نے کہا تو سراج بولا
 ”رانی کے بعد اب وہ کسی پر ظلم کریں میں انہیں یہ موقع نہیں دینا چاہتا تو بھی خیال رکھا کر۔ یہ پتہ کر کہ لکا چوہدری ہمیں ملے گا کہاں پر، اب اسے ختم کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر سراج حیران سے چما کے کو لے کر ایک جانب چل دیا۔
 ماکھا ڈیرے پر پہنچ چکا تھا۔ چوہدری کبیر شہید فیسے اور حیرت میں تھا اور ماکھا سر جھکاے قریب کھڑا تھا۔
 ”یہ سراج، کدھر سے آ گیا مگر ہمارے راستے میں۔“

”میں نہیں جانتا تھے چوہدری جی، چما کا فقط چند لمحوں کا مہمان تھا اگر وہ نہ آتا تو۔“ ماکھے نے اپنی صفائی دی تو چوہدری کبیر نے غصے میں کہا

”اوے ماکھے جب وہ تمہارے راستے میں آئی گیے تھا تو اس بھی پھڑکا دینا، پر نہیں، یہ کام تم لوگوں سے نہیں ہو گا جی کرتا ہے تمہیں ہی گولی مار دوں۔ لیکن سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ اس نے یہ بددوق کب سے اٹھائی؟“
 ”کیا فہم نے اپنی سیکورٹی بتائی ہے یہ جانتا بڑا ضروری ہے۔ ورنہ وہ ہمارے لیے درد سر بن جائے گا۔“ ماکھے نے تشویش سے کہا
 تو چوہدری کبیر بولا

”اوے تم لوگوں سے کچھ نہیں ہو گا تمہیں تو یہ بھی نہیں پتہ۔ تم لوگوں نے خاک علاقے کو اپنے قابو میں رکھنا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے تم لوگ مر گئے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ بے چینی سے بولا، ”یہ نڈرے والا معاملہ اتنا لمبا کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے لگتا ہے، اب مجھے خود ہی اسے ختم کرنا پڑے گا۔“

”یہ بڑا آسان ہے کہ میں جاؤں اور فہم اور سراج کو مار دوں لیکن آپ نے انکشن بھی لڑنا ہے چوہدری صاحب۔! میرے خیال میں یہ معاملہ وڑھے چوہدری صاحب پر چھوڑ دیں۔ ابھی تک رانی کا معاملہ بھی سر پر ہے۔“ ماکھے نے اسے یہ دلا یا تو چوہدری کبیر نے غصے میں کہا
 ”کچھ اس نہیں کروائے، بھاڑ میں گیا انکشن، چما کے کے قتل کا رانی سے کیا تعلق؟ میں دیکھتا ہوں انہیں۔“
 یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی کار کی چابی اٹھائی اور باہر کی جانب چل دیا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ کھیت کے کنارے فہد اور سسلی بیٹے جا رہے تھے۔ فہد نے رک کر اس

سے پوچھا

”سسلی! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ منیہ اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا وہ جوش، وہ جذبہ کہیں ٹھنڈا

تو نہیں پڑ گیا۔“

”نہیں تو، اس پر اگر پہلے کی طرح دباؤ نہیں ہے تو وہ پہلے جیسی مایوس بھی نہیں ہے۔ مگر بات کیا ہے۔“ سسلی نے چونکتے ہوئے

پوچھا تو فہد نے جواب دیا

”بات یہ ہے کہ چوہدری جلال ایسے جھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ جیسے کوئی دیوار سے لگ کر بات کرتا ہے۔ کیونکہ چوہدری اب

دیوار سے لگنے والا ہے۔ اب وہ اپنی ہٹا کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر جب تک منیہ میرے ساتھ ہے۔ کسی لالچ یا دباؤ میں نہیں آئے گی۔ مجھے یقین ہے۔“ سسلی نے اسے

یقین دلایا تو وہ بولا

”حالات بدل رہے ہیں۔ آنے والوں چند دنوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ چوہدری جلال اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے کچھ بھی

سکتا ہے۔“

”آپ لکرنہ کریں۔ میں اب ہر آنے والے طوفان اور زلزلے کے لیے خود کو تیار کر چکی ہوں۔ آپ کی محبت نے مجھے اتنا حوصلہ

دیا ہے کہ میں بے خطر آگ میں کودنے پر تیار ہوں اور میں اپنا یہ دھڑیلا وقت آنے پر ثابت بھی کر دوں گی۔“ سسلی نے عزم سے کہا

”ہم ساری زندگی حالات کو سمجھتے اور اس کے ساتھ نیر د آزمائی میں گزار دیتے ہیں۔ آسانیاں تو بس یقین اور اعتماد کی وجہ سے

ہوتی ہے۔ اور یہ تو تم صرف محبت کے دامن میں ہوتی ہیں۔ سسلی زندگی میں بہت سارے فیصلے کرنا مشکل ہو گئے۔ لیکن یہ محبت ہی تو ہوتی

ہے جیسے معیار بنا کر انسان اپنے فیصلے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“ فہد بڑے نرم لہجے میں بولا

”اور محبت کا فیصلہ یہ بھی تو وقت ہی کرتا ہے تاکون کس کے لیے کتنی محبت رکھتا ہے۔ آپ منیہ کی فکر نہ کریں۔“ سسلی نے حیار ہار

آنکھوں سے کہا اور قدم بڑھا دیے۔ فہد نے حیرت سے اسے دیکھا، اس سے پہلے وہ کوئی بات کرتا، اسی لمحے سراج کا فون آ گیا۔ اس نے

چھ کے پر حصے کی تفصیل بتائی تو فہد کو ایک دم سے غصہ آ گیا۔ اس نے اسی وقت وکیل کو فون ملایا۔

”جی فہد صاحب۔ کیسے حراج ہیں؟“

”میرے حراج تو ٹھیک ہیں۔ مگر لگتا نہیں کہ چوہدریوں کے حراج درست ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وکیل نے پوچھا تو فہد بولا

”آپ نے جو مجھ سے بات کی تھی۔ اب وہ مجھے صرف آپ ہی کی خواہش لگتی ہے۔ چوہدریوں کو اس کی ضرورت نہیں۔“

”ہوا کیا ہے بتائیں تو؟“ وکیل نے پوچھا تو فہد نے بتایا۔ جسے وکیل سننا رہا۔ تب فہد نے کہا ”ایک طرف وہ صبح کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہمارا ساتھی مارنے کے لئے بندے بھیجتے ہیں۔ اب بتائیں مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”وہی جو آپ کا دل چاہتا ہے۔ جو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ یہی سمجھیں کہ میں نے آپ سے بات کی ہی نہیں۔“ وکیل نے افسردہ لہجے میں کہا تو فہد نے غصے میں کہا

”اور ساتھ میں یہ بات آپ سمجھا دیں انہیں۔ کبیر کو لگام ڈال دیں۔ گولی مجھے بھی چلائی آتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سلیکی خوف زدہ نہیں ہوئی بلکہ اس نے کہا

”فہد، لگتا ہے اب صرف باتوں سے کام نہیں چلے گا، انہیں سبق دینا ہوگا۔“

”ایسے ہی لگتا ہے۔“ فہد نے کہا تو دونوں پلٹ کر کار کی جانب چل دیئے۔

فہد اس وقت سکی کو چھوڑ کر اپنے گھر پہنچا ہی تھا کہ ملک فہم کی گاڑی اس کے گارڈز کے جلوس ساتھ گھر کے باہر آن رکی۔ فہد کے پاس سراج بیٹھا ہوا تھا۔ ملک فہم اندر آ گیا تو دونوں اس کے ساتھ تپاک سے ملے۔ فہد نے خوشگوار لہجے میں پوچھا

”ملک صاحب آپ؟“

”میں یہ بات فون پر بھی کر سکتا تھا لیکن میں خود آنا مناسب سمجھا۔“

ملک فہم نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”ایسی کیا بات ہو گئی“ فہد بھی پوچھتے ہوئے بیٹھ گیا

”مجھے پارٹی کنٹ دیئے گئے ہیں۔ ان میں آپ کا نام نہیں، آپ کے ریلیزس سے سلی امیدوار ہوگی۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ یہ دیکھیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔ تو فہد نے خوشگوار لہجے میں کہا

”اوہ۔ تو سلی کو پارٹی کنٹ مل گیا۔“

”فہد۔ اچھے کم از کم پہلے بتا تو دیا ہوتا۔ میں آپ کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور اوپر سے سلی کے لیے۔“

ملک فہم نے کہا تو فہد نے سمجھا

”پارٹی کے جوڑے ہیں۔ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے تا تو بس ٹھیک ہے۔ آپ الیکشن مہم کا آغاز کریں۔“

”مجھے اتنا تو مجھے اعتماد ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہی کر رہے ہوں گے۔ لیکن ایسا نام جس کے بارے میں لوگ جانتے

نک نہیں۔ اور خود امیدوار ایک عام سی لڑکی۔ جسے سیاست کی الف بے کا نہیں پتہ، یہ کیسے چمے گا؟“ ملک فہم نے اچکچاتے ہوئے پوچھا

”سب ٹھیک ہو جائے ملک صاحب۔ ایہ میری ذمہ داری ہے، آپ کیا پسند کریں گے۔ چائے یا ٹھنڈا؟“ فہد نے پوچھا

”فہد آپ اب بھی سوچ لیں۔ کل کا خد جمع ہونے ہیں پھر سوچنے بچنے کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ ملک نصیم نے کہا تو فہد

اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا

”آپ فکر نہ کریں۔ بتائیں، خدا انکس کے پا جائے؟“

”چلیں، دیکھتے ہیں۔“ ملک نصیم نے سکون سے کہا تو فہد بولا

”آپ سکون کریں۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“

وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو سراج چائے بنوانے کے لئے اٹھ گیا۔



نور پوری عدالت میں کافی رش تھا۔ اس دن الیکشن میں حصہ لینے والوں کی حتمی فہرست لگنا تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح فہد، سلمیٰ، سراج اور ان کے ساتھ لوگ انتظار میں کھڑے تھے۔ کافی دیر بعد بلا دی نے عدالت کے باہر حتمی فہرست لگا دی۔ فہد جلدی سے آگے بڑھا۔ فہرست پر انگلی رکھ کر سلمیٰ کا نام تلاش کرتے ہوئے نام پڑھ کر اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ سلمیٰ کے کاغذات منظور ہو گئے تھے۔ اب وہ الیکشن لڑ سکتی تھی۔ وہ خوشگوار چہرے کے ساتھ واپس چلا تو سامنے کاشی کھڑا تھا۔ اس نے فہد کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے فہد۔ اپنی طاقت سے زیادہ اڑنے والا بہت جلد گر کر مر جاتا ہے۔“

فہد نے اس کے چہرے پر دیکھا اور کوئی سخت جواب دینے لگا تو وہ ایک طرف چل دیا۔ فہد اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔ وہ ایک طرح سے فہد کو وارننگ دے گیا تھا۔ فہد نے ایک دم سے اپنا سر جھک دیا۔ دشمن تو بیکس چاہتے تھے کہ اسے وٹانی اذیت دیں۔ اسے اسی وار سے پچنا تھا۔ تبھی اس نے دیکھا عدالت میں ایک لینڈ کروڈز راجا طرہ عدالت میں آ کر رک گئی۔ اس میں سے مائرہ باہر نکلی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ فہد پر نگاہ پڑی تو وہ اس جانب بڑھ آئی۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔ مائرہ بہت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ دور کھڑی سلمیٰ نے انہیں دیکھا۔ وہ قریب آئے تو سراج نے کہا

”ہمیں لگنا چاہیے اب۔“

”ہاں کیوں نہیں چلو۔“ فہد بولا تو مائرہ نے سلمیٰ سے کہا

”آؤ سلمیٰ ادھر، میرے ساتھ جیب میں بیٹھو۔ ہم نے ایک بڑے جلوس کے ساتھ تمہارے گاؤں جانا ہے۔“

”جلوس، کہاں ہے جلوس؟“

فہد نے پوچھا تو مائرہ نے عدالت کے باہر ایک قالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”وہ دیکھو سامنے جلوس، ہمارا منتظر ہے اس جیب کا ڈرائیور یہاں کا ایک بڑا کاروباری آدمی ہے۔ یہاں بازار کا ایک پکڑ لگائیں

کے، پھر گاؤں جائیں گے۔“

”کیوں مارو کیوں؟“ فہد نے دھیرے سے پوچھا

”اپنی طاقت کا اظہار، انتخابی روایت کا حصہ الیکشن کی ضمن ضرورت۔ زیادہ فکر نہ کرو آ جاؤ۔ ہمارے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی میں۔ آؤ سٹپی۔“

سسی، فہد کا عندیہ پا کر ماروہ کے ساتھ چل پڑی۔ وہ لینڈ کروزر میں بیٹھ گئی۔ کچھ لمحوں میں بعد ماروہ اور سٹپی سن روٹ کھول کر کھڑی تھیں۔ اور جوں آگے بڑھ رہا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ سسی کے گھر میں رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ سبھی محن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فہد نے ماروہ سے پوچھا

”یہ تم نے جلوس کیسے بنالیا۔ یہ سب کیسے کیا تم نے؟“

”الیکشن میں ذرا رعب شعوبہ جمانا پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں صبح ہی نور پور چلی گئی تھی۔ وہاں موجود اپنے لوگوں سے ملی ہوں۔ پاپا کاریفرنس تھا۔ انہوں نے جلوس کا اہتمام کیا۔ نور پور کی حد تک تو میں سب اوس کے کرائی ہوں۔ باقی کی پلاننگ ہم کر لیتے ہیں۔“

”اور جعفر.....“ فہد نے پوچھا

”الیکشن کے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں نا۔ وہ دو دن بعد آئے گا۔ پوسٹر، بیورو وغیرہ لے کر۔ پاپا نے اسے روک دیا تھا۔ پھر نور پور میں کام بھی بہت ہے اور وہ پولیس آفیسر ہے۔ یوں کھلم کھلا تو ہمارے کام کرنے سے رہا۔ تاخیر سے سکی لیکن وہ آئے گا ضرور۔“

”ماروہ بیٹی! یہ الیکشن کے دنوں میں تو صحافی لوگوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان کے کیریئر کے لیے بھی یہ بہت اچھا موقع ہوتا ہے۔ تمہارے کام کا تو بہت حرج ہو گا نا۔“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا تو ماروہ بولی

”انکل! اس وقت سٹپی کا الیکشن میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے۔“

اس پر فہد نے چونک کر ماروہ کو دیکھا تو سٹپی نے سب سے کہا

”ماروہ! کھانے کے بعد لمبی بات کریں گے، تم فریش ہو جاؤ۔“

”اور تھوڑا آرام کر بیٹا بیٹی۔ پھر باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

ماسٹر دین محمد نے کہا تو ماروہ نے اٹھتے ہوئے فہد کو دیکھا۔ وہ اسے ممنوعیت سے دیکھ رہا تھا۔



چوہدری کے ڈرائیونگ روم میں بڑی اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔ وکیل کے ساتھ دو اور لوگ بھی تھے جو خامے سوہرا اور امیر کبیر دکنائی دے رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو الیکشن میں چوہدری کے ہر معاملے کے مشیر تھے۔ وکیل، چوہدری کبیر کی بات کر کے بولا

”چوہدری صاحب! آپ یہ تسلیم کر لیں کہ فہد نے ہی آپ کی سیاسی سادکھ کو نقصان نہیں پہنچایا ہے، چوہدری کبیر نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اس الیکشن میں آپ کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔“

”کیر کی چھوڑ دو، فہد بارے سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے لوگوں میں نبھانے کیا بھونک دیا ہے۔ سب اس سے چپے ہوئے ہیں۔“
 ”آپ نے اسے فقط ایک پڑھا لکھا جوان سمجھنے کی فطرت کی ہے۔ وہ بہت سمجھ دار ہے۔“ وکیل نے کہا تو چوہدری جلال نے تنک کر کہا
 ”یہاں کتنے سمجھ دار دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ کیا کر لیا انہوں نے آج تک، کچھ بھی تو نہیں۔ اتنے برس آزادی کو گزر گئے
 سوائے الیکشن مہنگا ہونے کے اور کیا تبدیلی آئی ہے۔“

”شکر کریں کہ عام آدمی کو اپنی اہمیت کا نہیں پتہ۔ یہی عام آدمی تبدیلی لاتے ہیں۔ جیسے کہ فہد نے آپ کو بھی سیاسی پارٹی کی
 چھتری تلے آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمیں یہاں بیٹھ کر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کامیابی کسے ملے گی۔ اس نے مخالف امیدوار مقابلے کے لیے
 کھڑا کر دیا اور ٹکٹ بھی لے لیا۔ مانیں کہ وہ وانا دشمن ہے۔“ وکیل نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا تو وہاں موجود ایک شخص نے پوچھا
 ”ایک اتاری لڑکی کو ٹکٹ دلوانے کا فیصلہ، بھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فہد نے ایسا کیوں کیا؟“

”وہ جو ہونا تھا ہوا چوہدری صاحب، اب آپ آگے کی سوچیں۔ اب دوسری آپشن ہیں۔ یا تو فہد کو دہشت زدہ کر کے یہاں سے
 بھاگنے پر مجبور کر دیا جائے یا پھر کچھ دیکھو، وہ کی پالیسی اپناتے ہوئے ڈینگ کر لی جائے۔“
 دوسرے شخص نے صلاح دی تو وکیل بولا

”ابھی یہی تو بات ہوئی ہے، دونوں آپشن ناکام ہو چکے ہیں۔ اب تو الیکشن جیت کر ہی کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لڑ بڑ کر نہیں،
 عوامی ریٹا فہد کے ساتھ ہے۔ کیوں چوہدری صاحب؟“

”جیل صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں لڑنا ہی ہوگا۔ اب الیکشن جیتنے کا خطا ایک ہی طریقہ ہے۔“ پہلے
 شخص نے کہا تو چوہدری جلال نے پوچھا
 ”وہ کیا؟“

”فہد ہماری طرح الیٹ کلاس سے نہیں ہے۔ اس کے ارد گرد لوٹوں کی دیوار کھڑی کر دی جائے۔ ووٹ خریدیں۔ چلیں فٹہ چار
 گنا کر دیں۔ ہر گاؤں کا مطالبہ مان لیا جائے۔ جیت جائیں گے تو یہ سب چار گنا ہو کر واپس آ جائے گا۔“ اس نے طریقہ بتا دیا تو چوہدری
 جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”ہاں۔ یہ ہوئی نہ بات اس کی کیا اوقات وہ کیا الیکشن لڑے گا۔“
 ”اور ہاں چوہدری صاحب۔ چھوٹے چوہدری کو سمجھا دیں۔ یہ وقت جوش کا ہے جوش کا نہیں۔“ وکیل نے کہا تو چوہدری جلال
 نے دھجے سے کہا

”مان لیا وکیل صاحب۔“
 ”چلیں اب ملے کر لیں کہ کس نے کیا کرتا ہے۔“ ایک شخص نے کہا تو ان میں ہاتھ پھیلنے لگیں۔ کافی دیر تک ہر بعد ملے کر کے
 وہ اٹھ گئے۔

چوہدری جلال جب حویلی کے اندر آیا تو چوہدری کبیر تیار ہو کر باہر جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ فیسے میں بھرا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے، کدھر جا رہے ہو؟“ چوہدری جلال نے اس سے پوچھا تو چوہدری کبیر فیسے میں بولا

”جس طرح سٹلی جوس کے ساتھ گاؤں واپس آئی ہے اس کے بعد کوئی چین سے کیسے سو سکتا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ

وہ میرے مقابلے میں آجائے گی۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ اس بے چاری کی اپنی کیا حیثیت ہے۔ کٹھ پتلی ہے کٹھ پتلی، چند دن بعد دیکھنا ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تم پر

سکون رہنا۔ یہ انکیشن بڑے شندے دماغ سے لڑتیں۔ تم ابھی سے پریشان ہو گیا ہو۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھایا تو چوہدری کبیر نے

طویل سانس لے کر کہا

”میں پریشان نہیں ہوں بابا۔ مگر آئندہ آنے والے دنوں کا اندازہ ضرور لگا رہا ہوں۔ اس بلا مقابلہ سیٹ پر اگر وہ ہمیں مقابلے

کے لیے میدان میں لے آئے ہیں تو پھر انہیں مات ایسی دی جائے کہ پھر کبھی کسی کی جرات نہ ہو انکیشن لڑنے کی۔“

”ایسے ہی ہوگا۔“ چوہدری جلال نے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے روئے سخن بشری بیگم کی جانب کر کے بولا، ”بیگم! اس بار حقے

بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ملائے میں نکلنا ہوگا۔“

”کیوں نہیں۔ میں اپنے چر کے ساتھ ہر جگہ جاؤں گی۔ مجھے کون روٹ نہیں دے سبھی دیں گے۔“ بشری بیگم نے کہا لیکن اس

کا چہرہ اور لہجہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ چوہدری کبیر بولا

”انکیشن تو ہم نے جیت ہی جانا ہے۔ بس انہیں مات ایسی دیں ہے۔ کہ یاد رکھیں۔ چلو بابا چلیں۔ ڈیرے پر بہت سارے لوگ آ

گئے ہیں۔“

دونوں باپ بیٹا نکل گئے تو بشری بیگم انہیں حسرت سے دیکھ کر رو پڑی۔

انکیشن کی گہما گہما ایک دم سے شروع ہو گئی۔ ایک طرف چوہدری جلال اپنے لوگوں کے ساتھ علاقے میں ہر گاؤں، کھیت اور

کنویں پر جانے لگا۔ تو دوسری طرف ملک فیم اپنے لوگوں کے ساتھ علاقے میں لوگوں کے پاس جانے لگا۔ جہاں ملک فیم کی اپنی شرافت

تھی وہاں جب لوگ ماسٹر دین محمد کی بیٹی کے بارے میں سنتے تو حیران ہونے کے ساتھ ان کے دل میں امدادی پکیں جاتی۔ پتہ نہیں کتنے

لوگ اس کے شاگرد تھے اور سبھی جانتے تھے کہ چوہدریوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ماسٹر دین محمد کا نام ان کے لئے محترم ہو گیا۔

چوہدری جلال تک یہ ساری اطلاعیں آ رہی تھیں۔ وہ جب بھی سنتا مضطرب ہو جاتا۔

ایک رات چوہدری جلال بڑے اضطراب میں ٹہل رہا تھا۔ وہ اچانک رکا اور فون کے پاس جا کر نمبر ملایا۔ پھر پوس ہو کر ریسور

رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر پریشان پرمکھی ہو گئی تھی۔ اتنے میں بشری بیگم چائے کا کپ لے کر اس کے قریب آ گئی۔ بشری بیگم نے اس کے

چہرے پر دیکھ کر پوچھا

”آپ اتنے پریشان کیوں ہیں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”میں میں پریشان نہیں ہوں۔ اپنے علاقے میں لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پر بھی تو نظر رکھنا ہے۔“

چوہدری جلال نے کہا تو بشری بیگم بولی

”لیکن انسان کے لیے نیند بھی ضروری ہے۔ آپ کچھ دیر کے لیے سو جائیں۔ آئیں۔“

”میں تم جاؤ اور جا کر سو جاؤ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ جاؤ“ چوہدری جلال نے آکٹا سٹ سے کہا تو بشری بیگم نرم لہجے میں بولی

”میں آپ کو ڈسٹرب کیا کروں گی آپ پہلے ہی پریشان ہیں مجھے ایک بات بتائیں کیا آپ کی اس طرح پریشانی سے الیکشن پر

کوئی فرق پڑے گا؟“

اس کے یوں پوچھنے پر چوہدری جلال نے خود پر قابو پاتے ہوئے چائے کا سپ لیا، پھر سوچتے ہوئے بولا ”میں بیگم، تم ٹھیک

کہتی ہو۔ میرے یہاں پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا لیکن سکون بھی تو نہیں ہے۔“

”جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر لگتا ہے آپ علاقے سے مطمئن نہیں ہیں؟“ بشری بیگم نے پوچھا

تو چوہدری جلال نے دھجھے لہجے میں کہا

”یہ جہنم نے نئی قیادت، نئی سوچ اور تبدیلی کا نعروں لگایا ہے نا اسی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اس نے پوری پائانگ کر کے

الیکشن لڑا ہے۔“

”مگر کچھ غلطیاں ایسی ہیں جس سے آپ کا تاثر پہلے والا نہیں رہا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہی کہ ہم ناامید ہو جائیں۔ جیت ہماری ہی

ہوگی لیکن آپ اپنا خیال تو رکھیں۔“ بشری بیگم نے کہا تو چوہدری جلال بولا

”ہماری خامیاں ہیں لیکن میں نے اتنی دولت اس علاقے میں ہانٹ دی ہے کہ ان کی ساری نعرہ بازی ختم کر کے رکھ دے گی، تم

دیکھتی جا نا پس۔“

”جلس، آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔“ بشری بیگم نے کہا تو وہ خشکیں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولا

”میں نے کہا نا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

بشری بیگم نے شاکی لگا ہوں سے اسے دیکھا اور اٹھ گئی۔



رات گہری تھی لیکن فہد کے گھر چما کا، سراج اور فہد جاگ رہے تھے۔ فہد نے سراج سے کہا

”دیکھو سراج! یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ ہر الیکشن کمپ پر ہمارا جو بندہ ہو۔ اس تک یہ استغاثہ فہرستیں پہنچانی ہیں۔ اور پھر ان

سے رابطہ رکھنا ہے۔ پورے علاقے کی خبر یہاں ہوتی جا رہی ہے۔“

اسنے میں چھ کے سنے باہر کی جانب دیکھا تو سامنے سادہ لباس میں جعفر کھڑا تھا۔

”جعفر! تم۔“ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے بولا، ”اسنے دن لگا دیئے یا تم نے آتے ہوئے۔“

”میں تو آؤں کر آ جاتا رہ لیکن تمہارے پوشر اور نہ جانے کیا کچھ ایک ٹرک میں بھر کے لایا ہوں۔ وہ باہر کھڑا ہے۔ سامان اتروالو اس

سے، محمود سلیم صاحب نے بھجوائے ہیں۔“

”میں دیکھتا ہوں آپ بیٹھو۔“ سراج نے کہا اور باہر کی جانب نکل گیا تو چھ کے نے اٹھ کر پوچھا

”جعفر بھائی۔ کوئی چائے واسے پیو گے یا سیدھے کھانا ہی کھاؤ گے۔ تکلف نہ کرنا۔ سب کچھ ملتا ہے۔“

”اب آ گیا ہوں نا۔ سب کچھ خود کر لوں گا۔ تم فی الحال پانی پلاؤ۔ اور شور نہ ہو کہ میں ادھر ہوں سمجھے۔“

”سمجھ گیا۔“ چھ کے نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ تو فہد نے پوچھا

”پاپا تمہارے ساتھ رابطے میں ہیں۔“

”بالکل، اور میں نے کچھ بندے تمہارے کیئے ہیں۔ تیرے انکیشن کا سارا کام وہ سنبھال لیں گے، تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔ باقی میں تو ہر وقت رابطے میں ہوں۔“ جعفر نے اسے بتایا تو فہد نے پوچھا

”سنو اس چوہدری نے اوپر سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے؟“

”تم فکر نہ کرو، ہماری اسپنہ ہیں اس دباؤ کو روکنے والے تو بس جدی سے سسٹی کے ہاتھ کے پراسٹھے بنا کر کھلا میں نے ابھی واپس

بھی جاتا ہے۔“ اس نے فہد لگاتے ہوئے کہا تو فہد کا فہد بھی اس میں شامل ہو گیا۔ وہ رات دیر تک گپ شپ لگانے کے بعد چلا گیا۔

اگلی صبح فہد کچھ کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ قریب بیٹھا ہوا سراج بھی ایک کاغذ دیکھتے ہوئے بولا

”فہد، جس طرح تم نے یہ لسٹ بنائی تھی اس کے مطابق سارے کام ہو گئے ہیں اب مزید تاؤ کیا کرتا ہے۔“

اس دوران چھ کا چائے لے کر آ گیا۔ وہ کپ ان کے پاس رکھتا ہوا بولا

”چائے پیو اور تاؤ کیسی ہے۔ اب تو پورے علاقے میں چھ کے کی چائے کی دس دیکھ ہو گئی ہے۔“

”اچھا تم دونوں یہ چائے پی لو اور پھر کچھ دیر آرام کر لو اس کے بعد میں تم لوگوں کو متا تا ہوں کہ کیا کرتا ہے۔“ فہد نے کہا اور کپ

اٹھایا۔

”اوکر لیں گے آرام پار، تو کام بتاؤ؟“ سراج نے کہا تو فہد مسکراتے ہوئے بولا

”اچھا پھر یہ دس کچھ والی چائے پی لو متا تا ہوں۔“

”چائے بھی پیتے ہیں اور اور بات بھی کر لیتے ہیں۔“ سراج بھی کپ اٹھاتے ہوئے بولا تو فہد نے چند لمبے سوچنے کے بعد کہا

”دیکھو اب تک سارے کام ہماری سوچ کے مطابق ٹھیک ہو رہے ہیں۔ لیکن انکیشن کے ان دنوں میں ایک بات کا بہت خیال

رکنا ہے۔ چوہدری کسی نہ کسی طرح ہمیں قصہ دمانے یا ہمیں بھڑکانے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے ساتھ لڑیں گے، جھگڑا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ایکشن کے دن پولنگ بھی خراب کریں گے۔“

”بالکل۔! یہ تو پہلے ہی ہو رہا ہے ان کے بندے ہمارے پوسٹر پینر اتار دیتے ہیں جو ہمارے ووٹر ہیں مطلب جنہوں نے ہمارا ساتھ دینے کا باقاعدہ اعلان کر دیا ہے وہ ان کے گھر پہنچ کر کسی کو لالچ دے رہے ہیں اور کسی کو دھمکا رہے ہیں۔“ چھا کے نے بتایا تو فہد بولا ”وہ اس سے بھی زیادہ کریں گے۔ وہ ہمارے جلسے خراب کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”لیکن ہم نہیں ہونے دیں گے، ہم نے کون سا چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“

سراج نے غصے میں کہا تو فہد قہقہے سے بولا

”بات چوڑیوں یا سنگتوں کی نہیں ہے سراج، بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ووٹ کی طاقت کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اگر شکست کا احساس بھی ہو گیا تو وہ خون خرابے پر بھی اتر سکتے ہیں۔“

”تو پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا خاموشی سے ان کا ہر وار سہہ جائیں۔“ سراج نے پوچھا تو فہد نے سمجھایا

”نہیں جہاں تک ممکن ہو تصادم سے بچنا ہے اپنی قوت ضائع نہیں ہونے دینی اور دوسری بات کہ ہماری ساری توجہ ایکشن پر ہو زیادہ سے زیادہ ووٹ کا سٹ ہوں اور یہ کام بہت قہقہے سے کرنا ہے۔“

”تمہاری بات سن کر یہ احساس ہو گیا ہے کہ چوہدری کچھ بھی کر سکتے ہیں اس لیے ہمیں بہت محتاط ہو کر رہنا ہو گا۔“ سراج نے بات سمجھتے ہوئے کہا تو فہد بولا

”ہاں یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ آخری سب لے کر خالی کپ چھا کے کو قصاتے ہوئے بولا، ”تمہاری دس پیچہ والی چائے بہت مزیدار تھی یا۔“

اس پر وہ قہقہوں میں دھنس دینے۔



سہمی اپنی ایکشن مہم کے لئے اس لینڈ کروزر پر نکل تھی جو، ٹرہ نے اسے دی ہوئی تھی۔ قسمت نگر سے باہر نکلی تو اس جگہ آگئی، جہاں کبیر نے کبھی سہمی کی ملازمت والے کاغذ پھاڑے تھے۔ اس نے ڈرائیور سے رکنے کا کہا اور سوچنے لگی کہ اگر آج وہ جاب کر رہی ہوتی تو اس طرح ایکشن میں حصہ نہ لے سکتی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ ملازمت نہ کرے۔ اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ ایک دم سے حوصلہ مند ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا رتبہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے چوہدری کبیر اپنی گاڑی میں رکنا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سامنے گاڑی روک دی تھی۔

کبیر اسے طہریہ انداز میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آیا۔ سہمی بھی بھوکی شیرینی کی مانند باہر نکل آئی۔ وہ اسے کہنے

تو زنگا ہوں سے دیکھ رہی تھی کہ کبیر نے طنزیہ انداز میں کہا

”واہ کیا بات ہے، میں نا کہتا تھا تیرے جیسی اس علاقے میں نہیں ہے۔ جسے بات کرنا نہیں آتی وہ میرا مقابلہ کر رہی ہے۔“

”اوئے کبیر، بچپن اس جگہ کو، یہیں تو نے مجھ اپنی بے بسی کا احساس دلا یا تھا لیکن داری جاؤں اس سب سے بڑے منصف کے آج میں تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی ہوں۔ یہ زمین بھی تیری ملکیت ہے لیکن تیری ہمت نہیں کہ تو میرا راستہ روک سکے۔“ سلمیٰ نے آگ اچھے والے انداز میں کہا تو کبیر بولا

”میری ہمت تو تب بھی تھی اور اب بھی ہے، جن لوگوں کی وجہ سے تو بول رہی ہے نا وہ ...“ اس نے کہنا چاہا لیکن سلمیٰ نے بھڑکتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا

”تو ان کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے کبیر، تو بھول جا انہیں، میرا سامنا کر، میں یہاں پہنچ کرتی ہوں تو مردوں کی طرح میرا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا۔“

”تو اور تیری ہمت اور مقابلہ چند دن خوش ہوئے پھر وہی تم، وہی میں۔“ کبیر نے غصیلی مسکراہٹ میں طنزیہ انداز میں کہا تو سلمیٰ بولی

”تم تم کیا ہو، کچھ نہیں ہو، تیرا کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے تیرا تو اپنے باپ کی وجہ سے بات کر رہا ہے، پھر تم میں اور مجھ میں فرق کیا ہوا؟“

”تو جو مرضی کر لے، یہ الیکشن جیت نہیں سکتی، پھر“ اس نے اپنی مونچھوں کو تالاؤ دیتے ہوئے کہا

”تو پھر بھی کچھ نہیں کر سکے گا اور سن الیکشن تو میں اسی وقت جیت گئی تھی جب قدرت نے مجھے تیرے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ اب

مجھے جیت ہار سے کوئی مطلب نہیں میری جنگ تو شروع ہی اب ہوئی ہے۔ اب ہر روز الیکشن ہوگا، ہر روز ہار جیت ہوگی، دیکھتی ہوں کس میں کتنا دم ہے۔“

سلمیٰ نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا تو قریب کھڑے ماسکے نے حالات بھانپتے ہوئے کہا

”نگے چوہری جی چلیں۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں لے جا اسے درنڈا الیکشن سے پہلے اسے یہاں سے بھانگنا نہ چڑ جائے۔“ سلمیٰ غصے میں بولی تو اس نے انتہائی غصے میں سلمیٰ

کو دیکھا مگر کچھ نہیں کہتا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ سلمیٰ کھڑی رہی، کبیر کی گاڑی اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ وہ قاتحہ مسکان کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی اور ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا۔ اس کے من میں سرور اتر گیا تھا۔

ایسے ہی وقت ایک کچی سڑک فہد اور سراج گاڑی میں وہ پاس کے گاؤں سے کچھ لوگوں کو بل کر آرہے تھے۔ جمعی ایک موٹر سائے

ی سامنے دو لوگوں کے ساتھ کاشی کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے راستہ ردکا ہوا تھا۔ فہد کو بریک لگانا پڑے۔ دونوں کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ جمعی فہد نے کہا

”سراج، تم باہر نہیں آؤ گے، جمعہ کو فون کرو۔ فوراً۔“

ایسے میں کاشی اسے باہر نکل آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا

”باہر آؤ۔“

فہد بڑے سکون سے باہر آگیا اور بولا

”اس وقت مجھے جلدی ہے۔ راستہ بھر کسی وقت روک لینا۔“

”جلدی۔ مجھے تم سے بھی زیادہ جلدی ہے پیارے۔ میں نے کہا تھا نا اونچا اڑنے والا گر جاتا ہے۔ تو نے مان لیا ہوتا تو اچھا تھا۔

اب بھکتو۔“ کاشی نے کہا تو فہد بولا

”تم کیا سمجھتے ہو۔ مجھے قسم کرو پنے سے تم سب جاؤ گے یادہ تیرے چہ ہری۔ یہ تم بھیا تک فطعی کرو گے جو۔“ لفظ اس کے منہ سے

میں رو گئے۔ کاشی نے غصے میں ریوالتور سیدھا کر کے اس پر فائر کر دیا۔ سراج باہر نکل کر ان کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالتور

تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ کاشی نے دوسرا فائر کیا جو فہد کے لگ گیا۔ سراج نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ لوگ آگ کا قانا جیپ میں بیٹھے اور پلٹ گئے۔

چلتی جیپ سے کاشی نے ایک اور فائر کر دیا اور بھاگ گئے۔ سراج کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ان کے پیچھے جائے یا فہد کو سنبھالے۔

فہد نے حال ہو رہا تھا۔ سراج جلدی سے فہد پر جھک گیا، جو کرب ناک چہرے سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پایا۔ وہ

بے ہوش ہو گیا۔ سراج نے جلدی سے اسے اٹھایا اور کار میں ڈال کے ہسپتال کی جانب چل پڑا۔ سراج نے جعفر کا اطلاع دے دی تھی۔ اس

لئے سب ہسپتال پہنچ چکے تھے۔

فہد کو سٹرچر پر ڈال کر اندر لے جایا گیا۔ سب اس کے ساتھ تھے۔ مختلف راہدار یوں سے ہوتے ہوئے آپریشن روم میں لے

گئے۔ جہاں ملک فہم کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اسے فوراً اندر لے گئے۔

جعفر ہسپتال کے کہاؤٹ میں کھڑا اپنے سیل فون سے نمبر پیش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں مگر خود پر اس نے قابو پایا ہوا

تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا ہوا تھا کہ دوسری طرف رابطہ ہو جائے۔

حمود سلیم اپنے ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کا فون بجا تو اس نے ٹی وی اسکرین پر لگا دیں جمائے فون سنا۔

”بولو جعفر کیا حال ہے۔“

”انکل۔ فہد ہسپتال میں ہے اور۔۔۔“ جعفر نے بہت مشکل سے کہا تو حمود سلیم نے تشویش سے پوچھا

”کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیا ہوا سے اور تمہارا لہجہ ایسے کیوں ہے۔“

جعفر نے حمود سلیم کو اختصار سے فہد کی حالت بارے بتا کر کہا۔

”اس کی حالت خطرے میں ہے۔ ایک بہت اچھا ڈاکٹر تو ہے یہاں پر۔ اور اس کا ٹریٹمنٹ بھی ٹھیک ہو رہا ہے بس وہ آنکھیں

نہیں کھول رہا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ رو دیا۔ محمود نسیم خود روتے ہوئے بولا

”دیکھو تم میرے بہادر بیٹے ہو۔ تم حوصلہ نہیں ہارتا۔ میں ابھی یہاں سے نکلتا ہوں۔ میں آ رہا ہوں بیٹا تم حوصلہ رکھو اور رب سے

دعا کرو، میں آ رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جعفر نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

آپریشن تھیٹر کے اندر فہد ایک بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر اس کا آپریشن کر رہا تھا۔ نرسیں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ اس نے ایک

بلٹ نکال کر رکھی مگر دوسری بلٹ بھی نکال دی۔

ہسپتال کے اندر آپریشن تھیٹر کے باہر سسٹی، مائزہ، جعفر، ملک، نعیم اور سراج سب کھڑے تھے۔ سب پریشان تھے۔ تبھی ڈاکٹر باہر

آیا، اس کا چہرہ افسردہ تھا۔ ملک نعیم نے آگے بڑھ کر پوچھا

”ڈاکٹر۔ کیا حال ہے فہد کا؟“

”دیکھیں۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اسے دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ میں نے نکال تو دی ہیں۔ لیکن ان کا اثر تو ہے۔ خون بہت بہہ گیا

ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ آپ سب دعا کریں۔“ ڈاکٹر نے کہا تو جعفر نے پوچھا

”خطرے والی بات؟“

”ہے، میں سو فیصد اسے خطرے سے باہر نہیں کہہ سکتا۔ آپ دعا کریں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر وہ آگے کی

جانب چل دیا۔ سسٹی کے آنسو بہہ نکلے۔ مائزہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں تھی۔

صبح کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ماسٹر دین محمد جائے نماز پر بیٹھا دعا کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بیگا ہوا تھا۔ وہ زیر

لب دعا مانگ رہا تھا

”اے وحدہ لا شریک، میرے مالک۔ اے فہد کی زندگی دے دے۔ تو جانتا ہے کہ وہ صرف اپنے لیے نہیں جی رہا۔ کتنے لوگ اس

سے وابستہ ہیں۔ وہ سب مایوس ہو جائیں گے۔ میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں میرے پروردگار۔ اس سے کتنے لوگوں کی امیدیں

بندھی ہوئی ہیں۔ اسے صحت دے دے میرے مالک زندگی اور موت تیرے ہی ہاتھ میں ہے، زندگی دے دے، میرے مالک۔“

وہ پھر رونے لگا۔ صفیہ اس کے قریب آئی اور نرمی سے بولی

”ماسٹر جی۔! آپ رات بچھلے؟ سے یہاں بیٹھے ہیں۔ اٹھ جائیں۔ میرا دل کہتا ہے اسے کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہاں تو بھی دعا کر۔ اور جا اپنے بچوں کو کھانا دے۔ وہ بے چارے بھوکے ہوں گے۔ میں اٹھ جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا

تو صفیہ نے اسے سہارا دے کر دالان میں پڑی چارپائی پر بیٹھا کر جل گئی۔ ماسٹر دین محمد نے بڑی بے چارگی سے آسمان کی جانب دیکھا اور

پھر آنکھیں بند کر کے رونے لگا۔

قسمت نگر کے ہر گھر میں یہ اطلاع کافی جلد پھیلی تھی کہ فہد پر قاتلانہ حملہ ہو گیا ہے۔ سبھی سمجھ رہے تھے کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے، لیکن زبان سے کوئی بھی اظہار نہیں کر رہا تھا۔ چور اے میں چا چا سوہنا، حنیف دوکاندار اور ایک شخص تشویش ناک انداز میں بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔

حنیف دوکاندار نے کہا

”او چا چا سنا ہے۔ فہد ہسپتال میں اپنی آخری سانسوں پر ہے۔“

”اللہ نہ کرے وہ آخری سانسوں پر ہو۔ کچھ تو اچھا ہوں۔“ چا چا سوہنا دکھ سے بھرا تو ایک شخص نے کہا ”چاچا! گاؤں سے کتنے ہی لوگ شہر کے ہسپتال سے ہو کر آئے ہیں۔ وہ بھی بتاتے ہیں کہ اب فہد کی امید نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا ہے یا رب تو انکیشن والی بات ہی سمجھ ختم ہے۔ وہ نہ رہا تو کس نے مقابلہ کرتا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا تو وہ شخص بولا

”پر یہ کیا کس نے ہے، یہ کوئی پتہ چلا؟“

”ہم تو کہہ نہیں سکتے، ظاہر ہے اس کے کوئی مخالف ہی ہوگا۔ ساری بنی بنائی کھینچ ختم ہو کر رہ گئی ہے۔“

”اچھا چل یار۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ وہ شخص کہہ کر چل دیا۔ چاچے سوہنے نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ کر مسجد کی طرف چلا گیا۔

ہسپتال میں وہ سب ای سی یو کے باہر کھڑے تھے۔ سب غمگین تھے۔ فہد بیڈ پر پڑا تھا۔ نرس اس کے پاس کھڑی تھی جب اس نے آنکھیں کھولیں۔ فہد کو دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ نرس ڈاکٹر کو بلائے دوڑی۔ سب اس کے پاس جمع ہو گئے۔ فہد نے ڈاکٹر کی سانسوں سے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں پایا۔ پھر بڑی مشکل سے دھیمی آواز میں بولا

”میں کہاں ہوں؟“

”تم ہسپتال میں ہو، سراج بروقت تمہیں یہاں لے آیا تھا۔ دو گولیاں لگی تھیں۔ لیکن اب خطرے سے باہر ہو۔“ مائرہ نے تیزی سے بتایا تو فہد بولا

”اور تم سب یہاں ہو؟“

”جیسے چھوڑ کر کہاں جاتے تم زندگی اور موت کے۔“ جعفر نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولا

”نہیں! مجھے چھوڑ دو، انکیشن کمبین زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، ہم لوگ کمبین چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”عجیب آدمی ہو تم۔ تمہیں ہوش نہیں اور۔۔۔“ جعفر نے کہا تو فہد بولا

”ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لیے یہاں ہیں نا۔ یہ نازک وقت ہے کمبین کے لیے۔ مخالف تو یہی چاہتے تھے کہ تم لوگ اپنی توجہ

... جاؤ پالیز۔“

”جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ ہم آپ کو کیسے چھوڑ کر چا سکتے ہیں۔“

سہمی نے نرمی سے کہا تو فہد مایوسی سے بولا

”یعنی میرا مقصد ناکام ہو گیا۔ ہاں اب مجھے مر جانا چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا تھا۔ سہمی نے اسے دیکھا اور تڑپ کر بولی

”نہیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کا مقصد پورا ہوگا۔ میں ابھی اور اسی وقت جا رہی ہوں، آپ بس ٹھیک ہو جائیں۔ بس ایک

بار آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔“

سہمی کے یوں کہنے پر فہد نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھ تو فوراً پلٹ گئی۔ مائرہ چند لمحے سوچتی رہی پھر وہ بھی پلٹ گئی۔ جعفر نے

اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کئے اور پلٹا تو ملک نعیم نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ سراج بھی چلا گیا تو فہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہ گئی۔ وہاں فقط چھاکارہ گیا جو اس کے ساتھ لگ کر روئے لگا۔

وہ پانچوں ہسپتال کے کارڈیو لرس تیزی سے واپس یوں جا رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہوں۔ جس وقت

وہ جا رہے تھے، اسی وقت ہسپتال کے باہر کارڈیو لرس میں سے محمود سلیم اتر آیا۔

فہد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ چھاکا اس کے پاس اداس بیٹھا ہے۔ اسنے میں محمود سلیم اتر آ گیا اور بڑے جذباتی انداز میں فہد کو

دیکھا۔ بڑے پیار سے اس کا سر سہلایا تو فہد نے آنکھیں کھول کر خوشگوار حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا

”پاپا آپ۔ ا۔“

”ہاں بیٹا میں، ابھی پہنچا ہوں۔ کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں پاپا۔ آپ بالکل ٹھیک نہ کریں۔ بس ایک دو دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ نے ذرا سا بھی

پریشان نہیں ہونا۔“ فہد نے کراہتے ہوئے کہا تو محمود سلیم نے اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھ کر کہا

”میں جانتا ہوں بیٹا، اللہ کرے ایسا ہی ہو، اب میں آ گیا ہوں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں پاپا آپ بیٹھیں نا میرے پاس۔“

وہ اس کے قریب بیٹھ گیا تو چھاکے کی طرف دیکھ کر پوچھا

”یہ کون ہے؟“

اس سے پہلے کہ فہد کچھ کہتا وہ تیزی سے بولا

”میں چھاکا جی، چاہے سو نہ بنے کا پتر، پورے علاقے میں میری دس بچہ ہے۔ فہد میرا بچپن کا یار ہے جی۔“

اس کے یوں کہنے پر فہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی محمود سلیم نے اسے دیکھا اور کہا

”تم نے اس انکیشن مہم کے لیے بالکل نہیں گھبراتا۔ میں آگیا ہوں۔ میں سب دیکھ لوں گا اب تم صرف اپنے آپ توجہ دو۔“
فہد اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

سسی شعلہ جوالا بن چکی تھی۔ وہ سارے علاقے میں پھرنی۔ اس کے ساتھ مائرہ تھی۔ وہ تقریر کرتی گویا آگ لگا دیتی۔ کسی کے گمن میں بھی نہیں رہا کہ یہ وہی چھوٹی موٹی سی لڑکی ہے جو خوف زدہ گھر میں بند رہتی تھی۔ جعفر نے انہیں ہر طرح کا تحفظ دیا تھا۔ ملک نصیم نے پورے علاقے میں اپنے آدمیوں سے انکیشن مہم کا جاری رکھا ہوا تھا۔ سراج نے سب سنبھال لیا تھا۔ یہاں تک کہ انکیشن کا دن آگیا۔

فہد ہسپتال میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس آئے۔ نرس بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے لگ گئی تو ڈاکٹر نے خوش ولی سے پوچھا
”کہئے فہد صاحب! کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں اور آج آپ مجھے ڈسپارچہ کرویں۔ آج مجھے جانا ہے۔“ فہد نے تجزی سے کہا تو ڈاکٹر نے پریشانی سے پوچھا
”آج، دو کیوں، ابھی تو چند دن حزیہ لگیں گے، ابھی آپ پوری طرح تندرست نہیں ہوئے۔“

”لیکن آج مجھے جانا ہے ڈاکٹر، آج ووٹ ڈالے جا رہے ہیں۔ اور میرا وہاں ہونا بہت ضروری ہے، آپ سمجھیں ڈاکٹر۔ مجھے اپنا ووٹ کا سٹ کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو، لیکن اگر طبیعت خراب ہو تو فوراً یہاں آ جائیں۔ ورنہ پھر سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“
ڈاکٹر نے کہا تو فہد جلدی سے بولا

”میں آ جاؤں گا۔“

”میں ابھی آپ کو بھیج دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے چارٹ پر لکھا اور آگے بڑھ گیا۔ تبھی فہد نے چماکے سے کہا

”دیکھ کیا رہے ہو۔ سامان اکٹھا کرو اور گاڑی منگواؤ، ہمیں گاؤں جانا ہے۔“

چماکے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ شدت جذبات سے بول نہیں سکا، بلکہ سیل فون پر نمبر ملاتے ہوئے آنسو صاف کرنے لگا۔

رات کے وقت سسلی کا آفس کے سامنے لوگ جمع تھے۔ ایسے میں گاڑی آ کر رکی اور اس میں سے فہد نکلا۔ مائرہ اور سسلی دونوں آگے بڑھیں اور اسے سہارا دیا۔ سسلی ایک طرف تھی اور مائرہ دوسری جانب۔ تبھی فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

”کتنا حسین سہارا ہے۔“

اس پردوں نے کچھ نہیں کہا فقط مسکرا کر رہ گئیں۔

وہ تینوں آفس میں تھے۔ فہد بہت بے چین اور تھک محسوس کر رہا تھا۔ تبھی مائرہ نے فون نکالے ہوئے کہا

”بہت وقت ہو گیا۔ ابھی تک رزلٹ نہیں آیا۔ میں ملک نعیم کو فون کرتی ہوں۔“

”ابھی ٹھہرو۔ ادھر خود فون کرے گا۔“ فہد نے کہا تو سسلی بولی

”باہر دیکھو کتنا جھوم ہے۔ سب یہی رزلٹ سننے کے لیے آئے ہیں۔“

اتنے میں چھا کاٹے اندر آ کر کہا

”سارے پورنگ اسٹیشنوں سے رزلٹ آ گیا ہے اور ہم جیت گئے ہیں۔“

”سسلی شدت سے رو پڑی۔ فہد پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ مائرہ نے خوشی سے سسلی کو گلے لگاتے ہوئے کہا

”واؤ۔“ پھر والہانہ انداز میں فہد کے پاس جا کر بولی، ”فہد تم جیت گئے ہو۔“

”نہیں۔ ہم سب جیت گئے ہیں۔ سسلی جیت گئی ہے، تم جیت گئی ہو، چھا کا سراج، امین ارائیں، صفیہ، رانی سب جیت گئے ہیں۔“

”اؤے اب ہوگی، پورے علاقے میں ہماری دس بچھ۔“ چھا کے نے فخر و لگایا تو باہر بھی فخرے گلنے کی آوازیں آنے

لگیں۔ اتنے میں فون آ گیا۔

”مبارک ہو فہد۔ اسسلی جیت گئی ہے، ہم دوسری چھوٹی سیٹ بھی جیت گئے ہیں۔ اور انشاء اللہ بڑی بھی جیت جائیں گے۔

بہت لیڈ ہے۔“

”آپ کو بھی مبارک ہو۔“ فہد نے کہا

”نہیں یہ آپ کی کامیابی ہے، اور ہاں، ذرا ادھیان سے چوہدری کچھ بھی رد عمل دکھا سکتے ہیں۔

”اب میں دیکھ لوں گا۔“ فہد نے دانت پیستے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ مائرہ اس کے پاس آ کر بڑے جذباتی انداز میں بولی

”تم جیتے تھے۔ انسان کے پاس اگر حوصلہ ہو تو ہو کیا نہیں کر سکتا۔“

فہد کچھ نہیں بولا بلکہ دونوں ہاتھوں کو یوں کھول دیا جیسے دونوں کا سہارا چاہ رہا ہو۔ سسلی اور مائرہ نے اسے سہارا دیا اور آفس نے

ٹکٹے چلے گئے۔



رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ جعفر اپنے آفس تھا اور نور پور کے تھانیدار نے اندر آ کر سلیوٹ کیا اور بولا۔

”جی سر۔“

جعفر نے انتہائی تھکیک سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا

”اچھا کیا تم فوراً آ گئے ہو ورنہ میں تجھے۔۔۔ خیر، کیا اب بھی تمہاری ہمدردیاں چوہدریوں کے ساتھ ہے اور پھر تم افمی کی

قلای کرنا چاہتے ہو؟“

تجہی تھانیدار ہاتھ باندھ کر ہوا

”سرجی میں نے نوکری کرنی ہے۔ وہ اس علاقے میں طاقتور تھے۔ آپ کو پتہ ہے وہ سر پر ہاتھ رکھتے تھے، اس لیے کرنا پڑتا تھا سرجی۔“
 ”بکو اس کرتے ہو تم۔ تم اپنا فرض نہیں سمجھتے رہے ہو۔ چند لوگوں کی خاطر اپنا ایمان فروخت کرتے رہے ہو۔ تمہیں پتہ ہے تم نے کتنا ظلم کیا ہے۔ اگر اس کا ازالہ کرنے لگو تو تیری ساری عمر بھی کم ہے۔ تم مرنے کو تو سوچ کر تجھے موت نہ آئے۔ بولو کیا کروں تیرے ساتھ اپنی سزا خود ہی مجبور کر لو۔“ جعفر نے انتہائی غصے میں کہا

”ایسا ہی ہے سرجی میں بہت گنہگار ہوں۔ ایک بار معاف کر دیں۔“

وہ لپالت سے بولا تو جعفر نے نرم پڑتے ہوئے کہا

”معافی تجھے صرف ایک صورت میں مل سکتی ہے۔ اگر تم تم اس بندے کو گرفتار کر کے لاؤ جس نے فہر پر کاٹنا نہ حملہ کیا تھا۔ کیونکہ مجھے پکی خبر ہے تو اس کے بارے میں جانتا ہے۔ چوہدری کبیر کو میں خود لے کر آؤں گا۔“

”جی میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ مجھے بس ایک دن دیں۔ میں اسے زندہ یا مردہ آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔“ اس نے حتیٰ لچھے میں یقین دلاتے ہوئے کہا تو جعفر بولا

”دیکھ لو، اپنے لفظوں پر غور کر لو۔ ورنہ جو کچھ میں نے تیرے بارے میں سوچا ہوا ہے، اس پر عمل نہ کروں۔“

”بس ایک موقع سرجی۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو اس نے ایک دم کہا

”چلو تمہیں ایک موقع دیا کل شام تک۔“

یہ سنتے ہی تھانیدار نے فوراً سلیوٹ مارتے ہوئے کہا

”جینٹل یو سرجی اب اجازت دیں۔ لو لکھ جیتی ہے۔“

جعفر نے سر کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ مڑا اور چلا گیا۔ جعفر مسکرا کر رہ گیا۔ اسے تھانیدار پر اعتماد نہیں تھا، اس نے اپنی فیملی تک گارنٹی تھی۔



رات گہری ہو چکی تھی۔ چوہدری جلال کاریڈور میں مضطرب انداز سے ٹہل رہا تھا۔ بشری بیگم نے اس کے قریب آ کر کہا
 ”چوہدری صاحب۔! میں مانتی ہوں کہ آپ اس الیکشن میں بہت مصروف رہے ہیں۔ اب تو ووٹ بھی پڑ چکے، آپ اتنے پریشان ہیں۔ پتہ ہے آپ نے شام سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا۔ آئیں کھانا کھالیں۔“

”ووٹوں کی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ کچھ دیر میں حتیٰ رزلٹ آ جائے گا۔ میں وہ سن کر ہی۔۔۔“ وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔
 ”پتہ نہیں کب آئے گا رزلٹ، وقت لگے گا، جو ہو گا وہ سننے آ جائے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔“ بشری بیگم نے کہا تو چوہدری جلال بولا

”نیگم پہلی بار جیتنے کے لیے اتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑا، کیسی کیسی بستوں میں جانا پڑا، سیاست میں سب سے مشکل مرحلہ بھی ہے۔“

”کبیر ہے نا اے پردہ...“ بشری نیگم کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اتنے میں فون بھا۔ چوہدری نے جلدی سے فون ریو کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔ بشری نیگم نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا

”کیا ہوا؟“

”ہم ہار گئے نیگم۔ لیکن نہیں۔ میں نہیں ہاروں گا میں نے ہمیشہ جیت دیکھی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ چوہدری جلال نے غصے میں خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو

بشری نیگم جلدی سے بولیں

”آپ آئیں۔! بیٹیں۔! ابھی کتنی...“

”ہونجی ہے، میں بھی ہار گیا ہوں اور کبیر بھی۔“ چوہدری جلال نے مشکل سے کہا اور دونوں افسردگی میں خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بشری نیگم اسے اٹھا کر اندر لے گئی۔

دونوں بیڈروم میں تھے۔ بشری نیگم نے دھیمے سے پوچھا

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

”پہلی بار شکست کھائی ہے نا۔ جسے نہ دل مانتا ہے اور نہ ذہن۔ یہ سب کچھ فہد کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب میں جو اس کے ساتھ کروں گا نا۔ وہ دنیا دیکھے گی۔ پھر کسے جرات نہیں ہوگی۔ ہمارا سامنا کرنے کی۔“ چوہدری جلال نے دانت پیستے ہوئے کہا تو بشری نیگم بولی

”چوہدری صاحب۔! یہ سیاست ہے۔ اس میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ اسے دل پر کیوں لگاتے ہیں۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اگر یہ سب فہد کی وجہ سے ہوا ہے تو سوچیں اس نے لوگوں کے دل کیسے جیتے۔ وہ کیسے کامیاب ہو گیا۔“

”یہ تو وقت بتائے گا نا کہ یہ جیت اُسے کتنی پہنچی پڑتی ہے۔ اسے شاید یہ علم نہیں کہ وہ سیاست کرتے کرتے عداوت بنا بیٹھا ہے۔ اور وہ بھی میرے ہی علاقے میں۔“ چوہدری جلال نے نفرت سے کہا

”جب آپ کے پاس طاقت تھی، تب وہ جیت گیا۔ اب تو آپ کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ ذرا سوچیں؟“

”بس۔ نیگم بس۔ مجھے یہ مشورے مت دو کہ اس کے آگے سر جھکا دوں۔ جنہیں آج تک میں نے اپنی جوتی کے برابر سمجھا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو ہم صرف حکومتی طاقتوں کے بل بوتے پر یہاں عکرائی کر رہے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔“ چوہدری جلال نے غرور سے کہا

تو بشری نیگم قہقہے سے بولی

”آپ جو مرضی کریں، یہ آپ کا اختیار ہے۔ لیکن آپ میری ایک بات ضرور مان لیں۔ خدا کے لیے۔ کبیر کو یہاں نہ رہنے

دیں اسے باہر کسی بھی ملک بھجوا دیں۔ یہ وقت نل جائے تو ہم اسے بلا میں گے۔“

”نہیں بیگم۔ اب اگر اسے یہاں سے بھیجا تو پورے علاقے میں یہی کہا جائے گا کہ میں نے اسے فہد کے ڈر سے بھگا دیا اور پھر ان حالات میں تو مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ یہیں رہے گا اور ان کیوں کا مقابلہ کرے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا تو بشری بیگم بولی

”سوچ لیں چوہدری صاحب۔! وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

”اب وقت ہی کو تو اپنے ہاتھ میں کرنا ہے۔ انہیں ہی نہیں جوام کو بھی بتانا ہے کہ حکمرانی کون کر سکتا ہے۔“ چوہدری جلال نے

نخوت سے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن کیر؟“ بشری بیگم نے اشارے میں کہا تو چوہدری جلال بولا

”بس بیگم۔ اب زیادہ بحث نہیں کرو۔“

یہ کہہ کر وہ بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند لیں۔ بشری بیگم اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ جیسے چوہدری جلال بھی وقت سے آنکھیں

بند کئے ہوئے ہے۔



نئے دن کا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ قسمت مگر میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔ فہد بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سسلی اس کے لیے چائے لے کر

آگئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو سسلی اسے کپ تھا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی

”فہد۔! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہمارے حالات یوں پٹ جائیں گے۔ ان خالوں سے چھٹکارا بھی مل سکتا ہے۔ اور

میرے ہاتھوں ان کی مانت ہوگی۔“

فہد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا

”تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت۔“

”میں کچھ اور کہہ رہی ہوں اور آپ کوئی اور جواب دے رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے بتا رہے ہیں؟“

سسلی نے حیرت سے کہا تو فہد پر سکون انداز سے بول

”نہیں، قدرت نے تمہیں اتنا مکمل اور خوبصورت بنا دیا ہے کہ مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ خوشی ہے کہ تمہارے اندر بہت

بڑی تہذیبی آچکی ہے۔“

”میں شاید کچھ بھی نہیں رہی۔ میری ذات کی نفی ہو گئی ہے۔ اب تو بس آپ ہی آپ ہو۔ فہد۔! میں وہ وقت یاد کر کے بڑا عجیب

محسوس کرتی ہوں جب آپ نے مجھے خواب دیکھنے کا کہا تھا۔“ سسلی یاد کرتے ہوئے بولی

”ابھی تو آدھے خواب پورے ہوئے ہیں۔ میرے خواب میں صرف تم اور میں نہیں، بہت سارے لوگ شامل ہیں۔ ہم نے جو

نعرے لگائے، تقریریں کیں۔ یہ فرضی، جھوٹی اور انکیشن جیتنے کے لیے نہیں کیں۔ ان پر عمل کر کے ہی ہم اپنے خواب کا سفر طے کریں گے۔“
فہد نے گہری سچیدگی سے کہا

”آپ ساتھ ہیں نامی خرابوں کے ہر جزیرے کو فتح کر لوں گی۔“ وہ محبت آمیز لہجے میں بولی

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ فہد نے پراحت دلچہ میں کہا

”یقین چاہیں۔ پھر وقت بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔ آپ چائے ٹکس ٹھنڈی ہو جائے گی۔ میں ناشتہ بنالوں۔ پھر باہر بیٹھ کر سبھی ناشتہ کرتے ہیں۔“ اس نے کہا تو وہاں میں سر ملاتے ہوئے چائے پینے لگا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

صبح کا سورج چڑھ آیا تھا۔ ماسٹر دین محمد، مائرہ، سلسلی، صفیہ اور فہد بھی صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان سب کے چہرے دکھ رہے تھے۔ ایسے میں مائرہ نے کہا

”ساری رات گزر گئی، ذرا سا بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا، جیت کی خوشی اتنی ہے کہ نیند اب بھی نہیں آرہی ہے۔“

”پتر۔ ایسا کامیابی تم لوگوں کے حوصلے، یقین اور محنت کی وجہ سے ملی۔ یہ خوشی، فطری ہے، لیکن یہ کوئی منزل تو نہیں ہے۔ اصل امتحان تو

اب شروع ہونا ہے۔ جس میں تم ایمانداری سے کامیاب ہو جاؤ۔ اصل کامیابی تو لوگوں کا دل جیت لینے میں ہے نا۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا

”ہاں یہ دل۔“ مائرہ کہتے کہتے مسکرا دی۔ ”خیر۔ اگر کے باہر سرکاری گاڑیاں آگئی ہیں۔ پتہ ہے کیوں۔ پورے ملک میں

ہماری سیاسی پارٹی جیت گئی ہے۔ حکومت کی ڈوریں اب اسی سیاسی جماعت کے ہاتھوں میں ہوں گی۔“

”فہد، تم کچھ نہیں بول رہے ہو۔ خاموش کیوں ہو؟“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا تو وہ بولا

”میں اس امتحان ہارے میں سوچ رہا ہوں، جس سے اب گذرنا ہے، سلسلی اس سے گذر بھی پائے گی یا نہیں۔“

”ماائرہ ہے نامیرے ساتھ، جس طرح یہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح وہ کامیابی بھی مل جائے گی۔“ سلسلی نے مائرہ کی

طرف دیکھ کر کہا تو ماسٹر دین محمد بولا

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم لوگ تھوڑا آرام کر لو۔“

”ابھی آرام نہیں ہے انگل۔ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔“ مائرہ نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا تو فہد نے چوتھے ہوئے پوچھا

”کیا کرنا باقی ہے؟“

”بتاؤں گی۔ بہت جلد بتاؤں گی۔“ یہ کہہ وہ نازل ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ لوگ چائے ختم کر دو سلسلی کے آفس جائیں وہاں

بہت سارے لوگ آئے ہوئے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی چائے پینے لگی۔

ماائرہ ابھی سلسلی کے آفس پہنچی ہی تھی کہ جعفر کا فون آگیا۔ وہ قسمت نگر سے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سراج سے کہا اور

اپنی گاڑی میں وہاں چلی گئی۔ کھیتوں کے پاس سڑک کنارے جعفر سادہ لباس میں کھڑا تھا۔ اس کے پاس سراج تھا۔

”کچھ دیر بعد وہ تینوں کھیتوں کے کنارے سڑک پر کھڑے تھے۔ سراج ان کے ساتھ تھا۔ مائرہ نے رک کر اس سے پوچھا۔

”نہی وہ جگہ ہے، جہاں فہد فیکٹریاں لگانا چاہ رہا ہے۔“

”جی، یہی جگہ ہے۔“

”جگہ تو مناسب ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے سیل فون سے اس جگہ کی ویڈیو بنانے لگی۔ پھر اس سے پوچھا، ”سراج بھائی آپ کا کیا

خیال ہے۔ یہاں فیکٹری لگ جانے سے یہاں کے عوام کو کتنا فائدہ ہوگا۔“

”فائدہ ہی فائدہ ہے۔ بہت روزگاروں کو اور ان لوگوں کو جو چودہریں کے کمی ہیں“ سراج نے کہا تو مائرہ سوچے ہوئے بولی

”چلو چلتے ہیں۔“

وہ سراج کے ساتھ پلٹ کر گاڑی تک گئی۔ سراج واپس پلٹ گیا تو جعفر نے پوچھا

”مائرہ، انکیشن ہو چکا، حکومتیں بننے، حلف اٹھانے میں تو کئی دن لگ جائیں گے۔ کب واپس جانا ہے تم نے؟“

”کیوں اتنی جلدی اکتا گئے ہو مجھ سے۔“ مائرہ نے خوشگوار لہجے میں کہا تو جعفر بولا

”میں اور تم سے اکتا جاؤں بلکہ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کاش تم اسی طرح میرے ساتھ زندگی کی راہوں پر چلو“ وہ مسکراتے

ہوئے بولا

”سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ تم یہاں سے اب جانا چاہ رہے ہو۔“ مائرہ نے کہا

”اور تم سیدھا جواب کیوں نہیں دیتی ہو کہ یہاں پر کیوں پڑی ہوئی ہو۔ میرے ساتھ چلو نا تو رپور، وہاں کچھ دن رہو میرے

ساتھ۔ وہاں بھی تو....“

”مجھے بھی معلوم ہے آج ہی چلتے ہیں، آؤ چلیں۔“

یہ کہہ کر وہ گاڑی کی جانب بڑھی تو جعفر بھی چل دیا۔

سراج اپنی ہائیک پر چڑھا ہے میں آیا تو چاچا سوہنا، حنیف دوکاندار کے ساتھ اور کئی لوگ کھٹے ہوئے تھے۔ وہ سب خوش تھے

۔ ہاتھیں کر رہے ہیں۔ سراج اپنی ہائیک سے اتر کر ان کے پاس گیا، ہاتھ ملاتا ہوا ان میں بیٹھ گیا تو حنیف دوکاندار نے کہا

”یہ تو انقلاب آ گیا یار۔ چودہریوں کو اس قدر شکست ہوئی، سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ فہد نے کیا جادو کر دیا ہے۔ سمجھ نہیں آرہی۔“

”انقلاب جادوؤں سے نہیں آتے، ہمت، حوصلے اور یقین سے آتے ہیں۔ عوامی شعور سے آتے ہیں۔ تمہیں سمجھ اس لیے نہیں

آ رہی ہے کہ تمہیں عوام کی قوت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ عوام ہی ایسی قوت ہیں جو عالموں کو بے بس کر کے رکھ دیتی ہے۔“ سراج نے کہا تو

ایک آدمی ہنستے ہوئے بولا

”تم تو اچھی بھلی تقریر کرنے لگ گئے ہو یا۔“

”آخر فہد کا اثر جو ہے۔ اس نے ایک عام سی لڑکی کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ نہیں کیا یہ سراج، آزاد فضاؤں میں سانس لینا کیسا ہوتا ہے۔ ابھی انہیں آزاد اور صاف فضا میں سانس پینے کا موقع ہی کہاں ملا ہے۔ وقت گلے گا۔ پھر انہیں ساری عقل بکھڑا جائے گی۔“

چاچا سوہنا حسرت سے بولا تو سراج نے کہا

”تم نے نہ سہی چاچا، ہم نے نہ سہی لیکن آنے والی نسیمیں تو صاف اور آزاد فضا میں سانس لیں گی نا۔“

”یہ ہوتا ہے اصل بدلہ۔ چوہدریوں کی وہ رگ ہی کاٹ دی، جس کی وجہ سے وہ ظلم کرتے تھے۔ ہزارم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ سارا علاقہ اب تم لوگوں کے ساتھ ہے۔“ چاچے سوہنے نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو سراج اٹھ گیا۔



حویلی کے ڈرائنگ روم میں چوہدری جلال اور فشی کے ساتھ تھانیدار بیٹھا ہوا تھا اور ان میں بات جاری تھی۔

”چوہدری صاحب! آپ انکار کر دیں تو یہ الگ بات ہے۔ ورنہ جس بندے نے فہد پر قاضی نہ حملہ کیا تھا۔ اسے یہاں دیکھا گیا ہے۔ وہ آپ کی ایکشن مہم میں آپ کے ساتھ تھا۔ اس کا ثبوت، فوٹو اور ویڈیو کالمس کی صورت میں ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ مدعی بھی اسے پہچان چکے ہیں۔ آپ اپنی ساکھ بچائیں اور قانون کا ساتھ دیتے ہوئے اسے ہمارے حوالے کر دیں۔“

تھانیدار نے منت بھرے لہجے میں کہا تو چوہدری جلال مسکراتے ہوئے بولا

”حکومت کیا بدلی، تم لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ ہماری ساکھ تباہ ہو جائے گی۔ ہم سدا بہار ہیں اور رہیں گے۔ باقی جہاں گڑ ہوتا ہے نا۔ وہاں ہزاروں بھگیاں، بھینٹاتی ہیں۔ گڑ قلم، بھگیاں، عاقب، اب میں کسے کہاں تلاش کرو۔ یہ تم لوگوں کا کام ہے۔“

”دیکھیں۔ آپ اب تعاون کریں۔ میں سرکاری ملازم ہوں، سرکار ناراض ہو گئی تو میری نوکری چلی جائے گی۔“ تھانیدار

لجالت سے بولا

”مگر میں اسے کہاں سے لاؤں۔ جس کا ذکر تم کر رہے ہیں۔ رات گئی، بات گئی، دو چار چھاپے مارو، روزنامہ کال کر دو، اسے اشتہاری قرار دے کر قائل بند کر دو۔ اب یہ بھی سبق مجھے پڑھانا پڑے گا۔ پہلے ہی تمہاری وجہ سے میرے بچے کبیر کا معاملہ بھی لٹک گیا ہے۔“ چوہدری جلال نے ناراضگی سے کہا تو تھانیدار بولا

”ناں چوہدری صاحب! ناں، میں نے اپنے اختیارات سے کہیں زیادہ کچھ چوہدری کو تحفظ دیا اب ہماری وردی کسی کی قسمت سے تو نہیں لڑ سکتی نا۔“

”کہاں تحفظ دیا۔ وہ کیس تو عدالت میں ہے۔ تم تعاون کرنے تو سارا معاملہ تھانے ہی میں رفع دفع ہو گیا ہوتا۔ پھر کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آتا۔ اب جاؤ، سر نہ کھڑو۔“ چوہدری جلال نے اکتاتے ہوئے کہا تو تھانیدار نے پھر منت کرتے ہوئے کہا

”نہیں چوہدری صاحب ایسے نہیں کوئی نہ کوئی حل تو ہو۔ وہ بندہ مجھے چاہے آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ عجیبہ قانونی معاملہ ہے۔ اس وقت لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ حالات آپ کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ پھر بھی وہ بندہ آپ پولیس کے حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ اسے دیں اور اپنی جان چھڑائیں۔“

”اس نے میرا کام کیا ہے۔ پولیس کے حوالے کر دیا تو میرا نام بک دے گا ڈبچے ڈبچے مجھے بھی بے ڈوبے گا۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھایا۔

”پھر کیا ہوگا۔ اقدار کریں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ پولیس آپ کو گرفتار کرنے سے قورہی۔ میں معاملہ ہی گوں کروں گا۔ آپ کا کہیں نام نہیں آئے گا۔“ قائد ار نے صلاح دی تو چوہدری جلال نے بھڑکتے ہوئے کہا

”یعنی سر جھکا دوں ابھی سے چھوڑا دوں اور جاؤ اچھا کام کرو۔“

”میں تو اسے ایس پی صاحب کے کہنے پر آپ کے پاس آیا تھا۔ لیکن۔ خیر میں چلا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے قائد ار اٹھا اور ان سے ہاتھ ملا کر چل دیا۔ چوہدری اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

رات کے پچیس بجے کے سنانے میں چوہدری کے ڈیرے پر چوہدری کبیر اور کاشی باتیں کر رہے تھے۔ کاشی نے اکتائے ہوئے لیجے میں کہا

”میں نے تو اپنا کام کر دیا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت ہے کہ ابھی اوپر والے نے اس کا ویزہ نہیں منظور کیا۔ چوہدری صاحب سے پوچھو آگے کیا کرنا ہے، اسے ختم کروں یا پھر وہ مجھے یہاں سے لٹا لٹے ہیں۔“

”میری اس معاملے میں بابا سے بات ہوئی تھی۔ وہ فی الحال اسے چھیڑنا نہیں چاہ رہے ہیں۔ آج رات تم جب جا ہو چلے جانا خیر رقم تجھے مل گئی ہے۔“ چوہدری کبیر نے سکون سے کہا تو کاشی بولا

”ٹھیک ہے، میں آج رات ہی نکل جاؤں گا۔ تم چوہدری صاحب سے پوچھ لو۔“

”کاشی! تمہیں نوٹوں کی ضرورت تو ہوگی۔ میں تمہیں ڈالر دوں گا۔ ایک کام کرو میرا جاتے جاتے۔“ چوہدری کبیر نے حسرت

آہر لیجے میں کہا تو وہ بولا

”بولو، کیا کام ہے۔“

”سٹی نے اگر اسٹیبل میں جا کر حلف اٹھا لیا تو سمجھ، ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہے اسے نہیں رہنا چاہئے۔“ چوہدری کبیر نے بے بسی سے کہا تو کاشی بولا

”وہ تو بہت آسان شکار ہے۔ کہو تو آج رات ہی پا کر دوں۔“

”جب تمہارا دل چاہے۔ نہ وہ ہوگی، نہ حلف اٹھائے گی۔ کام ہوتے ہی تمہیں ہمارے بندے لے کر نکل جائیں گے۔“ وہ

دانت پیٹے ہوئے بولا تو کاشی نے اٹھتے ہوئے کہا

”تم اپنے بندے تیار رکھو میں آتا ہوں ابھی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا بطل نکال کر چپک کیا اور اٹھ کر چل دیا۔

رات کے گہرے اندھیرے میں ڈیرے کے باہر پولیس وین آ کر رکی۔ اس میں سے پولیس مین تیزی سے باہر نکل کر پھیل گئے۔ ان کے جعفر اور اس کے پیچھے تھانیدار تھا۔ اس کے ساتھ ہی چیمل کی وین آ کے رکی۔ اس میں سے مائرہ اور کبیرہ مین نکل کر وہ بھی پھیل گئے۔ تھی اندر سے ایک فائر ہوا تو ہر سے فائرنگ ہونے لگی۔ اچانک ہی ان میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ کچھ پولیس والے زخمی ہوئے لیکن ڈیرے پر موجود کافی بندے خون میں لت پت پڑے تھے۔ کبیرہ مین انہیں کور کرتا تھا۔ پولیس والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس لئے چند منٹوں ہی میں ان پر قابو پالیا۔ اچانک تھانیدار اور کبیرہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تو تھانیدار نے کہا

”خبردار کبیرہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”تم۔ تم مجھے گولی مارو گے۔ کل تک ہمارا کھانے والا آج ہمیں دھمکی دے رہا ہے۔ چل مجھے یہاں سے باہر نکال۔ تجھے مال مال

کر دوں گا۔“ کبیرہ نے غارت سے کہا تو تھانیدار بولا

”نہیں چوہدری اب تیرا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ تجھے مرنا ہوگا۔ ورنہ میں میراؤں گا۔ تیرے کھانے میں قتل ہی بہت ہیں“ کبیرہ نے اسے شدید حیرت سے دیکھا۔ لیکن تھانیدار نے لمحہ بھر بھی تاخیر نہیں کی۔ اور اس پر فائر جھونک دیئے۔ گولیاں کبیرہ کے لگیں تو وہ گرنا چلا گیا۔ ایسے میں ایک فائر تھانیدار کے آگے۔ اسے کاشی نے گولی ماری تھی۔ کاشی گھبرا کر نکلنے کی کوشش کی تو پولیس والے نے اسے پکڑ لیا۔ پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ کبیرہ مین کور کرتا رہا۔

چوہدری کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ قریب بیٹھی بشری بیگم سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ قریب ہی فون سیٹ کا رسیور ایک طرف پڑا

ہوا تھا۔

”وقت بدل گیا تو سارا زمانہ ہی بدل گیا۔ میں نے ایسا بھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ چوہدری جلال نے انتہائی یاسیت سے کہا تو

بشری بیگم روتے ہوئے بولی

”میرا پتر۔ تمہاری جھوٹی انا اور انتقام کی سیاست کی نذر ہو گیا۔ تم میرے بچے کے قاتل ہو۔“

”نہیں بیگم نہیں، کبیرہ کو خدا نخواستہ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے صرف زخمی ہونے کی اطلاع ہے وہ ابھی زندہ ہے۔“ چوہدری

جلال نے غصہ کر کہا

”وہ زندہ بھی ہوا تو پولیس اسے مار دے گی۔“ بشری بیگم نے پاگلوں کی طرح کہا اور ایک دم سے اٹھ کر باہر جانے کو لپکتی

۔ چوہدری جلال نے تیزی سے پوچھا

”کہاں جا رہی ہوں۔ تجھے ہو کیا گیا ہے؟“

”میرا بیٹا مر رہا ہے اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔“ بشری بیگم نے ہڈیانی انداز میں کہا تو چوہدری جلال سختی

سے بولا

”تم ادھر رو میں جا رہا ہوں تا میں سب سنبھال لوں گا۔“

”تمہاری بات کسی نے نہیں سنی، کہاں گیا تمہارا رعب اور وہ بدبہتم تو ایم این اے تھے۔ اتنا غرور کدھر گیا۔ تمہاری کسی نے عدو

نہیں کی، کہاں گئی تمہاری سیاسی پارٹی۔“ بشری بیگم نے پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے کہا چوہدری جلال بے بسی سے بولا

”سب آنکھیں پھیر گئے ہیں، سب“

”صرف ایک صورت ہے اپنے بیٹے کو بچانے کی۔ کسی طرح فہد کو جا کر متالو میرا کبیر بچ جائے گا۔ ورنہ... اگر اب بھی تم

میں کوئی غرور باقی ہے تو میں خود جا رہی ہوں اس کے پاس میں کروں گی اس سے انتحار۔“

”نہیں۔ بیگم، تم نہیں، میں خود جاؤں گا۔“ چوہدری جلال نے کہا تو بشری بیگم نے منت بھرے انداز میں کہا ”تو جاؤ، میرے

بچے کو لے آؤ۔“

چوہدری نے سر جھکا دیا۔



فہد اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ فون بجتے پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اسکرین دیکھ کر فون رسو کیا۔

”ہاں جعفر کیا بات اتنی رات گئے خیریت تو ہے نا۔“

”خیریت ہی ہے۔ اگر آسکتے ہو تو فوراً پور تھا نے میں آ جاؤ۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔“

”تھانے؟ وہیں جا رہے؟ بات کیا ہے تم اس وقت کہاں ہو؟“ اس نے الجھتے ہوئے کہا تو جعفر نے بتایا

”چوہدری جلال کے ڈیرے کے پاس ہوں اس وقت، ہم نے یہاں چھاپا مارا ہے، کافی قازنگ بھی ہوئی ہے، وہ بندہ بکڑا گیا ہے

جس نے تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ کئی دوسرے اشتہاری بھی ہیں۔ چوہدری کبیر کے کوئی لگی ہے۔ وہ زخمی ہے اسے ہسپتال لے گئے ہیں۔“

”اوہ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، تم فوراً۔“ اس نے کہنا چاہا تو وہ بولا

”مجھے مارہ نے منع کیا تھا۔ وہ بھی یہاں موجود ہے اپنی صحافی ٹیم کے ساتھ، جس نے یہ ساری کاروائی ریکارڈ کی ہے۔ ان سب

کو پولیس تھانے لے جا رہی ہے۔ تم آ جاؤ آسکتے ہو تو۔“

”یار یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ تم فوراً مارہ کو ادھر بھیجو پھر سب دیکھ لیتے ہیں۔“

فہد نے پریشانی میں کہا تو جعفر نے کہا

”وہ ماننے والی چر ہے تو نہیں، میں اسے کہہ دیتا ہوں۔ وہ جانے اور۔۔۔“

فہد نے فون بند کر دیا اور تیزی سے مائرہ کے نمبر ملائے۔ مائرہ مصروف تھی۔ فون بیل بجی تو اس نے مسکرا کر کہا
”مجھے معلوم تھا کہ تمہارا فون آئے گا۔ گھرانے کی کوئی بات نہیں۔ اب یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں آ رہی ہوں، دل پر ہاتھ رکھو۔“
یہ کہہ کر دوسری طرف سے کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا۔

صبح سویرے ابھی نور کا ٹکڑا تھا۔ فہد اس وقت ماسٹر دین محمد کے گھر جا پہنچا تھا۔ فہد اور سسلی صحن میں تھے۔ صفیہ ان کے پاس
تھی۔ تبھی مائرہ اور سراج گھر میں آ گئے، مائرہ ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی تو فہد نے کہا
”مجھے توقع نہیں تھی کہ تم یوں اپنی زندگی خطرے میں ڈالو گی، یہ سب کیسے؟“

”فہد تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ چوہدری کا زہر نہ نکالا جاتا تو یہ پھر ڈسٹا۔ ابھی رات کے دوسرے پہر اس نے ایک بندے کو یہاں
بھیجا۔ سسلی کو ختم کرنے کے لیے۔ وہ تو جعفر کی پلاننگ تھی چھاپے مارنے کی تاکہ کیر کو کچل سکے، ہر طرف سیکورٹی کے باعث وہ کاشی بھی پکڑا گیا۔“
”کاشی؟ وہی جو۔۔۔“ سسلی نے کہا تو فہد نے

”ہاں، وہی جس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اور کیر بھی بہت زخمی ہے۔“

”آؤ۔ اٹھانے چلتے ہیں۔ وہاں بہت سارے کام ہیں۔ رستے میں بتا دیتی ہوں کہ میں نے یہ سب کیسے اور کیوں کیا۔ اور پھر
میں نے وہیں سے ہی فور پور جانا ہے۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ مائرہ نے اس سے کہا تو سسلی نے حیرت سے کہا
”یوں آنا کا؟“

”بہت سارے کام کرنے ہیں وہاں، اس سے پہلے کہ یہ گرفتار لوگ اپنے تعلق آزمائیں۔ مجھے ان کا سب کچھ آن ایئر کرنا ہے۔“

اسنے میں ماسٹر دین محمد اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور خوف کا تاثر تھا۔ اس نے آتے ہی بتایا

”وہ چوک میں، مسجد کے پاس بہت سارے لوگ جمع ہیں چوہدری کے ڈیرے پر چھاپے کی اطلاع پورے علاقے میں جنگل کی

آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ لوگ خوش ہیں۔“

”ہم چلیں۔ صفیہ سامان رکھ دیا گاڑی میں۔“ مائرہ نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”کیا بیٹی جا رہی ہو تم؟“

”ہاں۔ اٹکل مجھے بہت جلدی جانا ہے۔ میں پھر آؤں گی اور اسی طرح ڈیر سارے دن رہوں گی۔“ مائرہ نے معذرت خواہانہ

انداز میں کہا اور فہد کی جانب دیکھا۔ وہ افسردہ تھا۔ تب ماسٹر دین محمد نے کہا

”بیٹا، ناشہ تو کر کے جانا۔“

”میں چائے پی لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ فہد کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ سب چائے پی رہے ہیں کہ فہد کا فون بج اٹھا ہے۔ فہد

اسکریں دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ فون کان سے لگا کر بولا

”ان حالات میں آپ کا فون آنا ہی تھا وکیل صاحب، بتائیں، کیا کر سکتا ہوں میں آپ کے لیے۔“

”آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے صلح کی کوشش کی تھی۔ مگر چوہدری کی اپنی طاقت اور دولت پر گھمنڈ تھا۔ اب نتیجہ بھگت رہا ہے۔ میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ وہ آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہے۔“ وکیل نے کہا تو فہد بولا

”وہ اب بھی نہیں مانے گا۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں اس نے ابھی مجھے خود فون کیا ہے۔ یہ وقت ہے، اس سے ہر شرط منوانے کا اور.....“ وکیل نے کہا چاہا تو فہد بولا

”مجھویری میں مانی گئی کوئی شرط، شرط نہیں ہوتی خیر۔ اسے کہیں وہیں آجائے جہاں آج سے کئی برس پہلے، اس نے استاد جی کا راستہ روکا تھا، وہیں بات کرتے ہیں۔“

”میں کہہ دیتا ہوں۔“ وکیل نے کہا تو فہد نے فون بند کر دیا۔ پھر ماسٹر دین محمد کی طرف دیکھ کر بولا، ”آئیں استاد جی، اسی جگہ پر ہول کے فیچر سڑک پر، جہاں ہمارا تانگہ روکا گیا تھا۔“

اس نے کہا تو وہ واقعہ ایک لمحے میں اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ خرد پوری قوت کے ساتھ اس کی سماعتوں میں ابھرا کہ میں ان کی کینوں سے بات نہیں کرتا۔ ماسٹر جی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مجھ سویرے مختلف گلیوں سے گاڑیاں نکل کر چوراہے سے گذریں۔ چاہے سوہنے نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔ عوام ان کے پیچھے چل دی۔ سراج اور چھا کے نے چند لڑکوں کو بتایا کہ چوہدری معافی مانگنے آ رہا ہے۔ یہ خبر پورے قسمت نگر میں پھیل گئی۔ میل فون نے لہجوں میں سب کو باخبر کر دیا تھا۔ اسی لئے عوام امنڈ آئی تھی۔

وہ اسی سڑک پر آ گئے۔ جہاں ہول کا درخت اب بھی کھڑا تھا۔ وہاں آ کر انہوں نے گاڑیاں روکیں اور ان میں سے باہر نکل آئے۔ فہد کو ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا جب انہیں مارا گیا تھا۔ دوسری طرف سے چوہدری جلال اور کئی لوگ آ گئے۔ وہ قریب آئے تو فہد نے اونچی آواز میں کہا

”ابھی وہیں کھڑے رہو چوہدری جلال۔ میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ صلح کرنے آیا ہوں۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ چوہدری جلال نے صلح جو انداز میں کہا

”ہاں، جانتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے ہمیں کھڑے ہو کر تم نے کہا تھا میں کی کینوں سے بات نہیں کرتا؟“

”ہاں ہاں مجھے یاد ہے مگر.....“ چوہدری جلال نے کہا چاہا تو فہد نے اس کی بات کاٹ کر کہا

”اس وقت تم مجبور ہوئے ہو تو یہاں آئے ہو۔ ورنہ تیرے جیسا ظالم اور مغرور آدمی یہاں کبھی نہ آتا۔ اس بیٹے کے لیے تم نے

میری خوشیاں برباد کیں۔ میرے والدین کو در بدر کیا۔ میرے شریف باپ کو چور بنا دیا۔ اب بتاؤ۔ وہ چور تھا یا سادھ؟“

”فہد پتر۔ ایر وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم“ چوہدری جلال نے عوام کی طرف دیکھ کر لجالت سے کہا تو فہد بولا
 ”نہیں چوہدری، یہی وقت ہے۔ تم آج تک انہیں چور کہتے رہے۔ لیکن سب سے بڑے چور تم ہو۔ حرام کھاتے ہو۔ زمینوں پر
 ناجائز قبضے کرتے ہو۔ بچاؤتوں سے نفع کھاتے ہو۔ مال ڈنگر کھلاتے ہو۔ بے گناہ غریبوں کے خون سے ہاتھ رنگتے ہو۔ کونسا جرم ہے جو
 تمہارے کھاتے میں نہیں۔“

چوہدری جلال نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں پایا فہد نے اپنی بات جاری رکھی
 ”میں اپنا ہر نقصان تمہیں معاف کر دیتا ہوں لیکن تم نے جو میرے استاد کی شان میں گستاخی کی تھی۔ یہ جرم ناقابل برداشت
 ہے۔ ساری زندگی میں نے اسی آگ میں جلتے ہوئے گزاری ہے چوہدری۔“
 ”مجھے معاف کر دو بیٹا۔“ چوہدری جلال نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تو فہد بولا
 ”چوہدری میرے استاد کو راضی کر لو۔ میں راضی ہو جاؤں گا۔“

”اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں ایسا کر لیتا ہوں مگر خدا کے لیے میرے بیٹے کو بچاؤ دہ زخمی ہے۔ میں اسے یہاں سے دور بھجوا
 دوں گا وہ دوبارہ کبھی یہاں نظر نہیں آئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور ماسٹر دین محمد کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تو ماسٹر دین محمد نے کہا
 ”بس چوہدری۔ میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا، جاؤ۔ سوہنے رب کے حضور جھک کر توبہ کرو۔ وہ معاف کرنے والا
 ہے۔“ پھر روئے سخن فہد کی طرف کر کے بولا، ”فہد بیٹے۔ امارے پیارے نبی ﷺ نے مکہ فتح کیا تھا نا۔ تو سب کو معاف کر دیا تھا۔ یہ
 سنت اپناؤ پتر۔ معاف کر دو میں نے معاف کیا۔“

”لوگ کہتے تھے آج انتقام کا دن ہے۔ مگر میرے سوہنے نبی نے فرمایا آج معافی کا دن ہے۔ جا۔ اسماعانی کا بھی کھٹول تمام اور
 صفیہ بی بی کے در پر چلا جا جس کے سہاگ کو تیرے فرعون حجاج بیٹے نے آجاؤ کر اس کے بچوں کو یتیم کر دیا۔ جا چلا جا۔ اس سے پہلے کہ میرا
 خون جوش مار جائے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔“

چوہدری واپس پلٹا ہی تھا کہ جعفر کی پولیس گاڑی وہاں آ گیا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بھی وہ چوہدری کے پاس آ کر بولا
 ”بہت افسوس ہوا چوہدری صاحب۔ تیرا پتر بہت ہی بزدل نکلا۔ اس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا ہے۔ ہم اسے بچا نہیں سکے۔“
 چوہدری کچھ نہیں کہہ پایا۔ پہلے ہونٹوں کی طرح اسے دیکھتا رہا پھر دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ آئے لوگ اسے جلدی
 سے اٹھا کر لے گئے۔

وہاں صرف سہیلی، مائرہ، فہد اور جعفر رہ گئے تھے۔ باقی سب لوگ چلے گئے تھے۔ بھی مائرہ نے فہد سے کہا
 ”فتح مبارک ہو۔“

”تمہیں احساس ہے کہ ذات کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ کئی برس پہلے یہاں میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ میں ظلم کے خلاف

لڑوں گا۔ اور فتح تک لڑتا رہوں گا۔ کیا یہ انقلاب نہیں ہے۔ اس فتح میں تم بھی میرے ساتھ شامل ہو مازہ۔“

”ہاں۔! آئندہ بھی رہوں گی۔ فہد میں تمہیں ایک خوبصورت فہد دینا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سسلی کا ہاتھ تھام کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہوں گی کہ تم سسلی سے شادی کر لو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ فہد نے پوچھا

”تم اور سسلی بہت سارے لوگوں کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ میری محبت تو رہے گی۔ مگر میں دوسروں کی محبت میں حائل نہیں ہو سکتی۔“ یہ کہتے ہوئے مازہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر قریب کھڑے جعفر کا ہاتھ یوں تھام لیا جیسے وہ فہد کو بتانا چاہتی ہو کہ اس نے اپنا ساتھ جعفر کو چن لیا ہے۔ ”یہ ہے نامیرے ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھ بھانے والا میرا دوست۔“

جعفر نے اس کی طرف بہت غور سے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر دیئے۔ وہ چند لمحوں سے دیکھتے رہے پھر پلٹ کر گاڑی کی جانب چلے گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے ہاتھ بلایا اور گاڑی چل دی۔ فہد اور سسلی نے ان کے ہاتھ ہلانے کا جواب دیا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور قسمت نگر کی طرف پلٹ گئے۔ وہ دور تک جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔



ختم شد